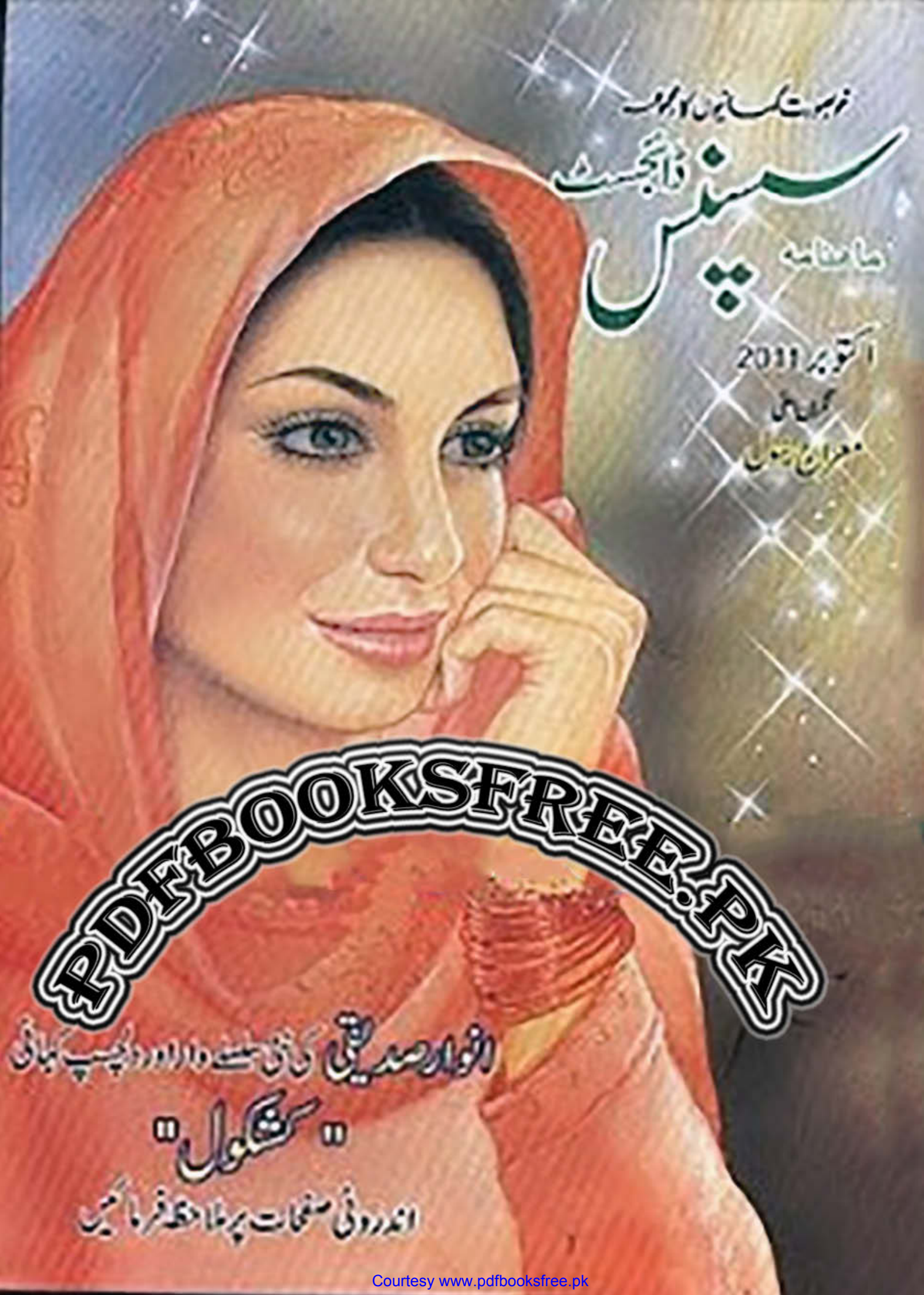

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انشائیہ — جون ایلیا
آفات زدہ لوگوں پر ایک صاحب دانش کا مرثیہ — 11

آپ کے خط — مدیر اعلیٰ
سسپنس کی مجلس مشاورت قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے — 12

صحرا بہ صحرا — ڈاکٹر ساجد امجد
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات — 20

مددگار — کاشف زبیر
فنا میں بقا تلاش کرنے والوں کی عجیب روداد — 49

کشکول — انوار صدیقی
اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ — 64

زادِ راہ — ش صغیر ادیب
ماضی کی خوشگوار یادوں میں گم ایک سچے عاشق کا فسانہ — 97

پرایا مال — منظر امام
مکروفریب کے بھنور میں پھنسے ایک پرخلوص جوڑے کی کتھا — 105

اقبالِ جرم — ملک صفدر حیات
عقلمندی سے واردات کرنے والے ایک بے عقل مجرم کی کتھا — 110

انتساب — تنویر ریاض
ایک قلمکار کا چونکا دینے والا انداز تحریر — 139

سزا — محمد زبیر سلیمانی
سطر سطر پر فکر..... ایک حساس تحریر — 147

محفل شعروسخن — قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ برنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ — 150

سیانا — مریم کے خان
ایک کامیاب بزنس مین کی ناکام چالوں کا احوال — 153

اناڑی
حالات کی سنگینی اور دریاؤں کی روانی کھلاڑیوں کے بھائی ایک اناڑی کی کتھا — 160

لاحاصل — سلیم انور
دولت کے حصول کی ایک رائیگاں کوشش... ایک بلاجواز مسافت کا ماجرا — 195

حضرت حزقیل علیہ السلام — رضوانہ ساجد
حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے پیغام کو بڑھانے والے ایک اور نبی کا احوال — 197

باوزن — ثمر عباس
غیر متوازن حالات میں توازن برقرار رکھنے والوں کا قصہ — 209

خزاں سے پہلے — رضوان اللہ منظر
گزرتے لمحوں کی فکر سے آزاد ایک پریمی جوڑے کا نظریہ — 225

پارسائی — محی الدین نواب
اذیتوں کے گرداب میں الجھی ایک معصوم دوشیزہ کی داستان الم — 236

جلد 40 • شمارہ 10 • اکتوبر 2011 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 5895313 فیکس (021) 5802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com
مالک و مدیر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انشائیہ

تم کملائی نہیں ہو!

جون ایلیا

کائنات اپنی قہاری کے ساتھ زندہ اور انسان جو وجود کا سرمایہ اور کائنات کا شرف ہے، زخم کاری کی اذیت سے سسک رہا ہے۔ فنا، پھول جیسے بچوں سے لے کر کہکشاؤں تک سب کا مقسوم ہے۔ وہ ماں جس نے بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ اپنی گود میں اپنی بچی کی آخری ہچکی سنی۔ اس بچی کی آخری ہچکی سنی، جس کے لب اپنی اذیت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اسے ابھی بولنا نہیں آتا تھا۔ بس اس کی اذیت زدہ اور اذیت ناک آنکھیں یہ بتاتی تھیں کہ میں اذیت کی حدوں سے گزر رہی ہوں۔ کوئی ڈراؤنی چیز ہے جو مجھے نگلنے کے لیے میری طرف بڑھ رہی ہے۔

آہ! وہ باپ جس نے بے کسی کے ساتھ اپنی لخت جگر، اپنی مہکتی ہوئی بچی کو اپنے ہاتھوں سے تہ خاک سلایا، جسے وہ اپنے سینے پر لٹاتا تھا تو اس کی روح معطر ہو جاتی تھی۔

وائے قسمت، وائے نصیب کہ جن ماں باپ کے دل اپنی بچی، اپنی معصوم خوب صورتی کو دیکھ کر گنگنا اٹھتے تھے، وہی اب اس کے لیے نوحہ کناں ہیں، ان کی سوگوار آنکھیں کہتی ہیں۔

ہائے مرا پھول لے گیا کون
ہائے مجھے داغ دے گیا کون

وہ جن کی آنکھوں میں اس سے روشنی تھی، جن کے ہونٹوں پر اس کے معصوم اشاروں سے مسکراہٹ جاگ اٹھتی تھی، انہوں نے، ہاں ان ماں باپ نے اپنی، رنگ و نکہت، بچی کا پرسا لیا، موت سے کس کو رستگاری ہے۔ رستگاری، کیسی رستگاری! زمین سے لے کر آسمانوں تک کہاں ہے رستگاری؟ کائنات کے ہر گوشے میں مرگ، ہلاکت اور فنا کا نقارہ بجتا ہے۔ زمین اور آسمانوں کے درمیان، زندگی، الامان۔۔۔ الامان، پکارتی ہے مگر کہیں بھی امان نہیں ہے۔ یہاں تو عالم پناہوں کو بھی پناہ نہیں ملتی۔

تو کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے، زندگی اور زندگی کا عیش؟ زندگی اور زندگی کی اذیتیں؟ وہ سارے دکھ جو زندگی کی خاطر جھیلے جاتے ہیں۔ وہ ساری شان و شوکت جس کو حاصل کرنے کے لیے آدمی ہر داؤ چلتا ہے۔ جب ہر چیز بے معنی تو پھر زندگی کے آخر کیا معنی ہیں؟ ہزاروں سال کی تاریخ، ہزاروں سال کی تہذیب اور ہزاروں سال کا تمدن، کیا یہ سب کچھ بے معنی ہے؟

ہاں، یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ اس قدر بے معنی کہ اگر انسان حقیقت پر غور کرے، چیزوں کی اصلیت اور ماہیت پر سنجیدگی کے ساتھ سوچے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ ہر شے میں گھاٹا ہی گھاٹا پائے گا اور صرف پشیمانی کمائے گا۔

''اگر یہ سب کچھ بے معنی ہے تو آخر معنی کے کیا معنی ہیں؟''

''بے معنی ہونا، یکسر بے معنی ہونا؟''

''ہاں، یکسر بے معنی ہونا...... مگر ایک حقیقت ایسی ہے جو اس ساری گفتگو کے برعکس ہے اور بس وہی سب کچھ ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہی ساری باتوں کی ایک بات ہے اور وہی رمز حیات ہے اور وہ ہے چیزوں کو بامعنی بنانا۔ ورنہ زندگی اور وہ سب جو زندگی کا حاصل ہے، وہ از خود بے معنی ہے۔ انسان اسے بامعنی بناتا ہے۔''

یہ سب کچھ تو درست ہے مگر کیا وہ کھلونے بھی بے معنی ہیں جن سے کھیلتے کھیلتے ہماری ننھی منی گڑیا ثنا عدم کے اندھیرے میں جا چھپی ہے؟

نہیں، وہ کھلونے بے معنی نہیں ہیں۔ وہ کھلونے بے معنی نہیں ہو سکتے...... اس لیے کہ وہ کھلونے ہیں اور انہیں ان سے کھیلنے والی ایک معصومیت نے بامعنی بنایا تھا۔ ان کھلونوں کو پیار کرو اور انہیں اپنے سینے سے لگا لو۔

ہم ان کھلونوں کو پیار کرتے ہیں اور انہیں، اپنی ثنا کے کھلونوں کو اپنے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ اس ثنا کے کھلونوں کو جو مرجھا گئی ہے۔

ثنا! ہم تمہیں آواز دیتے ہیں۔ تم ہماری آواز کا جواب دو۔ تم مرجھائی نہیں ہو۔ ثنا، تم ہماری یادوں کے گلدستے میں، ہمارے دل میں کھلی ہوئی ہو۔ تم بھلا کیسے مرجھا سکتی ہو، دل میں...... ہمارے دل میں!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقبول عام ٹی وی سیریلز اور شاہکار ناولوں کی تخلیق کار

عمیرہ احمد

جنہوں نے میدان میں آتے ہی قارئین و ناظرین سے اپنے فن تحریر کا لوہا منوالیا

......جو ہر نئی تحریر میں اپنے ہی بنائے ہوئے سنگ میل عبور کرتی جا رہی ہیں

ایک نئی اور تازہ، سلسلے وار کہانی

عمیرہ احمد کے قلم سے نکلی ہوئی، دلوں کی گہرائیوں کو چھو لینے والی،

ماہنامہ پاکیزہ میں ملاحظہ فرمائیں

عزیز قارئین

السلام علیکم!

اکتوبر 2011ء..... آپ کا من پسند سسپنس تمام تر لوازمات سے آراستہ آپ کے پیش نظر ہے..... پچھلے دنوں ہمارے سربراہ مملکت نے عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا۔ اس دورے سے واپسی کے بعد وفاقی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ چند برس میں پاکستان میں پرائمری کلاسز میں چینی زبان کی تعلیم دی جائے گی۔ خبر تو خوش آئند ہے مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہمارے قائدین بجائے زبان کے، ان اصولوں کو بھی اپناتے جن کے تحت چین نے ترقی کی دوڑ میں دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، چین میں ایک کہاوت بہت مقبول ہے کہ کسی بھوکے کو مچھلی نہ دو بلکہ کانٹا دے دو تاکہ وہ خود مچھلی پکڑ سکے، اور چین ہم سے بھی یہی چاہتا ہے لیکن ہم ہیں کہ اتنے برس سے صرف مچھلی پر ہی اکتفا کرتے آرہے ہیں۔

پچھلے دنوں ماہ صیام کے دوران اور عیدالفطر کے بعد ہمارے یہاں بااختیار طبقے نے جس طرح اپنی طاقت کا بے دریغ استعمال کیا ہے شاید ہی بربریت کی ایسی مثال پچھلے پینسٹھ سالوں میں قائم ہوئی ہو۔ جوان نسل کو پہلے بے روزگاری اور ناداری کی اذیتوں میں مبتلا رکھا اور پھر شاید توجہ ہٹانے کے لیے بوری بند نعشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کراچی پچھلے دنوں بیروت کی عکاسی کررہا تھا..... اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے..... کراچی رفتہ رفتہ مذبح خانوں اور عقوبت خانوں میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ جوں ریز سیاست کا یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا۔ ایسے میں سیلاب، ڈینگی کا عذاب اور دیگر آفتوں کا عتاب نازل نہ ہوتو کیا ہو..... لگتا ہے خدا کی رحمت نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے، نہ شہر میں رونق نظر آتی ہے اور نہ ہی کلیوں میں خوشی کی رمق ہی محسوس ہوتی ہے۔ عذاب کی ایک صورت مسلسل برسنے والی بارشیں بھی ہیں مگر افسوس کہ ذخیرہ گاہیں نہ ہونے کے باعث وہ پانی جسے ہم کئی برسوں تک کے لیے محفوظ کر سکتے تھے، ہمارے لیے زحمت بنا ہوا ہے بقول شاعر ؎

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

اس شعر کے ساتھ چلتے ہیں اب اپنی گنگناتی محفل کی جانب۔

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ ''ستمبر کا سسپنس چمکتے دمکتے رنگوں کی بہار لیے ہاکر سے موصول ہوا تو مانو جیسے دل کی کلی کھل اٹھی۔ ٹائٹل بھی موقعے کی مناسبت سے بہت خوب ہے۔ مہ جبیں گلفن کی جوت آنکھوں میں لیے محو انتظار و بے قرار ہے۔ ہمیشہ کی طرح انشائیہ بھی حکمت و دانائی کی باتوں سے مہک رہا ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو انجمن کہکشاں میں جاوارد ہوئے جہاں خوبصورت گل بوٹوں کی شکل میں نامۂ دل موجود ہیں، انہی کی قطار میں اپنا بھی نامۂ دل حال دل سنا رہا تھا مگر شاید گرمی کی تمازت نے کچھ مختصر کر دیا اپنے شعر کو تلاش کیا مگر وائے ناکامی ہم اس امید میں بھی خوش ہیں کہ امید ہی سب کچھ ہے۔ اس کے بعد اناڑی کے در پہ جا پہنچے جہاں اور شوخیاں، بے باکیاں، چالاکیاں اور نت نئی پینترے بازیاں جاری ہیں۔ اناڑی کی کہانی جاری ہے، رانا ختم تو اناڑی کی کہانی ختم۔ اس کے بعد انوار صدیقی کی کشکول شروع کی، پہلی قسط کی طرح اس دوسری قسط میں بھی یہ حال رہا کہ پہلی سطر سے قسط کی آخری سطر تک ڈائجسٹ سے نظریں نہ ہٹ سکیں باوجود بخار کی حرارت ہونے کے، جس کی وجہ سے حرارت زیادہ ہو گئی۔ عشق پیچاں بھی کہنہ مشق مصنف و محقق کار ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی محنت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ہم مغلیہ دور میں ہوں اور ہر واقعہ چشم کشا ہو۔ اکبراعظم کے حالات و واقعات، سلیم جہانگیر کی سلطنت آرائی و نور جہاں کی دانائی اور محبت کے گدگداتے لمحات سے لطف اندوز ہوئے جہاں محلاتی ریشہ دوانیاں بھی ہیں۔ بازگشت بھی ایک چبھتی ہوئی تحریر تھی کہ ہمارا معاشرہ بھی مغرب کی اندھی تقلید میں آنکھیں بند کیے دوڑ رہا ہے جس سے ظاہر ہے ٹھوکر تو لگے گی ہی مگر بچوں کو اپنی ڈگر پر چلانے کے لیے ماں باپ خصوصاً ماں کا کردار زیادہ اہم ہوتا ہے۔ جیسا کہ بزرگوں کا کہنا ہے کہ تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ نئی نسل یہ تاثر لیے ہوئے... مغرب کی کہانی تھی۔ پھر جنس کے بازار میں جہاں چنگاری ہوگی وہاں آگ تو لگے گی ہی۔ شناسا چہرہ بھی ٹھیک تھی جو کہ واقعات کے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ تھی۔ منظر امام کی پھولی زاد سالا ہلکی پھلکی مزاح کا تاثر لیے ہوئے تھی۔ آج کل کے پرمساعد حالات کے لیے اس جیسی کہانیاں ضرور ہونی چاہئیں جو اس گھٹن زدہ ماحول میں راحت کا احساس دلائیں۔ محفل شعروسخن میں اچھے اور بامعنی اشعار تھے۔ مختار آزاد کی انتظار بھی اچھی لگی۔ انتظار کی صلیب پر لٹکے متعدد افراد سرحدوں کے دونوں طرف پڑے ہوئے ہیں اور رہائی کی امید کی خواہش شدید رکھتے ہیں۔ جو رہا ہوتے ہیں ان کی رہائی زندگی کی نوید بن جاتی ہے۔ ایم اے راحت صاحب کی تحریر خیر خواہ بہت اچھی لگی کہ جمالے کو حرام کا مال ملا۔ مال مفت دل بے رحم کے مصداق وہ اپنے باپ کی جاگیر سمجھا۔ اتنا بڑا جرم کر کے وہ اگر دولت کو غریبوں میں بانٹ دیتا تو شاید اس کو بھی کچھ سکون کے لمحے مل جاتے۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کا قصہ اختتام کو پہنچا جو ایمان کو تازہ کرنے کا سبب بنا۔ درمیان میں لطائف سے بہت محظوظ ہوئے اور اقوال زریں سے بھی رہنمائی کا سبق ملا۔ پرفیکٹ سیٹ اپ بھی اچھی کہانی تھی کہ بہترین حکمت عملی سے میٹ نے منظم رہزن گروہ کو پکڑ لیا۔ آخری صفحات کی بہترین کہانی ٹارگٹ کلنگ آج کی کہانی ہے۔ آج یہی سب کچھ کراچی کی سڑکوں پر ہو رہا ہے اور تواتر سے یہ سلسلہ جاری

ہے جو ملک کے لیے ناسور اور لوگوں کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے۔ اب موت کا خوف کہ آج ہر انسان گھر سے نکلتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ گھر بھی واپس آپائے گا یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو، پورے پاکستان کو اپنی حفظ امان میں رکھے۔ سب ہی شرکت کرنے والے دوستوں کو عید کی پرخلوص مبارکباد...''

✠ **حکیم سید محمد رضا شاہ**، نورنگہ میانوالی سے تشریف لائے ہیں ''آپ کا ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ ماہ ستمبر ملا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اس سے قبل سرگزشت کے لیے چار پانچ خط لکھے مگر محفل میں شامل نہیں ہوئے۔ میرے خیال میں آپ مستقل خطوط لکھنے والوں کو شامل محفل کرتے ہیں۔ (ہمیں افسوس ہے کہ اگر آپ کے خط شامل نہ ہوسکے، وقت پر خط ملنے کی صورت میں ضرور شائع کیے جاتے ہیں یا کم از کم نام شائع کر دیا جاتا ہے) بہر حال ماہ رمضان اچھا گزر گیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی عشق پیچاں پڑھی۔ نورالدین محمد جہانگیر اور نور جہاں ملکہ کے واقعات پڑھے۔ یہ کہانی پہلے بھی سسپنس کے صفحات کی زینت بن چکی ہے۔ ویسے تو مغل بادشاہوں کے رحم دلی کے واقعات بیان کیے جاتے ہیں مگر جہانگیر بادشاہ کا شیر افگن اور کاتب اور نوعمر لڑکے کا سلوک پڑھ کر شدید ندامت ہوئی۔ بازگشت ایک سبق آموز کہانی ہے۔ محی الدین نواب کی کہانی واپسی ختم ہوئی۔ کہانی .... متوسط تھی۔ اس میں دیوتا کا عکس تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کشکول (انوار صدیقی) ایک اچھا سلسلہ ثابت ہوگا۔ دونوں قسطیں بہت اچھی تھیں۔ مرزا امجد بیگ کی شناسا چہرہ پڑھی۔ مکافات عمل کا بہترین نمونہ ہے۔ انتظار اچھی کاوش ہے۔ اناڑی کو خواہ مخواہ ڈھیل دی جاتی ہے اور نواب رفیق احمد آف ست بدھائی کے اور دشمن پیدا کیے جارہے ہیں۔ بہر حال ایک بہتر سلسلہ ہے۔ خیر خواہ اور پرفیکٹ سیٹ اپ عمدہ کہانیاں ہیں۔ جیسے کو تیسا کی بہترین مثال ہیں۔ احمد اقبال صاحب کی ٹارگٹ کلنگ پڑھی۔ کراچی درویشوں کا شہر کے بارے میں بہترین تصویر کشی ہے۔ خدا اس شہر کو نظر بد سے بچائے۔ اس شہر کو امن کا گہوارہ بنائے۔ پتا نہیں اس شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔''

✠ **خواجہ مدنی**، چوک ظاہر پیر سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''خط لکھنے کی پہلی مرتبہ جسارت کر رہا ہوں۔ 20 اگست کو رسالہ ملا۔ سب سے پہلے احمد اقبال کی کہانی ''ٹارگٹ کلنگ'' پڑھی۔ بہت اچھی لگی۔ وقار اور زریا کی لازوال محبت اور کہتے ہیں ناکہ زخم اپنے ہی دیتے ہیں۔ وقار کو زریا کے بھائی نے جرائم کی دلدل میں پھنسا کر اس کا گھر برباد کر دیا۔ رضوانہ ساجد کی اسلامی معلومات پر مبنی تحریر حضرت یرمیاہ نے بہت سی معلومات فراہم کیں۔ ایم اے راحت کی ''خیر خواہ'' اچھی کہانی تھی۔ اس میں جمالا تو حد سے زیادہ کنجوس نکلا۔ بہر حال دولت اس کے حقدار کو ملی۔ سلسلہ وار کہانی ''اناڑی'' بھی پہلے کی طرح بڑھیا تھی۔ نواب صاحب پہلے کی طرح مشکلات میں پائے گئے۔ میرے خیال میں رفیق احمد شیرازی اور نور کی گرفتاری میں شاکر کا ہاتھ ہے۔ ''انتظار'' مختار آزاد کی اچھی کاوش تھی، یہ ہوتی ہے سچی محبت، مسز احمد نے اپنی ساری زندگی فراز صاحب کے انتظار میں گزار دی۔ اس دفعہ منظر امام کی کہانی بس گزارا تھی۔ مرزا امجد بیگ نے ''شناسا چہرہ'' کیفی کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ اچھا لگا۔ غیر ملکی کہانیوں میں ''نئی نسل'' اچھی لگی۔ کاشف زبیر ویلڈن این جیمس نے بغیر دیکھے بھالے ایک سنگدل بڈھے سے دوستی کر لی جو اس کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنا۔ انوار صدیقی صاحب کی ''کشکول'' کی دوسری قسط پڑھی۔ لیاقت اور فرحین کی محبت، شیخ حامد، افضل خان کے جرائم اور سراج انسپکٹر کے کردار نے بے حد متاثر کیا۔ تاریخی کہانی ''عشق پیچاں'' میں ڈاکٹر ساجد امجد نے مغلیہ دور میں رونما ہونے والے واقعات پر مشتمل معلومات فراہم کیں۔ جلال الدین محمد اکبر اور اس کا بیٹا شہزادہ سلیم جو جہانگیر کے لقب سے اور مہرالنسا جو ملکہ نور جہاں کے بارے میں تھی۔ اب چلتے ہیں انشائیہ کی طرف جس میں جون ایلیا نے ارتقا کو مدعا بنا کر بیان کیا۔ جو اپنے اندر بہت سی نصیحتیں سموئے ہوئے تھا۔ محفل خطوط میں پہنچے تو اس مرتبہ شارقہ سلجوق کو کرسی صدارت پر پایا۔ واقعی ان کا تبصرہ قابل تحسین تھا اور وہ اس کرسی کی مستحق تھیں۔ جناب ایک ماہ کے لیے بادشاہت مبارک ہو۔ اس کے علاوہ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ اچھا لگا۔ اس دفعہ دلنشین جی پھر غائب، واہ جی واہ۔ طاہرہ یاسمین جی میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ''انسان بمقابلہ شیطان'' دوبارہ چھپنی چاہیے۔ ماہ ایمان آپ کو سیر و تفریح میں مزہ آیا کہ نہیں؟ سعید عباسی، سیدہ نسرین، رضا دی گریٹ کو بلیک لسٹ میں پا کر افسوس ہوا جبکہ محمد نعمان پیارے، روشن رشید اور حمیرا رضا کو محفل یاراں میں نہ پا کر بھی افسوس ہوا۔ محفل شعروسخن میں ماہ ایمان اور عاصم اقبال جسپال کے شعر اچھے لگے۔ تفسیر عباس بابر کے لطائف پڑھ کر ہنسی آ گئی۔'' (تبصرے کا شکریہ)

✠ **دانیال کاکڑ**، بہاولپور سے چلے آرہے ہیں ''سسپنس ڈائجسٹ تین ماہ پہلے پڑھنا شروع کیا، میرا بھائی سسپنس ڈائجسٹ پڑھتا ہے۔ ایک دن میں نے بھی پڑھا تو بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے میں اناڑی کے بارے میں بات کروں گا۔ یہ آخر نواب صاحب ہر بار اغوا ہوتا ہے پھر واپس خود ہی اپنے آپ کو بچاتا ہے، یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوتی میرا اندازہ ہے کہ جو لوگ نواب صاحب کو اغوا کرتے ہیں وہ لوگ ہی نالائق ہیں اور ٹارگٹ کلنگ میرے سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا آج کل اسی طرح کراچی میں ٹارگٹ کلنگ ہوتا ہے تو پھر ہر روز اتنے لوگ کیوں مرتے ہیں۔ اس طرح واقعات تو کبھی کبھار ہونا چاہیے، کشکول بھی اچھی کہانی ہے اس دفعہ جب لیاقت حسین کو گولی لگی یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوئی اگر لیاقت کے جسم پر گولی کے نشانات رہ گئے تھے تو پھر نشان کس طرح ختم ہو گئے۔''

✠ **حیدر خان**، روکھڑی ڈسٹرکٹ میانوالی سے تشریف لائے ہیں ''ڈاکرانکل اگر سرورق کی حسینہ کے جھمکوں میں آپ نے اس لباس کے رنگ کا نگینہ فٹ کر دیا ہوتا تو بہت سوٹ کرتا۔ بہر حال مجموعی تاثر اچھا رہا۔ اشتہارات چھلانگتے جون ایلیا صاحب کی خدمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں حاضر ہوئے اور علم و دانش کے گوہر سمیٹے۔ بے شک اہل علم اس جہان فانی کے مال و متاع اور خوش نمائی پر قناعت نہیں کرتا۔ اس کی منزل تو کچھ اور ہی ہوتی ہے آپ کے خط میں محترمہ شارقہ سلجوق کرسی صدارت پر جلوہ گر ہیں بڑی آب و تاب کے ساتھ۔ مبارک باد وصول کریں جناب عالیہ خوشبو لگا کے...... !طاہر یاسمین صاحبہ لگتا ہے آپ نے پرائمری تک ہی پڑھا ہے وہ بھی کسی سرکاری اسکول سے۔ ورنہ 15 اوراق کی کہانی پڑھنے میں دو گھنٹے تو نہیں لگتے۔ بھائی ہمایوں صدقہ خیرات کیجیے۔ انشاءاللہ پھر آپ کو خواب میں چڑیلیں نہیں ستائیں گی۔ بھائی حسنین عباس بلوچ دل چھوٹا مت کریں۔ امتحان اللہ کے پیاروں پر ہی آتے ہیں۔ لو جی محمد نعمان پیارے ماہا ایمان کی دعا قبول ہوگئی، آپ کو تو بلیک لسٹ سے بھی گیٹ آؤٹ کر دیا گیا، ہم احتجاج کرتے ہیں۔ ماہا ایمان جی طاہرہ یاسمین صاحبہ آپ سے حلوہ کھا کر ہی دم لیں گی۔ اب کھلا ہی دیں بیچاری کو، حلوے کی لالچ میں چار اسٹیشن آگے آگئی ہیں کسی مولوی کی طرح۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ''اناڑی'' پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح پرفیکٹ رہی لو جی! فیکے پتر نے ثمرہ کو بھی امپریس کر ڈالا۔ نور گئی کام سے۔ کشکول میں لیاقت کی پھرتی نے متاثر کیا۔ کہانی بہتر طریقے سے اپنا پلیٹ فارم بنا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سراج کی چیلنجنگ ٹیچر نے بھی متاثر کیا۔ کاش حقیقت میں بھی پولیس میں ایسے ہی افسران موجود ہوتے۔ انتظار نے دل کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ بازگشت میں ثنا نے اپنی بچکانا حرکت کی کافی سے زیادہ سزا بھگتی اور اس کی ماتھے کی کالک ساری عمر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ شناسا چہرے میں بیگ صاحب نے عمران کو مکھن میں بال کی طرح باہر نکال لیا۔ ویل ڈن بیگ صاحب۔ کبھی ایسی داستان بھی رقم فرمائیے جن میں آپ ہارے ہوں۔ منظر امام کی پھوپی زاد سالا نے آخر تک لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے رکھی۔ خیر خواہ میں رحمان نے دن دہاڑے شہزادا اور پرویز کو چکما دے دیا۔ جمال شاہ تو بیٹھ گئے سرمنڈا کے...... ٹارگٹ کلنگ کراچی کے حالیہ افسوس ناک حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی جانے والی داستان تھی مگر کہانی میں اتنی جان نہیں تھی۔ محفل شعر و سخن میں صوبیدار صاحب کا اول انعام یافتہ شعر بہت پسند کیا۔ بے شک ہم اندرونی خلفشار اور انتشار کا اتنا شکار ہو گئے ہیں کہ خدانخواستہ مشکل گھڑی میں ہمارے اوسان خطا ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ مہر عاصم حفیظ اور ایم ڈبل اے کے انتخاب بہت پسند آئے۔ اگرچہ عید کو گزرے کافی دن بیت چکے ہیں مگر پھر بھی ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور محفل میں تمام دوستوں کو عید مبارک... '' (خیر مبارک)

✠ **رائے قیصر عباس کھرل**، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل یاراں میں تشریف لائے ہیں ''سسپنس کے تمام اسٹاف کو میری طرف سے دلی عید مبارک اور تمام قارئین کو عید مبارک۔ میں کم از کم گیارہ سال سے سسپنس کی محبت میں گرفتار ہوں۔ پہلی دفعہ لب کشائی کا موقع حاصل کر رہا ہوں پہلے تو اور کاموں سے فراغت ہی نہیں ملتی تھی۔ اب جیل کی زندگی، جیل کی چار دیواری سسپنس کے سہارے کٹ رہی ہے۔ اس دفعہ کا شمارہ اٹھارہ تاریخ کو ملا۔ حسینہ کے ہاتھوں کی مہندی نے عید کی مبارک باد دی۔ سب سے پہلے چھلانگ لگا کر (اناڑی) پر پہنچے بڑا ہی مزہ آیا۔ لیکن کہانی رکی ہوئی ہے تھوڑا سا اس کو آگے چلائیں۔ فیقا پتر ہر دفعہ اتنی سیکورٹی میں اغوا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ''عشق پیچاں'' زبردست رہی۔ کشکول کا آغاز اچھا جا رہا ہے۔ واپسی کو ختم کر دیا بہت اچھا کیا۔ ٹارگٹ کلنگ کراچی کے حالات پر بہت اچھی تحریر تھی۔ بازگشت کا بھی اچھوں میں شمار ہے۔ ماہا ایمان جی میں حافظ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ آپ کا تبصرہ پڑھ کر کافی خوشی ہوتی ہے۔ خیر کیا ہوا میں ابھی اناڑی ہوں۔ عمران حیدر بلوچ اور حسنین عباس بلوچ میں بھی آپ ہی کی طرح جیل کا قیدی ہوں۔''

✠ **صوبیدار (ر) حاجی عبدالحکیم**، خانیوال سے چلے آرہے ہیں ''مورخہ 23 اگست کو میرا پیارا سسپنس آج میرے سینے سے آلگا ہے۔ صفحہ نمبر 17 پر اپنا خط دیکھ کر آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے۔ ذاکر صاحب نے جو سرورق بنایا ہے وہ ہماری مشرقی روایت کی پوری پوری عکاسی کر رہا ہے۔ ہماری بچیاں آج بھی عید کے موقعے پر ہاتھوں میں مہندی لگا کر اور چوڑیاں پہن کر عید کی خوشیوں کو آپس میں مل کر عید کے تہوار کو چار چاند لگاتی ہیں۔ اب آتے ہیں جون ایلیا صاحب کی محفل میں۔ جون ایلیا صاحب نے اس دفعہ ایک نئے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ جون ایلیا صاحب نے اس دفعہ ہمیں دین کی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور ہم سب کو شیخ کمیل ابن زیاد کے ارشادات پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی گزارنی چاہیے۔ اب چلتے ہیں اپنی خطوط کی محفل میں، شارقہ سلجوق صاحبہ کرسی صدارت پر اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ ان کو واپسی کی آخری قسط دیکھ کر جھٹکا لگا حالانکہ سسپنس کے زیادہ قارئین نے واپسی کی آخری قسط دیکھ کر آپ کا شکریہ ادا کیا۔ اب کچھ اناڑی کے بارے میں اپنی رائے پیش کر رہا ہوں۔ شکر ہے آپ نے اس قسط میں نواب صاحب کو اغوا نہیں کروایا اور کہانی کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ کشکول نے ہمیں اپنی دوسری ہی قسط میں اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے، لگتا ہے انوار صدیقی بھی ہمیں اب سب سے پہلے کشکول کی قسط پڑھنے پر مجبور کر دیں گے۔ میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی توجہ ان تصنیف عشق پیچاں کی آخری پیراگراف کی طرف دلانا چاہتا ہوں، انہوں نے لکھا ہے جہانگیر کے انتقال کے بعد نور جہاں کو جہانگیر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا حالانکہ نور جہاں کو جہانگیر کے مقبرے سے دو فرلانگ دور اس کی پہلی خاوند شیر افگن کی بیٹی لاڈلی بیگم کے ساتھ شاہدرہ میں مقبرہ نور جہاں میں دفن کیا گیا ہے۔ سسپنس کی دیر سے موصول ہونے کی معذرت میں نے قبول کر لی ہے کیونکہ چند دن پہلے مجھے خانیوال اسٹیشن پر جانے کا اتفاق ہوا تھا کراچی سے آنے والی خیبر میل اور لاہور سے آنے والی خیبر میل دونوں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے

لیٹ صبح چھ بجے خانیوال اسٹیشن پر کھڑی تھیں۔ آخر میں کراچی کینٹ کے صوبیدار (ر) انوار بخش صاحب کے شہر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ کراچی کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے جو شعر تحریر کیا ہے اس نے میری آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا ہے۔ کاش کراچی کے بے گناہ لوگوں کو شہید کرنے والے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ واقعی وطن جب خون مانگے گا تمہارے پاس کیا ہوگا۔ لاشوں پر سیاست کرنے والے ہمارے سیاست دانوں کو صرف تین باتیں زبانی یاد ہیں۔ دہشت گردوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ کسی کو قانون سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ شہدا کے ورثہ کو پانچ لاکھ معاوضہ دیا جائے گا۔ کاش کوئی ان کے وارثوں سے پوچھے جن کے پیارے جدا ہو جاتے ہیں ان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔''

✠ **عمران حیدر بلوچ**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ کرتے ہیں ''اس دفعہ کا سسپنس بہت زیادہ انتظار کے بعد 21 اگست کو ملا۔ شاید اس دفعہ ہمارا سسپنس اس ٹرین میں سوار ہوگیا جس کا انجن پانچ دن فیل رہا۔ ٹائٹل پر دوشیزہ کی مہندی اور چوڑیوں سے عید کی خوشی چھلک رہی تھی۔ آگے بڑھ کر محفل یاراں میں قدم رکھا۔ شارقہ سلجوق نے کرسی صدارت سنبھال رکھی تھی۔ بھئی شارقہ ہماری طرف سے کرسی صدارت کی مبارکباد قبول ہو۔ آگے بڑھے تو اپنا خط محفل میں پا کر ادارہ کے ممنون ہوئے کہ ادارہ نے ہمیں اس عزت سے نوازا۔ محمد فراز کاٹھیہ صاحب اچھا تو یہ وجہ ہے حسنین عباس رہتے تو گم سم ہیں مگر ہمیں کچھ نہیں بتاتے اب پتا چلا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ ہمایوں سعید راج صاحب لگتا ہے آپ سونے سے پہلے بنوں کا مشہور نسوار استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے آپ کو سپنوں میں بھارتی فلمیں نظر آتی ہیں۔ جو آپ نے ان کی تمام اداکاراؤں کی خوبیاں لکھ ڈالیں۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ ہماری طرف سے بھی آداب۔ ماہا ایمان اتنی بے خبری اچھی نہیں ہوتی اور بہاولپور میں ایسی تو کوئی خاص بات نہیں کہ اس کو سپنوں میں دیکھا جائے۔ تمام محفل یاراں کے دوستوں اور تمام قارئین کو عید مبارک۔ محفل شعر و سخن میں حرا ایمان کا شعر دل کو اچھا لگا، باقی دوستوں کے اشعار اچھے تھے۔ ماہا ایمان کے اشعار میں بہت گہرائی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی۔ شیخ حامد نے شاید کافی لمبا چوڑا جال بچھا رکھا ہے اور لیاقت حسین پر تو قدرت خاصی مہربان ہے۔ میڈم روبی شروع میں ہی حادثے کی نذر ہوگئیں، پتا نہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ اناڑی اس دفعہ مزید کونپلیں پھیلا رہی تھی، نواب صاحب کی جان تو ہمیشہ کی طرح چھوٹ گئی مگر نور بے چاری کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔''

✠ **تفسیر عباس بابر**، اوکاڑہ سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''ماہ ستمبر، عید کا خوبصورت رنگین، دلنشین اور بہترین شمارہ، 20 اگست کو دستیاب ہوا۔ خوبصورت دوشیزہ سرورق کا انتہائی دیدہ زیب آنچل دل آویز مہندی نرم و نازک کلائی اور جلترنگ کی طرح کھنکتی ہوئی چوڑیاں، عید پر لوٹ کے آنے والے کی راہ میں بچھی ہوئی پرکشش اور بھید بھری آنکھیں۔ کیا خوب منظر کشی کی ہے ذاکر صاحب نے۔ فہرست مضامین کی سادگی سے متاثر ہونا لازم تھا۔ سب سے پہلا قیام جون ایلیا کی قیام گاہ پر ارتقا، کے ساتھ کیا۔ یہ انشائیہ بھی حسب روایت ہمارے زوال و زبوں کا پرچار، دعوت فکر دے رہا تھا۔ آپ کی محفل میں آپ کی تاریخ ساز باتیں...... لیکن اب دیوانے کا یہ خواب دیکھنا بھی عبث ہے کہ ہماری متعصب و منتشر قوم کو 1947ء جیسا اتحاد اور 1965ء جیسا جذبہ دفاع نصیب ہو۔ تخت طاؤس پر جہانگیر آباد سے شارقہ سلجوق کا زبردستی، اوہ نہیں...... زبردست قبضہ بلا مبالغہ کو تبصرہ مفصل و جاندار تھا۔ تہہ دل سے مبارکباد۔ خانیوال سے قدرت اللہ نیازی! آپ نے ہمارے دل پارہ پارہ کا سارا درد اپنے جگر میں محسوس کیا یہی انسانیت کی معراج ہے۔ حسن ابدال سے ریاض بٹ، ہمارا سر جون ایلیا کی حق گوئی و بے باکی نے نہیں... ارباب اختیار کی بے حسی خود غرضی اور منافقت نے جھکا رکھا ہے۔ شورکوٹ سے فراز کاٹھیہ، ادارے سے خصوصی اپیل کریں کہ دلنشین بلوچ کی تلاش گمشدگی کا اشتہار شائع کر دیں اور یہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ محترمہ کا دماغی نیٹ ورک متاثر ہے وہ تو دیکھنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ سرگودھا سے عمران حیدر بلوچ، ہماری جانب سے بزم یاراں میں تہ دل سے خوش آمدید۔ اس ماہ مقدس میں ہم رب عظیم کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ آپ سمیت تمام بے جرم اسیروں کو اذن رہائی نصیب فرمائے (آمین) حافظ آباد سے ماہا ایمان کا سفر نامہ بھی دلچسپ رہا۔ خانیوال سے عبدالحکیم صاحب، ہم آپ سے صد فیصد متفق ہیں جب ایک مسافر کراچی سے شام پانچ بجے والی ٹرین پکڑ کر صبح گیارہ بجے اوکاڑہ اور سہ پہر دو بجے لاہور پہنچ سکتا ہے تو یہ سسپنس راستے میں اتنے دن اور راتیں کہاں گزارتا ہے کہیں اس کا چال چلن تو مشکوک نہیں ہوگیا؟ گجرات سے ڈاکٹر ندیم خالق، آپ کی T-20 والی مثال بھی خواب رہی خیر...... اس طرح تو ہوتا ہے۔ ساہیوال سے راجہ ثاقب نواز ثاقب، لاقانونیت اور ظلم و جبر کے اس دور ناگوار میں ہم یا آپ کس کس بات کا رونا روئیں گے بس ایک چپ اور سو سکھ۔ اس دفعہ بھی انوار صدیقی کی دلچسپ اور پراسرار تحریر کشکول سے آغاز کیا۔ اب کے کچھ بوریت سی محسوس ہوئی۔ لیاقت کے ساتھ جو ہو رہا ہے۔ ایسے شعبدے اکثر انگلش فلموں میں دیکھے تھے۔ احمد اقبال کی اناڑی میں اس بار کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی۔ ہمیں تو لگتا ہے اناڑی کو بھی اب ایویں ای طول دیا جا رہا ہے۔ خیر اس پر بھی تبصرہ محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ عمرو عیار کی اس زنبیل سے کسی بھی وقت کچھ بھی برآمد ہوسکتا ہے۔ آخری صفحات کی خاص الخاص تحریر ٹارگٹ کلنگ۔ حالات حاضرہ کے بدنام زمانہ موضوع پر قلم اٹھایا اور حق بھی ادا کر دیا مصنف نے۔ گویا دانستہ واقعات کو بھی ٹارگٹ کلنگ کا نام دے دیا جاتا ہے پولیس بھی مطمئن۔ وقار نے غلط راستے کا انتخاب کیا اور خمیازہ بھی بھگت لیا۔ زیبا کی ہمت قابل تحسین ہے انجام نے کافی مطمئن کیا۔ ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی نایاب ترین تحریر، عشق پیچاں، مغل اعظم کا شاہانہ کردار، شہزادہ سلیم کی اندھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور بے لگام محبت اور ملکہ ہندوستان کی شاطرانہ سازشیں دلچسپ شاہکار ثابت ہوئیں۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر بازگشت نے بہت متاثر کیا۔ معاشرے اور ماحول کے بگڑے ہوئے چال چلن سے انکار کہاں ممکن ہے موبائل فون، انٹرنیٹ کمپیوٹر سائنس کی ترقی نے اخلاقی اقدار کا جنازہ نکال دیا ہے۔ یہی کچھ کاشف زبیر کی عبرت اثر تحریر نئی نسل میں ہوا۔ مورس جیسے ننگ انسانیت یقیناً معاشرے کا بوجھ ہیں۔ مرزا امجد بیگ کا شناسا چہرہ بھی خوب رہا۔ منظر امام کی دلچسپ کوشش پھوپی زاد سالا بھی اچھی رہی۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک غم ناک پہلو ہے۔ مختار آزاد کی دلگداز تحریر انتظار، نے دل کے تاروں کو چھولیا گویا قسمت ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ وصال یار ہوتا۔ ایم اے راحت کا دلچسپ واقعہ، خیر خواہ جمال شاہ نے جو بویا وہ کاٹ بھی لیا یہی قانون ہے مکافاتِ عمل کا۔ حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ایمان افروز تحریر ماہ مبارک کی خصوصی سوغات اور سلیم انور کا سیٹ اپ واقعی پرفیکٹ رہا۔ آخر میں ایک اچھی خبر یہ ہے کہ 18 اگست 19 رمضان جمعۃ المبارک رب عظیم نے ہمیں ہمارے بیٹے عون عباس بابر کی پیدائش کے دوسال بعد ایک اور بیٹا عطا کیا ہے ہم نے اس کا نام تقی عباس بابر رکھا ہے۔'' (بیٹے کی پیدائش پر بے حد مبارک)

✠ **محمد جاوید بلوچ**، تحصیل علی پور سے چھپے آرہے ہیں ''خوابیدہ رنگوں سے آراستہ و پیراستہ سرورق نہایت خوبصورت لگا، آنکھوں میں سندر سپنے سجائے حنا کے پاکیزہ رنگ میں رنگے ہاتھوں میں دلکش چوڑیاں چاند جیسے چہرے پر ستاروں کی چادر اوڑھے حسینہ یقیناً اب بابل کے آنگن سے ... وداع چاہتی ہے۔ انشائیہ کے مطالعہ کے بعد سوچا شاید ہمارے ملک میں بے لوث جید عالم شیخ کمیل ابن داؤد جیسے اساتذہ اور زہیر ابن جنید جیسے تشنگی علم رکھنے والے شاگرد پیدا ہونا ختم ہو گئے ہیں۔ بے شک علم غیر فانی اور مال و زر فانی ہیں۔ اناڑی اس بار بہترین رہی۔ فیقا پتر بڑی مشکل میں پھنس گیا ہے، مسکین شاہ جیسے سفید پوش درندے ہمارے ملک میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فیقے پتر کا جذبہ انسانیت لائق تحسین اور آج کے نااہل ارباب اختیار کی شہ رگ پر انگوٹھا ہے کہانی میں تبدیلی اور تیزی لائی جانی چاہیے۔ سنسنی خیز کشکول میں انوار صدیقی کی بہترین منظر نگاری کی بدولت سارے مناظر دماغ کی پردہ اسکرین پر واضح ہوتے چلے گئے۔ اسٹوری ابھی پہلے پیروں پر کامیابی سے چل رہی ہے، آگے دیکھیں کیسے کیسے گل کھلاتی ہے۔ صوبیدار (ر) بخش، این ایس آر مدثر، پلوشہ پشاور کے شعر زیادہ پسند آئے۔ باقی اشعار بھی من کو بھائے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ خط 21 کو لازمی پوسٹ کرنا ہے کیونکہ اعتکاف میں بیٹھنے کا ارادہ رکھتا ہوں زندگی سلامت رہی تو عید الفطر کے بعد باقی شمارہ پڑھوں گا لہٰذا معذرت چاہتا ہوں۔ شارقہ سلجوق جی آپ کا نام تو بندہ کچھ کھا پی کے لے اتنا وزنی نام اور آپ کا ڈھائی من کا وجود یعنی یک نہ شد دو شد والا معاملہ توبہ توبہ پتا نہیں دونوں کو ساتھ ساتھ لیے آپ کیسے چلتی پھرتی ہیں تبصرہ پیارا لگا ست بدھائی ہو آپ کو لوجی بجلی چلی گئی باقی باتیں موبائل لائٹ سے کام چلا کے لکھتا ہوں۔ حمیرا رضا مجھے آپ سے ہمدردی اور اتفاق ہے کہ آپ کے محبت نامے بھی ضرور شائع ہونا چاہئیں۔ واہ واہ آیا ایمان عرف ماہا ایمان آپ کی سیدہ نسرین کا نادیدہ پنچ تو نظر آ گیا ہے۔ ستمبر کے شمارے میں تفسیر عباس بابر کی پڑی ہوئی زوردار فرنٹ لگ بھی آپ کو ضرور محسوس ہوئی ہوگی۔ خدا کرے آپ کی ناک اور دانت سلامت ہوں۔ این ایس آر مدثر بھی کبھی آتے ہیں مگر بہترین تبصرے کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ سیدہ نسرین آپ ہمیں بالکل نہ سر چڑھائیں نہ ہی ہمیں ضرورت ہے مگر آپ چڑیلوں کو ہم اپنے قدموں میں جگہ ضرور عنایت کریں گے آپ کے خط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ رسالہ صرف خطوط پڑھنے کے لیے لیتی ہیں۔ دلنشین بلوچ جی میں آپ کی صحت و سلامتی کے لیے تہ دل سے دعا گو ہوں خدا آپ کو شفائے کامل دے۔ حاجی عبدالحکیم صاحب واپسی ایک پیچیدہ اور منفرد موضوع کی اسٹوری تھی۔ ساری دنیا بالی ووڈ کی عجیب و غریب فلمیں دیکھتی ہے تو واپسی پر اتنا اعتراض اور اختتام پر اتنی خوشی کیوں؟ قدرت اللہ صاحب ماہا ایمان مرچیں چبائے یا نمک کی ڈلیاں چوسے آپ کو کیا؟ آپ ان کی خاطر مدارت کے لیے دونوں اشیا کا ذخیرہ جمع رکھیں بس۔ تفسیر عباس کے خطوط بہترین الفاظ پر مشتمل اور اعلیٰ پائے کے ہوتے ہیں۔ تفسیر عباس صاحب شہزادے کی پیدائش کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ہمایوں راج سعید آپ خوبصورت فلمی چہرے کی بجائے خوب سیرت شریک حیات کی تمنا دل میں رکھیں۔ حسن فانی ہے اور خوب سیرتی لافانی ہے۔ نیک عورت مرد کے لیے اس دنیا میں جنت سے کم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کی حاجن کی تلاش بزم دوستاں میں سے شروع ہو کر یہیں پر بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ طاہرہ یاسمین مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ صنف نازک کے بغیر محفل ادھوری ہے۔ رضوان تولی اور چودھری سرفراز کے تبصرے شوق سے پڑھتا ہوں۔ سرفراز کافی عرصے سے غائب ہیں پلیز انٹری دیجیے۔ انکل جی آپ نے مجھے محفل اور بلیک لسٹ دونوں سے غائب کر دیا؟ راجا ثاقب نواز اور دیگر ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ رجی پٹیل اور راؤ رشید خان کی تحریروں کو سسپنس کی زینت بنائیں۔ آخر میں اہل وطن بالخصوص بزم دوستاں کو میری جانب سے عید الفطر روزہ تراویح کی مبارک باد ہو۔'' (آپ کو بھی مبارک ہو)

✠ **ایم ڈبل اے**، مانسہرہ سے تبصرہ فرما رہے ہیں ''ماہ ستمبر کا شمارہ 20 اگست 2011ء کو ملا۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ حسینہ ٹائٹل بن سنور کو شاید ہمایوں سعید راج کے انتظار میں تھی، اس لیے باقی ٹائٹل پر تبصرہ پیارے دوست ہمایوں سعید راج کے حوالے۔ جون ایلیا کی محفل میں حاضری دے کر اپنی پیاری سی محفل میں انٹری دی اور اپنا خط تلاشا لیکن خط ہوتا تو ملتا۔ (جگہ کی کمی کی وجہ سے بھی ایسا ہی ہو جاتا ہے) کرسی صدارت اس دفعہ شارقہ سلجوق کے حصے میں آئی۔ مبارکاں، کرسی صدارت اور اتنا اچھا اور تفصیلی تبصرہ کرنے پر۔

تفسیر عباس بابر صاحب میں آپ کی بات سے صد فیصد متفق ہوں کہ ہم نے پاکستان کو کیا دیا ہے۔ عمران حیدر بلوچ آپ کی سزائے موت کا سن کر دلی رنج ہوا۔ طاہرہ یاسمین جی، لگتا ہے آپ کی عقل کے ساتھ ساتھ نظر بھی کافی کمزور ہے یا پھر عمر کا تقاضا ہے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ابھی ہم زندگی کی 21 ویں بہار میں ہیں۔ ہمایوں سعید راج، آپ کو نیک پروین اور حاجن صاحبہ کی تلاش ہے، اچھا انداز ہے طنز کرنے کا۔ حسنین عباس بلوچ، آپ کو بھی مبارک باد۔ اللہ پاک آپ کو جلد از جلد رہائی عطا فرمائے۔ این ایس آر مدثر صاحب، رب کائنات آپ کو جلد مکمل صحت یابی عطا فرمائے۔ آپ نے جو یہ کہا کہ یہ اس محفل کا حسن ہے کہ ایک دوسرے کو یاد کیا جاتا ہے، دکھ درد شیئر کیے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خط شائع نہ ہونے کے باوجود پھر خط لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ کہانیوں میں ابتدا ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ اناڑی سے کی۔ جہاں نواب تو دشمن کی قید سے نکل آیا لیکن نور ہنوز دشمن کی قید میں ہے جو کہ ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔ اس کے بعد نئی سلسلے وار کہانی کشکول پڑھی جو کہ مزہ دے گئی۔ ہمیں امید ہے کہ کشکول، واپسی کی کمی کو پورا کر دے گی۔ کیونکہ پہلی دو قسطیں انتہائی شاندار رہی ہیں۔ اولین صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق ان کے قلم کا کمال عشق پیچاں کی صورت میں ان کے زور قلم اور تحقیق و جستجو کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک بات کی وضاحت ہو جاتی تو اچھا تھا کہ اکبر بادشاہ نے کس وجہ سے نیا دین بنایا؟ اور کس طرح کا دین بنایا۔ مرزا امجد بیگ کا کارنامہ ''شناسا چہرہ'' بھی اچھی تحریر تھی۔ مرزا امجد بیگ صاحب جیسا حق پرست وکیل نہ ہوتا تو عمران یقیناً پھانسی کا مستحق قرار پاتا اور کفایت اللہ عرف کیفی مزے کی زندگی بسر کرتا لیکن مکافات عمل بھی کوئی چیز ہے۔ انسان جو بوتا ہے ضرور وہی کاٹتا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی بازگشت موجودہ دور کے حالات کی عکاسی کرتی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ ثنا کی ایک غلطی کی وجہ سے اتنی بڑی مصیبت کہ اپنا مستقبل بھی تباہ اور جگ ہنسائی علیحدہ۔ کاشف زبیر کی نئی نسل بھی اچھی رہی۔ کاشف انکل نے بہترین انداز میں پرانی اور نئی نسل میں فرق واضح کیا۔ لیکن پھر بھی ہمیں این کا ردعمل بڑا عجیب لگا۔ ویسے اگر یوں کہا جائے کہ یہ فرق ہے مشرقی معاشرے اور مغربی معاشرے میں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ منظر امام کی پھوپی زاد سالا بھی گزارے لائق ہی تھی۔ مختار آزاد کی انتظار بھی بہترین کہانی تھی۔ ایم اے راحت کی تحریر خیر خواہ بھی اچھی تھی۔ جمال شاہ تنہائی کا احساس کم کرنے کے لیے اگر ڈائری لکھنے کی بجائے دوست بناتا تو اس کے حق میں اچھا ہوتا۔ حضرت یرمیاہ کے واقعات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔ پرفیکٹ سیٹ اپ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ اس دفعہ کترنیں کم تھیں۔ شعروں میں پہلا شعر اور ارسلا افضل کے شعر پسند آئے۔ (پسندیدگی کا شکریہ)

✠ **ریاض بٹ**، حسن ابدال سے محفل میں تشریف لائے ہیں ''سرورق کی حسینہ مہندی لگے ہاتھوں سے قارئین سسپنس کو عید مبارک کہہ رہی ہے۔ جون ایلیا کی تحریر ارتقا حسب معمول سوچوں کے نئے در وا کر رہی ہے۔ اب ہم کیا بتائیں؟ اور کیسے بتائیں کہ ہم آگے بڑھے ہیں یا؟ تمام حالات سامنے ہیں۔ ہمیں پتھر کے دور کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ کون ان حالات کا ذمے دار ہے۔ روشنیوں کا شہر آہوں، سسکیوں اور خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمارا دل خون کے آنسو رو دیا ہے۔ محفل خطوطاں میں شارقہ سلجوق کرسی صدارت مبارک ہو۔ محمد فرید کاٹھیہ صاحب میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تفسیر عباس بابر آف اوکاڑہ بھائی دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں سسپنس بہت عزیز ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کوئی دوست احباب اچک کر نہ لے جائے۔ اس لیے..... عمران حیدر بلوچ خوش آمدید، خدا آپ کی مشکلیں آسان کرے، آمین۔ حاجی عبدالحکیم صاحب کس کس بات کا رونا روئیں۔ میں نے بھی نور جہاں اور لاڈلی بیگم کی قبروں کو دیکھا ہے۔ واقعی ان کی حالت دیکھ کر متعلقہ محکمے کی چشم پوشی، کوتاہی اور بے پروائی پر دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔ اس بار ڈاکٹر صاحب تاریخ کے جھروکوں سے ان ہی کی داستان لے کر آئے ہیں۔ مختار آزاد کی انتظار جنگ کے پس منظر میں لکھی ایک امر کہانی ثابت ہوئی۔ مسز احمد کا انتظار اس وقت ان کی ناگہانی موت کے ساتھ ختم ہوا جب ان کا شوہر آنے والا تھا۔ بہرحال انجام ہمیں رلا گیا..... صرف امجد بیگ صاحب اس بار ایک مشکل کیس کی پیروی کرتے نظر آئے۔ انہوں نے آخر تک سسپنس کو برقرار رکھا۔ صدر صاحب کی شخصیت بالکل آخر میں جا کر ظاہر کی۔ حالانکہ ان کا نام کہانی کے شروع میں ہی آ گیا تھا۔ پھوپی زاد سالا جسے منظر امام نے بڑی خوبصورتی اور چابک دستی سے لفظوں کے گورکھ دھندے میں لپیٹ کر سسپنس کے صفحات کی زینت بنایا۔ واقعی بات کا بتنگڑ بن ہی گیا۔ ایسے خیر خواہ سے اللہ بچائے۔ باقی کہانیوں میں ایم اے راحت کی خیر خواہ کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی اور اس سے بڑی زیادتی یہ ہوگی کہ باقی سلسلوں کے متعلق کچھ نہ لکھا جائے۔ محفل شعر و سخن میں صوبیدار (ر) انور بخش، نور کے ناصر اور مسز ضیا القمر سلطانہ کے اشعار پسند آئے۔ اب شعر و سخن کا معیار بہتر ہو رہا ہے۔ کترنوں میں ماہا ایمان کی ایمان افروز باتیں دل میں گھر کر گئیں۔ اس کے علاوہ خالد محمود کا انتخاب بھی خوب ہے۔ تفسیر عباس بابر کے سرداروں کے متعلق لطیفے بھی مسکراہٹ کا سامان کر گئے۔''

✠ **محسن علی موم**، بالاکوٹ سے لکھتے ہیں ''ماہ ستمبر کا شمارہ 24 تاریخ کو ملا تو گویا ہماری عید سے پہلے ہی عید ہو گئی۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ اس مرتبہ کافی سے زیادہ خوبصورت تھی۔ محفل بہاراں میں کرسی یزداں پر ''شارقہ سلجوق'' کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مبارک باد جی۔ تفسیر عباس کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح خوب تھا۔ ہمایوں سعید راج اے خواب سی خیر تاں راج کیوں رہتے نہیں۔ ماہا ایمان لوٹ کے بدھو گھر کو آئے اور صنف نازک آواز اور جوتی کے علاوہ اور اٹھا بھی کیا سکتیں ہیں؟ باقی سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اناڑی پڑھی جسے پڑھ پڑھ کر ہم خود اچھے بھلے کھلاڑی ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے فیقے پتر کو اغوا ہونے کا چسکا پڑ گیا ہے جو ہر قسط میں اغوا ہو جاتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس ماہ فیکا اغوا نہیں ہوا اس پر شکر ہے۔ واپسی کی واپسی کے بعد کشکول نے اس کی جگہ لی ہے۔ جامد ار تحریر ہے، افضل کا خدا پر یقین ہی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ آخری صفحوں پر احمد اقبال نے خوب صورت تحریر پڑھنے کو دی۔ پاکستان کی اقتصادی شاہ رگ کراچی کے حالات روز بروز خرابی کی طرف جا رہی ہیں۔ پتا نہیں وہ کون سے عناصر ہیں جو حالات میں خرابی کے ذمہ دار ہیں؟ بہر حال کہانی میں زیبا نے وقار کو سمجھنے میں دیر کی لیکن اس کا انتقام بھی خوب لیا۔ پھوپی زاد سالا پڑھ کر لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، خدا ایسے لوگوں سے بچائے جو پاگل بنا دیں۔ بازگشت ثنا کی برادری میں قصور واقعی معاشرے کی بے حسی کا بھی ہے اور وہ بے بھی جن بچوں کے والدین باہر ہوں ان کو اکثر ایسی ہی ناخوشگوار باتوں سے پالا پڑتا ہے کیونکہ دولت جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ نئی نسل خوبصورت تحریر تھی۔ تاریخ نے ایک بار پھر خود کو دہرایا۔ نئی نسل اور پرانی نسل میں زمین و آسمان کے فرق کو مصنف نے خوب دکھایا۔ اسٹوری آف ملتھ مختار آزاد کی تحریر انتظار رہی۔ فوجیوں کی زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں۔ آج ہم چند لوگوں کی وجہ سے پوری فوج کو بدنام کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف یہی سوچیں کہ یہ مغربی سرحد پر نہ ہوں تو کیا ہم ایک شام بھی سکون کی نیند سو سکتے ہیں یقیناً نہیں کلثوم یعنی مسز احمد کا طویل انتظار بالکل اچانک ہی ختم ہو گیا۔ جذباتی انداز میں لکھی گئی تحریر بے حد پسند آئی۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔''

✠ **ذیشان افتخار ڈھلوں**، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے تبصرہ لکھتے ہیں ''اس ماہ رمضان مبارک کے 21 روزے کو عید کا تحفہ ملا۔ ٹائٹل پر براجمان دوشیزہ اپنی تمام دلکشی کے ساتھ مہندی ہاتھوں پر سجائے عید کا چاند دیکھ رہی تھی۔ اس کو عید مبارک کہنے کے بعد ہم پہنچے اپنی محبوب محفل میں تو شارقہ سلجوق کو نمبرون پوزیشن پر فائز پایا گیا۔ مبارکباد نا دینا ناانصافی ہوگی۔ محترمہ نانا، دادا، انکل تو میں بن سکتا ہوں اگر کوئی بنائے تب نا۔ محترمہ ماہا ایمان جی ہم آپ سے اپنا شکوہ واپس مانگتے ہیں اگر ہو سکے تو کر دینا۔ تفسیر عباس بابر صاحب، بابر عباس کی جب اولاد جوان ہے تو ہمارے لیے تو قابل احترام ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے۔ طاہرہ یاسمین صاحبہ حلوے تو آپ اپنے بھائیوں کو بنا کر کھلاتی ہیں ہم بھی تو آپ کے بھائی ہی ہیں اور تو اور آپ کے شہر میں ہی پابند سلاسل ہیں۔ اب سمجھ نہیں آتی کہ ہم آپ سے شکوہ کریں یا آپ کا شکوہ قبول کر لیں۔ اشعار کی محفل میں رانا مختار احمد کا شعر بے حد سراہا گیا۔ کہانیوں میں اناڑی پڑھی اس مرتبہ مسکین شاہ فیکے پتر کے مدمقابل آیا۔ کشکول میں لیاقت حسین پر قسمت کی دیوی مہربان ٹھہری، ملنگ سائیں اپنا سب کچھ دے کے غائب ہو گئے۔ لیاقت حسین کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔ رائٹر کاشف زبیر صاحب کا پروین زبیر صاحبہ سے کیا تعلق ہے اگر معلوم ہو تو آگاہ کریں۔ (قلم کا تعلق ہے) اس ماہ سسپنس کا دیدار 21 رمضان المبارک کو ہوا۔ ٹائٹل پر کول گرل بڑی نازک چوڑیوں اور ہاتھوں کو کسی کے پیار کی مہندی سے رنگے اس انتظار میں بیٹھی تھی کہ کب عید کا چاند نظر آئے اور میں اپنے پیاروں کو عید مبارک کہوں، قدم بڑھاتے ڈرتے ڈرتے پہلی مرتبہ محفل سجناں میں پہنچے کہ شاید ہم ان خوش نصیبوں میں شامل ہو جائیں جن کو یہ خوشی مل چکی ہے۔ محفل یاراں کے تمام خطوط پڑھ کے بے حد انجوائے کرتا ہوں، خاص طور پر بابر عباس اور ماہا ایمان کی گفتگو بڑا فرحت بخشی ہیں۔ حمیرا رضا بی جی لاہور میں میری کچھ یادیں وابستہ ہیں جب بھی آپ کے تبصرے کو دیکھتا ہوں مجھے سب یاد آ جاتا ہے۔ تفسیر عباس بابر، دل نشین بلوچ، رمضان پاشا صاحب، پرنس تنویر، نعمان پیارے، ایم ڈبل اے، رضا دی گریٹ، سیدہ نسرین، ہمایوں سعید راج، محمد اسماعیل اجاگران سب دوستوں کو سلام۔ انہی کے دم سے اس محفل میں چار چاند لگتے ہیں۔ اشعار کی محفل میں تمام اشعار بہت خوبصورت تھے۔ رانا مختار احمد کا شعر قابل داد تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اناڑی پڑھی۔ نئی اسٹوری کشکول، لیاقت حسین کا کردار بے حد اچھا اور عمدہ ہے، ہر لحاظ سے پرفیکٹ اسٹوری ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی اب تک جتنی بھی اسٹوری پڑھی کبھی نہ بھولنے والی ہیں۔''

✠ **ہمایوں سعید راج**، بنوں سے محفل میں حاضر ہوئے ہیں ''ستمبر کے عید اسپیشل رومانٹک سرورق کو سیدھا دل میں اترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سلجوقی شہزادی شارقہ جی شاہی کروفر کے ساتھ تخت پر براجمان نظر آئی۔ جواپنی لیڈی سپہ سالار ماہا ایمان چنگیزی کو محاذ جنگ میں ڈٹے رہنے پر مبارک باد اور انعامات سے نواز رہی تھی۔ حاجی صاحب! آپ بجا فرما رہے ہیں یہ دنیا عبرت کدہ ہے، نور جہاں جیسی ہزاروں مثالیں حضرت انسان کو جھنجوڑ رہی ہیں مگر انسان جاگنے کو تیار ہی نہیں۔ حسنین بھائی، بالآخر آپ نے بھی تسلیم کر ہی لیا کہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں راج ہی کرتے ہیں۔ ماہا جی! یہ صنف نازک کے نازک ہاتھوں کے نازک پنچ درد دینے کے لیے تھوڑے ہوتے ہیں۔ وسیم صاحب! ڈاکٹر ہو کے خواتین کی کمسر پھسر سننے کے لیے دونوں کان ہر دم کھڑے رکھتے ہو؟ طاہر جی! اس میں حسنین صاحب کا کوئی دوش نہیں انہوں نے آپ کو بھی بہت شدت سے یاد فرمایا تھا۔ عمران بھائی! تہہ دل سے خوش آمدید۔ تفسیر صاحب نے حسب عادت ماہا پر چڑھائی جاری رکھی۔ ناصر صاحب! ایک بار آپ اس بزرگ کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سن لیں۔ پھر آپ انہیں کراس کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ قدرت اللہ صاحب! بڑے بدذوق واقع ہوئے ہیں آپ تو، کوئی اتنی اچھی اور خوبصورت لڑکی کو چھوڑ کے آگے بڑھتا ہے؟ کہانیوں کی ابتدا عشق جہانگیری سے کی۔ کہتے ہیں کہ جس محبت میں دو طرفہ خلوص نہ ہو اس کا اثر دھوپ میں رکھی برف کی طرح تیزی سے زائل ہوتا ہے، مگر حیرت ہے عظیم مغل بادشاہ کی عقل سلیم پر، رکھی کیسے مرتے دم تک وہ اس نام نہاد محبت کے طلسم میں گرفتار رہا؟ محبت جہانگیر نے بھی کی اور شاہجہاں نے بھی۔ مگر کتنا فرق ہے دونوں میں۔ نور جہاں جیسی عورتوں نے عورت کے ساتھ مگر کو اس طرح پیوست کر دیا کہ یہ ضرب المثل بن گیا۔ اس کے بعد تیز رفتار کشکول پڑھی۔ لیاقت اور فرعین پر شیطانی قوتیں اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ افضل

خان چونکہ مرد ہے اس لیے حسب تاریخ عورت سے بری طرح دھوکہ کھا گیا۔ سراج کا کردار بے حد پراثر ہے۔ آج مل ایماندار افسر غیر حقیقی سا لفظ لگتا ہے۔ اناڑی میں فیکا ایک بار پھر اپنی خوش قسمتی، بہادری اور ذہانت سے دشمن کے چنگل سے زندہ سلامت نکل آئے۔ رفیق واقعی نور سے بہت محبت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے اسے اتنے غیض و غضب میں دیکھا۔ کراچی کے موجودہ حالات کے تناظر میں لکھی گئی ٹارگٹ کلنگ بے حد پسند آئے۔ پولیس کی روایتی کمینگی نے سیروں خون جلایا۔ پروفیسر جوڑے کے بے رحمانہ قتل نے بھی آبدیدہ کیا۔ زیبا کے بہادرانہ فیصلے نے جی خوش کر دیا۔ پرفیکٹ سیٹ اپ اس فتوے پر پوری اترتی ہے کہ لوہے کو لوہے سے ہی کاٹا جاتا ہے۔ میٹ کی سیٹ اپ واقعی پرفیکٹ تھی۔ پھوپی زاد سالا پڑھتے ہوئے بھیجا گرم ہو گیا۔ مرزا امجد بیگ کافی عرصے بعد ایک مشکل کیس کے ساتھ حاضر ہوئے۔ کیفی کا جذباتی فیصلہ غیر دانش مندانہ تھا۔ بیگ صاحب ہر جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا اتنا مضبوط بندوبست کرتے ہیں کہ بندہ اش اش کر اٹھتا ہے۔ اس ماہ کی سب سے سبق آموز کہانی بازگشت رہی۔ واقعی نوجوان لڑکیوں کے ہاتھ میں موبائل فون دینا اسے بربادی کی راہ پر دھکیلنے کے مترادف ہے۔ کاشف زبیر کی نئی نسل میں بھی ایک معصوم دوشیزہ کو غیر معصوم بنانے میں اسی موبائل نے اہم کردار ادا کیا۔ خیر خواہ میں شاہ صاحب کی غیر معمولی کنجوسی نے بہت غصہ دلایا۔ رحمان نے سچ مچ شاہ جی کو ہر مشکل سے نجات دلا دی۔ نرم و نازک احساسات سے گندھی کہانی انتظار نے ہمارے نازک دل پر بہت برا اثر ڈالا۔ محبت کے ہزار پہلو اور ہر پہلو میں ہزار رنگ ہیں۔ مسز احمد کا انتظار رائگاں نہیں جائے گا اتنا تو یقین تھا مگر انتظار کی گھڑیاں یوں ختم ہو گی ایسا تو سوچا ہی نہیں تھا۔ صوبیدار کے شعر نے متاثر کیا اور ماہا کے شعر نے رات بھر سوچنے پر مجبور کیا۔''

✠ **طاہرہ یاسمین**، ضلع سرگودھا سے فرما رہی ہیں ''سب سے پہلے تو میری طرف سے آپ کو دلی عید مبارک اور ڈھیروں دعائیں۔ آپ کا شکریہ کہ میرا خط اس بار بھی محفل میں شامل تھا سارا ماہ اسی خوشی میں گزر جاتا ہے اور آئندہ ماہ کے شمارے اور اپنے خط کا انتظار رہتا ہے۔ اب آتی ہوں تبصرہ کے شمارے کی طرف تو سب سے پہلے ٹائٹل گرل بڑی خوبصورت لگی۔ سر پہ سلیقے سے رکھا دوپٹا تاروں بھرا آسمان اور چاند واہ کیا بات ہے۔ شارقہ سلجوق جی کرسی صدارت مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ اس بار سب سے اچھا تھا۔ ہمیں اس ماہ کا شمارہ ایک دن لیٹ ملا یعنی 18 اگست کو۔ تفسیر عباس بابر اوکاڑہ، بھئی آپ نے ماہا ایمان کے بارے میں جو لکھا کہ آج سے پندرہ سال پہلے آپ جھولے میں شمارہ پڑھتے تھیں عقل آپ کے پاس نہیں۔ مجھے ماہا ایمان کے بارے میں آپ کا اس طرح کہنا بہت برا لگا، خبردار آئندہ ماہ اس کے بارے ایسا لکھا۔ اس دفعہ تو سرگودھا جیل سے بہت خط اور شعر شائع ہوئے۔ عمران حیدر بلوچ آپ کی سزائے موت کا بہت دکھ ہوا میرے بھائی کا نام بھی عمران ہے۔ خدا کرے آپ کی سزا ختم ہو جائے میرا کزن بھی سرگودھا میں سزائے موت کاٹ رہا ہے۔ ہمایوں سعید راج آپ کو میری کس بات میں بے چینی و بے ترتیبی نظر آ گئی ذرا وضاحت کرنا۔ حسنین عباس بلوچ خدا کرے آپ جلد اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر روزے رکھیں اور عید منائیں۔ ماہا ایمان اس بار آپ کا شعر بہت اچھا تھا۔ ڈاکٹر وسیم خالق، میری دعا ہے کہ آپ کی کہانی ضرور شائع ہو اور مجھے امید ہے آپ کی کہانی اگر شائع ہوئی تو سب کو ضرور پسند آئے گی۔ نصر حیات لک، سرگودھا جیل آپ کا تعلق سرگودھا کے شہر ماڑی لک سے تو نہیں؟ ضرور بتانا، مجھے لگتا ہے میں نے آپ کا نام سن رکھا ہے ماڑی لک سے۔ اب کچھ تبصرہ کہانیوں پر اس ماہ کا شمارہ تو میں نے چار دن میں ختم کر لیا کیونکہ گھر کا کام وغیرہ تو سحری ٹائم ہی ختم کر لیتی تھی۔ اس دفعہ سب سے پہلے مرزا امجد بیگ کی شناسا چہرہ پڑھی بہت شاندار۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ قاتل بلڈنگ کے صدر صاحب ہوں گے پھر پڑھی اناڑی۔ واقع اب اناڑی اتنا مزہ نہیں دیتی ست روی سے چل رہی ہے۔ پھر کشکول پڑھی آیا۔ مزہ آ گیا یہ کہانی پڑھ کر تو رسالے کے پیسے ہی پورے ہو گئے۔ نئی نسل کے اینڈ نے تو چونکا دیا۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ این کو اپنی آبرو لٹ جانے کا دکھ تھا۔ انتظار کا اینڈ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ کاش مسز احمد مرنے سے پہلے احمد سے مل پاتیں۔ بازگشت میں جو کچھ ثنا کے ساتھ ہوا برا ہوا مگر ثنا جیسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جو لڑکیاں ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں کرتی انہیں عزت سے جینے کا کوئی حق نہیں۔ ثنا جیسی لڑکیوں پر رحم کرنا فضول ہے۔ پھوپی زاد سالا بور کہانی تھی۔ خیر خواہ اچھی کاوش تھی۔ بے چارے بڑے میاں جمال شاہ عرف جمال جیسا کرو گے ویسا بھرو گے والی مثال بن گئے۔ ان کے خیر خواہ رحمان نے تو کمال ہی کر دیا، بڑے میاں کو تمام پریشانیوں سے نجات دلا دی۔ آخر کو جمال شاہ کے خیر خواہ جو تھے مسٹر رحمان۔ پرفیکٹ سیٹ اپ، مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ بے چاری تانیا خود کو بڑا چالاک سمجھتی تھی مگر نیل نے اس کی ساری چالاکی چکنا چور کر دی۔ عشق پیچاں تاریخی کہانی بہت مزہ آیا پڑھ کر اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ٹارگٹ کلنگ بہت اچھی لگی۔ اس قسم کی کہانی ہر ماہ آنی چاہیے۔ واہ احمد اقبال صاحب اتنی خوبصورت کہانی لکھنے پر شکریہ۔''

(ملک آصف مجید اعوان، رحیم یار خان سے..... آپ نے ہم سے جو سوال کیا ہے جواب حاضر ہے، آپ اگر سسپنس کے لیے کچھ بھیجنا چاہتا ہیں تو ڈائجسٹ میں موجود پتے پر ہی اپنی تحریر روانہ کر سکتے ہیں)

اب ان قارئین کے نام جن کے نام محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

حمیرا رضا، کراچی۔ عائشہ افتخار مغل، کویت۔ ڈاکٹر وسیم خالق، ضلع گجرات۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال۔ سیدہ نسرین، ضلع تارو وال۔ راجا ثاقب نواز ثاقب، رتی ممی، ساہیوال۔ ماہا ایمان، حافظ آباد۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

صحرا بہ صحرا

ڈاکٹر سلیم اجد

جاری رہنے والے عہد کو کبھی یہ سوچ کر نہیں گزارا جاتا کہ اسے ایک طویل عرصے تک یاد بھی رکھا جائے گا مگر تاریخ وہ واحد ذریعہ ہے جو واقعات کو خود پر رقم کرکے زمانوں کو ناقابلِ فراموش بنادیتی ہے۔ مغل دورِ حکومت کے کسی بھی مخصوص عہد کی بات کی جائے... بہت خاص بن کر تاریخ میں ڈھل گیا ہے۔ ہمایوں جب شہنشاہِ ہند بنا تو اسے بھی اقتدار کی جنگ جیتنے کے لیے بہت سے رشتوں کو قربان کرنا پڑا... اگر وہ ایسا نہ کرتا تو خود قربان ہو جاتا کیونکہ شیر شاہ سوری نے اس کے رستے میں ایسے کانٹے بچھا دیے تھے جن پر چلتے چلتے اس کے پیر لہولہان ہو چکے تھے مگر پھر... ایسا ہوا کہ دشمن کے اتحاد کو توڑنے کے لیے اس کی فوج میں پھوٹ ڈالنا ضروری ہوگیا۔ اقتدار میں رہنا... محلاتی سازشوں سے مقابلہ کرنا اور پھر کامیابی سے خود کو منوانا اگرچہ کسی بھی شہنشاہ کے لیے آسان نہیں رہا مگر اس کے باوجود تاریخ انہیں آج بھی حکمرانوں کے حوالے سے آنے والی نسلوں سے متعارف کرا رہی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک سوار آگرہ کی طرف سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہے۔ اتنی طویل مسافت کہ اس کے گھوڑے تک کو پسینا آ رہا تھا۔ اس نے راستے میں کئی گھوڑے بدلے ہوں گے۔ اس کے باوجود اس کا گھوڑا تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی عام سوار نہیں تھا۔ سرکاری قاصد تھا جو بنگال سے ہمایوں بادشاہ کے لیے کوئی پیغام لے کر آیا تھا۔ آگرہ پہنچ کر بھی اس کی مسافت کم نہیں ہوئی تھی۔ اگر بادشاہ اس وقت آگرہ میں نہ ہوا تو اسے دہلی جانا پڑے گا۔

ہمایوں کی افیون کا خمار ابھی ٹوٹا نہیں تھا کہ اسے اطلاع مل گئی۔ بنگال سے قاصد آیا ہے اور بارگاہ میں حاضری کے لیے بے قرار ہے۔

''کہو قاصد، کیا پیغام لائے ہو؟''

''حضور، شیر شاہ سوری کے ارادے اچھے نہیں۔ وہ بہار کا حکمران تو بن ہی چکا ہے، اب بنگال کو بھی قبضۂ اقتدار میں لینے کے لیے فوجیں جمع کر رہا ہے۔ بعض جگہوں پر اس کی فوجوں کی نقل و حرکت بھی دیکھی گئی ہے۔''

''تم جا سکتے ہو۔'' ہمایوں نے قاصد کی اطلاع کو غور سے سنا اور اسے جانے کا حکم دے دیا۔

قاصد کے جاتے ہی اس نے مجلس مشاورت طلب کی اور حکم دیا کہ مرزا عسکری اور مرزا ہندال (ہمایوں کے بھائی) کو خاص طور پر بلایا جائے۔ داروغۂ توپ خانہ رومی خان کو بھی اس مجلس میں شامل کیا جائے۔

دور دراز کے امرا کے جمع ہونے میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں وہ بدلتے ہوئے حالات پر برابر غور کرتا رہا۔ گجرات سے آنے والی خبریں بھی اُمید افزا نہیں تھیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ بنگال اور گجرات میں سے وہ پہلے کس طرف متوجہ ہو۔ ہمایوں کی یہ کمزوری تھی کہ وہ اکثر اہم مسائل کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ افیون کی مقدار بڑھالی اور مجلس مشاورت میں ہونے والے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک ہفتے بعد جب تمام امرا جمع ہو گئے تو بنگال کا قبضہ ان کے سامنے رکھا گیا۔ سب سے پہلے ہمایوں نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''سہسرام کے ایک معمولی سے جاگیردار کی اب اتنی ہمت ہو گئی ہے کہ بہار اور پٹنہ پر قبضہ جمانے کے بعد اب بنگال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مقامی حاکم اس کے تابع دار بن چکے ہیں۔ اگر وہ بنگال پر قابض ہو گیا تو آدھا ہندوستان اس کے پاس چلا جائے گا۔ پھر اس کا اگلا ہدف آگرہ اور دہلی ہوگا۔ ہمارے والد بزرگوار نے لودھیوں کا قلع قمع کیا تھا۔ اب یہ سوری پٹھان مغلیہ سلطنت کے درپے ہے۔ اس کی تلوار اگر اس وقت نہیں توڑی گئی تو پھر یہ موقع کبھی نہیں آئے گا۔''

موید بیگ نے جو ہمایوں کا نہایت منہ چڑھا عہدے دار تھا، گرج کر کہا۔ ''وہ جاہل پٹھان چند مقامی حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ مغل فوجوں سے بھی ٹکرا جائے گا۔ اس کا یہ گھمنڈ دور کرنا ضروری ہے۔''

''گجرات کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہے ہیں کہ پہلے گجرات سے نمٹیں یا بنگال کی طرف جائیں۔''

''اس وقت ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں، مغل اور پٹھان۔'' مرزا ہندال نے کہا۔ ''اب یہ فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ یہاں مغل رہیں گے یا پٹھان۔ اگر شیر شاہ کو آگے بڑھنے دیا گیا تو پٹھانوں کی طاقت بڑھتی چلی جائے گی۔ یہ لوگ ہمارے لیے ہمیشہ دردِ سر بنے رہیں گے۔ ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ لہٰذا پہلے ہمیں بنگال پر حملہ کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہیے۔ گجرات کو بعد میں دیکھا جائے گا۔''

''مالوہ اور گجرات میرے ہاتھوں سے چلے گئے ہیں۔ انہیں مجھے دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ پہلے میں گجرات کی طرف چلا جاؤں تو کیا حرج ہے؟''

''بنگالہ کا حاکم سلطان محمود شاہ بہادر ضرور ہے لیکن وہ زیادہ دیر تک شیر خان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ اگر اسے شکست ہو گئی تو پھر بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ شیر شاہ سوری اپنے قدم جما چکا ہوگا۔ اگر ہم نے بروقت بنگالہ کا رخ کیا تو شیر شاہ بہار کو بچانے کے لیے واپس لوٹ آئے گا، نہیں لوٹا تو ہم بہار پر قبضہ کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔''

تجویز معقول تھی لیکن ہمایوں گجرات کی مہم پر جانے کے لیے بضد تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمایوں کا وہ حریف جس نے مالوہ اور گجرات پر قبضہ کر لیا تھا، پرتگالیوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا اور ہمایوں چاہتا تھا کہ اس موقعے سے فائدہ اٹھائے لیکن ایک پہلو یہ بھی تھا کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد شیر شاہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ مغلوں کا راستہ روکنے والا اب کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ اب تک وہ مطمئن تھا کہ مغل بہادر شاہ سے الجھے رہیں گے لیکن اس کے انتقال نے نقشہ ہی الٹ دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر حاکم بنگال سے صلح کر لی۔

ہمایوں کی مجلس مشاورت یہ فیصلہ دے چکی تھی کہ بنگال کی مہم پر روانہ ہوا جائے لیکن ہمایوں کو اطمینان نہیں تھا۔ اس

نے نجومیوں کو طلب کیا کہ ستارے دیکھ کر بتائیں۔ ستارہ شناسوں پر اس کا اتنا اعتقاد تھا کہ ان کے خلاف وہ کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ ستارہ شناسوں نے بھی غالباً بادشاہ کی رغبت دیکھتے ہوئے اس کے بنگال جانے کی مخالفت کی اور مشورہ دیا کہ وہ گجرات کی مہم پر روانہ ہو جائے۔

اب اسے گجرات جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا لیکن اس کے ستارے کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ شیر شاہ نے معاہدۂ صلح توڑ کر محمود شاہ پر حملہ کر دیا۔ محمود شاہ زخمی ہو کر فرار ہوا۔ اس کی فوجیں شکست سے دوچار ہو گئیں۔

حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ہمایوں کو نجومیوں کی باتوں کو ایک طرف رکھ کر بنگال کی مہم پر روانہ ہونے کا حکم جاری کرنا پڑا۔

فوجی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ایسی تیاریاں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ بنگال کا علاقہ مغلوں کے لیے اجنبی بھی تھا اور مشکل بھی، اس لیے کچھ زیادہ ہی جاں فشانی دکھائی جا رہی تھی۔ سامنا بنگال کے دریاؤں کا تھا لہٰذا متعدد کشتیاں تیار کر لی گئیں۔ رومی خاں کے زیرِ نگرانی غیر معمولی وزنی توپیں جو محاصرے کے وقت کارآمد ثابت ہوں اکٹھی کی گئیں۔ شاہی پیش خانہ آگرہ سے باہر نصب کر دیا گیا۔ اس عرصے میں موسم صاف ہو گیا تھا۔ جمنا کا سیلاب اتر چکا تھا۔

ہمایوں ایک بحری بیڑے میں رونق افروز تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیگمات سوار تھیں۔ عالی مرتبہ امرا اور اس کے جگری دوستوں کی کشتیاں اس کے پہلو بہ پہلو تھیں۔ بہت سے سپاہیوں نے امراء، افسران اور خود شہنشاہ کی تقلید میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے لیا تھا جیسے کسی تفریحی مقام کی سیر کے لیے جا رہے ہوں۔ رسالہ اور توپ خانہ سڑک کے ذریعے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

یہ قافلہ ''پریاگ'' کے مقام پر پہنچا تو ہمایوں کی جنگی کونسل کا اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ پہلے گوڑ پر حملہ کیا جائے یا چنار کے قلعے پر قبضہ کیا جائے۔ ہمایوں کی بدقسمتی کہ اس نے ان بزرگوں کی رائے مان لی اور قلعہ چنار پر قبضے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ راستے میں اسے خبر ملی کہ شیر شاہ سوری اپنے بیوی بچوں کو نکالنے کے لیے چنار کے قلعے میں آیا ہوا ہے۔ گوڑ کو وہ اپنے بیٹے جلال خاں کے سپرد کر آیا ہے اب وہ پتھر مل رہا تھا کہ اگر وہ گوڑ کی جانب بڑھ جاتا تو فتح آسان تھی۔ رسد پہنچانے کے دروازے شیر خان پر بند ہو جاتے۔ اس کو اتنی فرصت بھی نہ ملتی کہ بیوی بچوں کو نکال لے جائے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ واپس لوٹنا مشکل تھا۔

صبح کاذب کا وقت تھا۔ تارے ابھی ابھی ڈوبے تھے کہ مغل فوج کا ہراول دستہ چنار کے قلعے کے سامنے طلوع ہوا۔

شیر خان کو جیسے ہی اطلاع ملی اس نے اپنے چند افغان سرداروں کو قلعے کی حفاظت کے لیے چھوڑا اور خود دوندھیاچل پہاڑی کے پیچھے جھارکھنڈ مقام سے مغلوں کی نقل و حرکت کی نگرانی بغیر کسی قسم کے تصادم کے کرتا رہا۔

چنار کا قلعہ پہاڑ کی نکلی ہوئی ایک نوک پر واقع تھا۔ دریائے گنگا کا پانی ایک دائرہ سا بناتا ہوا شمال کی طرف بہہ رہا تھا جہاں مغل کشتیاں لنگر انداز ہو گئیں۔ کشتیوں کی اس حرکت سے قلعے کی رسد بند ہو گئی۔

مغل فوج پہاڑ کے دامن میں تھی۔ نشیب میں ہونے کی وجہ سے توپ کے گولے قلعے تک پہنچنے میں تکلف کر رہے تھے۔ قلعے سے افغان بڑے بڑے پتھر لڑھکا رہے تھے جن سے مغل سپاہیوں کی بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہو رہی تھیں۔

ہمایوں یہ سب دیکھ رہا تھا اور داروغۂ توپ خانہ رومی خاں کو بلا کر بار بار تنبیہ کر رہا تھا۔ رومی خاں ہر ترکیب آزما کر دیکھ چکا تھا لیکن اس کی ہر ترکیب ناکام ہو رہی تھی۔ پوری فوج بے کار پڑی تھی۔ سارا دارومدار رومی خان کے توپ خانے پر تھا اور وہ بے اثر تھا۔ ایک مہینا ہو چکا تھا اور فوج ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔

رومی خاں اپنے خیمے میں بیٹھا تھا کہ ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے اپنے غلام کلانت کو اپنے پاس بلایا۔

''میں تم پر کوڑے برساؤں گا۔ تم دو چار کوڑوں کے بعد چیختے ہوئے پہاڑ پر چڑھ جانا، جیسے قلعے میں پناہ لینے کے لیے آ رہے ہو۔ اگر کسی نے رحم کھا کر دروازہ کھول دیا تو ٹھیک ورنہ واپس چلے آنا۔''

''اگر انہوں نے مجھے اندر بلا لیا تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''اندر کا جائزہ لے کر جب بھی موقع ملے بھاگ آنا۔''

غلام تیار ہو گیا اور اس پر کوڑے برسنے لگے۔ وہ چیختا رہا اور پھر منصوبے کے مطابق قلعے کی طرف بھاگا۔ سادہ لوح افغانوں کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے اسے قلعے میں پناہ دے دی۔ غلام نے رو رو کر اپنی داستان سنائی۔

''میں رومی خان کا غلام ہوں۔ میرا آقا بہت ظالم ہے۔ بات بات پر میری چمڑی ادھیڑ دیتا ہے۔ میں اس کے پاس سے بھاگنا چاہتا تھا مگر کہاں بھاگتا۔ اس نے آج مجھے پھر مارا۔ اب آپ لوگوں کا مجھے سہارا تھا۔ میں یہاں چلا آیا۔ غلامی ہی کرنی ہے تو آپ لوگوں کی کر لوں گا۔''

افغان اس سے بہت متاثر ہوئے۔ غلام نے بھی کمال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوشیاری سے چند ہی روز میں ان لوگوں کا اعتبار حاصل کرلیا۔

افغان اس سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ رومی خاں کے توپ خانے کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ اس غرض سے انہوں نے غلام کو قلعے کا ایک ایک کونا دکھایا اور اپنی حفاظت کی سب ترکیبیں اسے بتادیں۔ غلام کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قلعے میں گولہ بارود اور غذائی اجناس وافر مقدار میں موجود ہیں۔

یہ سب معلومات لے کر ایک دن وہ چپکے سے وہاں سے نکل بھاگا اور اپنے آقا رومی خاں کو تمام راز سے آگاہ کر دیا۔ ان رازوں سے واقف ہونے کے بعد رومی خاں نے بادشاہ کی اجازت سے تین کشتیوں پر ایک بلند مینار تیار کرالیا۔ یہاں سے قلعے کا کونا کونا دکھائی دے رہا تھا۔ اس مینار کو وہ قلعے کے نزدیک لے گیا۔ دوسری جانب رومی خاں کے کہنے پر بادشاہ نے فوج کو حکم دے دیا کہ وہ قلعے پر حملہ کردے اور اس وقت تک پیچھے نہ ہٹے جب تک قلعے پر مکمل قبضہ نہ ہوجائے۔ دونوں جانب سے گولہ باری شروع ہوئی۔ زمینی فوج نے بھی لڑائی شروع کردی، آدھی رات تک لڑائی چلتی رہی۔ بڑے بڑے پتھر لڑھک کر آرہے تھے۔ مغل نشیب میں تھے لہٰذا بھاری نقصان ہورہا تھا۔ صبح ہوئی تو سات سو مغل سپاہی ہلاک ہوچکے تھے۔ مینار کا ایک حصہ بھی گولہ باری سے تباہ ہوچکا تھا۔

رات بھر کی لڑائی نے افغانوں کو یقین دلادیا کہ مغلوں کا ارادہ مستحکم ہے۔ وہ بھی نہ کبھی قلعے پر قبضہ کرلیں گے۔ لہٰذا وہ وقت آنے سے پہلے ہی صلح کرلی جائے۔ شیر شاہ تو پہلے ہی قلعے سے نکل چکا تھا۔ غازی خاں، اس کا ایک سردار قلعے کی محافظت کررہا تھا۔ اس نے گھٹنے ٹیک دیے اور صرف اس شرط پر صلح کی درخواست بھیج دی کہ وہ قلعے میں موجود تمام لوگوں کی جان کی سلامتی کا وعدہ کرلیں۔ بادشاہ نے اس آسان شرط کو پورا کرنے کا حکم صادر کردیا اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔

رومی خاں نے افغانوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کی جاں بخشی کا وعدہ ہوچکا ہے، بہت جلد تحریری حکم نامہ بھی پہنچ جائے گا۔ یہ تحریر جب موید بیگ کے ہاتھ لگی تو اس نے اس تحریر میں ردوبدل کردیا اور اس میں لکھ دیا کہ افغانوں کے ہاتھ قلم کردیے جائیں۔ قلعے پر قبضہ تو ہو ہی چکا تھا۔ دو ہزار افغانوں کو قیدی بنالیا گیا تھا۔ اس حکم نامے کو دیکھ کر رومی خاں نے سات سو بچیوں کے ہاتھ کٹوا دیے۔ یہ ایسا ظلم تھا کہ آسمان بھی کانپ اٹھا ہوگا۔

شیر خاں افغان مستورات اور چند جانباز افغانوں کے ساتھ پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ چند افغان قلعے سے اپنی جان بچا کر اس کے پاس پہنچے اور پوری روداد سنائی۔ اس عظیم نقصان پر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بے اختیار آسمان کی طرف ہاتھ اٹھادیے۔

''اے اللہ! تو اس خون کے صدقے میں مغلوں کی سلطنت کا خاتمہ کردے۔ ایسے ظالموں کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں جنہیں اپنے وعدے کا بھی پاس نہیں پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم لوگ گواہ ہو۔ میں مغلوں کے خلاف نہیں تھا۔ میں تو اپنے دفاع کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اب ہمایوں نے خود مجھے اشتعال دلایا ہے۔ میں اب اس کی سلطنت ختم ہونے تک جنگ کروں گا۔ اب میرے غضب سے اسے کوئی نہیں بچاسکتا۔ میں ہر جائز وناجائز طریقہ اختیار کروں گا۔''

وہ جنگل میں بے یارومددگار کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مستورات اور خزانے کو کس جگہ منتقل کرے۔ اسے شیر گڑھ کی یاد آئی۔ یہ قلعہ اس نے اپنے علاقے سہسرام کے نزدیک بنایا تھا لیکن یہ قلعہ کسی طویل محاصرے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس نے اس منصوبے کو خود ہی رد کردیا پھر اس کی آواز گونجی۔

''فلک شیر خاں!'' ایک ہیبت ناک شکل کا افغان اس کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

''حضرت! کیا حکم ہے۔'' (اس کے ساتھی اسے حضرت کے لقب سے یاد کرتے تھے)

''تم ابھی روہتاس کے راجا ہرکشن کے پاس جاؤ اور ہمارا یہ پیغام اس تک پہنچادو۔''

''جو حکم حضرت۔''

شیر شاہ نے ہرکشن کے نام تحریر لکھی۔

''مغل ہر طرف سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ علاقہ امیر تیمور کے خاندان کے ہاتھ لگ گیا تو قلعۂ روہتاس آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میرے پاس میری عورتیں اور بچے ہیں اور کافی بڑا خزانہ ہے۔ مغلوں کے مقابلے میں اب میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ ان سب کو لے کر مقابلے پر جانا خلاف مصلحت ہے۔ اگر قلعے میں عورتوں، بچوں اور خزانے کو رکھنے کی اجازت مل جائے تو میں ان کی طرف سے بے فکر ہوکر مغلوں سے لڑنے چلا جاؤں گا اور ان کو اپنے علاقے سے اور آپ کی سرحدوں سے دور بھگادوں گا۔

اگر میں مغلوں پر غالب آگیا تو آپ کے اس احسان پر تاعمر شکر گزار رہوں گا اور اگر خدانخواستہ کوئی اور معاملہ پیش آیا تو میرے اہل وعیال اور خزانہ آپ کی پناہ میں محفوظ رہے گا۔ میرے مال وناموس کی اپنی حفاظت میں لاج رکھ لینا۔''

راجا نے پہلے تو انکار کردیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر شیر شاہ مارا گیا تو یہ خزانہ اس کے قبضے میں آجائے گا، اس نے اجازت دے دی۔

شیر شاہ مغلوں کی نظر بچا کر دشوار گزار گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے قلعۂ روہتاس تک پہنچ گیا۔ شیر شاہ نے ایک ہزار ڈولیاں تیار کرائی تھیں۔ ہر ڈولی میں دو افغان بٹھائے گئے تھے۔ چند ڈولیوں میں عورتیں بھی تھیں جنہیں آگے رکھا گیا تھا۔ ڈولیوں میں ننگی تلواریں چھپا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ان ڈولیوں کو اٹھا کر چلنے والے بھی دراصل سپاہی تھے جنہوں نے بھیس بدل لیا تھا۔

یہ ڈولیاں قلعے میں داخل ہوئیں تو راجا نے یہ سوچ کر کہ افغان عورتیں بہت سخت پردہ کرتی ہیں، پہرے داروں کو حکم دیا کہ کوئی ان ڈولیوں کی تلاشی نہ لے مگر جیسے ہی یہ ڈولیاں قلعے میں داخل ہوئیں تو ان میں سے خواتین کے بجائے جوان نکلے۔ یہ سب کے سب بہادر پٹھان سپاہی تھے۔ ان سب نے دربانوں پر حملہ کردیا اور پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کردیا اور چند لمحوں میں ڈیوڑھی پر قبضہ کرکے دروازوں کو چوپٹ کھول دیا۔ شیر شاہ باہر منتظر کھڑا تھا۔ اپنی جمعیت کو لے کر نقارے بجاتے ہوئے قلعے میں داخل ہوگیا۔ راجپوت سپاہیوں نے تادیر مقابلہ کیا مگر کب تک۔ راجا کو خبر ہونے تک سارا قلعہ چوپٹ ہوچکا تھا۔ اب اس کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ اپنے چند آدمیوں کے ہمراہ خفیہ راستے سے نکل بھاگا۔ شیر شاہ نے روہتاس کے قلعے پر قبضہ کرکے اپنے چنار کے نقصان کی تلافی کرلی۔

اب شیر شاہ بے فکر تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں کو قلعے میں چھوڑا اور خود ایک طویل صحرا نوردی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ یہاں سے نکل کر اس نے جھارکھنڈ کے راجا پر فوج کشی کی۔ اس علاقے کے تسلط کے بعد وہ بنگال کی سرحد کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ یہ علاقہ روہتاس اور بنگال کے درمیان واقع تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ دونوں سرحدوں کی نگرانی کرسکتا تھا۔ اسے یہ خوش خبری بھی ملی کہ اس کے سرداروں نے ''گوڈ'' پر قبضہ کرلیا ہے۔

ہمایوں چنار پر قبضہ کرکے مطمئن تھا۔ اس کی فوجیں بھی عیش ومستی میں تھیں کہ ایک خبر نے سب کے ہوش اڑادیے۔ خبر تھی کہ شیر خاں نے بنگال فتح کرلیا ہے۔ ہمایوں نے روہتاس اور جھارکھنڈ کے خلاف فوج کشی کرنے کا اعلان کردیا۔ حملے کی دھمکی سے پہلے صلح کی بات ضروری تھی۔

ہمایوں نے شیر شاہ کے نام پیغام بھجوایا۔

''بنگال کا تخت اور خزانہ ہمارے پاس روانہ کردو۔ اس کے بدلے میں چنار، جونپور یا کوئی بھی پسندیدہ جگہ دے دی جائے گی۔''

یہ پیغام ہی عجیب تھا۔ شیر اپنے جبڑے کا شکار کسی کے حوالے کرتا ہے؟ اس نے لکھ بھیجا۔

''میں نے بنگال کی تسخیر میں چھ سال تک جاں فشانی کی ہے اور میرے بہت سے سپاہی اس مہم میں کام آئے ہیں۔ میں بنگال کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

ہمایوں ابھی شیر خاں کے جواب پر لاجواب ہونے بھی نہیں پایا تھا کہ بنگال کے حاکم سلطان محمود کا سفیر بارگاہِ ہمایوں میں حاضر ہوگیا۔

سلطان محمود فرماتے ہیں۔ ''افغان نے گوڈ کے قلعے پر ضرور قبضہ کرلیا ہے لیکن باقی ملک ہنوز میرے قبضے میں ہے۔ بادشاہ سلامت فوج کو اس جانب کوچ کا حکم فرمائیں اور قبل اس کے کہ افغانی اس علاقے میں اپنے قدم جماسکیں، ان کو بنگال سے نکال باہر کریں۔ اس مہم میں مجھے بھی آپ اپنا معاون پائیں گے۔''

سلطان محمد کی درخواست ہمایوں کے گوش گزار ہوئی تو اس نے اپنی فوج کو بنگال کی جانب کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ فوج کا ایک حصہ جھارکھنڈ کی جانب روانہ کیا جہاں شیر شاہ مقیم تھا۔

شیر خاں کو خبر ملی تو اس نے اپنی فوج کا بیشتر حصہ روہتاس کی جانب بھیج دیا اور خود چند گھڑ سواروں کے ساتھ چپ چاپ گوڈ کی طرف روانہ ہوگیا۔

شیر شاہ کے تعاقب میں مغل فوج کا ایک دستہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سہسرام کی پہاڑیوں میں چھپا لیا۔ مغل یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ آگے کی طرف بھاگ رہا ہے لہٰذا وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے جبکہ شیر شاہ ان کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔

تعاقب کرنے والا دستہ ایک ندی کے کنارے پہنچا۔ اس ندی کا نام سون تھا۔ یہاں پہنچ کر اس دستے نے پڑاؤ ڈال لیا اور باقی فوج کا انتظار کرنے لگے۔ چند روز بعد بادشاہ بھی وہاں پہنچ گیا۔

بادشاہ پہنچ گیا تھا کہ دور غبار اڑتا نظر آیا۔ کھلبلی مچ گئی کہ کہیں یہ شیر شاہ نہ ہو۔ بادشاہ نے چند سواروں کو راستہ روکنے کے لیے آگے بھیج دیا۔ یہ کوئی اور تھیں، بدنصیب سلطان محمود ... بنگال تھا جو زخمی بھی تھا اور ہمایوں کی۔ لشکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں شامل جراحوں نے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے ہمایوں کے سامنے پیش کر دیا۔ ہمایوں نے بنگال کا تخت واپس دلانے کا وعدہ کر کے اسے تسلی دی۔

''شیر شاہ ہم سے چھپ کر بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس کا کہیں سراغ ملے تو بنگال کا فیصلہ ہوتے دیر نہیں لگے گی۔''

''مجھے راستے میں یہ خبر ملی ہے کہ وہ پٹنہ کے قریب کہیں چھپا ہوا ہے۔''

''کیا ہم تمہاری بات پر یقین کر لیں؟''

''آپ گنگا تو پار کریں۔ اگر وہ پٹنہ میں نہ ہوا تو آپ کو گوڑ کی طرف بڑھنے میں آسانی ہو جائے گی۔''

ہمایوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔ ہمایوں کی فوج ان علاقوں سے ناواقف تھی لیکن اب سلطان محمود اس کے ساتھ شامل ہو گیا تو اس کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے گنگا پار کی اور ہراول دستے کو آگے روانہ کر دیا۔

ہراول دستہ پٹنہ پہنچا تھا کہ اسے خبر ملی، شیر خاں یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ خبر رساں اِدھر اُدھر دیہات میں پھیل گئے اور شیر خاں کی تلاش کی جانے لگی۔

تلاش کی ٹھوکروں سے بچتے ہوئے یہ خبر رساں ایک باغ کے قریب سے گزرے تو انہوں نے وہاں چند گھوڑے بندھے ہوئے دیکھے۔ اس معمولی سے گاؤں میں ایسے شاندار گھوڑے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا۔ وہ باغ سے باہر نکلے اور ایک دیہاتی کو پکڑ لیا۔

''کون ٹھہرا ہے یہاں۔ یہ گھوڑے کس کے ہیں؟''

''مجھے کیا معلوم؟ باندھ گیا ہو گا کوئی۔''

وہ دیہاتی کچھ بتانے سے قاصر تھا لیکن جب تلوار اس کی گردن پر رکھ دی گئی تو اس نے اگل دیا کہ بذاتِ خود شیر خاں ہے جو یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

خبر رساں اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ شیر خاں اس وقت کہاں ہے اور اس کے ساتھ کتنی فوج ہے؟ انہوں نے دیہاتی کو وہیں چھوڑا اور لشکر میں پہنچ کر خبر پہنچا دی۔ اس وقت تک ہمایوں بھی پٹنہ پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ نے اسی وقت جاسوس روانہ کر دیے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ شیر شاہ کہاں چھپا ہوا ہے؟

شیر شاہ کو غالباً خبر مل چکی تھی کہ مغلوں نے اس کا سراغ لگا لیا ہے۔ جب تک جاسوس اس گاؤں میں پہنچتے، شیر شاہ وہاں سے رفو چکر ہو چکا تھا۔

جاسوس یہ خبر لے کر آئے تو شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس اندھیرے میں تعاقب کے لیے روانہ نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ دوسرے دن کا سورج طلوع ہوتے ہی تعاقب شروع کر دیا گیا۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں فاصلے سمٹتے بڑھتے رہے۔ ایک روز تو ایسا وقت آیا کہ شیر شاہ آنکھوں سے نظر آنے لگا۔ وہ ہوا سے بھی تیز رفتار جا رہا تھا لیکن تعاقب کرنے والے بھی کم نہیں تھے۔ اس نے اپنے چند سواروں کو رک جانے کا حکم دیا اور خود آگے بڑھتا چلا گیا۔ پیچھے رہ جانے والوں نے مغلوں کو کئی گھنٹوں تک روکے رکھا۔ بس اتنا وقت کافی تھا۔ شیر شاہ مونگیر پہنچا اور یہاں سے تیز رفتار کشتی میں بیٹھ کر گوڑ پہنچ گیا۔ گوڑ پہنچ کر اس نے ہمایوں سے بے خطر ہو کر رسم تاج پوشی ادا کی اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اس رسم تاج پوشی سے وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ سابقہ حاکم کا اقتدار ختم ہو چکا اور اب وہ بنگال کا بادشاہ ہے۔

اسے معلوم تھا کہ ہمایوں کی توپیں اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے بس پہنچنے ہی والی ہوں گی لہٰذا رسم تاج پوشی کے دوسرے ہی دن وہ گوڑ سے فرار ہو گیا۔

مغل فوج خوش و خرم گوڑ کی جانب روانہ ہوئی اور چار دن میں بنگال کے دارالسلطنت میں بادشاہ جلوہ افروز ہو گیا۔

شیر شاہ نے اپنی فوج سہسرام اور روہتاس میں اکٹھی کر لی تھی۔ برسات نے اسے مزید فرصت دی۔ برسات ختم ہوتے ہی اس نے مغلوں کے خلاف جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کا آغاز ہو گیا۔ شیر شاہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح چنار کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے آئے لیکن یہاں مغلوں کا تسلط نہایت مستحکم تھا۔ شیر شاہ نے ہوشیار فاتح کی طرح یہاں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر بنارس پر قبضہ کر لیا پھر جونپور کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ یہاں اس کی مزاحمت ہوئی۔ اس نے اس محاصرے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اس محاصرے کو جاری رکھتے ہوئے مغلوں کی سلطنت میں موجود قنوج تک کے علاقے کو اپنے تصرف میں کر لیا۔

مغلوں کے تمام علاقوں پر شیر شاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اب صرف دو ہی علاقے چنار اور جونپور شیر شاہ کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا محاصرہ کیا گیا۔ ہمایوں گوڑ میں تھا اور شیر شاہ نے مغل علاقوں میں تباہی مچائی ہوئی تھی۔ یہ خبریں ہمایوں تک پہنچیں تو اسے یقین نہیں آیا کہ صورتِ حال اتنی ابتر ہو گئی ہے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''شیر شاہ کو یہ سب کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔'' اب اسے جلد سے جلد دارالخلافہ آگرہ کی طرف لوٹنا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ بنگال کا انتظام کس کے سپرد کر کے جائے؟ اسے اپنے ہمزلف زاہد بیگ کا خیال آیا جو اس کے ساتھ ہی سفر کر رہا تھا۔

''زاہد بیگ! تم ہم سے اپنی ترقی پر اصرار کرتے رہے ہو۔ ہم نے سوچا ہے تمہیں بنگال کا حاکم (گورنر) بنا دیا جائے۔''

زاہد بیگ نے رعب شاہی کا خیال کیے بغیر برافروختہ ہو کر کہا۔ ''کیا مابدولت کے خیال میں مجھے ذبح کرنے کے لیے بنگال سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔''

اس کا یہ جواب ایسا گستاخانہ تھا کہ ہمایوں اس کو سخت سزا دینے کی سوچنے لگا۔ اس بارے میں اس نے اپنے کچھ افسروں سے مشاورت بھی کی۔ زاہد بیگ کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ ایک دن چپکے سے نکلا اور آگرہ بھاگ گیا۔ آگرہ پہنچ کر اس نے حالات دگرگوں دیکھے۔ لوگ شیر شاہ کی فتوحات کو تشویش سے دیکھ رہے تھے اور بادشاہ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ بادشاہ کا بھائی مرزا ہندال بھی سخت بدظن تھا۔ زاہد بیگ نے اس موقعے کا فائدہ اٹھایا۔ مرزا ہندال کو اکسایا کہ وہ خود بادشاہ بن جائے۔

''ہمایوں بنگال میں گھرے ہوئے ہیں۔ آپ کو روکنے والا کوئی نہیں ہے۔''

بات معقول تھی مرزا نیم رضامند بھی ہو گیا تھا لیکن اسی وقت بادشاہ کا سفیر شیخ بہلول آگرہ آیا۔ بادشاہ نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ مغل حاکم کی مدد کے لیے جونپور پہنچے۔

اسے بھائی کی بے بسی کا خیال آیا اور جونپور جانے کے لیے تیاری کرنے لگا۔ زاہد بیگ نے اسے پھر ورغلایا، اسے ترغیب دی کہ وہ شیخ بہلول کو قتل کر دے اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ مرزا کے منہ میں ایسا پانی بھرا کہ شیخ بہلول کو قتل کرا دیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور جونپور جانے کے بجائے دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

بادشاہ گوڑ میں بیٹھا تھا کہ اسے شیخ بہلول کے قتل اور مرزا ہندال کے بادشاہ بننے کی خبر موصول ہوئی۔ اب ایک لمحہ بھی یہاں نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ اس نے کوچ کا حکم دے دیا۔ مغل سپاہی اس سے زیادہ مضطرب تھے کہ جلد از جلد شیر شاہ کے شکنجے سے نکل بھاگیں۔ گوڑ کا حاکم بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا بالآخر بڑی مشکل سے ایک افسر جہانگیر قلی بیگ کو رضامند کیا گیا۔ ہمایوں نے اسے پانچ ہزار فوج دے کر گوڑ کی حفاظت پر مامور کیا اور خود آگرہ بچانے چل دیا۔

شیر شاہ ابھی تک جونپور اور چنار کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے قنوج کے سارے علاقے پر اپنا تصرف کر لیا تھا۔ اب اپنی فوج روہتاس کے نزدیک اکٹھی کر لی۔ اسے یقین تھا کہ ہمایوں روہتاس پر حملہ آور ہو گا۔ اس لیے وہ یہ انتظامات کر رہا تھا۔

گنگا کا شمالی کنارہ خالی پڑا تھا۔ شیر شاہ کی فوج کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہمایوں نے حکم دیا کہ اس مقام سے دریا پار کیا جائے۔ تمام افسروں کا بھی یہی خیال تھا لیکن موید بیگ کو اس سے اختلاف تھا۔

اس نے مشورہ دیا۔ ''آپ شہنشاہِ ہند ہیں۔ آپ پر لازم ہے کہ جس راستے سے آپ آئے تھے اسی راستے سے واپس جائیں ورنہ دشمن یہ کہے گا کہ اصل راستہ اختیار نہ کر کے مغل فوج دوسرے راستے سے دم دبا کر بھاگ رہی ہے۔''

بادشاہ، موید بیگ کی ہر بات مان لیا کرتا تھا، یہ مشورہ بھی مان لیا۔ اس مشورے نے بادشاہ کو شیر شاہ کے چنگل میں ڈال دیا۔ شیر شاہ کا ہمایوں سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو روہتاس بچانے کی فکر میں تھا لیکن غلط جگہ سے دریا پار کرنے اور مغرب کی طرف بڑھنے سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب وہ مغل لشکر کے عقب میں تھا۔ اس کے لیے بڑا آسان ہو گیا تھا کہ وہ مغل لشکر پر عقب سے حملہ کر دے۔ اس نے یہی کیا۔ فوج کے پچھلے حصے پر حملہ کر دیا۔ دونوں طرف سے تیر و تفنگ چلے۔ اگلے روز شیر شاہ نے پھر چھاپہ مارا۔ اسے اتنی کامیابی ملی کہ کوہ شکن توپیں مغلوں کے قبضے سے نکل گئیں۔ شہنشاہ نے حکم دیا کہ مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو جائیں۔ سپاہیوں نے زرہ بکتر پہن لی اور چوسہ کے مقام پر پہنچ گئے۔ شیر شاہ بھی تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گیا۔ یہ موقع اچھا تھا۔ شیر شاہ کے سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ اس وقت لڑائی چھیڑ دینی چاہیے تھی۔ شہنشاہ کا بھی یہی خیال تھا لیکن موید بیگ نے پھر مخالفت کی۔ غالباً وہ کسی سازش کا حصہ بنا ہوا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی بات مان لی اور لڑائی مؤخر ہو گئی۔ فوج رک گئی اور پڑاؤ ڈال دیا۔ شیر شاہ نے بھی شاہی فوج کے بالمقابل خیمے ڈال دیے۔

لڑائی مؤخر ہوتی رہی۔ محل وقوع ایسا تھا کہ شیر شاہ کو دھوکا دے کر نکلنا ممکن نہیں تھا اور ہمایوں فی الحال الجھنا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ دلی اور آگرہ سے آئے دن تشویشناک خبریں آ رہی تھیں۔ ہمایوں بار بار اپنے بھائیوں کو مدد کے لیے پکار رہا تھا لیکن بھائی اپنے باہمی عناد میں مصروف تھے۔ اس انتظار میں تھے کہ شہنشاہ کے متعلق کوئی بدخبر آئے اور وہ سلطنت کے حصے بخرے کریں۔ کوئی راستہ نہ دیکھ کر مجبوراً بادشاہ صلح کے لیے جھکا۔ لڑائی اس وقت تک ملتوی ہوتی رہی جب تک صلح کے لیے بات چیت چلتی رہی۔ دو مہینے کی کدو کاوش کے بعد یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ شیر شاہ نے شرط رکھی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ بادشاہ چنار کو اس کے حوالے کر دے۔ ہمایوں اور اس کے امیروں نے یہ شرط قبول نہیں کی۔

اب دونوں فریق آزاد تھے لیکن ہمایوں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ شیر شاہ لڑائی چھیڑنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ اس نے کوئی غیر معمولی اقدام نہیں کیے۔ بس اتنا کیا کہ دونوں لشکروں کے درمیان جو ندی تھی اس پر نگاہ رکھنے کا حکم دے دیا۔

صبح کاذب کی ٹھنڈی ہوا مغلوں کو لوریاں دے کر سلا رہی تھی۔ ہتھیار کھلے رکھے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے لہٰذا سپاہیوں کے جسموں پر کپڑے بھی آدھے تھے۔ کچھ اندھیرا کچھ اجالا تھا کہ ندی کی طرف سے ہزاروں سائے زمین کے سینے پر رینگتے ہوئے آگے بڑھے اور سوئے ہوئے مغلوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ شیر شاہ کے افغان سپاہی تھے۔ قیامت کا شور مچا۔ مغل سپاہی بیدار ہوئے تو ہتھیار سنبھالنے کا وقت نہیں تھا۔ بھاگ کر ہی جان بچائی جا سکتی تھی۔ جس کو جدھر راستہ ملا بھاگ کھڑا ہوا۔

اس کثرت سے میدان خالی ہوا کہ جب بادشاہ کے حکم سے جنگ کا نقارہ بجا تو صرف 300 سپاہی فراہم ہو سکے۔ تیموری خون نے جوش مارا۔ اس قلیل تعداد کے باوجود وہ میدان میں کود پڑا۔ بادشاہ خود میدان میں تھا۔ اسے دیکھ کر افغان سراسیمہ ہو گئے لیکن مغل سپاہیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ ان میں سے بھی بہت سوں نے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ ہمایوں کی تلوار اِدھر اُدھر چمک رہی تھی۔ سیکڑوں افغانوں کو اس نے تہ تیغ کر دیا تھا کہ ایک تلوار نے اس کا بازو زخمی کر دیا۔ اب وہ دانتوں سے گھوڑے کی باگیں پکڑے ہوئے تھا اور ایک ہاتھ سے تلوار چلا رہا تھا۔ دشمن اسے چاروں طرف سے گھیرنے لگے تھے۔ چند وفادار سپاہی آگے بڑھے اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر میدان جنگ سے نکال کر گنگا کی جانب دوڑ پڑے۔ بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا لیکن اتنا بدحواس تھا کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ چند سپاہی اور کودے تھے جو گرداب میں پھنس کر غرق ہو گئے۔ ایک سقہ جس کا نام نظام تھا اپنی مشک کے ذریعے دریا پار کر رہا تھا، اس کی نظر پڑی تو وہ بادشاہ کے قریب آ گیا اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ہمایوں کو اپنی مشک پر لے لیا اور دریا کے پار لے آیا۔

جو سپاہی ڈوبنے سے بچ گئے تھے وہ بھی ہمایوں کے ساتھ کنارے پر پہنچے۔ سب کے سب حیران تھے کہ اب کیا کیا جائے اور کہاں جایا جائے؟ ہمایوں کی نظر اچانک نظام سقہ پر پڑی جو اپنی مشک لیے کھڑا تھا۔

ہمایوں نے اسے قریب بلایا اور کہا۔ ”تم ہمارے محسن ہو۔ تم نے ہماری جان بچائی ہے۔ کہو کیا مانگتے ہو؟“

نظام سقہ دل میں ہنسا تو ضرور ہو گا کہ بادشاہ کے کپڑوں کا پانی بھی ابھی خشک نہیں ہوا ہے، سر ننگا ہے۔ شاید قیمتی کلاہ بھی پانی میں بہہ گئی۔ اس وقت یہ مجھے کیا دے سکتا ہے پھر بھی وہ دل کی بات زبان پر لے آیا۔

”حضور میں یہ چاہتا ہوں کہ میں کم از کم ایک دن کے لیے آپ کے تخت پر بیٹھوں۔ سب مجھے بادشاہ سلامت کہہ کر پکاریں اور میرے حکم پر چلیں۔“

”ہم تمہاری اس خواہش کو ضرور پورا کریں گے لیکن اس کے لیے تمہیں ہمارے ساتھ آگرہ چلنا ہو گا۔“

”میں تیاری ہوں سرکار۔ بادشاہت حاصل کرنے کے لیے یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“ ہمایوں نے اس سقے کو ساتھ لے لیا۔

ہمایوں کے تقریباً چھ ہزار آدمی اس معرکے میں کام آئے۔ ان میں سے آدھے تو وہ تھے جو دریا میں غرق ہو گئے۔

ہمایوں یہاں سے بنارس اور پھر چنار کی طرف بھاگا۔ چنار ابھی تک اس کے افسروں کے قبضے میں تھا۔ بہت چھوٹا سا لشکر اس کے ساتھ تھا۔ اس لشکر میں بہ مشکل دو سو سپاہی ہوں گے اور ان میں بھی آدھے سے زیادہ نہتے۔ ان کی تلواریں راستے ہی میں کہیں گر گرا گئی تھیں۔

ہمایوں نے سوچا تھا کہ وہ چنار کے قلعے میں کچھ دن قیام کرے گا لیکن تیسرے ہی دن اسے معلوم ہوا کہ شیر شاہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے والا ہے۔ اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ مقابلہ کرتا۔ اس نے قلعہ خالی کر دیا اور گنگا کے جنوبی کنارے کی سمت گامزن ہوا۔

قسمت کی گردش ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شیر شاہ کو معلوم ہوا کہ ہمایوں فرار ہو چکا ہے تو اس نے اپنے رسالے کے ایک نامور افسر کو اس کے تعاقب کے لیے روانہ کر دیا۔ ہمایوں اس نئی صورتِ حال سے بے خبر چلا جا رہا تھا کہ اس کے ہمراہیوں نے احساس دلایا کہ کوئی تعاقب میں ہے۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔

نظام سقہ سمجھ رہا تھا کہ بس اب آگرہ پہنچے لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ ٹھوکریں تو آسانی سے کھا لیتا لیکن اب تو جان پر ہی بن گئی تھی۔ بادشاہوں کو کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اس سے تو میں غریب ہی بھلا۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں بھاگ جائے لیکن اس بیابان میں کہاں بھاگتا۔ اس کی حالت تو اب قیدیوں جیسی تھی، جی کڑا کر کے بیٹھا رہا۔

ہمایوں چلتے چلتے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں جمنا، گنگا سے آ کر مل جاتی ہے۔ یہاں وہ حیرت زدہ ہو کر رکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دریا کس طرح پار کیا جائے۔ اس کی قسمت نے ساتھ چھوڑ دیا تھا لیکن خدا اب بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک اور غبار بلند ہوا اور پانچ چھ سو سوار نمودار ہوئے۔ یہ اریل کا راجا تھا۔ الٰہ آباد قلعے کے پار ریاست اریل تھی اور یہ اس کا راجا تھا۔ اس نے ہمایوں کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

”ان داتا، اس مشکل وقت میں، میں آپ کی مدد کروں گا۔“

”میری خاطر کیوں شیر شاہ سے دشمنی مول لیتے ہو۔ بس اتنا بتا دو، میں دریا کہاں سے پار کروں؟“

”کشتیوں کے بغیر ناممکن ہے کہ دریا پار ہو۔ مجھے خشکی کے ایک راستے کا علم ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔“

وہ ہمایوں کو ایک گزرگاہ سے اس پار لے گیا۔ ہمایوں کے سپاہی پانچ دن سے بھوکے پیاسے تھے، راجا نے ان کے لیے ایک بازار کھلوا دیا۔ ان لوگوں نے کھایا پیا؟ کچھ وقت آرام سے گزرا۔ گھوڑوں کو بھی راحت ملی۔ جن کے گھوڑے ضائع ہو گئے تھے انہوں نے نئے گھوڑے خرید لیے۔

راجا کی اعلیٰ ظرفی سے کچھ دن آرام سے کٹ گئے۔ سفر پھر شروع ہوا لیکن وہ اب اپنے علاقے میں تھا، خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ زندگی قسمت میں لکھی تھی کہ بالآخر آگرہ پہنچ گیا۔

ہمایوں کے دونوں بھائی تو کسی خبرِ بد کے انتظار میں تھے۔ کامران مرزا تو یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ بس دہلی اس کے قبضے میں ہے۔ جیسے ہی ہمایوں کے مرنے کی خبر آئے گی وہ تخت پر پاؤں رکھ دے گا لیکن غیر متوقع طور پر جب ہمایوں واپس آیا تو امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ہمایوں لٹا پٹا آیا تھا۔ کوئی بڑا لشکر بھی دستیاب نہیں تھا۔ اس کی صحت بھی جواب دے چکی تھی۔ اس کے باوجود دونوں بھائیوں کو اس کے مقابل آنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

متواتر صدمیوں نے بادشاہ کو دائمی بخار میں مبتلا کر دیا۔ کسی پر یہ خبر ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ بادشاہ بیمار ہے بلکہ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ مسلسل جسمانی مشقت کے بعد اب وہ آرام کر رہے ہیں۔ اس کے دونوں بھائیوں نے یہ موقع غنیمت جانا کہ اس وقت وہ اپنا قصور معاف کرا لیں۔

اس کی آرام گاہ کے گرد سخت پہرا تھا۔ کسی کو اس تک جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف اطبا اور بیگمات جا سکتی تھیں لیکن جب کامران مرزا اور ہندال مرزا اس سے ملنے آئے تو انہیں روک لیا گیا۔ وہ بہرحال بھائی تھے۔ سخت تکرار کے بعد انہیں جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ دونوں چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔ بڑا بھائی شہنشاہ ہند ہمایوں بستر راحت پر دراز تھا۔ اسے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا اس لیے اس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

”برادر کلاں، ہم دونوں نادم ہیں اور اپنے کیے پر شرمندہ۔“

”تم لوگوں نے کیا، کیا ہے جو شرمندہ ہو؟“

”آپ بنگال میں گھرے ہوئے تھے اور ہم آپ کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔“

”بنگال میں ہم نہیں، تیموری وقار خطرے میں تھا۔“ ہمایوں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تم نے ہم سے نہیں بلکہ اپنے خون سے غداری کی ہے۔“

”میں نے تمام تیاری مکمل کر لی تھی لیکن حاسدوں نے آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔“ کامران نے کہا۔

”تم اگر آ گئے ہوتے تو میں افغانوں کو نیست و نابود کر دیتا۔“ ہمایوں نے بستر پر دوبارہ لیٹتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرے خلاف بغاوت کا اشارہ دے کر دشمن کو طاقت بخشی۔ جب آپس ہی میں پھوٹ پڑ جائے تو دشمن سے کون لڑ سکتا ہے؟“

ہمایوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے اسے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ کامران مرزا آگے بڑھا اور ہمایوں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”آپ ہمارے باپ کی جگہ ہیں۔ ہمیں معاف فرما دیں۔ ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہماری تلواریں ہمیشہ آپ کے حکم پر اٹھیں گی اور افغانوں کو نیست و نابود کر کے ہی نیام میں جائیں گی۔“

ہمایوں کی طبیعت میں شفقت بہت تھی۔ بھائیوں کا تو وہ بہت ہی خیال رکھتا تھا۔ اس کا دل بھر آیا اور کمال شفقت سے دونوں کو معاف کر دیا۔

”جاؤ اور شیر خان سے مقابلے کی تیاری کرو ورنہ یہ آندھی بابری چراغوں کو گل کر دے گی۔ نہ صرف تم پر بلکہ تمام مغلوں پر یہ فرض ہے کہ وہ افغانوں کو نیست و نابود کر دیں۔“

بھائیوں کی طرف سے بے فکری ہوئی تو ہمایوں تیزی سے صحت یاب ہونے لگا۔ صحت یاب ہوتے ہی اسے نظام سقہ کی یاد آئی جس سے اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اسے تخت پر بٹھائے گا۔ اس کی تلاش ہوئی تو وہ مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا اور غالباً اپنی جان کو رو رہا تھا کہ اچھے وقتوں میں وعدہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا کہ قیدی بن کر رہ گیا۔ اسے تو امید بھی نہیں تھی کہ بادشاہ کو اپنا وعدہ یاد رہا ہوگا لیکن بادشاہ کو یاد تھا۔ اس نے نظام کو مہمان خانے سے نکالا اور دہلی لے گیا۔ یہاں اس کے لیے شاہی پوشاک تیار کرائی گئی اور اسے القاب وآداب کی منادی کے ساتھ تخت پر بٹھایا گیا اور تمام امیروں کو آداب بجا لانے کا حکم دیا۔ نظام نے جس عہدے پر جس کو چاہا سرفراز کیا اور جس کو چاہا انعام دیا۔ کہتے ہیں اس بہشتی نے چمڑے کا سکہ بھی جاری کیا تھا۔

ہمایوں نے اسے دو روز تک اور بعض مورخین کے نزدیک تین روز تک تخت پر بٹھائے رکھا اور چوتھے روز بہت سا مال و دولت دے کر رخصت کیا۔

مغل دربار ایک طرف جشن و شادمانی کا دور تھا تو دوسری طرف سازشوں کا جال بھی پھیل رہا تھا خصوصاً اس کے بھائی بظاہر اس کا ساتھ دے رہے تھے لیکن دل ہی دل میں اس کے خلاف تھے۔ ان کی یہی منافقت بعد میں ہمایوں کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوئی۔

☆☆☆

افغانوں کے ہاتھوں مغلوں کی شکست نے خاندان تیموری کے قومی جذبے کو ابھار دیا۔ انہیں افغانوں سے دلی نفرت تھی۔ یہ خیال کہ اب افغان ان پر غالب آجائیں گے ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ سخت سے سخت باغی تیموری بھی اب ہمایوں کے جھنڈے تلے آنے لگے۔ بنگال میں جو فوج منتشر ہوگئی تھی وہ بھی سمٹ کر ہمایوں کی خدمت میں آگئی اور اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ عالم یہ تھا کہ ان کی تلواریں نیاموں سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ وفاداریوں کے پیمان باندھے جارہے تھے۔ افغانوں سے بدلہ لینے کے مطالبے پیش کیے جارہے تھے۔

ہمایوں نے اپنی شکست کا داغ بڑی ثابت قدمی سے مٹایا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اس کی غیر حاضری میں جو نازیبا رویہ اختیار کیا تھا اسے اس نے بڑی فراخدلی سے فراموش کردیا تھا۔ یہ بھائی بھی اب اس کے لیے لڑنے مرنے پر آمادہ تھے۔ تقریباً ایک لاکھ فوج بھی جمع ہوچکی تھی۔ مغل توپ خانے کی ازسرِنو تنظیم کی گئی۔

☆☆☆

الٰہ آباد تک ہمایوں کا تعاقب کرنے کے بعد اب شیر شاہ کا پہلا کام بنگال پر دوبارہ قبضہ کرنا تھا۔ اس نے ایک دستہ ''گوڑ'' کی جانب روانہ کیا جہاں ہمایوں اپنا حاکم مقرر کر گیا تھا۔ اس دستے نے معمولی سی جھڑپ کے بعد گوڑ پر قبضہ کرلیا۔ شیر شاہ ایک فاتح کی حیثیت سے گوڑ پہنچا۔ یہاں اس کی دوبارہ تاج پوشی ہوئی۔

ہمایوں کی شکست نے اسے یہ ہمت بخش دی تھی کہ وہ آگرہ تک پہنچے۔ اب تک صرف بنگال پر اس کی نظریں تھیں، شیر خان نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کرے گا۔ ہمایوں نے خود اس کے دل میں یہ امنگ پیدا کردی۔

اس نے بنگال کا انتظام اپنے سرداروں کے سپرد کیا اور خود ایک بھاری لشکر لے کر ہمایوں کے علاقوں میں لوٹ مار کے لیے چل دیا۔ وہ ہمایوں کو سنبھلنے کا زیادہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے یہ سفر بڑی تیزی سے طے کیا۔

وہ اپنی فوج لے کر لکھنو سے چل کر گنگا کے کنارے کنارے پریاگ تک آیا۔ یہاں سے اس نے اپنے بیٹے قطب خاں کو جمنا کے کنارے کنارے کالپی کی جانب روانہ کیا۔ اس کے ساتھ جو فوج بھیجی گئی تھی اس کا مقصد مغلوں سے لڑنا نہیں بلکہ مغل فوج کو دو حصوں میں منقسم کرنا تھا۔ شیر شاہ سے یہ بڑی غلطی ہوئی۔ اسے مغل فوج کی تعداد کا اندازہ نہیں ہوسکا۔ یہ بھی غلطی تھی کہ اس مہم کو اس نے قطب خاں جیسے نوعمر اور ناتجربہ کار کے حوالے کیا۔

ان علاقوں میں لوٹ مار کی خبریں آگرہ پہنچیں تو ہمایوں نے اپنے نامور امیروں کے ہمراہ ایک دستہ فوج کا اس طرف روانہ کردیا۔ اس دستے نے افغانوں پر شدید حملے کیے اور افغانوں کی ایک بڑی تعداد مع قطب خاں ماری گئی۔

ایک روز آگرہ کے لوگ سو کر اٹھے تو انہوں نے شہر کے دروازے پر ایک سر لٹکا ہوا دیکھا۔ تھوڑی دیر میں یہ خبر عام ہوگئی کہ یہ شیر شاہ کے بیٹے قطب خاں کا سر ہے۔ یہ سننا تھا کہ ہمایوں کے حق میں نعرے لگنے لگے۔ ایک جشن سا برپا ہوگیا۔ لوگوں کا خوف وخطر جاتا رہا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ اب افغان اس ملک پر قبضہ نہیں کرسکیں گے۔

ابھی یہ جشن جاری تھا کہ یہ خبر موصول ہوئی کہ شیر شاہ گنگا کے مغرب میں آگیا ہے اور اپنے سب سے چھوٹے لڑکے قطب خاں کی شہادت کا بدلہ لینے پر آمادہ ہے۔ اس اطلاع پر ہمایوں خود ایک لاکھ سواروں کو لے کر پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے نکلا۔ شیر شاہ پچاس ہزار سواروں کے ساتھ تنگ راستے پر گھاٹیوں اور غاروں میں دبکا ہوا بیٹھا تھا اور شاہی لشکر کا راستہ روکے ہوئے تھا اس لیے دو مہینے تک وہاں ٹھہرنا پڑا۔

اس عرصے میں ہمایوں کے لشکر میں پھر پھوٹ پڑ گئی۔ محمد سلطان مرزا (ہمایوں کے چچا) نے اپنے بیٹوں اور مرزا

کامران کے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ غداری کی اور لشکر سے نکل کر واپس چلا گیا۔ کامران مرزا پہلے ہی ساتھ نہیں آیا تھا اور لاہور کی طرف چلا گیا تھا۔ مغل ویسے ہی افغانوں سے خوف زدہ تھے۔ اس غداری سے باقیوں کے حوصلے بھی پست ہوگئے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی ٹولی لشکر سے نکل کر فرار ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دو حصے سے زائد فوج بھاگ گئی۔

دوسری مصیبت یہ آئی کہ ایک روز اچانک بڑی سخت بارش شروع ہوگئی۔ سارے لشکر میں جل تھل ہوگیا۔ بادشاہ نے لشکر گاہ کو دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیا۔ خیمے اکھاڑے جانے لگے۔ سپاہی کیچڑ میں لت پت ساز وسامان اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ عین اس وقت شیر خاں دس بارہ ہزار سواروں کو لے کر نکلا اور دو طرف سے شاہی لشکر پر حملہ کردیا۔ کسی کو ہتھیار اٹھانے کا موقع تک نہ مل سکا اور قتلِ عام شروع ہوگیا۔

یہ عظیم الشان فوج ایسی حواس باختہ ہوئی کہ لڑنے کے بجائے فرار کے لیے گنگا کے پل کی طرف دوڑی کہ دریا پار کرلے۔ پل پر ایسی دوڑ ہوئی کہ پل ٹوٹ گیا۔ بہت سے کچل کر مر گئے، بہت سوں کو دریا کے پانی نے غرق کردیا۔

ہمایوں بھی اس عالمِ نامرادی میں اپنے گھوڑے سمیت دریا میں کود گیا اور کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پر جا اترا۔

وہ جب دریا میں کودا تھا اس کے ساتھ ایک ہزار آدمی تھے لیکن جب وہ دوسرے کنارے پر اترا تو اس کے ساتھ صرف آٹھ آدمی تھے جو زندہ بچے تھے۔ برہنہ سر، برہنہ پا، حواس باختہ ہمایوں آگرہ کی طرف چل پڑا۔

ننگے گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار یہ قافلہ 9 روز کا سفر طے کر کے آگرہ پہنچا۔ ہمایوں ایسا افسردہ خاطر تھا کہ قلعے میں داخل ہونے سے انکار کردیا۔

''قلعوں میں تو بادشاہ قیام کرتے ہیں۔ اب میں بادشاہ نہیں رہا۔ ایک دہقانی نے بابری چراغوں کو گل کردیا۔ میں کہتا رہا کہ بابر کی اولاد! خود کو متفق ومتحد رکھو۔ میری کسی نے نہیں سنی، میرے بھائی ہندوں نے مجھ سے غداری کی۔''

یہ ایسی مصیبت تھی کہ پہاڑ بھی ہوتا تو ریزہ ریزہ ہوجاتا۔ یہ ہمایوں کا پائے استقامت ہی تھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں البتہ ناامیدی تھی جو اسے گھیرے کھڑی تھی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اب آگرہ شیر شاہ سے دور نہیں اور اسے روکنے والی طاقت کوئی نہیں۔

شیخ رفیع الدین صفوی اسے بہلا پھسلا کر اپنے مکان پر لے گئے۔ لوگ اس کے پاس یوں آرہے تھے جیسے عیادت کو آتے ہیں۔

شہنشاہ ہمایوں منتشر مزاج ہورہا تھا۔ اس وقت کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ کسی کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یک بارگی غیرت نے جوش مارا۔

ہندال کو حکم دیا۔ ''شاہی حرم کی بیگمات کو قلعے سے یہاں لے آؤ۔''

''وہ کس لیے بھائی صاحب؟''

''دیکھتے نہیں افغان ہماری ناموس کے کتنے قریب آگئے ہیں۔ میں اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا تاکہ افغانوں کے ہاتھ ان کی طرف نہ بڑھ سکیں۔ اس کے بعد مجھے آزادی ہوگی۔ جس طرف چاہوں نکل جاؤں۔''

''گستاخی معاف! یہ فیصلہ قبل از وقت ہے۔''

''اب وقت کہاں ہے۔ شیر شاہ ضرور آگرہ کا رخ کرے گا۔''

''میں اس سے پہلے تمام بیگمات کو لاہور لے جاؤں گا۔ وہاں کامران موجود ہے۔ اس کے پاس عظیم الشان فوج موجود ہے۔ اگر اس نے ساتھ نہیں بھی دیا تو ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ ہم آگے بڑھ جائیں۔ آپ یہاں رہ کر حالات کا جائزہ لیجیے ورنہ آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی لاہور چلے آئیے۔ وہاں رہ کر دوبارہ اپنی سلطنت حاصل کرنے کی کوشش کیجیے۔''

شیر شاہ کی تو جیسے مرادیں بر آئیں۔ فقط ایک ہی فتح سے اس کو اتنے ہاتھی گھوڑے اور توپیں مل گئیں کہ ہندوستان کی فتح کے لیے اس کو آلاتِ حرب کی کمی نہ رہی۔ دوسرے ہی دن اس نے گنگا پار کی اور قنوج میں قیام کیا۔ یہاں سے اس نے اپنے سپہ سالار کو فوج دے کر آگرے کی جانب روانہ کیا۔ بعد میں وہ خود بھی روانہ ہوگیا۔

مغلوں پر بے حد خوف طاری تھا۔ وہ آگرہ اور دہلی کی جانب سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے لیکن کہیں جھڑپ نہ ہوسکی کیونکہ شیر شاہ کی فوج ایک منزل پیچھے تھی۔ جیسے ہی یہ خبر پہنچی کہ شیر شاہی فوجیں آندھی طوفان کی طرح آگرہ کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہمایوں نے آگرہ خالی کیا اور فتح پور سیکری کی جانب بھاگا۔ اس نے یہاں صرف ایک دن گزارا اور پھر موجودہ بھرت پور کے شمالی حصے میں کاما پہاڑی کے سنسان راستے سے گزرتے ہوئے ریواڑی پہنچ گیا۔

اس اثنا میں شیر شاہ کے ایک دوسرے دستے نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ مفرور شہنشاہ اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوگیا۔ وہ دہلی کے گرد ونواح سے سرپٹ بھاگا تو شیر شاہ کو فرصت مل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئی۔ وہ آگرہ پہنچا اور وہاں کے انتظام وانصرام میں مشغول ہوگیا۔ دو ہفتے قیام کے بعد وہ دہلی پہنچ گیا۔

ہمایوں روہتک کی جانب تیزی سے بھاگے چلے جارہا تھا۔ اس مصیبت کے وقت میں روہتک کے فوجی دستے نے اسے شہر میں داخل نہیں ہونے دیا۔ شہر کے دروازے بند تھے اور ہمایوں ان لوگوں کے ساتھ جو ریواڑی سے دہلی کے سفر میں ہمایوں کے ساتھ ہولیے تھے حیران پریشان کھڑا تھا۔ کھلے آسمان کو کبھی اپنے سائے کو دیکھ رہا تھا جو اس سے دور ہٹ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ مرزا ہندال جو بیگمات کو لے کر اپنی جاگیر الور کی طرف چلا گیا تھا اب لاہور جانے کے لیے نکلا تھا، ہمایوں سے آملا۔ دونوں کے سپاہیوں نے روہتک پر حملہ کر دیا۔ اس کا منشا یہاں ٹھہرنا نہیں تھا بلکہ اس حملے کا مقصد اپنی عزت وآبرو بچانا تھا۔ افواہیں اڑ رہی تھیں کہ شیر خاں روہتک کی طرف آرہا ہے۔ ہمایوں سرہند کی طرف بھاگا۔

شیر شاہ نے اپنے آدمیوں کو حکم دے دیا تھا کہ کسی مرحلے پر بھی بادشاہ سے جھڑپ کا موقع نہ آئے۔ بس اسے آگے کی طرف دھکیلتے رہو یہاں تک کہ وہ ملکی سرحدوں سے باہر نکل جائے۔

ہمایوں نے سرہند پہنچ کر مرزا ہندال کو وہیں چھوڑا اور ہدایت کی کہ وہ تعاقب کرنے والوں کا راستہ روکے رکھے اور خود وہاں سے نکل کر جالندھر پہنچ گیا۔ کچھ دنوں میں مرزا ہندال بھی اس سے آکر مل گیا۔ یہاں کسی نے ان کا تعاقب نہیں کیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے شیر شاہ خود یہ چاہتا ہو کہ وہ لاہور تک بہ آسانی چلا جائے۔

ہمایوں لاہور پہنچا تو سب بچھڑے ہوئے لاہور پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی جنہوں نے اس سے غداری کی تھی اور وہ بھی جو اتفاقیہ الگ الگ ہوگئے تھے۔ سب شیر شاہ کے ڈسے ہوئے تھے۔ خستہ وخراب تھے، سب کا دشمن مشترکہ تھا۔ سب مغل تھے اور افغانی ان کے دشمن تھے۔ مغلوں کی آن بھی بچانی تھی اور اقتدار بھی۔ ہر فرد صلح ومصالحت کی بات کرنے لگا۔ ہمایوں کے پہنچتے ہی سب اس کے گرد جمع ہوگئے۔

ہمایوں کی آواز گونج رہی تھی۔

''حضرات! اگر ہم لوگوں کی باہمی نااتفاقی، بغض وکینہ کی وجہ سے ہندوستان تیموری خاندان سے نکل کر ناکسوں کے تسلط میں چلا گیا تو اہلِ عقل ہم کو کیا کہیں گے؟''

اقتدار بچانے کے لیے تجاویز کا بازار گرم ہوگیا۔ مرزا کامران نے تجویز پیش کی کہ وہ خاندان کی سب بیگمات کو کابل چھوڑ آئے اور وہاں سے ایک فوج لے کر واپس آئے۔ اس تمام عرصے میں بادشاہ اور تمام مغل پہاڑوں میں پناہ گزین رہیں۔ اس تجویز کی سب نے مخالفت کی۔

مرزا ہندال کا کہنا تھا کہ شیر شاہ سے لڑنے کا ارادہ ملتوی کر دیا جائے۔ سندھ کو فتح کر کے ''کچھ'' کے راستے سے گجرات پر قبضہ کرلیا جائے اور پھر وہیں تب تک انتظار کیا جائے جب تک حملہ کرنے کا کوئی اچھا موقع نہ مل جائے۔ ایک تجویز یہ بھی آئی کہ کشمیر فتح کرلیا جائے تاکہ وقت ضرورت تمام مغل وہاں پناہ لے سکیں۔

ہر شخص کی اپنی اپنی رائے تھی۔ کوئی بھی کسی کی تجویز پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ دم بھر کو ایک چنگاری سی بھڑکی تھی کہ تمام مغل ایک ہوجائیں گے، پل بھر میں خواب ٹوٹ گیا۔ ہر شخص اپنا الگ راستہ تلاش کرنے لگا۔

موسم برسات شروع ہوچکا تھا۔ کسی فوجی مہم پر عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک اندھیری رات میں ہمایوں کے دل میں ایک خیال جگنو کی طرح چمکا۔ یہ ایسا خیال تھا جو کسی مفتوح ہی کے دل میں آسکتا تھا۔ اس نے شیر شاہ کے نام ایک خط تحریر کیا جس میں اس نے شیر شاہ کی منت سماجت کی تھی اور لکھا تھا کہ وہ اس (ہمایوں) کے لیے کم از کم سرہند کے پار پنجاب کا علاقہ چھوڑ دے۔

یہ خط اس نے لاہور کے صدر قاضی کے حوالے کیا اور اسے شیر شاہ کے پاس روانہ کر دیا۔ شیر شاہ اس وقت دہلی میں تھا۔

شیر شاہ نے خط پڑھا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ فتح کا نشہ اور گہرا ہوگیا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''ہمایوں سے کہنا، شیر شاہ نے تمہارے لیے کابل چھوڑ دیا ہے، وہیں چلے جاؤ۔''

قاضی عبداللہ کی زبانی اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمایوں اور اس کے بھائیوں میں جو صلح اور مصالحت کی بات چیت چل رہی تھی، وہ ختم ہوچکی ہے چنانچہ اس اختلاف کا فائدہ اٹھا کر وہ دہلی سے سرہند کی جانب روانہ ہوگیا اور اپنے سپہ سالار خواص خاں کو بھی حکم دیا کہ وہ ستلج پار کرلے۔ یہ خبر سنتے ہی کامران مرزا نے ہمایوں کو لاہور میں چھوڑا اور خود فرار ہوگیا۔

جب ہمایوں کو یہ خبر ملی کہ دشمن نے بیاس دریا پار کرلیا ہے تو لاہور میں روز قیامت بپا ہوگیا۔ مغل خانہ داری کا دو لاکھ کا ایک قافلہ طوفانی دھارا کی مانند دریائے راوی کو پار کر کے مغرب کی سمت بے سروسامانی کی حالت میں بھاگا چلا جارہا تھا۔

ہمایوں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا، بالآخر اس نے سندھ جانے کا ارادہ کرلیا اور جہلم کے مشرقی کنارے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتے ہوئے ملتان پہنچنے کے لیے جنوب کی سمت کوچ کر دیا۔ کچھ منزلوں تک مرزا ہندال اس کے ساتھ رہا اور پھر ایسی بے مروتی دکھائی کہ خوشاب کے مقام پر ہمایوں سے علیحدہ ہو گیا۔

شیر شاہ کی فوج بھاگتے ہوئے مغلوں کے قریب آتی جا رہی تھی۔ اب ہمایوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا وہ مغرب کی سمت بھاگا اور دریائے جہلم عبور کر کے اس پار چلا گیا۔ اتفاق سے کامران مرزا بھی یہیں تھا۔ اس وقت شیر شاہ، جہلم کے دوسرے کنارے پر تھا۔ دہشت ایسی تھی کہ دونوں بھائی دریائے سندھ کی طرف بھاگتے رہے۔ اب یہ دونوں ایک تنگ درے کے پاس کھڑے تھے۔ یہاں سے سڑک دو جانب جاتی تھی۔ ایک ملتان کی طرف اور دوسری کوہاٹ ہوتے ہوئے کابل جاتی تھی۔

کامران مرزا، بھائی کے ساتھ سفر ضرور کر رہا تھا لیکن ابھی تک دل صاف نہیں تھا۔ اس نے سوچا جو اس درے کو پہلے پار کر لے گا وہ راستے کے انتخاب میں آزاد ہو گا۔ اگر ہمایوں درے میں داخل ہو گیا تو ممکن ہے وہ ملتان جانے کے بجائے کابل چلا جائے اور کابل پر قبضہ کر لے۔ کامران تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا کہ اس درے کو پہلے وہ پار کرے گا۔ اس لشکر میں ایک درویش ابوالتقا نامی بھی سفر کر رہا تھا۔ دونوں نے اس کا فیصلہ اس فقیر پر چھوڑ دیا۔ اس نے فیصلہ ہمایوں کے حق میں دیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بادشاہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ بڑا بھائی تھا۔

چند میل دور جا کر یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ دونوں بھائی اس مقام پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شیر شاہ نے خوشاب میں قیام کیا اور تمام قابل افسروں کو فوجی دستوں کے ساتھ مغلوں کی تلاش میں اطراف و جوانب بھیج دیا۔ اپنے سپہ سالار خواص خاں کو حکم دیا کہ وہ جہلم کے مغربی کنارے کنارے ہمایوں کے تعاقب میں جائے۔ حسب سابق یہ ہدایت بھی کر دی کہ بادشاہ سے لڑائی کی نوبت نہ آئے بلکہ متواتر اس کا پیچھا کرتے رہو جب تک کہ وہ سلطنت کی حدود سے باہر نہ چلا جائے۔ خواص خاں یہ سنتے ہی روانہ ہو گیا تھا لیکن وہ ہمایوں سے سات منزل دور تھا۔

خواص خاں، ہمایوں کے راستے کا پتا لگاتے لگاتے ستلج کے شمالی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہاں سے خواص خاں کو ہمایوں کے راستے کا پتا نہ لگ سکا کیونکہ ہمایوں روہڑی کی سیدھی سڑک چھوڑ کر جنوب مشرق کی جانب مڑ گیا تھا۔

جنوری 1541ء کے آخری ہفتے میں وہ خستہ حال روہڑی پہنچا تو اس نے سکھر کے شاہ حسین ارغون کے فوجدار سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس قلعے کو اس کے حوالے کر دے اور اسے وہاں سکونت پذیر ہونے دے۔ فوجدار ڈر گیا اور اس نے کئی سو کشتیوں پر غلہ لاد کر ہمایوں کے لشکر میں بھیج دیا۔ اس کامیابی نے ہمایوں کا حوصلہ بلند کر دیا۔ اس نے سندھ کے فرمانروا شاہ حسین کو پیغام بھیجا کہ وہ فوراً اس کے دربار میں حاضر ہو۔ اگر تاخیر ہوئی تو وہ ٹھٹھہ (صدر مقام) پر حملہ کر دے گا۔

ہمایوں انتظار کر رہا تھا کہ شاہ حسین اس کے پاس حاضر ہو جائے گا لیکن اسے یہ خبر ملی کہ شاہ حسین نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے اور جو رسد اس کے فوجدار نے روانہ کی تھی اسے بھی راستے ہی میں ضائع کرا دیا۔

ہمایوں کے پاس نہ توپ خانہ تھا نہ، کشتیاں پھر بھی اس نے بذات خود اس جزیرے کا گھیراؤ کر لیا اور مرزا ہندال اور یادگار مرزا کو جو دریا پار کر کے سندھ کے مغربی کنارے پر لاڑکانہ میں پاتر کے مقام پر ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے، سیہون کے قلعے پر حملہ کرنے کا حکم دیا لیکن کسی نے اس کے حکم پر عمل نہیں کیا۔

جب بھکر میں غلہ نایاب ہو گیا تو ہمایوں کوچ کر کے پاتر پہنچا جہاں مرزا ہندال قیام کیے ہوئے تھا۔ یہاں آنے کا مقصد یہ تھا کہ مرزا ہندال کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ ملا لے۔

جب بادشاہ مرزا ہندال کی قیام گاہ پر پہنچا اور دو راتیں اور ایک دن مرزا ہندال سے ضروری باتیں ہو چکیں تو مرزا ہندال کے حرم اور باقی تمام لوگ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام پیش کیا۔ ہمایوں باری باری سب کا سلام قبول کر رہا تھا کہ ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ چودہ پندرہ سال کی یہ لڑکی نہایت حسین اور باتہذیب تھی، سلام پیش کر کے واپس پلٹ رہی تھی کہ کسی چیز میں پاؤں الجھا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ ہمایوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ اس لڑکی نے سنبھلتے سنبھلتے ایک سلام اور کیا، یہ شکریہ کا سلام تھا۔

جب وہ لڑکی جا چکی تو ہمایوں نے اس کی بابت پوچھا۔

''یہ ذات شریف کون ہیں جو ابھی ابھی گری اور سنبھلی تھیں۔''

''یہ دختر میر بابا دوست ہیں۔ میر بابا دوست میرے استاد تھے۔ ان کے بعد یہ لڑکی میری کفالت میں ہے۔''

''ہم نے نام پوچھنا چاہا تھا۔''

''اس کے والد نے اس کا نام حمیدہ بانو بیگم رکھا تھا۔''

اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی لیکن کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ہمایوں اس لڑکی پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ یہ تو خود ہمایوں کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے تو اس وقت معلوم ہوا جب وہ اپنی سوتیلی

ماں دلدار بیگم سے ملاقات کے لیے گیا اور بے اختیار کہہ اٹھا۔

''ہم چاہتے ہیں حمیدہ بیگم ہمارے عقد میں آ جائیں۔''

''کون حمیدہ بیگم۔'' بادشاہ کی والدہ نے کہا۔

''وہی جو کل مجرے کے وقت گرنے لگی تھیں۔''

''آپ بابا دوست کی دختر کی بات کر رہے ہیں تو ان کے کفیل مرزا ہندال ہیں۔ اس سلسلے میں تو وہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔''

''وہ کون سے دور ہیں۔ انہیں بھی بلا لیا جائے۔''

کچھ دیر میں مرزا ہندال بھی آ گئے۔ بادشاہ نے مرزا ہندال کے سامنے بھی یہی سوال رکھا لیکن مرزا کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر بادشاہ کو تعجب ہوا۔

''ہندال، کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔ کیا مجھ سے بہتر بھی کوئی رشتہ ہو سکتا ہے؟''

''آپ بادشاہ ہیں اسی لیے مجھے کچھ سوچنا پڑ رہا ہے۔''

''ہم کچھ سمجھے نہیں ہندال۔''

''آپ بادشاہ ہیں۔ مبادا ٹھیک اور مناسب گزر اوقات نہ ہونے پائے اور یہ بات باعث تکلیف بن جائے۔''

ہمایوں کو یہ بات اتنی ناگوار ہوئی کہ ناراض ہو کر اٹھ آیا۔

دلدار بیگم ہمایوں کی دلداری کی خواہاں تھیں لیکن مجبور بھی تھیں کہ حمیدہ بانو ان کے اختیار میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ حمیدہ کی والدہ کو اس شادی کے لیے مجبور کرتی رہیں۔ مرزا ہندال کو اعتراض تھا اس لیے وہ بھی کچھ نہ بولتی تھیں۔ ہمایوں کو بھی تسلی کا رقعہ لکھوایا۔

''لڑکی کی ماں اپنی بیٹی کو ترغیب دے رہی ہے۔ وہ جیسے ہی راضی ہو گی آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔''

ہمایوں نے بھی جواب میں لکھوا بھیجا۔

''آپ نے جو حکایت لکھی ہے اس سے میں بہت خوش ہوا ہوں۔ آپ جو تجویز و تحریک فرمائیں گی میں اسے بسر و چشم قبول کروں گا۔ باقی آپ معاش کے سلسلے میں جو لکھیں گی اسے مان لیا جائے گا۔ میں چشم براہ ہوں۔''

اس شادی کا قصہ کیا چلا تھا، ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بہت کم لوگ حمایت کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ مخالف ہی تھے۔ مرزا ہندال نے تو اسے سیاسی مسئلہ بنا لیا تھا۔ خود حمیدہ بانو بھی اس شادی کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔

ہمایوں اپنی سوتیلی والدہ کے پاس بیٹھے تھے کہ جی چاہا اس وقت حمیدہ بانو بھی ہوتی۔ دبے لفظوں میں درخواست کی کہ کسی کو بھیج کر حمیدہ بیگم کو بلوائیں۔ فوراً ایک آدمی کو بھیج دیا گیا۔ وہ واپس تو آ گیا لیکن جواب ایسا لایا کہ ہمایوں طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

حمیدہ نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ''اگر غرض یہ ہے کہ میں تسلیمات بجا لاؤں تو میں یہ عزت پا چکی ہوں پھر میں کیوں آؤں؟''

''آپ دیکھ رہی ہیں، مرزا ہندال نے اس کے کیسے کان بھر دیے ہیں۔''

''بچی اپنی شرم میں نہ آئی ہو گی، اس میں ہندال کا کیا قصور؟ اگر ایسا ہی ہے تو ہندال سے کہو۔ وہ اپنا اثر استعمال کرے اور اسے یہاں بھیج دے۔''

اس بار جواب اور بھی زیادہ سخت آیا تھا۔ بیگم نے کہلا بھیجا تھا۔ ''بادشاہوں کو ایک بار دیکھ لینا تو جائز ہے دوسری مرتبہ جائز نہیں کیونکہ وہ نامحرم ہیں۔ اس لیے میں انہیں دیکھنے نہیں آؤں گی۔''

بادشاہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''اگر میں نامحرم ہوں تو محرم بن جاؤں گا۔''

خاندان میں شور مچتا رہا۔ خود حمیدہ بانو بھی کسی طرح تیار نہیں ہوتی تھی۔ دلدار بیگم نے ایک مرتبہ پھر سمجھایا کہ آخر کار تم کسی نہ کسی شخص سے شادی کرو گی۔ بادشاہ سے کون آدمی بہتر ہے؟

حمیدہ بیگم نے بھی کیا خوب جواب دیا۔ ''یقیناً میں کسی آدمی سے ضرور شادی کروں گی لیکن ایسے آدمی سے جس کے گریبان تک میرا ہاتھ پہنچ سکے نہ کہ اس سے کہ میں اس کے دامن تک بھی نہ پہنچ سکوں۔''

یہ سوال جواب چلتے رہے اور بالآخر حمیدہ بانو تیار ہو گئی۔ ایک نیک ساعت میں ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا۔ مرزا ہندال اس نکاح سے اتنا برگشتہ ہوا کہ قندھار کی طرف چل دیا۔ یادگار ناصر مرزا بھی قندھار جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ہمایوں نے بہ مشکل تمام اپنی طرف کر لیا اور اس شرط پر اس کو اپنے ساتھ روہڑی لایا کہ ہندوستان کی سلطنت تسخیر کرنے کے بعد ایک تہائی حصہ اس کو دیا جائے گا۔

ہمایوں کو اپنا عہد یاد آ گیا۔ شادی کے جھمیلوں نے سب کچھ بھلا دیا تھا، اس سے نمٹتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ قلعۂ سیہون پر حملے کی غرض سے نکلا تھا۔ بھائیوں کی بے وفائی نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے یادگار ناصر کو روہڑی کے محاصرے پر چھوڑا اور خود سیہون چلا گیا۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دریا عبور کیا اور قلعۂ سیہون کا محاصرہ کرلیا۔

ہمایوں کے پہنچنے سے قبل شاہ حسین کے امرا قلعے میں داخل ہو چکے تھے اور قلعے کی حفاظت کا پورا بندوبست کرلیا تھا لہٰذا ایک ایک مہینا کر کے سات مہینے گزر گئے اور فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ہمایوں نے تنگ آ کر یادگار ناصر کو لکھا کہ وہ فوراً اس کی مدد کو آئے۔ ہم دونوں مل کر ہی اس قلعے کو فتح کر سکتے ہیں۔ اس اثنا میں شاہ حسین اپنا کام دکھا چکا تھا۔ اس نے یادگار ناصر کو لالچ دیا کہ وہ اس کو بادشاہ تسلیم کرلے گا اور اپنا داماد بھی بنالے گا۔ یہ سب لالچ اس لیے تھا کہ وہ ہمایوں کا ساتھ چھوڑ دے۔ اس کی یہ ترکیب کامیاب ہوگئی تھی۔ یادگار ناصر نے تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیا تاکہ ہمایوں دریائے سندھ نہ پار کر سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ہمایوں کو گرفتار کرنے کی بھی راہ دیکھنے لگا۔ شاہ حسین دریائے سندھ میں اترا اور ہمایوں کی ان تمام کشتیوں پر جو کہ سیہون پر لنگر انداز تھیں، قبضہ کرلیا۔ ان میں اس کا تمام خزانہ لدا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی سوار تھے۔ جو مال واسباب شیر شاہ کے حملوں سے بچ گیا تھا، وہ اب ہاتھ سے نکل گیا۔

ہمایوں مقامی زمینداروں کی مدد سے بہ مشکل تمام روہڑی کی جانب بچ کر نکل گیا لیکن یادگار ناصر، شاہ حسین کے بہکاوے میں آ کر جنگ کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس کے یہ تیور دیکھے تو ہمایوں نے یہی بہتر سمجھا کہ وہ اس کے پڑوس سے ہٹ جائے پر کہاں جائے.....؟

جب تک ٹھٹھہ کی فتح کا یقین تھا اس نے زمیندار مالدیو کی عرضیوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ مالدیو ہندوستان کے معتبر زمینداروں میں سے ایک تھا۔ تسخیر ہندوستان میں مدد دینے کا وعدہ ہمایوں سے کر چکا تھا۔ اب ٹھٹھہ کی فتح کی طرف سے وہ مایوس ہوگیا تو اس نے اعلان کر دیا۔ ''میں اب مالدیو کے پاس جاؤں گا۔''

مختصر سی فوج اس کے پاس رہ گئی تھی کیونکہ اس کے زیادہ تر سپاہی یادگار مرزا (ہمایوں کے چچا) اور شاہ حسین (حاکم ٹھٹھہ) سے مل گئے تھے۔

سندھ کا سفر، ریگستان ہی ریگستان، گرمی، اجنبی راستے، عورتیں ساتھ۔ یہ لشکر کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے مالدیو کی ولایت کی حدود میں پہنچ کر رک گیا۔ اطمینان کی چادر سر پر تھی کہ مالدیو نہایت طاقتور زمیندار ہے۔ وہ شیر خاں سے خوش بھی نہیں ہے لہٰذا ہندوستان کی دوبارہ تسخیر میں وہ ضرور ہمایوں کی مدد کرے گا۔ ہمایوں ایک علاقے میں بیٹھا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ راجا مالدیو جودھپور میں ہے۔ اس نے اپنے ایک سفیر کو تحائف دے کر مالدیو کے پاس بھیجا۔

ہمایوں اپنے سفیر کی واپسی کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ اسے مالدیو کی نیت بدل جانے کی اطلاع ملی۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس اطلاع پر یقین کرے لیکن جب وہ سفیر واپس آ گیا اور اس نے اس اطلاع کی بذاتِ خود تصدیق کی تو ہمایوں کو مالدیو کی بے مروتی کا یقین ہوگیا۔

راجا مالدیو کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہمایوں کے پاس بہت مختصر سی فوج ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اگر ہمایوں کے پاس لاکھ دو لاکھ کا لشکر ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر شیر شاہ کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیر شاہ وہ علاقے بھی چھین لے جو اسے مل چکے ہیں۔

مالدیو نے چالاکی یہ کی کہ ایک کثیر جماعت ہمایوں بادشاہ کی طرف بھیجی کہ اسے گرفتار کر کے لے آئیں اور سفیر کو رخصت نہیں کیا تاکہ ہمایوں غافل رہے لیکن سفیر کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور اس نے ہمایوں کو خبردار کر دیا کہ مالدیو غداری پر آمادہ ہے۔ جتنی جلد ہو سکے اس کی ولایت سے دور چلے جانا بہتر ہے۔

اطلاع مل چکی تھی لیکن شاید دیر سے ملی تھی۔ دوسری نماز کا وقت تھا کہ شور اٹھا، مالدیو آن پہنچا ہے۔ کوئی ایسا گھوڑا قریب نہیں تھا جس پر حمیدہ بانو کو سوار کیا جاسکتا۔ وہ حاملہ تھی لہٰذا اونٹ کی سواری اس کے لیے مناسب نہیں تھی۔ بادشاہ نے اپنا گھوڑا حمیدہ بانو کو دے دیا اور خود اونٹ پر سوار ہوئے۔ مختصر سی جماعت ساتھ تھی۔ ایک رہبر کو ساتھ لے لیا تھا کہ راستہ دکھائے۔ گرم ہوا چل رہی تھی گھوڑے اور دوسرے چوپائے گھنٹوں گھنٹوں تک ریت میں دھنسے جا رہے تھے اور مالدیو تعاقب میں تھا۔

مالدیو کا لشکر نزدیک آ گیا تھا۔ ہمایوں نے کچھ لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑا کہ وہ غنیم کا راستہ روکیں اور خود آگے بڑھ گئے۔ وہ لشکر جو پیچھے چھوڑ آئے تھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ تین دن ہو گئے تھے، گھوڑوں کو پانی میسر نہیں آیا تھا۔ ایک جگہ پانی میسر آیا۔ یہیں اس کے وہ ساتھی بھی مل گئے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ یہاں سے اس سفر کا پھر آغاز ہوا اور راستے کی اور بہت سی مشکلیں اٹھانے کے بعد یہ قافلہ عمر کوٹ پہنچ گیا۔

عمر کوٹ کا رانا ایسا بامروت نکلا کہ ہمایوں کے استقبال کے لیے خود باہر آیا اور ہمایوں کو قلعے کے اندر لے گیا۔ قلعے کے باہر شاہی فوج نے قیام کیا۔

چند روز کی مہمان داری کے بعد عمر کوٹ کے رانا نے

ہمایوں کو اعتماد میں لے کر حرف مطلب بیان کیا۔

''مہاراج (ہمایوں) آپ کا اور میرا دشمن مشترکہ ہے۔ شاہ حسین نے میرے باپ کو قتل کیا تھا۔ اب میں لشکر جمع کر کے اس سے بدلہ لینے جا رہا ہوں۔ آپ بھی اپنے آدمیوں کو لے کر میرے ساتھ چلیں۔''

ہمایوں نے شاہی حرم کو عمر کوٹ میں چھوڑا۔ ان میں حمیدہ بانو بیگم بھی تھیں جو حاملہ تھیں۔ حمیدہ بانو کے بھائی کو ان عورتوں کا نگراں مقرر کیا اور خود رانا کے ساتھ بھکر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ابھی وہ پندرہ بیس کوس پہنچا ہوگا کہ اس کا ایک معتوب جنگجو گھوڑا دوڑاتے ہوئے آ پہنچا۔ اس وقت ہمایوں دس ہزار فوج کے ساتھ ایک باغ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ تردی بیگ نے خوش خبری سنائی کہ حمیدہ بانو کے بطن سے اللہ نے اسے فرزند عطا کیا ہے۔

ہمایوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اسے وہ خواب یاد آ گیا جو اس نے عرصہ پہلے لاہور میں دیکھا تھا۔ اسے کسی بزرگ نے بشارت کی تھی کہ ہمایوں نئی شادی کرے گا۔ اس بیوی سے ایک فرزند پیدا ہوگا۔ اس کا نام جلال الدین اکبر رکھا جائے تو وہ ہندوستان پر حکومت کرے گا۔

اب جو فرزند پیدا ہوا تو ہمایوں کو یقین آ گیا کہ خواب سچا تھا۔ اسے یہ بھی یقین ہوگیا کہ بہت جلد ہندوستان اس کے قبضے میں ہوگا۔ اس نے بیٹے کا نام جلال الدین محمد اکبر رکھا۔

جب پرگنہ جون ہمایوں نے فتح کرلیا تو اہل حرم کو عمر کوٹ سے اپنے پاس بلوا لیا۔ ان میں نومولود اکبر بھی تھا جس کی عمر اس وقت چھ ماہ تھی۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ مشکلیں ٹل گئیں لیکن حوادث نے ابھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے امرا آپس میں لڑ پڑے اور ایک ایک کر کے الگ ہوتے رہے۔ جو لوگ اطراف سے آ کر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ کہا جاتا ہے صرف ستر آدمی اس کے گرد رہ گئے تھے۔ ان میں اس کے اہل وعیال بھی شامل تھے۔ ایسے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ معلوم ہوا بیرم خاں گجرات سے اس کی مدد کو آن پہنچا ہے۔

بیرم خاں مغلیہ خاندان کا پرانا نمک خوار تھا۔ مہد بابری میں وہ اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ مغلوں کا نمک خوار تھا۔ اس نے جو سنا کہ ہمایوں مشکل میں ہے تو وہ مدد کو آن پہنچا۔ بیرم خاں جس وقت آیا تھا جب ہمایوں تنہا رہ گیا تھا اور ایران کی طرف کوچ کا ارادہ کر چکا تھا۔ بیرم خاں نے بھی اس کے ساتھ چلنے کی ٹھانی تھی۔ ہمایوں نے شاہ حسین کے پاس آدمی بھیج کر دریا عبور کرنے کے لیے چند کشتیاں طلب کیں جو اس نے فوراً فراہم کر دیں۔ وہ تو خدا سے چاہتا تھا کہ یہ بلا کسی طرح ٹلے۔

نومولود اکبر کو ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس کو اس کی دایا کے سپرد کر کے خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا۔ صرف اکبر کی والدہ اور چند خادماؤں کو ساتھ لے کر دریا عبور کر گیا۔

شاہ حسین نے مرزا عسکری اور مرزا کامران کے پاس آدمی بھیجا اور اطلاع دی کہ ہمایوں قندھار چلا گیا ہے۔ بے مروت بھائیوں نے پہلے تو یہ کیا کہ لشکر گاہ پر حملہ کر کے ساز وسامان لوٹ لیا اور شہزادہ اکبر کو پہلے تو قلعہ قندھار میں لے جا کر رکھا۔ پھر کسی مصلحت کی بنا پر کابل کے قلعے میں پہنچا دیا۔ دوسری طرف مرزا کامران نے جو قندھار میں تھا، ہمایوں کا راستہ روکا۔ ہمایوں قندھار جانے کے بجائے ایران کی طرف چلا گیا۔

ہمایوں مراحل طے کرتے ہوئے خراسان کے گرم ترین علاقہ سیستان جا پہنچا اور بیرم خاں کو شاہ طہماسپ صفوی کی خدمت میں بھیجا۔ اسی کے ہاتھوں اپنے ہاتھ کا لکھا خط بھی روانہ کیا جس میں اپنے حالات کا تذکرہ کیا تھا اور یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس کی مدد سے قندھار پر قبضہ کرنے کا خواہاں ہے۔

ہمایوں کے حالات ہی ایسے تھے کہ شاہ ایران خط پڑھنے کے بعد آبدیدہ ہوگیا۔ اپنے امیروں کو متعین کر دیا اور حکم دیا کہ راستے میں ہر منزل پر کھانے پینے کی اشیا مہیا کی جائیں اور گانے بجانے والے بھی متعین کیے جائیں جیسا کہ بادشاہوں کے شایان شان ہے۔

بادشاہ نے اس کے مزاج کا ایسا خیال رکھا کہ جب وہ اس کا مہمان ہوا تو اس کی دل شکنی کے خیال سے کبھی اس شکست کا ذکر نہیں چھیڑا جو اسے افغانوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔ کبھی ہمایوں نے خود بھی تذکرہ کرنا چاہا تو اسے تسلی دے کر خاموش کر دیا۔

ایک روز اتفاق سے ذکر چھڑ گیا۔ ہمایوں نے بھی یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔ ''بھائیوں کی منافقت ہی کی وجہ سے دشمن اتنا طاقتور ہوگیا تھا۔''

شاہ طہماسپ، ہمایوں کی اس مختصر بیانی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کی امداد کے لیے دل وجان سے حاضر ہوگیا اور اسے تیس ہزار سواروں پر مشتمل ایک فوج مہیا کر دی۔ ہمایوں نے چلتے وقت عہد کیا کہ وہ فتح کے بعد قندھار، شاہ کے بیٹے شہزادہ مراد کی نذر کر دے گا۔

ہمایوں اس فوج کو لے کر روانہ ہوا اور راستے کے قلعوں کو فتح کرتے ہوئے قندھار پہنچ گیا۔ قندھار پر مرزا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عسکری قابض تھا۔ ہمایوں نے چھ مہینے کے محاصرے کے بعد اس کو شکست دی اور قلعے پر قبضہ کرلیا اور حسب معاہدہ قندھار شہزادہ محمد مراد کے آدمیوں کے سپرد کردیا۔

عرصۂ دراز کے بعد وہ کسی فتح سے دوچار ہوا تھا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اب اسے کابل فتح کرنا تھا۔ اس وقت اس کے عزائم ایسے تھے کہ پہاڑ کو چیونٹی سمجھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ شہزادہ مراد کے فوت ہوجانے کی خبر پہنچی۔

جس وقت یہ خبر پہنچی، اس وقت کچھ لوگ ہمایوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ کابل کے فتح ہونے تک اہل وعیال کو قلعۂ قندھار میں رکھا جائے۔ ہمایوں نے کچھ لوگوں کو قلعۂ قندھار کی طرف واپس بھیجا۔ قزلباش قلعہ دار نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اب قلعہ ہماری تحویل میں آچکا ہے۔ اس لیے اب ہم کسی کو بھی قلعے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

یہ بات ہمایوں کو بڑی ناگوار گزری۔ بیرم خاں اور دوسرے امرا نے فیصلہ کرلیا کہ ہر قیمت پر قندھار پر دوبارہ قبضہ کرلینا چاہیے۔

قندھار پر قبضے کی یہ تدبیر کی گئی کہ چند ہندوستانی اور مغل سپاہیوں کو اونٹوں پر گھاس اور جلانے کی لکڑیاں دے کر شہر میں پہنچا دیا۔ اسی طرح چند دن تک ہمایوں کے لشکری گھاس کے گٹھے لے کر شہر میں آتے جاتے رہے۔ ان گٹھوں میں ہتھیار تھے جو اندر پہنچتے رہے پھر ایک رات جب دربان اور محافظ غافل تھے، یہ سپاہی ہتھیار لے کر ان پر ٹوٹ پڑے اور قلعے کے دروازے کھول دیے قلعہ دار کو اس وقت خبر ملی جب سب کچھ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ لشکر قلعے کے قریب ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اشارہ پاتے ہی اندر داخل ہوگیا۔ قلعہ دار نے لڑائی کو بے سود جانا اور قلعے سے نکل کر عراق کی طرف بھاگ گیا۔

ہمایوں نے قندھار بیرم خاں کے سپرد کیا اور خود کابل کی طرف روانہ ہوگیا۔

جب ہمایوں کا لشکر کابل کے دروازوں پر پہنچا تو مرزا کامران اپنی جان بچا کر غزنی بھاگ گیا۔ ہمایوں فتح کے نقارے بجاتے ہوئے کابل میں داخل ہوا۔

مرزا عسکری، شہزادہ اکبر کو کابل لے آیا تھا۔ اس کی بیوی اس کی دیکھ بھال کررہی تھی۔ قلعے میں داخل ہوتے ہی اسے فتح کا یہ انعام ملا کہ بچھڑے ہوئے بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوگئیں۔ حمیدہ بیگم تو ماں تھیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کتنی زور سے لپٹا کر پیار کریں۔

مرزا عسکری کی بیوی سلطان بیگم قریب کھڑی اس ملاپ کو دیکھ رہی تھی۔

''بہن! تمہارا شکریہ کہ تم نے میرے بیٹے کو زندہ رکھا۔ اس کے بدلے میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں؟'' حمیدہ بانو نے کہا۔

''زندگی کا بدلہ زندگی ہوتی ہے۔ میرے شوہر کی زندگی بچا لو۔ اگر وہ اطاعت پر آمادہ ہوں تو ان کی جان بخشی کی جائے۔''

''بہن میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔''

حمیدہ بانو نے ہمایوں کو راضی کرلیا کہ اس احسان کے بدلے میں اپنے بھائی کو معاف کردے۔ مرزا عسکری نہایت شرمندگی کے ساتھ ہمایوں بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ گزشتہ باتوں کا مطلق ذکر نہیں ہوا۔ مغل قبائل کے سردار گردن میں تلوار لٹکا کر اور کفن ہاتھ میں لے کر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہمایوں نے فراخ دلی سے اسے معاف کردیا۔ اس احسان کا بدلہ اس نے یہ دیا کہ بدنیتی کو کام میں لایا اور موقع ملتے ہی فرار ہوگیا۔

مرزا کامران نے پہلے تو پٹھانوں کے پاس جا کر پناہ لی تھی مگر اسے وہاں سے بڑی بے آبروئی کے ساتھ نکلنا پڑا۔ وہ بھٹکتا چلا گیا اور کچھ دن اپنے چچازاد بھائی شاہ حسین کا مہمان رہا۔ یہیں اسے یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں بادشاہ بدخشاں کی طرف گیا ہوا ہے۔ اس نے لشکر فراہم کیا اور تیزی سے یلغار کرتے ہوئے کابل پہنچ گیا اور اندھیری رات میں قلعے کے نیچے جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔ جیسے ہی صبح کے وقت قلعے کے دروازے کھولے گئے۔ اس کا لشکر اچانک اندر داخل ہوگیا اور قبضہ کرکے چند امیروں کو قتل کردیا۔

یہ سن کر ہمایوں نے بدخشاں سے لوٹ کر دوبارہ کابل کا محاصرہ کرلیا اور چند دن کے اندر ہی کامران کو وہاں سے بے دخل کردیا مگر وہ بھی نچلا بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس نے تین مرتبہ کبھی تو مرزا عسکری کی مدد سے، کبھی دوسرے مرزاؤں سے ساز باز کرکے کابل پر قبضہ کرلیا۔ ہمایوں نے ہر مرتبہ اسے نکال باہر کیا اور بالآخر ہمایوں نے اسے اندھا کرکے کعبۃ اللہ بھجوا دیا۔

مرزا ہندال کے سر میں بھی خودسری کی ہوا بھری۔ اس نے ہمایوں کے لشکر پر شب خون مارا مگر جلد ہی گرفتار ہوکر آیا اور قتل کردیا گیا۔

مرزا کامران کا بھی حشر اچھا نہیں ہوا۔ وہ کعبۃ اللہ گیا ضرور لیکن جلد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔

☆☆☆

بنگال کے انتظام کے بعد شیر شاہ آگرہ آیا اور وہاں کا بندوبست کرنے کے بعد سکہ اور خطبہ اپنے نام جاری کیا اور مالوہ کی تسخیر کے ارادے سے گوالیار کا رخ کیا۔

شیر شاہ کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مالوہ اور مارواڑ کی فتوحات اس کا راستہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ بہترین منتظم اور نہایت دلیر تھا۔ اس نے نہ صرف ہمایوں کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا بلکہ ہمایوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستان پر پانچ سال تک نہایت کروفر سے حکومت کی لیکن اس کی وفات کے ساتھ ہی پٹھانوں میں پھوٹ پڑنے لگی۔ اس کا جانشین سلیم شاہ پھر بھی کچھ لائق بادشاہ تھا لیکن اس کے انتقال نے بغاوتوں کے دروازے کھول دیے۔

ہمایوں کے کانوں تک یہ خبریں برابر پہنچ رہی تھیں لیکن ابھی وہ ہندوستان پر حملے کے حق میں نہیں تھا بلکہ اس عرصے میں وہ دو مرتبہ بلخ، سیستان اور کشمیر پر فوج کشی کرکے مخالفوں کو نیچا دکھا کر کابل واپس آتا رہا تھا۔

سکندر شاہ سوری نے فتح وغلبہ کے بعد تمام سوری سرداروں کو جمع کیا اور ان سے مخاطب ہونے کے لیے یہ تقریر شروع کی۔

''اب میں صاف صاف یہ کہتا ہوں کہ میں سلطنت کے قابل نہیں ہوں۔ تم سے میری درخواست ہے کہ جس کو تم اس کا اہل جانتے ہو اسے تخت پر بٹھا دو۔ میں اس کا اطاعت گزار رہوں گا لیکن اچھی طرح یاد رکھو کہ اس نازک وقت میں جبکہ ہمایوں نے قزلباشوں کا ایک خوں خوار اور جرار لشکر لے کر اپنے ملک پر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے۔ کابل کو بھی فتح کرچکا ہے اور اپنے بھائیوں کی سرکوبی کرکے بہت جلد ہندوستان میں داخل ہونے والا ہے۔ ہم پٹھانوں میں لودھیوں اور سوریوں کی نزاع برپا ہے۔ یہ خاندانی جھگڑے اس ملک سے ہماری سلطنت کا قلع قمع کردیں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم غنیم کا مل کر مقابلہ کریں۔''

اس تقریر پر تمام پٹھان سرداروں نے اتفاق واتحاد کی قسمیں کھائیں اور اطاعت کے عہد وپیمان کرکے سکندر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا جو شیر شاہ کا چچازاد بھائی تھا۔

اس تقریر نے ابھی پر پرزے نکالے بھی نہیں تھے کہ ہمایوں کی ہندوستان آمد کی اطلاعات پہنچنے لگیں۔ ان اطلاعات نے اتفاق کی جگہ انتشار پھیلا دیا۔ اس وقت تک افغانی اقوام ٹکڑوں میں بٹ چکی تھیں۔ ہر قوم اپنی اپنی جاگیر میں خوش تھی۔ ممکن ہے سکندر شاہ انہیں آپس میں ملوا دیتا لیکن ہمایوں کے ہندوستان پہنچنے کی اطلاع نے ان سب کو اپنے اپنے دفاع میں مشغول کردیا۔ ہر طرف وہی افراتفری پھیلی ہوئی تھی جیسے کبھی شیر شاہ کی موجودگی سے مغل خائف رہا کرتے تھے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ اب افغانوں پر وہی وقت آپڑا تھا حالانکہ ابھی ہمایوں ہندوستان پہنچا نہیں تھا۔ صرف اس کی خبریں تھیں جو دہشت بن کر چھا رہی تھیں۔

☆☆☆

ہمایوں کابل میں تھا۔ ہندوستان پر حملے کا عزم کرچکا تھا لیکن ابھی سوار نہیں ہوا تھا۔ شکار کا موسم تھا اور وہ ہندوستان پر حملے میں الجھ کر اس موسم سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔

وہ مقتدر امرا کے ہمراہ شکار کے لیے سوار ہوا اور ازراہ تفنن فرمایا۔

''اس وقت تین آدمی یکے بعد دیگرے راستے میں ملیں، ان کے نام دریافت کرکے فال کا اندازہ کیا جائے، شاید اس فال سے اندازہ ہو کہ ہندوستان پر حملے کا نتیجہ کیا ہوگا؟''

قافلہ روانہ ہوا۔ پہلا شخص جو سامنے آیا، اس کا نام دریافت کیا گیا۔ اس نے جواب دیا، میرا نام دولت خواجہ ہے۔ ہمایوں نے اس کو بشارت سمجھا اور اس شخص کو انعام واکرام عطا کرکے جانے دیا۔ جب کچھ اور آگے بڑھے تو ایک اور دیہاتی ملا۔

''اے شخص، تیرا نام کیا ہے؟''

''میرا نام مراد خواجہ ہے۔''

''خوب ہو اگر تیسرا آدمی اپنا نام سعادت خواجہ بتائے۔'' ہمایوں نے کہا۔

جب کچھ اور راستہ طے ہوا تو ایک شخص دکھائی دیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس تیسرے آدمی نے اپنا نام سعادت خواجہ بتایا۔

اس عجیب وغریب واقعے پر ہمراہی تعجب کرنے لگے۔ سب کو یقین آگیا کہ امداد غیبی ہمارے ساتھ ہے، ہمیں ہندوستان میں ضرور فتح نصیب ہوگی۔

اس فال نیک کے بعد ہمایوں نے اپنی سلطنت واپس لینے کے لیے لشکر ترتیب دیا اور روانہ ہوگیا اور کہیں رکے بغیر پشاور جا کر قیام کیا۔ قندھار کا حاکم بیرم خاں حسب الحکم حاضر ہوا۔ شاہی لشکر دریائے سندھ سے گزرا۔ روہتاس کا حاکم تاتار خاں کاشی تھا۔ قلعہ مستحکم ہونے کے باوجود وہ مقابلے پر نہ ٹھہر سکا اور فرار ہوگیا۔ ہمایوں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے لاہور کی طرف متوجہ ہوا۔ لاہور کے افغان ہمایوں کے لشکر کی آمد کی خبر پا کر فرار ہوگئے۔ ہمایوں بغیر جنگ کیے شہر لاہور میں داخل ہوگیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمایوں اپنی قیام گاہ پر بیٹھا اس زمانے کو یاد کر رہا تھا جب وہ شیر شاہ سوری کے لشکر سے شکست کھا کر لٹا پٹا لاہور کی طرف بھاگا تھا۔ اس کے بھائیوں نے اس سے غداری کی تھی اور اسے لاہور سے بھی فرار ہونا پڑا تھا۔ اس کے بعد اس نے کیسی کیسی تکالیف اٹھائی تھیں۔ ایک ایک تکلیف کا ذائقہ اس کی زبان پر اب بھی موجود تھا۔ وہ اب بھی لاہور میں موجود ہے لیکن ایک فاتح کی حیثیت سے۔ اس وقت اس کے ساتھ صرف پندرہ ہزار سوار ہیں لیکن فتح اس کے قدم چوم رہی ہے۔ اب دلی دور نہیں۔ دہلی کا خیال آتے ہی کیسے کیسے مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ وہ ایک آہ سرد کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے ہراول دستے کے امرا جالندھر اور سرہند کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہمایوں بے چینی سے ان کی واپسی کا منتظر تھا۔ اگر انہیں ان محاذوں پر فتح مل جاتی ہے تو پھر دہلی کے دروازے مغلوں کے لیے کھلے ہوئے ملتے۔

افغانوں پر ہمایوں کی دہشت اس وقت کچھ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کوئی بھی مقابلے پر آنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ علاقے بھی بغیر جنگ کے مغل لشکریوں کے قبضے میں آ گئے۔

عسکر ہمایونی لاہور میں کیمپ لگائے بیٹھی تھیں کہ اطلاع ملی۔ سکندر شاہ کی طرف سے تاتار خاں اور ہیبت خاں چالیس ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے آ رہے ہیں۔

''بیرم خاں!'' ہمایوں کی آواز نے بیرم خاں کو حاضر کر دیا۔

''بیرم خاں شہنشاہ ہند کے حضور حاضر ہے۔''

''جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ سکندر شاہ کا لشکر مقابلے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ پیش خانہ لگایا جائے ہم خود مقابلے کے لیے روانہ ہوں گے۔''

''گستاخی معاف! حضرت کا مقابلے پر جانا مناسب نہیں۔''

''کیا تم نہیں جانتے کہ ہندوستان پر قدم رکھنے کے بعد یہ ہماری پہلی باقاعدہ جنگ ہوگی۔ اس میں فتح کتنی ضروری ہے۔''

''میری اطلاع کے مطابق سکندر شاہ اس لشکر کے ساتھ موجود نہیں۔ اس لیے آپ بھی یہ کام میرے سپرد کیجیے۔''

''اس جنگ میں فتح پر ہماری کامیابی کا دارومدار ہے۔''

''یہ غلام اس فتح کو یقینی بنائے گا۔''

بیرم خاں کی بہادری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ ہمایوں سیکڑوں مرتبہ اس کی وفاداری اور بہادری کا امتحان لے چکا تھا۔ اس کی درخواست پر ہمایوں لاہور میں ٹھہرا رہا اور اس مقابلے کے لیے بیرم خاں کو نامزد کر کے رخصت کیا۔

مغل امرا جالندھر میں جمع ہوئے۔ دشمنوں کی کثرت اور دوستوں کی کمی کے باوجود جنگ کرنا طے ہوا چنانچہ کوچ کر کے دریائے ستلج کو عبور کیا۔

افغان لشکر کو شام کے قریب ان لوگوں کے دریا عبور کرنے کی اطلاع پہنچی۔ سورج ڈوب رہا تھا کہ دونوں لشکر مقابل ہوئے۔ مغلوں نے تیر اندازی شروع کی تو افغانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے مغل تیر انداز دکھائی نہیں دیتے تھے۔ افغانوں نے روشنی کے حصول کے لیے قریب کے گاؤں کو آگ لگا دی۔ پھونس کے مکان شعلہ بن کر بھڑکے، میدان جنگ روشن ہو گیا۔ افغانوں کے لیے یہ ترکیب الٹی پڑ گئی۔ مغل تیر اندازوں کو نشانہ لینے میں جو دشواری پیش آ رہی تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ روشنی میں افغان بہ آسانی تیروں کا نشانہ بننے لگے۔

بیرم خاں کی بہادری نے تو پانسا ہی پلٹ دیا۔ اس نے اپنے امیروں کو بھی اطلاع نہیں دی۔ بس اپنے خاصہ کے سواروں کو لے کر وہ اچانک دشمن پر جا پڑا اور ایسا بھرپور حملہ کیا کہ دشمن کو شکست فاش ہوئی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

چغتائی لشکر کو اس معرکے میں ہاتھی گھوڑے اور بڑا مال و اسباب ہاتھ آیا۔

بیرم خاں لوٹ کر آیا تو ہمایوں نے بڑی قدر افزائی کی اور خان خاناں یار وفادار کا خطاب مرحمت کیا۔

سکندر شاہ کو جب اس شکست کی اطلاع ملی تو ہوش اڑ گئے۔ اس فتح کے نتیجے میں ہمایوں کو دہلی کے اردگرد کے کئی پرگنوں پر قبضہ حاصل ہو گیا تھا اور اب دہلی کا تخت ڈانوا ڈول ہو رہا تھا۔ سکندر شاہ نے پٹھانوں کے تمام قبائل کو یکجا کیا اور انہیں یہ باور کرایا کہ آپس کی نااتفاقی ہمایوں کے قدم جمانے میں معاون ثابت ہوگی۔ اس وقت ہمیں تمام اختلافات بھلا کر ہمایوں کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے۔

''دیکھ لو جب مغلوں میں پھوٹ پڑی تھی تو ہمایوں جیسا طاقتور بادشاہ گھاس پھوس کی طرح ہوا میں اڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی سلطنت چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ برسوں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرا۔ اب وہ پھر طوفان بن کر سامنے آیا ہے۔ اب تک مغل ہندوستان میں نظر نہیں آتے تھے اب وہ ایک مرتبہ پھر ہر طرف گھومیں پھریں گے اور ہمیں یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ اور دشمن کا مقابلہ کرو۔''

سکندر شاہ کے گرد 80 ہزار کا لشکر جمع ہو گیا۔ بے شمار ہاتھی اور لاتعداد توپیں اس کے علاوہ تھیں۔

ایک آندھی تھی جو لشکر کی صورت میں نمایاں ہوئی اور سرہند پہنچ کر رک گئی۔ اس نے لشکر کے چاروں طرف خندق کھدوائی اور قلعہ بنوایا۔ مغل امرا شہر میں شہر بند ہو گئے اور شہر کو مضبوط کر لیا۔

ہمایوں نے پہلے مرحلے میں شہزادہ اکبر کو جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، بیرم خاں کی اتالیقی میں سکندر شاہ کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ امرا نے اس انتظام کو ناکافی سمجھ کر بادشاہ کو بلانے کی درخواست لاہور بھیجی۔ بادشاہ جو، اب تک لاہور کے باہر کیمپ لگائے ہوئے تھا ایک عظیم لشکر لے کر سرہند روانہ ہوا۔

جب بادشاہ قریب آیا تو ہراول دستے کے امرا استقبال کے لیے حاضر خدمت ہوئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ صفیں آراستہ کی جائیں۔

افغانوں کی تعداد مغلوں سے کہیں زیادہ تھی لیکن ہمایوں کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔ اس نے ہراول دستے کو حملے کا حکم دیا۔ اس دستے کی نگرانی شہزادہ اکبر کر رہا تھا۔ کم سن شہزادہ ایک ہاتھی پر سوار تھا جس پر اس کے ملازمین حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھی کے برابر بیرم خاں کا ہاتھی تھا۔

کم سن شہزادے کو دیکھ کر کئی افغان سرداروں کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ اس پھول کو ہمایوں کیوں میدان میں لے آیا۔ اکبر کے دلاوروں نے حملہ کیا تو زبردست شجاعت دکھائی پھر عام جنگ چھڑ گئی۔

چند روز تک جنگ ہوتی رہی۔ طرفین کے بہادروں نے خوب داد مردانگی دی۔ لاشوں سے میدان پٹ گیا۔ پٹھان شکست کھا کر بھاگے اور بے شمار گرفتار ہوئے۔ سکندر شاہ فرار ہو کر لاہور کی طرف بھاگا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔

فتح مند فوج کا ایک دستہ سکندر کے تعاقب میں روانہ ہوا اور بادشاہ خود دہلی میں داخل ہوا۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ہمایوں بادشاہ کے نام کا خطبہ دوبارہ جاری ہوا۔ وہ لوگ جنہوں نے ہمایوں بادشاہ کی ہمراہی میں سختیاں برداشت کی تھیں ان پر خوب نوازشیں ہوئیں اور ہر ایک امیر کو ایک ولایت کا حاکم بنا دیا گیا۔

شاہ ابوالمعالی نے جو سکندر کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا، ان امرا کے ساتھ جو کمک کے لیے گئے تھے، اچھا سلوک نہیں کیا اور ان کی جاگیروں میں دخل اندازی کر کے خزانہ عامرہ پر بھی ہاتھ ڈالا۔ یہ شکایتیں برابر دربار تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ تعاقب میں ڈھیل دیکھ کر سکندر شاہ اپنی قوت میں روز بروز اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ منتشر پٹھان پھر اس کے گرد جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمایوں نے اس کے ازالے کے لیے بیرم خاں کو شہزادہ محمد اکبر کی اتالیقی پر مقرر کیا اور شہزادے کی ہمراہی میں سکندر کو دفع کرنے کے لیے مقرر فرمایا۔

ملک کا سارا نظم و نسق بگڑا ہوا تھا۔ ہمایوں نے از سر نو انتظامات کرائے۔ امیروں کو ان کے صوبوں کی طرف روانہ کیا۔

دہلی کے انتظامات نمٹ چکے تھے۔ اب وہ دہلی سے آگرہ جانا چاہتا تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ بادشاہ کی جانب سے حکم جاری ہوا کہ کل صبح کوچ کا نقارہ بجایا جائے۔

سورج غروب ہونے کا وقت نزدیک تھا۔ ہمایوں اس وقت بالاخانے پر ٹہل رہا تھا۔ جب احساس ہوا کہ اذان کا وقت قریب ہے تو اس نے نیچے اترنے کے لیے زینے پر قدم رکھا۔ ابھی دوسری سیڑھی پر تھا کہ موذن نے اذان شروع کر دی۔ وہ اذان کے احترام میں دوسری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ملازمین اس کے احترام میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اذان ختم ہوئی۔ ہمایوں نے اٹھنا چاہا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ زینے سے گر کر زمین پر آ گیا۔ ہر طرف کہرام مچ گیا، اہل مجلس نے کسی نہ کسی طرح اسے محل کے اندر تک پہنچایا۔ آنکھوں میں اندیشے، چہروں پر گھبراہٹ لیے اطبا حاضر ہو گئے۔ بے ہوش کو ہوش میں لانے کی تدابیر کی جانے لگیں۔

ایک امیر کو پنجاب کی طرف دوڑایا گیا کہ شہزادہ اکبر، سکندر شاہ کے دفع کے لیے پنجاب میں ٹھہرا تھا۔ ہمایوں کی حالت کبھی بگڑتی، کبھی سنبھل جاتی تھی۔ کبھی وہ ہوش میں آ جاتا تھا کبھی ضعف طاری ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حکم دیا کہ میرے بعد اکبر کو تخت پر بٹھا دینا اور میں بیرم خاں کو اس کا اتالیق مقرر کرتا ہوں۔ مملکت کے کام آسان نہیں ہوتے۔ جب تک اکبر ہوش کی عمر کو نہیں پہنچ جاتا، بیرم خاں کے احکامات کی تعمیل سب پر لازمی ہوگی۔ یہ اس کی آخری گفتگو تھی جو اس نے اپنے امیروں سے کی۔ اس کے بعد اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اکبر اس وقت لاہور کے قریب قصبہ کلانور میں تھا کہ اس کو باپ کی رحلت کی خبر ملی۔ امرائے دربار، ہمایوں کی وصیت کی بجاآوری کے لیے مستعد تھے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اکبر کا دہلی یا آگرہ تک پہنچنے کا انتظار نہ کیا جائے، اسے تخت شاہی پر بٹھا دیا گیا۔ اس وقت اکبر کی عمر تقریباً چودہ سال تھی۔

خان خاناں یار وفادار بیرم خان کے سلاطین چغتائی سے قدیم روابط تھے۔ سفر ایران میں آپ نے جس طرح ہمایوں کی رفاقت کا حق ادا کیا اور سائے کی طرح اس کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگا رہا۔ اس کی وفاداری کا تقاضا تھا کہ وہ مشکل کی اس گھڑی میں ڈوبتے ہوئے ہندوستان کو بچاتا۔ ہمایوں کی وصیت کے الفاظ اکبر کے کانوں تک پہنچ چکے تھے، اس نے بیرم خاں کو خان بابا کو لقب دیا اور وکالت اتالیقی اور سپہ سالاری کے عہدے تفویض کر کے سلطنت کے سارے اختیارات اس کے سپرد کر دیے۔ فرامین شاہی دہلی اور آگرہ کو روانہ کر دیے گئے۔

ہمایوں کو ہندوستان کا نظم و نسق دوبارہ سنبھالے ہوئے پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ دشمنوں کی پوری طرح سرکوبی نہیں ہو سکی تھی۔ مفسد زمینداروں نے ابھی تک اپنا سر نہیں جھکایا تھا۔ ہمایوں کے رخصت ہوتے ہی سارے ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو گیا۔ لودھی، سوری، نیازی، پٹھانوں کے الگ الگ جتھے تھے، جس کو جہاں موقع مل گیا اس نے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مغلوں کا تسلط پنجاب میں تو مضبوط تھا، باقی دوسرے مقامات پر نظم و نسق پوری طرح ان کے قابو میں نہیں تھا۔ جیسے ہی یہ نوعمر جانشیں (اکبر) تخت نشیں ہوا، ان طاقتوں نے مزید تیزی سے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

اور تو اور ہمایوں کے مقرب درباری ابو المعالی نے بغاوت کا ارادہ کر لیا۔ اکبر تو شاید اس سے بے خبر ہی رہتا لیکن بیرم خاں کو اس کی بروقت اطلاع مل گئی۔ ابو المعالی کو گرفتار کر لیا گیا لیکن وہ قید سے بھاگ نکلا بہر حال بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ تو گھر کی بغاوت تھی لیکن سکندر شاہ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا تھا۔ اس کی آزادی کسی وقت بھی مغلوں کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔

☆☆☆

شیر شاہ سوری کے جانشیں سلیم شاہ سوری کی وفات ہوئی تو اس کا بیٹا فیروز شاہ تخت پر بیٹھا لیکن تیسرے ہی دن اس کا ماموں مبارز خاں اپنے آدمیوں کو لے کر فیروز خاں کے قتل کا ارادہ کر کے محل میں گھس آیا۔

فیروز خاں کی ماں مبارز خاں کے قدموں میں گر پڑی اور اپنے بیٹے کی زندگی مانگنے لگی۔

''میرے بیٹے کی جان بخش دو۔ تخت پر قبضہ کر لو۔ میں اپنے بیٹے کو کسی دور دراز ملک میں لے کر چلی جاؤں گی یا پھر زندہ قید خانے میں ڈال دو۔''

مبارز خاں اس کا بھائی تھا لیکن ایسا سنگ دل کہ بہن کی باتیں بے اثر ہو گئیں۔ اس کے آنسو مبارز خاں کے قدموں میں گر کر سوکھ گئے۔ مبارز خاں نے فیروز خاں کو قتل کر دیا اور محمد شاہ عادل کے خطاب سے دہلی کے تخت پر بیٹھ گیا مگر دہلی کے عوام نے اس کے خطاب عادل کو بدل کر عدلی شاہ کر دیا کیونکہ عادل سے کسی بے گناہ کا خون بعید ہے۔ وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہمایوں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔

عدلی شاہ عیاش اور نفس پرست انسان تھا۔ وہ قاتل تو تھا، حاکم بننے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔ اس کے گرد بہت جلد ادنیٰ اور رذیل اشخاص جمع ہو گئے۔ انہی میں ایک شخص ہیمو نام کا تھا، یہ کوتوال تھا لیکن بہت جلد اتنا مقرب اور معتمد بن گیا کہ عدلی شاہ نے اسے اپنی سلطنت کا مدار المہام (وزیر) بنا دیا۔ سارا نظم و نسق اس بقال کے حوالے کر کے خود شاہد و شراب میں مشغول ہو گیا۔

اب ہیمو بقال کی بن آئی تھی یا پھر مسخروں اور بھانڈوں کے مزے آ گئے تھے۔ عدلی شاہ کی ان کمزوریوں نے اسے اپنے ہم قوموں میں بے وقار کر دیا تھا۔ مختلف طاقتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں جو اس سے اقتدار چھین لینا چاہتی تھیں۔ تاج خاں کرانی نہایت نامور امیر تھا۔ اس نے بغاوت کا اعلان کیا اور نقارہ بجاتے ہوئے بنگال اور چنار کی طرف کوچ کر گیا۔ عدلی شاہ نے اس کا تعاقب کیا اور اسے شکست دے کر بغاوت کو فرو کیا۔

عدلی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلیم شاہ کے بڑے بھائی عادل خاں کے سالے ابراہیم خاں نے ہتھیار سنبھالے اور آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا پھر اس نے آگرہ کی طرف پیش قدمی کی اور اکثر علاقوں پر قابض ہو گیا۔ اب تو عدلی شاہ کو اس کے مقابلے پر آنا پڑا۔ اس کا گماشتہ ہیمو خاں پیش پیش تھا۔

ابراہیم خاں نے جب دیکھا کہ جنگ میں اسے شکست بھی ہو سکتی ہے تو اس نے ایک چال چلی۔ عدلی شاہ کے پاس پیغام بھجوایا کہ وہ اپنے امیروں کو اس کے پاس بھیج دے۔ ''میں ان سے عہد و پیمان کی گفتگو کر کے خدمت شاہی میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

عدلی شاہ اس کی باتوں میں آ گیا اور اپنی حکومت کے اہم ترین ارکان کو ابراہیم خاں کے پاس بھیج دیا۔ ابراہیم خاں نے ان امیروں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

عدلی کے اہم ترین امرا ٹوٹ گئے تھے۔ ایک ہیمو بقال تھا جو اس کی وفاداری میں ڈٹا ہوا تھا۔ وہ اکیلا کیا کرتا۔ عدلی شاہ بھی کیا کرتا۔ وہ چنار کی طرف فرار ہو گیا اور ایک محدود علاقے پر اکتفا کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی۔

پنجاب کا حاکم احمد خاں سوری، ابراہیم خاں کی ان

کامیابیوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور سکندر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ اس نے دس ہزار سواروں کا لشکر ساتھ لیا اور لاہور سے آگرہ کی تسخیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ ابراہیم خاں نے بھی تیاری کی اور مقابلے پر آ گیا۔ سکندر شاہ نے مصالحت کا پیغام بھیجا کہ پنجاب پر اس کی حکومت رہنے دی جائے باقی علاقوں پر وہ حکومت کرے لیکن ابراہیم خاں نے اس کی یہ تجویز منظور نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ چھڑ گئی۔

سکندر شاہ نے مقابلے سے پہلے اپنے بادشاہی علم اور نشان دوسرے سرداروں کو دے کر انہیں غنیم کے مقابلے پر آگے بڑھا دیا اور خود ایک جانباز اور وفادار فوج لے کر ایک طرف گھات میں بیٹھ گیا۔

حسب توقع ایک سخت لڑائی کے بعد سلطان ابراہیم نے سکندر شاہ کے لشکر کو شکست دے دی۔ اس کے سپاہی مال و اسباب لوٹنے میں مصروف تھے کہ عین موقعے پر سکندر شاہ کمین گاہ سے اپنے بہادروں کو لے کر نکل آیا اور اچانک سلطان ابراہیم پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ ابراہیم خاں سنبھل ہی نہ سکا اور اسے ایک ناقابل یقین شکست ہو گئی۔ سکندر شاہ آگرہ پہنچا اور شیر شاہ سوری کی جانشینی کا حق ادا کرنے لگا۔ انہی دنوں ہمایوں کی ہندوستان آمد کی خبریں مشہور ہوئیں۔ سکندر شاہ سے ہمایوں کا مقابلہ ہوا اور سکندر شاہ شکست کھا کر فرار ہوا جس کی سرکوبی کے لیے ابھی تک کوششیں کی جا رہی تھیں۔

ہمایوں کی موت نے ہر طاقت کو آزاد کر دیا۔ عدلی شاہ کا گماشتہ ہیمو بقال بھی حرکت میں آیا اور آگرہ پر حملہ کر دیا اور کسی جنگ اور محاصرے کے بغیر ہی آگرہ پر قبضہ کر لیا کیونکہ آگرہ کا حاکم سکندر خاں ہیمو کی آمد کی خبریں سن کر ہی مقابلہ کیے بغیر قلعے سے نکل گیا تھا۔

جلال الدین اکبر، بیرم خاں کی اتالیقی میں حکومت سنبھال چکا تھا لیکن ہیمو بقال ہندوستان بھر میں دندناتا پھر رہا تھا۔ اس نے پہلے آگرہ پر قبضہ کیا اور اب دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ہمایوں نے تردی بیگ خاں کو دہلی کا حاکم مقرر کیا تھا۔ ہیمو کے آنے کی خبریں سن کر ایسا بدحواس ہوا کہ اکبر سے کمک بھیجنے کی درخواست کرنے کے بجائے مختصر سی فوج لے کر دہلی سے باہر آ گیا۔ ہیمو کے لشکر نے اسے تلواروں پر رکھ لیا۔ بری طرح شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

اگر وہ شہر میں محصور ہو کر شاہی کمک کا انتظار کرتا تو دہلی پر ہیمو کا قبضہ مشکل ہو جاتا۔ ہمایوں کے ایک اہم امیر نے ایک اہم موقع ضائع کر دیا۔

دہلی پر ہیمو کا قبضہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ اطراف و اکناف اسی کے اعمال اور کارپرداز مقرر ہو گئے۔ قصبہ ریواڑی کا ایک معمولی سا کوتوال عدلی شاہ کے دربار میں اتنا مقام و مرتبہ پا گیا کہ آج مغل لشکر سے ٹکر لیتا پھر رہا تھا۔ وہ جب آگرہ پر قابض ہوا تھا اس کے پاس پچاس ہزار سوار تھے اور دہلی فتح ہونے کے بعد اس کی رکاب میں فوج کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔

اس ٹڈی دل فوج کو لے کر وہ اکبر بادشاہ کے مقابلے کے لیے پنجاب کی طرف بڑھنے لگا۔ ہیمو کی ہیبت اتنی ہو گئی کہ اردگرد کے علاقے خود بخود خالی ہونے لگے۔ میرٹھ کا حاکم خان زماں جو بیرم خاں کا مقرب اور بڑا بہادر امیر تھا، میرٹھ چھوڑ کر چلا گیا۔ اکبر کے بڑے بڑے امرا اپنے علاقوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔

صرف یہ وحشت ناک خبریں ہی شاہی لشکر گاہ تک نہیں پہنچ رہی تھیں بلکہ بعض امیر بھی شکست کھا کھا کر پنجاب کی طرف آ رہے تھے۔

وہی موسم دوبارہ لوٹ آیا تھا جو ہمایوں بادشاہ کو آنکھیں دکھا چکا تھا۔ اکبر کے امیروں کے حوصلے گر گئے تھے اور سب کی رائے اور مصلحت یہ تھی کہ حسب دستور بادشاہ سلامت کابل چلے جائیں اور وہاں سے لشکر کی تیاری کر کے دوبارہ ہندوستان فتح کرنے کی مہم پر تشریف لائیں۔ صرف ایک بیرم خاں تھا جو وہیں ٹھہرنے اور مقابلہ کرنے کی رائے دے رہا تھا۔

تردی بیگ دہلی سے شکست کھا کر فرار ہوا اور بیرم خاں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت اکبر کلانور میں موجود نہیں تھا۔ ان خراب حالات کے باوجود اکبر ایسا بے خوف تھا کہ دل بہلانے کے لیے شکار پر نکل گیا تھا۔ تردی بیگ حاضر ہوا تو بیرم خاں نے اسے سامنے آنے کی اجازت نہیں دی اور بادشاہ کی مرضی معلوم کیے بغیر بے تامل حکم دیا۔ ''اس کی گردن مار دو۔''

اکبر واپس آیا اور اسے تردی بیگ کے قتل کی اطلاع ہوئی تو اس نے بیرم خاں کو طلب کیا۔

''خان بابا، اب آپ اتنے بااختیار ہو گئے کہ ہماری آمد کا انتظار تک نہیں کیا اور تردی بیگ جیسے امیر کے قتل کا حکم دے دیا۔''

''میں اس قصور اور جسارت پر عذر خواہ ہوں۔ حضور اس قصور کو اپنے حلم و عفو سے کام لے کر معاف فرما دیں کیونکہ میں نے یہ سزا صرف اس مصلحت سے دی کہ ان ہنگامی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشان کن حالات میں حکومت کا وقار سخت گیری اور سزاؤں ہی سے قائم رہتا ہے۔ میں نے اس کے قتل میں ملک اور بادشاہت کی بھلائی دیکھی تھی۔''

اکبر نے یہ سن کر بیرم خاں سے معانقہ کیا۔ ''آپ کی مرضی اور آپ کا اختیار۔ اپنے دل میں کسی اندیشے کو نہ آنے دیں اور حاسدوں کی نکتہ چینی کی فکر نہ کریں۔ ہم آپ کو اپنا مہربان چچا سمجھتے ہیں۔ سلطنت ہماری ضرور ہے مگر اس میں اختیارات ہمارے نہیں آپ ہی کے ہیں۔''

یہ قصہ اسی جگہ ختم ہوگیا لیکن خان خاناں کی اس خود مختارانہ جرات نے دربار کے امیروں، مقربوں اور خاص طور سے ماہم آغا کے دل میں جو بادشاہ کی انا اور کھلائی تھی، حسد کا بیج بو دیا۔ بیرم خاں کو اس کا خمیازہ بہت بعد میں جا کر بھگتنا پڑا۔

قتل کی اس سزا کے خاطر خواہ نتائج نکلے۔ ہندوستانی اور چغتائی امیر سہم گئے اور لشکر کا نظم و نسق ایک دم سے ٹھیک ہوگیا۔ بغاوت کے ارادے جہاں جہاں ہو رہے تھے، دم توڑ گئے۔

بیرم خاں کی صلاح کے مطابق اکبر نے طے کرلیا کہ ہیمو بقال کے مقابلے پر نکلا جائے گا۔ اس نے خواجہ خضر خاں کو سکندر شاہ کے دفع کے لیے چھوڑا اور خود اپنے لشکر کو لے کر ہیمو کے مقابلے پر بڑھا۔

ہیمو بھی دہلی کو فتح کرنے کے بعد ایک لاکھ سوار، ڈیڑھ ہزار ہاتھی لے کر پنجاب پر فوج کشی کی فکر میں تھا کہ اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی۔ اس نے جھٹ بیس ہزار سواروں کا ایک ہراول اکبری فوج کا راستہ روکنے کے لیے روانہ کیا۔ اکبر کا ہراول بیرم خاں کی سپہ سالاری میں روانہ ہوا تھا۔ دونوں ہراول فوجوں کا مقابلہ پانی پت کے میدان میں ہوا۔ ایک خونریز معرکے کے بعد پٹھان شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہیمول کو اس شکست کی خبر ملی تو اس کے پیٹے چھوٹ گئے۔ وہ تو دہلی میں راجا بکرماجیت بنا بیٹھا تھا۔ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا لیکن طوفان بن کر انھ کھڑا ہوا۔ اب وہ خود جنگ کے لیے نکلا۔ اس کی فوج کے آگے پانچ سو منتخب اور لڑاکا ہاتھی تھے۔ ان کے پیچھے توپ خانہ تھا۔ توپ خانے کے عقب میں جہاں تک نظر جاتی تھی زرہ پوش لشکریوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

دونوں فوجوں کا ٹکرانا تھا کہ میدان کارزار میں ہنگامۂ حشر برپا ہوگیا۔ بہادر گھوڑے بڑھا بڑھا کر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔

ہیمو نے ان ہاتھیوں سے جو اس کے پاس تھے شاہی فوج پر حملہ کر دیا۔ متواتر حملوں سے آخر کار شاہی فوج میں بدنظمی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ چغتائی لشکر پر غنیم کا پلہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ ہیمول پٹھانوں کی ایک جماعت لے کر فوج کے آگے نکل آیا کہ مغلوں کے قلب پر یکبارگی حملہ کر دے۔ مغلوں کی فوج میں شور و غل برپا ہوگیا۔ قریب تھا کہ شکست مقدر بنتی کہ قسمت نے یاوری کی۔ تیموری لشکر کے کسی تیرانداز نے اس طرح تیر جوڑ کر کمان سے چھوڑا کہ وہ سیدھا ہیمو کی آنکھ میں آ کر لگا۔ بس پھر کیا تھا اس کے گرتے ہی تمام پٹھان، راجپوت اور میواتی سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہیمو زخمی حالت میں تھا۔ خان خاناں بیرم خاں نے ہیمو کو دست بستہ لا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور درخواست کی کہ اس کافر کی گردن حضور خود اپنے ہاتھ سے ازادیں مگر اکبر نے انکار کیا۔ بعد میں بیرم خاں نے خود اپنے ہاتھ سے اسے قتل کیا۔ حکم شاہی ہوا کہ اس کا سر کابل بھیج دیا جائے اور اس کے جسم کو دہلی کے دروازے پر لٹکا دیا جائے۔

دوسرے دن شاہی لشکر نے پانی پت سے روانگی کی اور دہلی تک کسی جگہ قیام نہیں کیا۔

اکبر دہلی کے نظم و نسق میں مشغول تھا کہ سکندر شاہ نے پنجاب میں اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور اکبر کے نمائندے خضر خواجہ خاں پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں خضر خواجہ کو شکست ہوئی۔

اکبر پانی پت کی لڑائی کے بعد ابھی دہلی میں مقیم تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی کہ خضر خواجہ شکست کھا کر لاہور چلا آیا ہے۔ اکبر نے یہ سنتے ہی پٹھانوں کی گوشمالی کے لیے لاہور کی طرف کوچ کیا۔ جب وہ جالندھر پہنچا تو سکندر سوالک کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ شاہی لشکر نے اس کا تعاقب کیا۔ سکندر بھاگتا پھر رہا تھا اور شاہی فوجیں اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔

جب امرا یغار کرتے ہوئے سکندر کی فوج کے پاس پہنچے تو سکندر قلعہ مانکوٹ میں قلعہ بند ہوگیا اور شاہی لشکر قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ اس قلعے کو مرکز بنا کر درمیان میں لے لیا اور لوگ قلعہ گیری کے لوازم میں مشغول ہوگئے۔

اکبر کی فوجوں کو محاصرہ کیے چھ ماہ ہوگئے تھے۔ دونوں طرف سے بہ کثرت آدمی مارے جا چکے تھے اور زخمی ہوئے تھے۔

جب قلعے کی رسد اور ذخیرہ ختم ہوگیا تو سکندر شاہ اطاعت پر مجبور ہوگیا۔ اس نے پیغام بھیجا کہ کسی شاہی معتمد کو قلعے کے اندر بھیج دیا جائے تاکہ میں اس سے اظہار مدعا کروں اور صلح کی شرائط طے کرلوں۔ اکبر نے اتکہ خان نامی ایک امیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو قلعے کے اندر بھیج دیا۔ جب اتکہ خاں قلعے کے اندر پہنچا تو سکندر نہایت عاجزی سے پیش آیا۔

''میں نے چونکہ بہت گستاخی کی ہے لہٰذا میں اس قابل نہیں ہوں کہ منہ دکھا سکوں۔ اگر حسب الحکم اس شرط کے ساتھ کہ کسی وقت بھی اطاعت سے باہر نہیں ہوں گا کچھ عرصے کے لیے بنگالہ چلا جاؤں اور اپنے لڑکے کو خدمت کے لیے روانہ کردوں تو عین نوازش ہوگی۔''

اتکہ خاں نے سکندر شاہ کی معروضات بیرم خاں کے گوش گزار کیں اور اس نے یہ معروضات بادشاہ کے حضور میں اس طرح پیش کیں کہ بادشاہ نے انہیں قبول کرلیا۔

سکندر شاہ نے اپنے لڑکے عبدالرحمن کو چند ہاتھی اور کچھ دوسرے تحائف دے کر اکبر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور بادشاہ کے آدمیوں کو قلعہ سپرد کر کے خود باہر نکل آیا اور بنگالہ کی طرف رخصت ہوگیا۔

ہیمو تو قتل ہو ہی چکا تھا اس کا آقا سلطان عادل شاہ بھی مارا گیا۔ سکندر شاہ نے جان بخشی کرائی اور بنگالہ چلا گیا۔ ہمایوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اکبر کے پہلے سال میں وہ تکمیل کو پہنچا۔ افغانوں کی حکومت ختم ہوئی، اکبر کی عظمت و دولت کا ستارہ جانب عروج گامزن ہوا۔

بیرم خاں کو وہ خان بابا کے لقب سے یاد کرتا تھا۔ اکبر کی تمام کامیابیاں بیرم خاں کی مرہون منت تھیں۔ یہی وہ اسباب تھے جنہوں نے بیرم خاں کے حاسد کثرت سے پیدا کردیے۔ قدم قدم پر اس کی مخالفتیں کی جانے لگیں۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ کوئی اس کے سامنے آکر اس کی مخالفت کرتا۔ اس لیے سازشوں نے زور باندھا۔ دونوں طرف غلط فہمیاں زور پکڑنے لگیں۔

یہ غلط فہمیاں اس حد تک پہنچیں کہ ایک مرتبہ بیرم خاں نے بادشاہ کا دل صاف کرنے کے لیے قرآن کو بطور گواہ اپنے دو معتمد افسروں کے ساتھ خدمت میں بھیجا اور زبانی بھی پیغام دیا کہ جو بات حضور کے گوش گزار کی گئی ہے وہ قطعاً میرے دل میں نہیں ہے۔ اس کا مجھے کوئی خیال تک نہیں آیا ہے۔''

اس معذرت کے باوجود بادشاہ کو یقین نہیں آیا اور خاں خاناں کی معذرت قبول نہیں کی گئی بلکہ اس کا خط لانے والوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔

بیرم خاں جیسے وفادار امیر کو بدخواہوں نے اس حال کو پہنچا دیا کہ اس کی رسوائی اور بدنامی کی خبریں پر لگا کر اڑنے لگیں اور اپنوں اور بیگانوں نے اس معاملے کو خوب اچھالا۔

بادشاہ کی نظریں پھریں تو دوست بھی دشمن بن بیٹھے اور خان خاناں کا اقبال مائل بہ زوال ہوگیا۔

بیرم خاں اب بھی اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بادشاہ کے دل کی کدورت کو دور کیا جائے۔ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس نے مالوہ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا۔ دوسروں سے کوئی مدد نہیں لی۔ صرف اپنی فوج اور خرچ پر بادشاہ سے اجازت لے کر مالوہ پر حملہ کردیا۔ بادشاہ کو بیرم خاں کی بہادری پر اعتماد تھا اور امید کر رہا تھا کہ بیرم خاں کو کامیابی نصیب ہوگی لیکن یہ مہم ناکام ہوگئی۔

دبے دبے لفظوں میں یہ خبریں مشہور ہو رہی تھیں کہ بیرم خاں نے جان بوجھ کر اس مہم کو ناکام بنایا ہے۔

مالوہ کی ناکامی کے بعد بیرم خاں نے ملک شرقی اور بنگالہ کی تسخیر کا عزم کیا لیکن امیروں کی مخالفتوں کے سبب، باوجود کامل سعی و جہد کے کوئی نتیجہ نہ نکلا بلکہ الٹا یہ بدنامی گلے پڑی کہ بیرم خاں جس مہم پر بھی جاتا ہے عمداً سرکار کے کام کو خراب کردیتا ہے۔ خود بادشاہ کو یقین ہونے لگا تھا کہ بیرم خاں جان بوجھ کر کچھ کاموں کو خراب کر رہا ہے۔ بیرم خاں کو بھی یقین ہوگیا کہ اس کے مخالف کانٹے بچھانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ سازشیں اپنا کام دکھانے لگی ہیں۔ اس نے حج بیت اللہ کا عزم کرلیا اور بادشاہ سے اجازت طلب کی۔ اکبر بھی جیسے اس سے جان چھڑانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ بیرم خاں کو عجیب و غریب جواب لکھ بھیجا۔

''ہم نے ابتدا میں اپنی کم عمری اور سیر و شکار کے شوق اور ناتجربہ کاری کی بنا پر خان بابا کو تمام امور سلطنت سپرد کر دیے تھے۔ اب ہم رعیت اور سلطنت کے معاملات کو خود سرانجام دینا چاہتے ہیں۔ تم نے حج کا احرام باندھ لیا ہے اس لیے اب تم کو علائق دنیا سے دست کش ہوجانا چاہیے۔''

بیرم خاں کو یہ پیغام ملا تو اس نے تعمیل حکم کی۔ امارت و تجمل کا جو سامان اس کے پاس تھا، بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور خود بیت اللہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

دشمنوں کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر منزل پر اسے پریشان کرنے والے موجود تھے۔ دشمنوں نے سازش تیار کرلی تھی۔ یہ خبریں بھی پھیلا دی گئی تھیں کہ مخالفوں نے اس کو راستے ہی میں ہلاک کرا دینے کی سازش کر رکھی ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس کے اکثر ہمراہی اس کی رفاقت ترک کر کے قافلے سے نکل گئے۔

دراصل بیرم خاں کا مقام و مرتبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ بعض امرا کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔ بہت

سے مفسد یہ چاہتے تھے کہ اسے راستے سے ہٹا دیں۔ بادشاہ کی نگاہ بدلی تو مفسدوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔

وہ حج کو نکلا اور سازشیں سامنے آنے لگیں تو وہ فکرمند ہونے لگا۔ دارالخلافہ سے تیس کوس پر گیا تھا کہ حج کا ارادہ ترک کیا اور راستے سے لوٹ آیا۔ یہ بات اس کی مزید بدنامی کا سبب بنی کہ دیکھو، دنیا کی محبت میں حج بیت اللہ کا ارادہ فسخ کردیا۔

بادشاہ کی ناراضی اب کھل کر سامنے آنے لگی تھی۔ وہ لوگ جنہیں بیرم خاں ناپسند کرتا تھا، دربار میں واپس بلائے جانے لگے۔ انہی میں بیرم خاں کا ایک کٹر مخالف ملا پیر محمد بھی تھا۔ اکبر نے بیرم کی مراجعت کی خبر سن کر اسی پیر محمد کو دوسرے امیروں کے ساتھ بیرم کی سرکوبی کے لیے مامور کر دیا۔

بیرم خاں دوبارہ حج بیت اللہ کا ارادہ کر چکا تھا لیکن جب اسے ملا پیر محمد کی تعیناتی کی اطلاع ملی تو وہ اپنی جان و آبرو کی حفاظت کے لیے جمعیت فراہم کرنے اور مقابلے کی تیاریاں کرنے پر مجبور ہوگیا۔

ملا پیر محمد نے اکبر کو (سرہند پہنچ کر) لکھا کہ بیرم خاں بغاوت پر آمادہ ہے۔ حج کا سفر تو ایک بہانہ ہے۔ اس سفر کے بہانے وہ پنجاب پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

اکبر کو یقین آگیا کہ جسے وہ خان بابا کے لقب سے یاد کرتا رہا ہے وہ اس کے تاج و تخت پر قبضے کا خواہاں ہے۔ وہ اور بھی چراغ پا ہوگیا۔ اس نے پیر محمد کو لکھا کہ بیرم خاں کا سر کاٹ کر میرے قدموں میں ڈالنے کا اہتمام کرو۔

اکبر یہ احکام دے چکا تھا کہ بیرم خاں کا خط پہنچا۔

''میرا خاندان تین پشتوں سے خانوادۂ عالیہ کا خدمت گزار رہا ہے لیکن میری ان موروثی دیرینہ خدمات کو حاسدوں اور دشمنوں نے اپنی سخن سازیوں سے پامال کردیا ہے اور مجھے حضور والا کا نمک حرام ٹھہرا دیا ہے۔ لہٰذا میں چند رفیقوں کے ہمراہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ اسے میری بغاوت پر محمول نہ کیا جائے چونکہ میں نے حج کا ارادہ کرلیا ہے اس لیے خدمت والا میں حاضری کو اب میں کفر سمجھتا ہوں۔

اگر حضور والا مجھے نمک حراموں کے ذیل میں رکھ کر واجب القتل سمجھتے ہیں تو میری ایک درخواست ہے کہ آپ کسی ایک اپنے بے نام و نشان غلام کو مقرر کر کے بھیج دیں کہ وہ بیرم کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ متعینہ فوج کی سرداری سے ملا پیر محمد کو جو میرا پروردہ نمک حرام اور برطرف کردہ ہے واپس بلا لیں اور اس کی جگہ کسی بھی دوسرے ملازم کا تقرر فرما دیں۔''

اس عرض داشت نے اکبر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اس پر رقت طاری ہوگئی۔ اس نے فوراً پیر محمد کو واپس بلا لیا اور اس کی جگہ شمس الدین خاں کو لاہور پر حاکم مقرر کر کے روانہ کیا۔

شمس الدین خاں رخصت کی اجازت لینے حاضر ہوا تو خلوت دیکھ کر اکبر نے اس کے گوش گزار کردیا۔

''اگر بیرم خاں سے بغاوت یا نافرمانی ظاہر ہو تو اس کا سدباب تمہارے ذمے رہے گا۔''

بیرم خاں مطمئن تھا کہ بادشاہ نے اس کی فریادسنی اور ملا پیر محمد کو جو اس کا دشمن خاص تھا واپس بلا لیا اور شمس الدین خاں کی تقرری عمل میں آگئی لیکن سیاہ بختی ایسی زوروں پر تھی کہ دوست کو دشمن بنتے دیر نہیں لگ رہی تھی اور جو دشمن تھے وہ اپنا کام برابر دکھائے جا رہے تھے۔ شمس الدین خاں بھی دربار کے مقتدر لوگوں کے دباؤ میں آگیا اور بیرم خاں کے ساتھ پرخاش رکھنے لگا۔ آخر کار یہ کشمکش اس انجام پر پہنچی کہ بیرم خاں کی جمعیت کا شمس الدین خاں کی فوج سے مقابلہ ہوگیا۔

بیرم خاں کی دلاوری سے انکار کسے تھا۔ معمولی سے معرکے کے بعد اس نے شمس الدین خاں کی فوج کو بری طرح شکست سے دوچار کردیا۔

اس شکست کی خبر جب اکبر تک پہنچی تو وہ خود لاہور کے ارادے سے روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بیرم خاں فتح یاب ہونے کے باوجود مزید مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بظاہر پسپا ہو کر لکھی جنگل کی طرف چلا گیا۔ اس جنگل کے ساتھ ہی پہاڑی سلسلہ تھا۔

شاہی فوج کوہستان میں داخل ہوئی تو وہاں کے سارے زمیندار بیرم خاں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بیرم خاں زمینداروں کی طاقت سے بھی واقف تھا اور شاہی فوج سے بھی۔ اس کا تجربہ کہتا تھا کہ اطاعت کے سوا جو بھی صورت اختیار کی جائے گی وبال کا باعث ہوگی۔ اس نے ان زمینداروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

''میری خاطر آپ لوگ خود کو کیوں مصیبت میں ڈالتے ہیں؟''

بیرم خاں نے اپنے دونوں ہاتھ بندھوائے اور امان طلب کرتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔

بیرم خاں نے روئے عجز زمین نیاز پر رکھ کر معافی کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''یہ مقام سہس لنگ کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی زبان میں ''سہس'' ہزار کو کہتے ہیں۔ اس تالاب کے گرد ایک ہزار بت خانے ہیں۔ اس لیے یہ اسی نام سے مشہور ہے۔''

بیرم خاں اس مقام کی اس تعریف پر بہت خوش ہوا اور اس تالاب کی سیر کے لیے ایک کشتی کرائے پر لے لی، کنارے کنارے بت خانوں کی سیر کرتا رہا۔

ایک افغان باشندہ اسی وقت سے پوشیدہ طور پر اس کے ساتھ تھا جب سے بیرم خاں اپنی قیام گاہ سے روانہ ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک پتھر کے پیچھے بیٹھا بیرم خاں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ بیرم خاں کی کشتی کنارے کی طرف آنے لگی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

بیرم خاں کشتی سے اترا اور اپنی منزل کا رخ کیا۔ وہ افغان پتھر کے پیچھے سے نکلا اور بیرم خاں کے پیچھے ہولیا، اس نے بیرم خاں کو مخاطب کیا۔

''میرا خیال ہے آپ بیرم خاں خان خاناں ہیں؟''

''تم نے بالکل صحیح پہچانا۔''

''آپ سے ملنے کا مجھے بڑا اشتیاق تھا۔'' یہ کہہ کر وہ افغان سامنے آیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے وقت خنجر نکالا اور بیرم خاں کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ اس وقت صرف زخمی ہوا تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر کچھ ملاح اس کی طرف دوڑ پڑے اور اسے اٹھا کر اس کے خیمے تک لائے جہاں بیرم خاں نے دم توڑ دیا۔

مرتے وقت بیرم خاں کی زبان پر یہ کلمہ تھا۔ ''صد شکر کہ میں اپنے ولی نعمت کی راہ میں بیت اللہ کا سفر کرتے ہوئے شہید ہو رہا ہوں۔''

بیرم خاں کا چار سالہ بیٹا، بیوی سلیمہ سلطان بیگم اور دوسرے متعلقین احمد آباد لوٹ آئے۔ وہاں کے حاکم نے بدرقہ کی حفاظت میں ان کو بادشاہ کے حضور پہنچا دیا۔

بیرم خاں کی موت کے ساتھ ہی اکبر کا عہد خود اختیاری شروع ہوا۔

بابر نے ہندوستان فتح کیا۔

ہمایوں نے قبضہ کیا۔

اکبر نے سلطنت قائم کی۔

☆☆☆

درخواست کی۔ اکبر کو بھی اس کی دیرینہ خدمات یاد آئیں۔ باپ (ہمایوں) کا خیال آیا جس کو مصائب سے نکالنے والا یہی مرد میدان تھا جو اس وقت زمین پر سر رکھے ہوئے تھا اور معافی کا طلب گار تھا۔

اکبر نے مراحم خسروانہ سے اس پر نوازش کی۔ خلعت خاص عنایت کی اور دو روز کے بعد حرمین شریفین جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

''ہمارے ذمے تمہارے موروثی حقوق ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ دوبارہ ملازمت میں آنے کا ہے تو ہم کالپی اور چندیری کی جاگیریں عطا کرتے ہیں۔'' اکبر بادشاہ نے بیرم خاں کو پیشکش کی۔ ''اور اگر حضور میں رہنا چاہو تو ہم کسی بھی وقت تمہاری طرف سے غفلت نہیں برتیں گے اور تمہارے غم خوار و نگراں رہیں گے اور اگر تم بیت اللہ جانا چاہو تو تم کو عزت و آبرو کے ساتھ روانہ کر دیں گے۔''

بیرم خاں نے جواب دیا۔ ''انسان کی جو بڑی آرزو ہوسکتی ہے وہ فردوس مکانی (بابر) جنت آشیانی (ہمایوں) اور حضور والا (اکبر) کی رکاب میں بندے کو حاصل ہو چکی۔ اب تو میرے دل میں بس یہ مراد تھی کہ قدم بوسی کی تجدید کر کے اپنے قصوروں کو معاف کروا لوں اور کعبۃ اللہ جانے کی اجازت حاصل کر لوں جو آپ فرما چکے۔''

''خان بابا، ہم آپ کو روکنے کے حق میں ضرور ہیں لیکن آپ کی خواہش کا احترام بھی ضروری ہے۔''

اکبر نے اسے پچاس ہزار روپے سفر خرچ کے لیے دیے اور سفر کے لوازمات مہیا کر کے اسے رخصت کیا۔ بیرم خاں نے اپنے متعلقین کے ہمراہ گجرات کا راستہ لیا اور چل پڑا۔ جب وہ پٹن گجرات پہنچا تو یہاں اس نے چند روز قیام کیا۔ اس قیام کے دوران میں وہ اپنا اکثر وقت سیر و تفریح میں گزار رہا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ساتھیوں کے بغیر اکیلا ہی نکل جاتا۔ دور تک اور دیر تک گھومتا پھرتا رہتا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور کوئی ہتھیار بھی ساتھ نہیں تھا۔ وہ ایک تالاب کے پاس گیا جو پٹن (گجرات) کے باہر واقع تھا۔

''بھائی اس تالاب کا نام کیا ہے؟'' بیرم خاں نے ایک آدمی سے پوچھا۔

ماخذات: طبقات اکبری (جلد دوم) ترجمہ ایوب قادری، شیر شاہ سوری۔ کالنکا رنجن قانون گو، ہمایوں نامہ ترجمہ رشید اختر ندوی، منتخب اللباب، خافی خان

مددگار

کاشف زبیر

جب ہجوم میں چلتے چلتے اچانک تنہائی اپنے حصار میں لے لے تو یقینا کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔ بعض چہروں کے پیچھے اتنے چہرے ہوتے ہیں کہ اصل چہرہ دور کہیں رہ جاتا ہے۔ اس من موہنی صورت نے بھی جب اپنا اصل چہرہ دکھایا تو دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

دامن بچا کر گزرنے والوں کی عجیب روداد

ایرک مورگن کو دنیا میں دو چیزوں سے شدید نفرت تھی۔ ایک برف سے اور دوسرے اپنے سوتیلے باپ سے لیکن بدقسمتی سے وہ تیرہ سال کی عمر میں انہیں بہت زیادہ دیکھ چکا تھا۔ وہ کینیڈا میں جنوب مغربی علاقے میں رہتے تھے۔ بوشر ایرک کی ماں کی زندگی میں اس وقت آیا جب ایرک صرف تین سال کا تھا۔ بوشر ایک لکڑہارا تھا اور روزگار کی تلاش میں اکثر سفر کرتا رہتا تھا۔ جب کسی ایک علاقے میں جنگل کٹائی کا کام ختم ہونے لگتا تو وہ کسی دوسرے علاقے کی طرف نکل جاتا۔ ایرک نے ان دس سالوں میں کوئی نصف درجن جگہوں پر وقت گزارا تھا لیکن اسے ہر جگہ برف اور اپنے سوتیلے باپ بوشر کو دیکھنا پڑتا تھا۔ اس پورے خطے میں سال کے سات مہینے برف جمی رہتی تھی۔

چند دن پہلے دو ایک چھوٹے سے قصبے، اسنو لائن میں منتقل ہوئے تھے۔ بوشر کو یہاں ایک ٹمبر کمپنی میں ملازمت مل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئی تھی۔ اس نے پہلے دو بیڈ روم کا ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ لیا اور پھر ایرک اور لیانا کو لے آیا۔ اپریل کا آخری ہفتہ تھا اور یہاں ہر طرف برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ لیانا نے سب سے پہلے ایرک کو مقامی اسکول میں داخل کرایا کیونکہ اسکول سیشن ابھی جاری تھا۔ یکساں اسکول سسٹم کی وجہ سے اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ مگر اسے اسکول زیادہ اچھا نہیں لگا کیونکہ بچے اسے تنگ کرتے تھے۔

ایرک بزدل نہیں تھا، بس اس کے اندر کسی کو جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ یہ عادت اسے بوشر نے ڈالی تھی جو بچپن سے اس کے صبر اور ضبط کا امتحان لیتا آیا تھا۔ وہ ایک اذیت پسند اور انتہائی چالاک تھا۔ بوشر نے جان لیا تھا کہ ایرک کو برف سے نفرت ہے۔ وہ اسے جان بوجھ کر برف میں لے جاتا اور بہ ظاہر کھیلنے کے بہانے اسے گھنٹوں برف میں رکھتا۔ ایرک یہ بات سمجھتا تھا لیکن وہ بوشر کو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ لیانا اس خوش فہمی کا شکار تھی کہ بوشر اس کے بیٹے سے کتنا پیار کرتا ہے اور اس کا کتنا خیال رکھتا ہے۔

نئی جگہ پر لوگوں سے گھلنے ملنے اور تعلقات بنانے کے لیے بوشر اور لیانا اکثر مقامی کلب اور مسٹر جیمس کے گھر جمنے والی محفلوں میں شرکت کرنے جاتے تھے۔ جہاں سے ان کی واپسی رات گئے ہوتی تھی اور اس دوران میں ایرک کو گھر میں اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا لیکن اس کے باوجود گھر میں اکیلے رہنا اسے پسند نہیں تھا۔ برف کی وجہ سے وہ گھر سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس رات بھی بوشر اور لیانا باہر تھے۔ ایرک گھر میں اکیلا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ان کا اپارٹمنٹ تیسری منزل پر تھا اور یہ قصبے کا وسطی حصہ تھا جہاں سے جھیل کچھ فاصلے پر تھی اور برج کے اوپر سے ٹرین گزرنے کا راستہ تھا۔ سامنے بڑا سا میدان تھا جس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے وغیرہ لگے تھے۔ میدان کے پاس قطار میں اونچے اور سیدھے تنے والے درخت تھے۔ ایرک درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک اسے لگا جیسے ایک درخت سے کسی نے چھلانگ لگائی اور دوسرے درخت کے تنے سے چمٹ گیا۔ اس کا انداز بندروں والا تھا۔ ایرک حیران ہوا، اسے معلوم تھا یہاں بندر نہیں پائے جاتے ہیں۔

''شاید یہ کوئی پرندہ ہے۔'' ایرک نے سوچا۔ اس کی نظریں مستقل اسی درخت پر مرکوز رہیں۔ لیکن اس چیز نے دوبارہ حرکت نہیں کی تھی۔ پھر اسے لگا جیسے وہ چیز سرعت سے درخت سے نیچے اتری ہو اور پھر اسے درختوں کے درمیان کوئی انسان بہت تیزی سے بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی تیز رفتاری حیران کن تھی۔ لمحوں میں وہ درختوں کے درمیان سے نکل کر عمارتوں کے درمیان غائب ہو گیا۔ ایرک نے باہر جا کر اسے دیکھنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس کے پچھلے اسکول میں چند بچے تھے جو اسے تنگ کرتے تھے۔ یہاں اسکول میں بھی اسے ایک ایسا ہی گروہ مل گیا تھا۔ گزشتہ دن چارلی اور اس کے دو ساتھیوں جارج اور نیلسن نے اس کا لنچ چھین کر کھا لیا تھا اور اس کا لنچ بکس بھی توڑ دیا تھا۔ کھانے کو گرم رکھنے والا یہ لنچ بکس خاصا مہنگا تھا اور جب بوشر کو علم ہوا تو اس نے سزا کے طور پر ایرک کا جیب خرچ ایک ہفتے کے لیے بند کر دیا تھا۔ ایرک کو اب ایک ہفتے تک لنچ کے بغیر اسکول جانا تھا۔ اگلے دن لیانا نے چپکے سے اس کی جیب میں ایک ڈالر ڈال دیا تاکہ وہ اسکول میں کچھ لے کر کھا لے۔ وہ اسکول جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہاں بھی وہی کچھ ہے جس سے اسے شدید نفرت تھی۔

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ ان لوگوں سے بدلہ لے جو اسے تنگ کرتے ہیں لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر اس نے بدلہ لینے کی کوشش کی تو اس کا انتقام بہت زیادہ ہو جائے گا۔ وہ اسکول پہنچا۔ لنچ ٹائم میں وہ باہر بینچ پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بچے چیزیں کھا پی رہے تھے۔ اس کے پاس صرف ایک ڈالر تھا لیکن اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اچانک اسے چارلی اور اس کے ساتھی اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ وہاں سے اٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہ سکا۔ چارلی اس کے بالکل سامنے رکا اور خاص انداز میں بولا۔

''ہیلو ایرک! آج لنچ میں کچھ نہیں لائے؟''

ایرک اسے دیکھتا رہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اسے جتا رہا ہے کہ گزشتہ دن انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ چارلی نے کہا۔ ''آج تمہارے پاس لنچ بکس نظر نہیں آ رہا لیکن تمہارے پاس یقیناً کچھ رقم ہو گی اس سے ہم کینٹین سے کچھ لے کر کھائیں گے۔''

اس سے پہلے ایرک انکار کرتا یا وہاں سے جاتا چارلی کے دونوں ساتھیوں نے اسے جکڑ لیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن ان کی گرفت بہت سخت تھی۔ چارلی نے آرام سے اس کی جیب سے ایک ڈالر نکال لیا اور مایوسی سے بولا۔ ''بس ایک ڈالر... خیر اس سے بھی کچھ نہ کچھ آ جائے گا۔''

جارج اور نیلسن نے اسے چھوڑ دیا اور وہ تینوں قہقہے لگاتے وہاں سے چلے گئے۔ ایرک کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر وہ خود کو رونے سے روک رہا تھا۔ آس پاس جن بچوں نے

یہ تماشا دیکھا تھا وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایرک کو معلوم تھا کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا۔ وہ گھر آیا تو لیانا نے اسے بتایا کہ اس نے بوشر سے سفارش کر کے اس کا جیب خرچ بحال کرا دیا ہے اور اس کے لیے لنچ بکس بھی آ گیا ہے اگرچہ یہ اتنا مہنگا والا نہیں ہے لیانا نے اس کی میز پر کھانے لگاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تمہاری بے پروائی کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔''

''سزا۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔ ''اس جرم کی جو اس نے کیا ہی نہیں ہے۔''

اس شام بھی لیانا اور بوشر ایک تقریب میں مدعو تھے۔ وہ شام ہوتے ہی تیار ہو کر گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ایرک نے اپنی پڑھنے والی میز کی دراز میں چھپا چھوٹا سا خنجر نکالا۔ یہ خنجر ایک خوب صورت چمڑے کے کور میں رکھا تھا اور اس کی چمکیلی دھار یقیناً بہت تیز تھی۔ ایرک نے آج تک اس کی مدد سے کچھ نہیں کاٹا تھا۔ یہ خنجر اس کے باپ کے پاس تھا اور لیانا کے پاس رہ گیا تھا۔ ایک بار لیانا نے غیر ارادی طور پر ایرک کے سامنے اس کا ذکر کر دیا اور اس نے یہ خنجر چپکے سے نکال لیا۔ ایرک نے خنجر نکال کر جوتے اور گرم کپڑے پہنے اور اپارٹمنٹ سے نکل کر عمارت سے باہر آ گیا۔ سامنے میدان میں اب بھی برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ برف پگھلنے پر آمادہ نہیں تھی۔

سردی کی وجہ سے کوئی باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ میدان کے پاس درختوں کی طرف بڑھا۔ ایک موٹے تنے والے درخت کے پاس آ کر اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں تھام کر اس کی نوک تنے پر ماری۔ نوک تنے میں گھس گئی اس نے خنجر واپس کھینچا اور دوبارہ مارا، پھر مارا اور اس کے بعد جنونی انداز میں بار بار مارتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہوا، وہ وہاں اکیلا نہیں ہے، کوئی اس کے عقب میں موجود ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اینگل آئرن سے بنے، بچوں کے لیے کھیلنے والے ڈھانچے کے اوپری حصے میں ایک کم عمر اور دبلی سی لڑکی بیٹھی تھی اس نے اتنی شدید سردی میں ایک ہلکا سوئیٹر اور معمولی سی پتلون پہن رکھی تھی۔ لڑکی نے ایرک سے پوچھا۔ ''تم یہ کیا کر رہے ہو؟''

''خنجر چلانے کی مشق۔'' اس نے جواب دیا اور خنجر نیام میں ڈال کر جیب میں رکھ لیا۔ لڑکی کھڑی ہوئی اور سیڑھی سے اترنے کے بجائے اچانک نیچے کود گئی وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں لڑکھڑائی تھی۔ ایرک حیران ہوا اور یہ دیکھ کر وہ مزید حیران رہ گیا کہ اس نے پیروں میں کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔

''تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟''

''مجھے سردی نہیں لگتی۔'' لڑکی اس کے پاس آ گئی۔ ایرک نے اسے قریب سے دیکھا وہ چودہ برس کی گلابی رنگت اور بہت دل کش نقوش کی مالک تھی۔ جسم چھریرا اور وزن کم تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سے حلقے تھے اور ہونٹ ہلکے عنابی ہو رہے تھے۔ اس نے ایرک سے پوچھا۔ ''تم کہاں رہتے ہو؟''

ایرک نے پلٹ کر اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''وہ میرا کمرا ہے، تم کہاں رہتی ہو؟''

''تمہاری کھڑکی کے برابر والی کھڑکی میرے کمرے کی ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ایرک نے دیکھا کھڑکی کے شیشے پر بڑے سائز کی تصویر چپکی ہوئی تھی جس نے کھڑکی کو پوری طرح بند کر دیا تھا۔ ایرک نے دیکھا لڑکی کی بہت زیادہ سیاہ آنکھیں اس پر مرکوز تھیں۔ جانے کیوں اسے خوف سا محسوس ہوا اور وہ پلٹ کر عمارت کی طرف چل پڑا۔ جب وہ اندر داخل ہونے لگا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی میدان میں نہیں تھی۔ شاید وہ بھی جا چکی تھی۔ ایرک نے کپڑے بدلے، خنجر اپنی جگہ چھپایا اور سونے کے لیے بستر میں گھس گیا۔ اسے رہ رہ کر لڑکی کا خیال آ رہا تھا۔ رات گئے جب اس کے ماں باپ گھر آئے تب بھی وہ جاگ رہا تھا۔ وہ آپس میں کسی قدر بلند آواز میں بات کر رہے تھے۔ وہ چپکے سے بیڈ سے اترا اور دروازہ ذرا سا کھولا۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

''میرے خدا! بے چارے کا کیا حشر ہوا ہے۔ کل سے اس کی لاش جھیل میں پڑی ہوئی تھی۔''

بوشر بولا۔ ''شاید وہ زیادہ پی کر جھیل کی طرف چلا گیا ہو گا اور پاؤں پھسلنے سے جھیل میں گر گیا ہو گا۔''

لیانا اور بوشر کی باتوں سے ظاہر تھا کہ قصبے کا ایک دکان دار مسٹر کارمن، گزشتہ رات کسی وقت جھیل میں گر کر جاں بحق ہو گیا تھا۔ ایرک کے لیے یہ خبر غیر متوقع تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ زیادہ دیر جاگتا۔ وہ واپس بستر کی طرف آیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔ صبح وہ تیار ہو کر ناشتے کے لیے نیچے کچن میں آیا تو بوشر اخبار دیکھ رہا تھا جبکہ لیانا ناشتا تیار کرتے ہوئے ٹی وی پر خبریں بھی دیکھ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کارمن مرڈر کے بارے میں بتا رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی تھی اور پولیس کے مطابق کارمن کی موت پانی میں ڈوبنے سے نہیں بلکہ شہ رگ کٹ جانے سے ہوئی تھی۔ اس کی گردن پر ایسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشان تھے جیسے کسی نے باقاعدہ دانتوں سے کاٹ کر شہ رگ کاٹی ہو۔ پولیس کے مطابق یہ کسی انسان کا کام ہے۔ دانتوں کے نشانات بتاتے تھے کہ قاتل کم عمر تھا۔ لیانا فکرمند ہوگئی۔

''میرے خدا! یہاں کوئی ایسا درندہ صفت شخص موجود ہے۔''

''ممکن ہے وہ کوئی ویمپائر ہو۔'' بوشر نے کہا۔ ''اس نے مسٹر کارمن کی گردن کاٹ کر اس کا خون پی لیا ہو۔''

لیانا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''ہاں دنیا میں ویمپائر ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کا خون پیتے ہیں لیکن وہ بہت چھپ کر رہتے ہیں۔''

''مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے یقین ہے اگر مسٹر کارمن کو کسی عام انسان نے نہیں مارا تو وہ یقیناً کوئی ویمپائر ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ماسٹر کارمن کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہو اور ممکن ہے جھگڑنے والے نے کارمن کی گردن پر کاٹ لیا ہو اور وہ زیادہ خون بہہ جانے سے مر گیا ہو پھر قاتل نے اس کی لاش جھیل میں پھینک دی ہو۔''

''تم بھول رہی ہو اگر مسٹر کارمن کا خون کہیں اور ہوتا تو اس کا خون ملنا چاہیے تھا لیکن خون نہیں ملا ہے۔ بہرحال ہو سکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

اس تسلی کے باوجود لیانا کی فکر کم نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''اگر وہ غیر ارادی قاتل ہے تب بھی بڑی خوفناک بات ہے۔''

''میرا خیال ہے پولیس جلد اسے گرفتار کر لے گی۔'' بوشر نے کہا اور اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیانا ایرک کے سامنے ناشتا کر رہی تھی۔ اس نے ایرک سے کہا۔

''تم باہر جانے میں احتیاط کیا کرو، خاص طور پر رات کے وقت باہر مت نکلا کرو۔''

''او کے مام۔'' ایرک نے کہا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا پھر بس کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھایا۔ لیانا نے اسے پیار کیا۔ بوشر نے اس کے سر پر ہاتھ مارا، اگرچہ انداز شفقت والا تھا لیکن اس کے ہاتھ کی سختی ایرک نے سر پر محسوس کر لی تھی۔ لیانا نے اس کے لیے لنچ بکس تیار کر دیا تھا۔ ایرک باہر آیا تو اس کی نظر بے اختیار اپنے کمرے کے برابر والی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ لڑکی اسکول نہیں جاتی، اس کی عمر اسکول جانے والی تھی۔ مگر گزشتہ تین ہفتے میں ایرک نے ایک بار بھی اسے اپنے علاقے کے اکلوتے اسکول میں نہیں دیکھا تھا۔ اس روز آسمان پہ گہرے بادل تھے اور جب ایرک بس میں بیٹھا تو اسے لگا جیسے لڑکی والی کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے، اگرچہ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

اس شام لیانا اور بوشر گھر پر ہی تھے۔ کارمن کے قتل کی وجہ سے قصبے میں ہونے والی محفلیں ملتوی کر دی گئی تھیں۔ لیانا اور بوشر نے چند ہفتوں میں یہاں خاصے دوست بنا لیے تھے جن کے ذریعے انہیں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ڈنر کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کارمن قتل کیس میں مزید تفصیلات سامنے آئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔

یہ سن کر ایرک کو وہ بندر نما چیز یاد آ گئی جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر گئی اور پھر اس سے اتر کر بھاگ گئی تھی۔ وہ جھیل کی طرف سے ہی آئی تھی۔ ایرک نے سوچا کہ ماں اور بوشر کو اس بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا کہیں اس پر مزید کوئی پابندی نہ لگ جائے۔ بوشر تو موقع کی تلاش میں رہتا کہ اسے کس طرح پابند کرے اور یہ کام وہ بہ ظاہر اس کی تربیت اور بھلائی کی آڑ میں کرتا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑا میدان اور درختوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آج بھی اس چیز کی جھلک دکھائی دے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ تھک کر سونے کے لیے بستر پر چلا آیا۔

چارلی اور اس کے ساتھیوں سے اپنا لنچ بچانے کے لیے وہ یہ کرنے لگا کہ جیسے ہی وقفہ ہوتا وہ اپنا لنچ کھا لیتا اور بکس فوراً اپنے لاکر میں رکھ دیتا۔ اسے خوف تھا کہ چارلی نے اس کا یہ بکس بھی توڑ دیا تو اس بار اسے سخت سزا ملے گی۔ چارلی اور اس کے ساتھیوں نے دو بار اسے گھیرا لیکن دونوں بار انہیں اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ دوسری بار میں چارلی نے اسے دھمکی دی۔

''تم مجھ سے چالاکی دکھا رہے ہو، تمہیں جلد اس کی سزا ملے گی۔''

چارلی اور اس کے ساتھی اسکول میں ایرک کو ایک حد سے زیادہ تشدد کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے ورنہ بات پرنسپل تک چلی جاتی۔ اس لیے چارلی سوائے دھمکی دینے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت ایرک کا خیال تھا کہ یہ دھمکی ہی ہے۔ اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں برف پگھلنے لگی اور درختوں پر نئے پتے نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسکول کے بچوں کی شام میں سوئمنگ کلاسز شروع ہو گئیں۔ یہ کلاسز قصبے کے جمنازیم اور سوئمنگ

پول میں ہو رہی تھیں۔ ایرک کو پانی سے خوف آتا تھا لیکن سوئمنگ کلاس لینا لازمی تھا۔ وہ شام کو جاتا اور اس کی واپسی تک رات ہو جاتی تھی۔ اس شام وہ واپس آ رہا تھا کہ اس نے میدان میں اسی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ایک جھولے پر دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھی جھول رہی تھی۔ ایرک ہچکچایا پھر اس کی طرف چلا آیا۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' لڑکی بولی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ایلی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''اور تمہارا؟''

''ایرک، تم کتنے سال کی ہو؟''

''چودہ سال۔'' ایلی نے کہا۔ ''شاید کم یا شاید زیادہ۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب میں بھی نہیں جانتی اور تم کتنے سال کے ہو؟''

''تیرہ سال سات مہینے اور بارہ دن۔''

ایلی نے اپنی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مجھ سے کم ہی چھوٹے ہو۔''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں میں گھر میں ہوتی ہوں۔''

''اکیلی؟''

''نہیں میرے پاپا میرے ساتھ ہوتے ہیں۔''

ایرک نے اپنے برابر والے اپارٹمنٹ سے ایک بوڑھے اور گنجے آدمی کو آتے جاتے دیکھا تھا شاید اس کا نام ولسن تھا۔ ایلی نے تصدیق کی۔

''ہاں ولسن میرے ساتھ ہوتا ہے۔''

''تم اسکول جاتی ہو؟''

اس سوال پر ایلی خاموش رہی۔ ایرک سمجھ گیا وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لمحے اس کے کمرے کی کھڑکی سے اسے لیانا نظر آئی۔ وہ اس کے کمرے میں چیزیں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ ایرک نے جلدی سے ایلی کو بائے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ جانے کیوں اسے خیال آیا کہ اسے ایلی کے ساتھ نظر نہیں آنا چاہیے۔ لیانا اور بوشر نے اس عمارت میں کسی سے تعلق نہیں رکھا تھا۔ البتہ قصبے میں انہوں نے بہت سے گھرانوں سے اچھے تعلقات بنا لیے تھے۔ ایک بار لیانا نے ایرک سے بھی کہا تھا کہ وہ قصبے کے اچھے گھرانوں کے لڑکوں سے دوستی کرے۔ ایرک نے انکار کر دیا۔

''مجھے کسی سے دوستی نہیں کرنی۔''

لیانا نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''کیوں؟''

''اس لیے کہ جب میں کسی سے دوستی کروں گا تو کچھ عرصے بعد اسے چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اس لیے میں کسی سے دوستی نہیں کرنا چاہتا۔'' ایرک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''لیکن اب تم بڑے ہو رہے ہو۔'' لیانا دفاعی انداز میں بولی وہ سمجھ گئی تھی کہ ایرک اسے اور بوشر کو الزام دے رہا ہے۔ بوشر کی نوکری کی وجہ سے وہ جگہیں بدلنے پر مجبور تھے۔ ''تمہیں اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایرک نے کہا اور کچن سے نکل گیا۔ انہیں یہاں آئے دوسرا مہینا شروع ہو گیا تھا اور اب تک ایرک کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے اس کی طرف بڑھے بھی تھے لیکن اس کا روکھا انداز دیکھ کر خود پیچھے ہٹ گئے۔ جس واحد ہستی سے اس نے کچھ دیر بات کی وہ ایلی تھی۔ ایرک کا خیال تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایلی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوا اور اپنا کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر ٹانگا کہ لیانا کمرے سے نکل آئی۔

''ایرک یہ لڑکی کون ہے؟''

''کون سی لڑکی کی مام؟'' وہ انجان بن گیا۔

''یہی جس سے تم ابھی سامنے والے میدان میں بات کر رہے تھے۔''

''اوہ ایلی! مام وہ ایلی ہے ہمارے برابر والے اپارٹمنٹ میں اپنے پاپا کے ساتھ رہتی ہے۔''

''ولسن کی بیٹی۔'' لیانا نے بہت تعجب سے کہا۔ ''وہ تو بہت بوڑھا ہے اس کی عمر کم سے کم بھی ستر سال ہوگی، اس کی اتنی کم عمر بیٹی کہاں سے آ گئی؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' ایرک اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے مام کیا بوڑھے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی ہے؟''

''ہوتی ہے لیکن یہ۔۔۔۔'' لیانا کہتے کہتے رک گئی۔ ''خیر چھوڑو، تم اس سے بات مت کیا کرو، وہ نچلے طبقے کی لگتی ہے۔''

ایرک نے ماں کی بات سنی اور کوئی جواب دیے بغیر کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا جیسے لیانا کی بات اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ البتہ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اگر وہ ایلی سے ملا اور اس کی ماں نے دیکھ لیا تو اس کا کیا ردعمل ہوگا؟ ایرک کے ماں باپ دولت مند اور مہذب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشان تھے جیسے کسی نے باقاعدہ دانتوں سے کاٹ کر شہ رگ کاٹی ہو۔ پولیس کے مطابق یہ کسی انسان کا کام ہے۔ دانتوں کے نشانات بتاتے تھے کہ قاتل کم عمر تھا۔ لیانا فکرمند ہوگئی۔

''میرے خدا! یہاں کوئی ایسا درندہ صفت شخص موجود ہے۔''

''ممکن ہے وہ کوئی ویمپائر ہو۔'' بوشر نے کہا۔ ''اس نے مسٹر کارمن کی گردن کاٹ کر اس کا خون پی لیا ہو۔''

لیانا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''ہاں دنیا میں ویمپائر ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کا خون پیتے ہیں لیکن وہ بہت چھپ کر رہتے ہیں۔''

''مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے یقین ہے اگر مسٹر کارمن کو کسی عام انسان نے نہیں مارا تو وہ یقیناً کوئی ویمپائر ہے۔''

''لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ماسٹر کارمن کا کسی سے جھگڑا ہوگیا ہو اور ممکن ہے جھگڑنے والے نے کارمن کی گردن پر کاٹ لیا ہو اور وہ زیادہ خون بہہ جانے سے مرگیا ہو پھر قاتل نے اس کی لاش جھیل میں پھینک دی ہو۔''

''تم بھول رہی ہو اگر مسٹر کارمن کا خون کہیں اور ہوتا تو اس کا خون ملنا چاہیے تھا لیکن خون نہیں ملا ہے۔ بہرحال ہوسکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

اس تسلی کے باوجود لیانا کی فکر کم نہیں ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''اگر وہ غیر ارادی قاتل ہے تب بھی بڑی خوفناک بات ہے۔''

''میرا خیال ہے پولیس جلد اسے گرفتار کر لے گی۔'' بوشر نے کہا اور اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لیانا ایرک کے سامنے ناشتا رکھ رہی تھی۔ اس نے ایرک سے کہا۔

''تم باہر جانے میں احتیاط کیا کرو، خاص طور پر رات کے وقت باہر مت نکلا کرو۔''

''او کے مام۔'' ایرک نے کہا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا پھر بس کا ہارن سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے بیگ اٹھایا۔ لیانا نے اسے پیار کیا۔ بوشر نے اس کے سر پر ہاتھ مارا، اگرچہ انداز شفقت والا تھا لیکن اس کے ہاتھ کی سختی ایرک نے سر پر محسوس کرلی تھی۔ لیانا نے اس کے لیے لنچ بکس تیار کر دیا تھا۔ ایرک باہر آیا تو اس کی نظر بے اختیار اپنے کمرے کے برابر والی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ لڑکی اسکول نہیں جاتی، اس کی عمر اسکول جانے والی تھی۔ مگر گزشتہ تین ہفتے میں ایرک نے ایک بار بھی اسے اپنے علاقے کے اکلوتے اسکول میں نہیں دیکھا تھا۔ اس روز آسمان پر گہرے بادل تھے اور جب ایرک بس میں بیٹھا تو اسے لگا جیسے لڑکی والی کھڑکی سے کوئی جھانک رہا ہے، اگرچہ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

اس شام لیانا اور بوشر گھر پر ہی تھے۔ کارمن کے قتل کی وجہ سے قصبے میں ہونے والی محفلیں ملتوی کر دی گئی تھیں۔ لیانا اور بوشر نے چند ہفتوں میں یہاں خاصے دوست بنا لیے تھے جن کے ذریعے انہیں خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ڈنر کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کارمن قتل کیس میں مزید تفصیلات سامنے آئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کی موت رات ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان ہوئی تھی۔

یہ سن کر ایرک کو وہ بندر نما چیز یاد آ گئی جو ایک درخت سے دوسرے درخت پر گئی اور پھر اس سے اتر کر بھاگ گئی تھی۔ وہ جھیل کی طرف سے ہی آئی تھی۔ ایرک نے سوچا کہ ماں اور بوشر کو اس بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا کہیں اس پر مزید کوئی پابندی نہ لگ جائے۔ بوشر تو موقع کی تلاش میں رہتا کہ اسے کس طرح پابند کرے اور یہ کام وہ بہ ظاہر اس کی تربیت اور بھلائی کی آڑ میں کرتا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں آیا تو دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑا میدان اور درختوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید آج بھی اس چیز کی جھلک دکھائی دے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ تھک کر سونے کے لیے بستر پر چلا آیا۔

چارلی اور اس کے ساتھیوں سے اپنا لنچ بچانے کے لیے وہ یہ کرنے لگا کہ جیسے ہی وقفہ ہوتا وہ اپنا لنچ کھا لیتا اور بکس فوراً اپنے لاکر میں رکھ دیتا۔ اسے خوف تھا کہ چارلی نے اس کا یہ بکس بھی توڑ دیا تو اس بار اسے سخت سزا ملے گی۔ چارلی اور اس کے ساتھیوں نے دو بار اسے گھیرا لیکن دونوں بار انہیں اس کے پاس سے کچھ نہیں ملا۔ دوسری بار میں چارلی نے اسے دھمکی دی۔

''تم مجھ سے چالاکی دکھا رہے ہو، تمہیں جلد اس کی سزا ملے گی۔''

چارلی اور اس کے ساتھی اسکول میں ایرک کو ایک حد سے زیادہ تشدد کا نشانہ نہیں بنا سکتے تھے ورنہ بات پرنسپل تک چلی جاتی۔ اس لیے چارلی سوائے دھمکی دینے کے اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت ایرک کا خیال تھا کہ یہ دھمکی ہی ہے۔ اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مئی کے تیسرے ہفتے میں برف پگھلنے لگی اور درختوں پر نئے پتے نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اسکول کے بچوں کی شام میں سوئمنگ کلاسز شروع ہوگئیں۔ یہ کلاسز قصبے کے جمنازیم اور سوئمنگ

پول میں ہو رہی تھیں۔ ایرک کو پانی سے خوف آتا تھا لیکن سوئمنگ کلاس لینا لازمی تھا۔ وہ شام کو جاتا اور اس کی واپسی تک رات ہو جاتی تھی۔ اس شام وہ واپس آ رہا تھا کہ اس نے میدان میں اسی لڑکی کو دیکھا۔ وہ ایک جھولے پر دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھی جھول رہی تھی۔ ایرک ہچکچایا پھر اس کی طرف چلا آیا۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' لڑکی بولی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ایلی۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''اور تمہارا؟''

''ایرک، تم کتنے سال کی ہو؟''

''چودہ سال۔'' ایلی نے کہا۔ ''شاید کم یا شاید زیادہ۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب میں بھی نہیں جانتی اور تم کتنے سال کے ہو؟''

''تیرہ سال سات مہینے اور بارہ دن۔''

ایلی نے اپنی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مجھ سے کم ہی چھوٹے ہو۔''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''کچھ نہیں میں گھر میں ہوتی ہوں۔''

''اکیلی؟''

''نہیں میرے پاپا میرے ساتھ ہوتے ہیں۔''

ایرک نے اپنے برابر والے اپارٹمنٹ سے ایک لمبے اور گنجے آدمی کو آتے جاتے دیکھا تھا شاید اس کا نام ولسن تھا۔ ایلی نے تصدیق کی۔

''ہاں ولسن میرے ساتھ ہوتا ہے۔''

''تم اسکول جاتی ہو؟''

اس سوال پر ایلی خاموش رہی۔ ایرک سمجھ گیا وہ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لمحے اس کے کمرے کی کھڑکی سے اسے لیانا نظر آئی۔ وہ اس کے کمرے میں چیزیں ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ ایرک نے جلدی سے ایلی کو بائے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ جانے کیوں اسے خیال آیا کہ اسے ایلی کے ساتھ نظر نہیں آنا چاہیے۔ لیانا اور بوشر نے اس عمارت میں کسی سے تعلق نہیں رکھا تھا۔ البتہ قصبے میں انہوں نے بہت سارے گھرانوں سے اچھے تعلقات بنا لیے تھے۔ ایک بار لیانا نے ایرک سے بھی کہا تھا کہ وہ قصبے کے اچھے گھرانوں کے لڑکوں سے دوستی کرے۔ ایرک نے انکار کر دیا۔

''مجھے کسی سے دوستی نہیں کرنی۔''

لیانا نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''کیوں؟''

''اس لیے کہ جب میں کسی سے دوستی کروں گا تو کچھ عرصے بعد اسے چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اس لیے میں کسی سے دوستی نہیں کرنا چاہتا۔'' ایرک نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''لیکن اب تم بڑے ہو رہے ہو۔'' لیانا دفاعی انداز میں بولی وہ سمجھ گئی تھی کہ ایرک اسے اور بوشر کو الزام دے رہا ہے۔ بوشر کی نوکری کی وجہ سے وہ جگہیں بدلنے پر مجبور تھے۔ ''تمہیں اپنے ہم عمر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ کی ضرورت ہے۔''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایرک نے کہا اور کچن سے نکل گیا۔ انہیں یہاں آئے دوسرا مہینا شروع ہو گیا تھا اور اب تک ایرک کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے اس کی طرف بڑھے بھی تھے لیکن اس کا روکھا انداز دیکھ کر خود پیچھے ہٹ گئے۔ جس واحد ہستی سے اس نے کچھ دیر بات کی وہ ایلی تھی۔ ایرک کا خیال تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایلی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن جب وہ گھر میں داخل ہوا اور اپنا کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر ٹانگا کہ لیانا کمرے سے نکل آئی۔

''ایرک یہ لڑکی کون ہے؟''

''کون سی لڑکی مام؟'' وہ انجان بن گیا۔

''یہی جس سے تم ابھی سامنے والے میدان میں بات کر رہے تھے۔''

''اوہ ایلی! مام وہ ایلی ہے ہمارے برابر والے اپارٹمنٹ میں اپنے پاپا کے ساتھ رہتی ہے۔''

''ولسن کی بیٹی۔'' لیانا نے بہت تعجب سے کہا۔ ''وہ تو بہت بوڑھا ہے اس کی عمر کم سے کم بھی ستر سال ہوگی، اس کی اتنی کم عمر بیٹی کہاں سے آ گئی؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' ایرک اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے مام کیا بوڑھے لوگوں کی اولاد نہیں ہوتی ہے؟''

''ہوتی ہے لیکن یہ۔۔۔۔'' لیانا کہتے کہتے رک گئی۔ ''خیر چھوڑو، تم اس سے بات مت کیا کرو، وہ نچلے طبقے کی لگتی ہے۔''

ایرک نے ماں کی بات سنی اور کوئی جواب دیے بغیر کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ بستر پر لیٹ گیا جیسے لیانا کی بات اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ البتہ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اگر وہ ایلی سے ملا اور اس کی ماں نے دیکھ لیا تو اس کا کیا ردعمل ہوگا؟ ایرک کے ماں باپ دولت مند اور مہذب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگوں سے تعلق رکھنا پسند کرتے تھے۔ جبکہ ایلی اپنے حلیے سے واقعی نچلے طبقے کی نظر آتی تھی۔ ایرک حیران تھا کہ وہ اتنے عام سے کپڑے کیوں پہنتی تھی۔ اس عمر میں لڑکیاں فیشن اور میک اپ کے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ جبکہ ایلی کے بال تک بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ شام کو بوشر آیا تو لیانا نے اسے ایلی اور وِلسن کے بارے میں بتایا۔ اس نے ایرک کو بلالیا۔

''برخوردار یہ کیا چکر ہے کیا تم اس لڑکی سے دوستی کرنا چاہتے ہو؟''

''نہیں۔'' ایرک نے سہم کر کہا۔ ''میں نے بس کچھ دیر اس سے بات کی تھی۔''

''اب اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بوشر نے سختی سے کہا۔ ''مجھے اس کا باپ مشکوک لگتا ہے سارا دن گھر میں گھسا رہتا ہے اور بہت کم کہیں باہر جاتا ہے۔''

اگلے دن وہ سوئمنگ کلاس سے واپس آرہا تھا تو ٹرین کے اوورہیڈ کے نیچے سے گزرتے ہوئے سامنے سے چارلی آتا دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے پلٹا لیکن پیچھے جارج اور نیلسن کو موجود پاکر رک گیا۔ اس کے فرار کی راہ مسدود ہو چکی تھی۔ چارلی اس کے قریب رکا۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ ''اے ایرک! میں نے کیا کہا تھا، تمہیں تمہاری چالاکی کی سزا ضرور ملے گی۔ اب وقت آگیا ہے۔''

جارج اور نیلسن نے اسے دونوں ہاتھوں سے قابو کرلیا۔ جانے کیوں چارلی کو سامنے پاکر وہ بے دم سا ہو جاتا اور شدید خواہش کے باوجود کچھ نہیں کر پاتا تھا۔ چارلی نے اپنے کوٹ سے ایک بید کی چھڑی نکالی۔ اس نے چھڑی ایرک کے چہرے کے سامنے لہرائی اور بولا۔ ''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ۔۔۔ تمہیں پتا ہے جب یہ لگتی ہے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے؟''

چارلی نے یہ کہتے ہی چھڑی گھما کر اس کے پیروں پر ماری، ضبط کے باوجود اس کی کراہ نکل گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے تھے۔ چارلی پوری قوت سے اس کے پیروں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے گن کر دس چھڑیاں ماریں اور پھر ہاتھ روک لیا۔ ''میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

جارج اور نیلسن نے اسے چھوڑا تو وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے پیروں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ جس وقت وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے گھر کی طرف جارہا تھا۔ دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں جن میں سرخی چمک رہی تھی۔ اس نے لیانا اور بوشر کو اس بارے میں نہیں بتایا اسے معلوم تھا کہ بوشر اس معاملے میں بھی اس کا کوئی قصور تلاش کر لے گا اور اسے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ لیانا بھی شوہر کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گی۔ اس کے پیروں میں نیل پڑ گئے تھے لیکن کوئی زخم نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ بات چھپانے میں کامیاب رہا تھا۔

اگلے دن وہ سوئمنگ کلاس لینے نہیں گیا تھا۔ اس کے پیروں میں ابھی تک تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے بجائے وہ میدان میں آگیا۔ لیانا اور بوشر ایک تقریب کے لیے سرِشام ہی روانہ ہو گئے تھے اس لیے ان کو پتا نہیں چلا۔ وہ بنچ پر بیٹھا گیم کھیل رہا تھا کہ اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، اس نے دیکھے بغیر جان لیا کہ وہ ایلی ہے۔ وہ بنچ پر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''اس نے تمہیں کیوں مارا تھا؟'' ایلی نے سرگوشی میں کہا۔

''میں نہیں جانتا۔''

''تم نے اسے کیوں نہیں مارا؟''

ایرک نے اس بار ایلی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایرک سہم گیا۔ ''میں اسے نہیں مار سکتا۔''

''اب تم اسے مارو گے۔'' ایلی نے سرسراتی آواز میں کہا۔

ایرک انکار کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا لیکن ایلی کی آنکھوں میں جانے کیا تھا وہ انکار نہیں کر سکا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''میں اسے ماروں گا۔''

ایلی کی آنکھوں کی سرخی دور ہو گئی اور اس میں نرمی آگئی تھی وہ مسکرائی۔ ''تم اچھے لڑکے ہو۔''

''تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟''

''میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔'' ایلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں تمہارے سوا کسی سے نہیں ملتی۔''

''گھر میں صرف تم اور مسٹر وِلسن ہوتے ہو؟''

''ہاں اور تمہارے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟''

''میں، میری مام لیانا اور بوشر۔''

''بوشر؟'' ایلی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرا سوتیلا باپ ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے بتادیا۔

''تم اسے چھوڑ دو گے؟''

''ہاں جیسے ہی میں اٹھارہ سال کا ہوں گا اسے چھوڑ کر

چلا جاؤں گا۔ مجھے برف سے بھی نفرت ہے میں جنوب کی طرف جاؤں گا جہاں سال میں صرف چار مہینے برف پڑتی ہے اور سبزہ بالکل نہیں مرجھاتا۔'' ایرک نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں برف پسند ہے؟''

''مجھے موسم سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

''تم عجیب سی ہو۔'' ایرک نے کہا۔ ''میرے ساتھ گھومنے چلو گی؟''

ایلی نے کچھ سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''لیکن میں صرف شام اور رات کو نکلتی ہوں۔''

''میں تمہیں کل شام لے چلوں گا۔'' ایرک نے کہا اور اٹھ گیا۔ ''اب میں جاؤں گا مجھے اسکول کا کام کرنا ہے۔''

ایرک کے جانے کے بعد ایلی نے دیکھا اس کا گیم وہیں پڑا رہ گیا تھا۔ ایلی نے گیم اٹھا لیا، اس نے دیکھا اس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے وِلسن دیکھ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر اندر چلی آئی۔ وِلسن نے کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کا بیگ بھی تیار تھا وہ کام سے جارہا تھا۔ اس نے ایلی کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم کسی لڑکے سے ملو۔''

''کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے یہ میں بہتر جانتی ہوں۔'' ایلی کا لہجہ سرد اور کسی قدر تحکمانہ تھا، جیسے اپنے باپ سے نہیں بلکہ کسی ماتحت سے بات کر رہی ہو۔ اس کی بات سن کر وِلسن فدویانہ انداز میں مسکرایا تھا۔

''ہاں میں بھول جاتا ہوں کہ تم بہتر جانتی ہو مگر تمہاری وجہ سے مجھے بہت مشکل پیش آتی ہے۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور پہلے کی طرح مشقت والے کام نہیں کر سکتا۔''

ایلی نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے اس بات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہ ہو۔ وِلسن نے زور دے کر کہا۔ ''میرے لیے تمہارا تحفظ سب سے اہم ہے۔''

''میں اپنا تحفظ خود کر سکتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''نہیں اس معاملے میں تم ناتجربے کار ہو۔ ہمارے لیے سب سے اہم مسئلہ اپنی شناخت چھپا کر رکھنا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو ایک بار پتا چل گیا کہ تم کون ہو تو وہ۔۔۔'' وِلسن مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر رک کر اس نے ایلی کی طرف دیکھا۔

''اب تم مجھے بتائے بغیر ایسا کوئی کام نہیں کرو گی۔ تم ابھی نہیں سمجھتیں میں نے وہ کام کتنی مشکل سے کیا تھا۔''

ایلی وِلسن کے پاس آئی اور اس کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وِلسن کا چہرہ چمک اٹھا۔ وہ سرگوشی میں بولا۔ ''تم جانتی ہو تم میرے لیے کیا ہو؟''

''ہاں اور میں تم پر مکمل اعتماد کرتی ہوں۔''

وِلسن کا چہرہ ذرا بجھا تھا۔ وہ اس سے شاید کچھ اور سننا چاہتا تھا۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں شاید کل تک آؤں۔''

''کام کر کے آنا۔'' ایلی نے کہا۔ ''تم جانتے ہو میری خوراک کا وقت قریب ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور گھر سے نکل گیا۔ وِلسن کے لیے سفر کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ گزشتہ ساٹھ سال سے سفر میں تھا۔ اس دوران میں اس نے کینیڈا اور شمالی امریکا کا بیشتر حصہ دیکھ لیا تھا لیکن کہیں بھی وہ سال بھر سے زیادہ نہیں رکا تھا۔ قصبے سے نکلنے کے بعد اس نے کار کا رخ نزدیکی شہر کی طرف کر دیا۔ یہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن پھر بھی اس قصبے کے مقابلے میں بڑا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہاں ہونے والی کسی واردات یا گمشدگی کا تعلق ان لوگوں سے نہیں جوڑا جا سکتا تھا۔ موقع اس نے ایک ہفتہ پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ یہ آئس ہاکی کا چھوٹا سا اسٹیڈیم تھا۔ وہ دس بجے اسٹیڈیم کے پاس پہنچا تو وہاں کی روشنیاں بند کی جارہی تھیں اور پریکٹس کرنے والے نوجوان جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وِلسن شاور والے حصے میں آیا۔ اس نے ایک کونے والے شاور کا انتخاب کیا اور اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سرنج نکال کر اس طرف بڑھا۔

ایک انیس یا بیس برس کا صحت مند نوجوان شاور لے رہا تھا۔ وِلسن نے عقب سے اس کی گردن میں سرنج اتار دی۔ اس نے تڑپ کر پلٹنا چاہا لیکن دوا اتنی دیر میں کام کر چکی تھی۔ نوجوان بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا۔ وِلسن نے شاور بند کیا اور اپنا سامان لے کر اسی حصے میں آگیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ چند منٹ بعد شاور لینے والے باقی کھلاڑی چلے گئے تو اس نے بے ہوش نوجوان کو کھینچا اور ایک اسٹور روم میں آیا۔ اس نے سب سے پہلے بیگ سے ٹیپ نکال کر اس کے ہاتھ پیر اور منہ کو باندھا۔ اب وہ نہ ہل سکتا تھا اور نہ آواز نکال سکتا تھا۔ وِلسن نے نوجوان کے پیر میں رسی باندھ کر اسے چھت سے لگے کنڈے سے الٹا لٹکا دیا۔ اس کام میں اسے بہت زیادہ محنت کرنا پڑی تھی اور اس کا سانس پھول گیا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کے سر کے نیچے ایک بڑا گیلن رکھا اور اس میں بڑے منہ والی کیف لگائی۔ یہ کیف نوجوان کے سر کے عین نیچے تھی۔ وِلسن نے اپنے انتظام سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مطمئن ہو کر چاقو نکالا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ وہ یہاں کا گارڈ تھا اور اسے دروازہ اندر سے بند دیکھ کر شدید شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے روشنی دروازے کے شیشے سے اندر ڈالی تو ولسن نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ گارڈ نے الٹے لٹکے نوجوان کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ دروازہ بجانے کے ساتھ ساتھ دوسرے گارڈز کو کال بھی کر رہا تھا۔

ولسن نے گہری سانس لی اور الٹے لٹکے ہوئے نوجوان کو دیکھا جو ہوش میں آ رہا تھا۔ اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس نے چاقو رکھ دیا اور اپنے بیگ سے ایک بوتل نکالی جس میں زرد رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ بوتل لے کر اسٹور روم کے ایک کونے میں آیا اور ایک ریک کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا۔ اب اسٹور روم کے دروازے پر ضربیں لگ رہی تھیں دوسرے گارڈ آ گئے تھے اور وہ دروازہ توڑ رہے تھے۔ جیسے ہی دروازہ ٹوٹا اس نے بوتل کھولی اور اسے سر سے بلند کرتے ہوئے اپنے اوپر انڈیل لیا اور پھر اچانک اسٹور روم میں ایک تیز چیخ گونج کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

ایرک ایلی کا منتظر تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھا تھا اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ایلی کب آئی۔ وہ اس کے برابر میں آ کر بیٹھ چکی تھی۔ ایرک نے دیکھا اس کا چہرہ سفید اور ستا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ ایرک کھڑا ہو گیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

ایلی خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ آج بھی اس نے موٹا کھردرا لیکن موسم کے لحاظ سے ناکافی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتے یا چپل نہیں تھی۔ ایرک اسے ایک اسٹور تک لایا۔ اس نے اندر جا کر دو کینڈی چاکلیٹ لیں۔ وہ واپس آیا تو دو بلیاں ایلی پر غرا رہی تھیں۔ ایرک نے ان کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔ ایلی اصل میں اسٹور میں لگے ٹی وی کو دیکھنے شیشے کے پاس چلی آئی تھی۔ ٹی وی میں نزدیکی شہر کے آئس ہاکی اسٹیڈیم سے ملنے والے زخمی شخص کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ تیزاب سے جھلس کر ناقابل شناخت ہو گیا تھا اور پولیس اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایرک کو دیکھ کر وہ جلدی سے ٹی وی سے دور چلی گئی تھی اور اس دوران میں ان دو آوارہ بلیوں نے پھر اس پر غرانا شروع کر دیا تھا۔ ایرک نے ایک کینڈی چاکلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔ ایلی نے انکار میں سر ہلایا۔ ”میں نہیں کھا سکتی۔“

”پلیز کھالو۔“ ایرک نے اصرار کیا تو اس نے کینڈی چاکلیٹ لے لی اور اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹا لیکن جیسے ہی ٹکڑا اس کے حلق سے نیچے گیا اس نے پیٹ پکڑ لیا اور پھر وہ نزدیکی گلی کی طرف بھاگی۔ جب ایرک وہاں پہنچا تو وہ الٹی کر رہی تھی۔ اس نے جو کھایا تھا وہ سب باہر آ گیا تھا۔ ایلی نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”میں نے کہا تھا نا میں نہیں کھا سکتی۔“

اس کی حالت دیکھ کر ایرک نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”سوری میں نے تمہیں مجبور کیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بولی۔ ”اب مجھے جانا ہوگا۔“

”کہاں اور اتنی جلدی؟“ ایرک بے تاب ہو گیا تھا۔

”ہاں مجھے جانا ہے۔“ ایلی نے کہا اور گلی کے سرے کی طرف چل پڑی۔ وہ ایرک سے پہلے نکل گئی اور چند سیکنڈ بعد ایرک سڑک پر آیا تو اسے ایلی کہیں نظر نہیں آئی وہ چند سیکنڈ میں غائب ہو چکی تھی۔ ایرک کچھ دیر حیران پریشان کھڑا رہا پھر گھر کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

شہر کے مرکزی اسپتال کے ریسپشن پر ایک نوجوان اور دل کش نرس موجود تھی اور کمپیوٹر پر کام کر رہی تھی۔ داخلی دروازہ سامنے ہی تھا۔ ایک بار گھنٹی بجی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کاؤنٹر کے دوسری طرف ایک کمسن لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا لباس معمولی اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ نرس نے پوچھا۔ ”میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

”میرے پاپا یہاں داخل ہیں۔“

”کس شعبے میں ہیں اور انہیں کیا ہوا ہے؟“

”اصل میں انہیں پولیس لائی ہے ان کا چہرہ جھلس گیا ہے۔“

”اوہ۔“ نرس نے ہمدردی سے کہا۔ ”وہ ساتویں فلور پر موجود ہے کیا تم اسے دیکھنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا اور پلٹ کر چلی گئی۔ نرس نے دیکھا اس کے پاؤں ننگے تھے۔ اسے خیال آیا کہ پولیس اس زخمی کے لواحقین کو تلاش کر رہی ہے۔ وہ کاؤنٹر سے نکل کر لڑکی کے پیچھے آئی لیکن جب تک وہ دروازے سے باہر آئی تو اسپتال کے سامنے وسیع پارکنگ میں لڑکی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اتنی سی دیر میں وہ غائب ہو چکی تھی۔ حیران نرس واپس اندر گئی تو بیرونی چھت پر موجود ایک سایا بہت تیزی سے دیوار پر چڑھتے ہوئے اوپر جا رہا تھا۔

☆☆☆

ایرک ناشتے کی میز پر تھا اور لیانا حسب معمول ٹی وی پر خبریں دیکھ رہی تھی۔ خبر ایک زخمی کے بارے میں تھی۔ گزشتہ رات کسی نے اسپتال کی ساتویں منزل پر اس کے کمرے میں گھس کر دانتوں سے اس کی شہ رگ کاٹ دی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے بستر پر بہت معمولی سا خون گرا تھا۔ نائٹ شفٹ میں استقبالیہ پر موجود نرس نے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا جس نے نامعلوم زخمی کو اپنا باپ بتایا تھا اور پھر وہ اسے دیکھے بغیر چلی گئی۔ نرس نے اس کا جو حلیہ بتایا تو ایرک ساکت رہ گیا۔ اس کا منہ کی طرف چمچ لے جاتا ہاتھ رک گیا تھا۔ اسے احساس نہیں ہوا کہ بوشر غور سے اسے دیکھ رہا ہے۔

”کیا بات ہے برخوردار! رک کیوں گئے؟“ بوشر نے پوچھا تو وہ چونک گیا اس نے جلدی سے چمچ منہ میں رکھ لیا۔ اپنے تاثرات چھپانے کے لیے وہ پیالے پر جھک گیا۔ اس دوران میں اسکول بس نے ہارن دیا تو وہ بیگ اٹھا کر باہر کی طرف لپکا اس نے لیانا اور بوشر کو بائے بھی نہیں کہا۔ لیانا نے حیرت سے بوشر کی طرف دیکھا تو اس نے سرد لہجے میں کہا۔

”یہ روز بروز بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے اسے سبق سکھانا پڑے گا۔“

لیانا کانپ گئی۔ ایک بار بوشر نے ایرک کو بیلٹ سے مارا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں میں اسے سمجھا لوں گی۔ ابھی بچہ ہے۔“

”تم نے غور نہیں کیا وہ ٹی وی میں خبر سنتے ہوئے ساکت رہ گیا تھا۔“ بوشر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ ”وہ بچہ نہیں ہے سب چودہ سال کا ہونے والا ہے۔“

لیانا نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“

”تم نے نیوز کاسٹر کا بتایا ہوا حلیہ غور سے سنا؟“

”کس کا حلیہ؟“

”اس لڑکی کا جو اپنے پاپا سے ملنے آئی تھی۔“ بوشر نے کہا اور کچن سے چلا گیا۔ لیانا بوشر کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

باہر آ کر ایرک نے ایک نظر ایلی کے کمرے کی بند کھڑکی کی طرف دیکھی۔ ایرک نے کبھی اسے کھلے نہیں دیکھا تھا۔ ... میں بس میں بیٹھا وہ موضوع شہر میں ہونے والا قتل تھا۔ ... کے خیال میں یہ کسی ویمپائر کا کام تھا۔ جس نے زخمی ... کا خون پی لیا تھا۔ ایرک نے زخمی وٹی وی ... تھا۔ اگرچہ اس کا چہرہ چھپا دیا گیا لیکن جب اسے اسپتال لایا گیا تھا تو اس نے اپنا خاص لباس پہن رکھا تھا۔ اسکول سے واپسی پر ایرک نے اپنے گھر کے بجائے ایلی کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ مایوس ہو کر واپس جا رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ ایلی کھڑی تھی۔ کل کے مقابلے میں آج اس کا رنگ گلابی اور آنکھوں کے حلقے کم ہو گئے تھے۔ چہرہ اتنا ستا ہوا نہیں تھا۔ ایرک اندر آ گیا۔ وہ غور سے ایلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بلاتمہید پوچھا۔

”کل اسپتال میں مرنے والا ولسن تھا؟“

ایلی نے سر ہلایا۔ ”ہاں۔“

”کسی نے اس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا۔“ ایرک نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ایلی خاموش رہی۔ ایرک نے بات جاری رکھی۔ ”اسپتال کی نرس نے ایک لڑکی کا حلیہ بتایا ہے۔ جو بالکل تمہارے حلیے سے ملتا ہے۔“

ایلی خاموش رہی تو ایرک نے اس کے شانے تھام کر اسے جھنجوڑ دیا۔ ”چپ کیوں ہو بولو؟“

ایلی نے کہا۔ ”اس نے پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔“

”وہ تمہارا باپ تھا؟“

ایلی نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ ایلی نے کہا اور دکھی نظر آنے لگی۔ ”وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔“

ایرک نے اس کا دکھ محسوس کیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔ ”وہ تمہارا بوائے فرینڈ تھا؟“

”بہت پہلے... جب وہ جوان تھا۔“

ایرک پیچھے ہوا۔ ”ایلی تم کتنے سال کی ہو؟“

”میں چودہ سال کی ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور پھر بولی۔ ”میں ایک نامعلوم وقت سے چودہ سال کی ہوں۔“

ایرک اگلا سوال پوچھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن اس نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ”ایلی تم ویمپائر ہو؟“

ایلی چپ رہی۔ ایرک نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ ویمپائر کیا ہوتا ہے لیکن میں خون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اگر مہینے میں ایک بار مجھے خون نہ ملے تو میں مرنے لگتی ہوں لیکن مرتی پھر بھی نہیں ہوں۔ میری خوراک صرف خون ہے میں کچھ اور نہیں کھا سکتی۔“

”تم نے ولسن کو مار کر اس کا خون پیا ہے؟“ ایرک کی آواز لرزنے لگی ”ہے نا؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بہت سارے لوگوں کا۔'' ایلی نے سرگوشی میں کہا۔ ''مجھے ان کی تعداد بھی یاد نہیں ہے۔ ولسن میرے لیے خون لاتا تھا لیکن کبھی کبھی نہیں لا پاتا تو۔۔۔۔''

''تو تم کسی کو مار کر اس کا خون پی جاتی تھیں؟'' ایرک نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور اچانک اسے تھپڑ مارا۔ ایلی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ایرک پلٹ کر اس کے گھر سے نکل آیا۔ اس نے دیکھا نہیں کہ گیلری کے سرے پر بوشر کھڑا اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے ایرک کو ایلی کے فلیٹ سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے بیگ ایک طرف پھینکا اور بستر پر گر گیا۔ وہ ایلی سے نفرت کرنا چاہتا تھا۔ اس دن وہ تمام وقت گھر میں رہا تھا۔ رات وہ سو رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے یونہی پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسے کھڑکی کے چھجے پر ایلی بیٹھی دکھائی دی۔ ایرک اسے دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

''تم اندر کیوں نہیں آ جاتیں؟''

''تم اجازت دو تو میں آ جاتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

ایرک اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آیا۔ اس نے پٹ کھولا۔ ''اگر میں اجازت نہ دوں تو تم پھر بھی آ جاؤ گی؟''

ایلی خاموش رہی۔ ایرک نے چٹکی بجا کر یوں اشارہ کیا جیسے کسی جانور کو بلا رہا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا تو ایلی اندر آ گئی تھی۔ اس نے ایرک کے حقارت آمیز انداز کو محسوس تو کیا لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ایرک نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر میں تمہیں منع کروں اور تم سے برا سلوک کروں تو تم مجھے بھی مار دو گی۔۔۔۔ ہے نا! میرا بھی خون پی جاؤ گی؟''

ایلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔''

''جھوٹ، تمہیں صرف لوگوں کو قتل کرنے اور ان کا خون پینے سے محبت ہے۔'' ایرک نے نفرت سے کہا تو پہلی بار ایلی کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نظر آئے۔ ایرک نے دیکھا اچانک ہی اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ پھر یہ خون اس کے کانوں، آنکھوں اور مساموں سے بہتا دکھائی دیا۔ ایرک کو لگا جیسے وہ اسے بتا رہی ہو کہ وہ اس کا خون نہیں پی سکتی بلکہ اس کے لیے اپنا خون بہا سکتی ہے۔

''نہیں۔'' وہ بے قرار ہو کر ایلی کو گلے کے لیے آگے بڑھا۔ ''ایسا مت کرو پلیز۔''

ایلی کے جسم سے لرزش جیسے ختم ہو گئی تھی۔ وہ مسکرانے لگی۔ کچھ دیر میں ایرک نے اس سے پوچھا۔ ''تم مجھ سے دوستی کرو گی؟''

''میں تمہاری دوست ہی ہوں۔'' ایلی نے کہا۔

''نہیں ایسے نہیں۔'' ایرک نے کہا اور میز کی دراز سے اپنا چاقو نکالا اس کی دھار سے اپنی ہتھیلی پر ہلکا سا چرکا لگایا تو خون چھلک آیا۔ اس نے ہتھیلی ایلی کی طرف بڑھائی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اس کی آنکھیں یک دم سرخ ہو گئیں۔ وہ بدلے ہوئے انداز میں بولی۔

''نہیں دور رہو۔''

''پلیز۔'' ایرک نے ہاتھ آگے کیا تو وہ تیزی سے مڑی اور کسی پرندے کے مانند کھڑکی سے باہر نکل گئی۔ جب تک ایرک نے آ کر نیچے جھانکا وہ غائب ہو چکی تھی۔ وہ مسکرایا اور اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اگلے دن اسکول انتظامیہ بچوں کو جھیل کے کنارے لے جا رہی تھی جہاں وہ مختلف کھیل کھیلتے۔ یہ اسکول والوں کی طرف سے بہار کا استقبال تھا۔ ایرک صبح تیار ہوا۔ اسکول کی بس آئی تو اس نے ماں کو پیار کیا اور بوشر کو نظر انداز کر کے باہر نکل گیا۔ بوشر نے لیانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''دیکھا تم نے۔۔۔۔ اسے سبق سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔''

''وہ اب بڑا ہو گیا ہے اور ہم اسے بچوں کی طرح نہیں مار سکتے۔''

''وہ کتنا بڑا ہو جائے مجھ سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ ان دنوں کس چکر میں ہے۔'' بوشر نے زہریلے انداز میں کہا اور اٹھ کر کچن سے چلا گیا۔

ایرک بس سے اترا تو سامنے جھیل کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ برف پگھل چکی تھی اور جھیل کے کنارے سبز گھاس ہوا کے جھونکوں سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ سامنے جنگل تھا جس کے ایک طرف قصبے کا حصہ لگتا تھا۔ جنگل اور جھیل کے درمیان۔۔ چھوٹا سا میدان تھا۔۔ بچے اور ان کے گروپ ٹیچرز اسی میدان میں پھیل گئے تھے۔ ایرک جھیل کی طرف آیا اور پانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کی نظر پانی میں تیرتی ایک ڈنڈی کی طرف گئی۔ اس نے ذرا آگے جھک کر ڈنڈی اٹھالی اور میدان کی طرف گیا۔

چارلی، جارج اور نیلسن ایک درخت کے پیچھے چھپ کر سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔ وہ ایرک کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے ایرک کو دیکھا تو چارلی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''جس بزدل کے بارے میں بات کر رہے تھے وہ آ گیا ہے۔'' یہ کہہ کر چارلی ایرک کی طرف بڑھا اور اس کے بالکل سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''کیا خیال ہے دوست آج یہیں پر تمہاری تھوڑی اور پٹائی نہ لگائی جائے؟''

''آج تم میری پٹائی نہیں لگا سکو گے۔'' ایرک نے آہستہ سے کہا۔

''کیوں؟'' چارلی مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔

''کیونکہ آج میں تمہاری پٹائی لگاؤں گا۔'' ایرک نے کہا اور عقب سے ہاتھ سامنے لا کر چارلی کے سر پر ڈنڈی ماری۔ پانی میں بھیگ جانے سے لکڑی کا وزن خاصا تھا اور ضرب چارلی کے کان پر لگی اور خون بہہ نکلا۔ چارلی چند لمحے تو بے یقینی کی کیفیت میں کھڑا رہا پھر چوٹ کھائے کتے کی طرح چلانے لگا۔ چند لمحوں میں وہاں ٹیچرز اور اسکول کے دوسرے بچے جمع ہو گئے۔ ان میں سے اکثر چارلی کو اس طرح روتے چلاتے دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے تھے۔ ٹیچرز کو صورت حال جاننے میں چند لمحے لگے اور وہ ایرک اور چارلی دونوں کو لے گئے۔ ایک گھنٹے بعد اسکول میں ایرک کی پیشی پرنسپل کے سامنے ہوئی جس نے اسے سخت تنبیہ کی اور پھر اس کے گھر فون کر دیا۔

☆☆☆

ایرک بستر میں دبکا بوشر کی غضبناک آوازیں سن رہا تھا۔ وہ ایرک کو سزا دینے کا اعلان کر رہا تھا اور لیانا اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے پر دستک ہوئی۔ ایرک نے چونک کر دیکھا تو ایلی تھی۔ ایرک نے کھڑکی کھولی۔ وہ اندر آئی اور ایرک کو گلے لگا لیا۔ ''تم نے بہت اچھا کام کیا۔''

''تم نے دیکھا تھا؟'' ایرک نے پوچھا۔

''نہیں میں دن میں باہر نہیں نکل سکتی لیکن میں نے ٹی وی پر اس بارے میں سنا ہے۔''

ایرک فکر مند ہو گیا۔ ''تم کب تک اکیلی رہو گی، کیا کوئی ولسن کے بارے میں معلوم کرنے نہیں آیا؟''

''نہیں۔۔۔۔ اور میں نہیں جانتی کہ کب تک رہوں گی؟'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''یہ فلیٹ تمہارا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔ ویسے ولسن کوئی جگہ خریدتا نہیں تھا تم ہمیشہ کرائے کی جگہ پر رہے ہیں۔''

باہر سے آتی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ بوشر کا غیظ و غضب بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کسی وقت بھی ایرک کے کمرے میں اپنی چھڑی کی بیلٹ سمیت آ جاتا۔ ایلی نے سیاہ آنکھوں سے ایرک کو دیکھا۔ ''اگر اس نے تمہیں ہاتھ لگایا تو میں اسے مار ڈالوں گی۔''

ایرک گھبرا گیا۔ ''تم ایسا نہیں کرو گی۔''

''وہ آنے والا ہے۔'' ایلی نے کہا۔ ''چلو میرے ساتھ۔'' وہ کھڑکی کی طرف بڑھی۔

''کہاں؟۔۔۔۔ اے رکو۔'' ایرک بولا لیکن اس نے کھڑکی کھولی اور ایرک سے کہا۔

''مجھے عقب سے مضبوطی سے پکڑ لو۔''

ایرک بوشر کی آوازیں سن رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ایلی کو یہاں دیکھ لیا تو بہت برا ہو گا اور اگر ایلی کو غصہ آ گیا تو بوشر کی خیر نہیں ہو گی۔ مجبوراً اس نے عقب سے ایلی کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے جکڑ لیا۔ ایلی نے کہا۔ ''اپنی آنکھیں بند کر لو۔''

جب ایرک کے حواس بحال ہوئے تو وہ ایلی کے کمرے میں تھا۔ اسے بس اتنا محسوس ہوا جیسے وہ ہوا کے تیز جھونکے سے گزرا ہو اور اگلے لمحے وہ یہاں تھا۔ ایرک حیران تھا۔ ایلی کا وزن مشکل سے ساٹھ پونڈ تھا اور وہ کم سے کم بھی نوے پونڈز کا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسے نہ جانے کیسے اٹھا کر یہاں تک لے آئی۔ اس نے ایلی سے کہا۔ ''تم نے یہ کیسے کیا؟''

''میں بہت سارے ایسے کام آرام سے کر سکتی ہوں جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔'' وہ بولی۔

ایرک کو بوشر کی فکر تھی۔ اگر وہ اسے کمرے میں نہ پاتا تو اور غضبناک ہو جاتا۔ جانے وہ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا؟ رات آٹھ بجے کے بعد اس پر گھر سے باہر جانے کی پابندی تھی۔ وہ صرف اسی صورت میں گھر سے باہر جا سکتا تھا جب لیانا اور بوشر گھر پر نہ ہوں تاکہ انہیں پتا نہ چل سکے۔ ایلی اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تمہیں اس شخص سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

ایرک نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے بوشر سے نفرت ہے لیکن میں اس سے ڈرتا بھی ہوں وہ مجھے بہت بے دردی سے مارتا ہے۔''

''تم میرے ساتھ رہ جاؤ۔'' ایلی نے اس سے کہا۔

ایرک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں ابھی چودہ سال کا نہیں ہوا اور اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد میں اپنی زندگی گزارنے کے قابل ہوں۔''

''اگر تم رقم کی بات کر رہے ہو تو اس کی ہمارے پاس کمی نہیں ہے۔'' ایلی نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

اس فلیٹ میں فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ لاؤنج میں صرف ایک صوفہ کم بیڈ پڑا تھا۔ جس پر ولسن سوتا تھا۔ پولیس نے اسے نامعلوم اور لاوارث قرار دے کر دفنا دیا تھا کیونکہ کسی سے بھی اس کی شناخت سامنے نہیں آئی تھی۔ دوسرے کمرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں فرنیچر نہیں تھا لیکن اس میں لکڑی کا ایک بڑا سا بکس تھا اور اس کے علاوہ چاروں طرف چھوٹے چھوٹے ڈبے اور بکس بکھرے ہوئے تھے۔ ایلی نے ایک ڈبا کھولا تو وہ ڈالرز سے بھرا ہوا تھا۔ ایرک حیران رہ گیا۔ اس نے ایلی سے پوچھا۔

''تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟''

ایلی خاموش رہی پھر اس نے دوسرا ڈبا کھولا تو اس میں سکے بھرے تھے یہ سب سونے کے تھے۔ کسی بکس میں چاندی کے ڈالرز بھرے تھے اور کسی میں چھوٹے موٹے ہیرے موتی اور اسی طرح کی قیمتی اشیا تھیں۔ ایرک نے پھر سوال کیا۔ ''یہ سب تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

ایلی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ مت پوچھو۔''

ایرک سمجھ گیا۔ ''تم لوگوں نے آج تک جتنے لوگوں کو ہلاک کیا ہے یہ سب ان سے حاصل کیا ہے؟''

ایلی خاموش رہی۔ ایرک نے اگلا سوال کیا۔ ''ولسن تمہارے ساتھ رہنے والا پہلا مرد تھا؟''

''نہیں.... ساتواں مرد تھا۔''

''باقی چھ کہاں گئے؟''

''بوڑھے ہو کر مر گئے۔ ولسن نے خود مرنے کی فرمائش کی تھی۔ ایک اور نے خودکشی کر لی تھی باقی بوڑھے ہو کر فطری موت مرے تھے۔''

''تم کہاں کی رہنے والی ہو؟''

ایلی نے گہری سانس لی۔ ''میں نہیں جانتی کہ میں کہاں کی رہنے والی ہوں لیکن مجھے یاد ہے، وہ کوئی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس میں زیادہ تر کاشت کار رہتے تھے اور کچھ لوگ دوسرے کام کرتے تھے۔ ہم دوسری آبادیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ پھر ہمارے گاؤں پر بلائیں نازل ہونے لگیں۔ لوگ غائب ہو جاتے اور کچھ دن بعد ان کی لاشیں ملتی تھیں۔ کوئی ان کا خون پی کر ان کو مار دیتا تھا۔ لوگ ڈر گئے، کوئی گاؤں سے باہر نہیں جاتا تھا کیونکہ جو بھی شام کے بعد گاؤں سے باہر جاتا وہ اس بلا کا شکار ہو جاتا۔ بچوں کو سختی سے منع تھا وہ گھر سے باہر بھی نہیں نکل سکتے تھے۔

لیکن ایک دن میں اور میری بہن کھیلتے ہوئے جنگل کی طرف چلے گئے اور ہمیں وہیں رات ہو گئی۔ جب ہم گھر کی طرف آنے لگے تو راستہ بھول گئے۔ ہم رو رہے تھے اور مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن گاؤں سے دور آنے کی وجہ سے کوئی ہماری آواز نہیں سن پا رہا تھا۔ ہاں اس بلا نے ہماری آواز سن لی۔ درختوں کے درمیان سے ایک تاریک سایا نکل کر ہم پر جھپٹا اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکی تھی کیونکہ اس نے میری گردن میں دانت گاڑ دیے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بلا میری شہ رگ کاٹ دیتی۔ میری بہن نے ہمت کر کے عقب سے اسے لکڑی ماری۔ اس نے مجھے چھوڑ کر میری بہن کو پکڑ لیا اور اسے لے کر درختوں کے درمیان غائب ہو گئی۔ میری گردن سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے اپنی قمیص سے پٹی پھاڑ کر زخم پر باندھی اور گرتی پڑتی گاؤں کی طرف جانے لگی۔ جانے کیسے مجھے راستہ مل گیا اور میں گاؤں پہنچ گئی۔

میرے گھر والوں کو سرِ شام ہی پتا چل گیا تھا کہ ہم دونوں بہنیں غائب ہیں لیکن ڈر کی وجہ سے کوئی ہماری تلاش میں نکلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے زخمی دیکھ کر گاؤں والے ڈر گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں ڈر رہے تھے لیکن کوئی میرے پاس آنے کو تیار نہیں تھا۔ پھر گاؤں والوں نے میرے باپ سے کہا کہ وہ مجھے مار دیں۔ میرے باپ نے انکار کیا تو گاؤں والوں نے ہمارے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی۔ مجبوراً میرے باپ نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ مجھے مار دے گا۔ وہ مجھے گاؤں سے باہر لایا اور مجھ سے کہا۔

''ایلی میں مجبور ہوں میں تمہیں ان لوگوں سے نہیں بچا سکتا، اس لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔ اب تم بھاگ جاؤ اور کہیں دور چلی جاؤ تاکہ میں گاؤں والوں کو کہہ سکوں کہ میں نے تمہیں مار کر دفن کر دیا ہے۔''

ایک چودہ سال کی لڑکی کے لیے یہ سب بہت خوفناک تھا۔ میں کبھی گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی اور نہ مجھے باہر کی دنیا کا علم تھا۔ جان بچانے کے لیے مجھے وہاں سے جانا تھا۔ اس وقت میں ویمپائر نہیں بنی تھی لیکن سفر کے دوران میں جب اگلے دن سورج نکلا تو اس کی روشنی میرے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی اور مجھے ایک سایے دار جگہ پر چھپنا پڑا۔ رات میں مجھے سکون ملا تھا۔ صبح کے قریب مجھے ایک قافلہ مل گیا اور میں اس کی ایک گاڑی میں گھاس میں چھپ کر لیٹ گئی۔ پھر میں ایک شہر پہنچی اور اس کے بعد سے میں مختلف جگہوں پر گھومتی رہی۔ مجھے لوگ ملتے رہے جو میری حفاظت کرتے تھے اور ساری عمر میرے ساتھ رہے۔ وہ بوڑھے ہو کر مر جاتے تھے اور میں ویسی کی ویسی ہی رہی۔ میں آج بھی ویسی ہی ہوں جیسے کئی سو سال پہلے تھی۔ پتا نہیں مجھے موت آئے گی بھی یا نہیں۔

ایرک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تم فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

اس نے غور سے ایرک کو دیکھا۔ ''تم میرے ساتھ ہو تے!''

''ہاں!'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

ایلی مسکرانے لگی۔ ایرک کو حیرت ہوئی۔ وہ مسکراتے ہوئے کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ ایرک کو معلوم تھا کہ بوشر اور اس کی ماں اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ لیانا پریشان ہو گی یقیناً بوشر اس پر پیچ و تاب کھا رہا ہو گا لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایلی اور اس کی محبت کی خاطر وہ ہر مشکل برداشت کر سکتا تھا۔ ہر سزا جھیل سکتا تھا مگر جو ہوا وہ ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ایرک سہم گیا۔ ایلی نے اس سے کہا۔

''تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے آؤ میرے ساتھ۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر لیانا اور بوشر موجود تھے۔ ایرک ایلی کے پیچھے تھا اسے دیکھتے ہی بوشر نے معنی خیز نظروں سے لیانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ یہ یہیں موجود ہو گا۔''

''ایرک۔'' لیانا نے سخت لہجے میں کہا۔ ''باہر آؤ.... میں نے تم سے کیا کہا تھا؟''

ایرک سر جھکائے ایلی کے برابر سے گزر کر باہر آ گیا۔ ایلی بوشر کو گھور رہی تھی۔ یک دم اس کی آنکھیں سرخ ہوئیں اور اس نے سرگوشی نما لہجے میں بوشر سے کہا۔ ''تم ایرک کو کچھ نہیں کہو گے۔''

اس کے تاثرات اور لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ بوشر خوف زدہ ہو گیا اور پلٹ کر اپنے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ لیانا بھی ڈر گئی اس نے ایرک کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گئی۔ ایرک نے مڑ کر دیکھا ایلی اسے دیکھ رہی تھی اور اس نے اشارے سے اسے مطمئن رہنے کو کہا۔ فلیٹ میں آتے ہی لیانا اس پر برس پڑی۔ ''ایرک تم نے نہایت غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ تم بیڈ روم میں ہو اور تم اس کے گھر میں تھے۔ تم کب گھر سے نکلے؟''

ایرک نے سکون کا سانس لیا وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ دروازے سے باہر گیا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''جب تم دونوں بیڈ روم میں تھے۔ مجھے بوشر سے ڈر لگ رہا تھا اس لیے میں باہر چلا گیا۔''

''ایرک آئندہ تم اس لڑکی سے نہیں ملو گے۔ وہ ٹھیک لڑکی نہیں ہے۔''

''ماما وہ اچھی لڑکی ہے۔'' ایرک نے اسی انداز میں کہا۔ ''آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہیں۔''

لیانا اسے سمجھاتی رہی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ بوشر فلیٹ میں آنے کے بعد بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ ایرک نے اطمینان محسوس کیا کہ اب اس کی جان چھوٹ گئی ہے لیکن جیسے ہی وہ اپنے کمرے میں آیا پیچھے سے بوشر بھی آ گیا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ ایرک سہم گیا۔ بوشر نہایت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم اپنی ماں کو بے وقوف بنا سکتے ہو لیکن مجھے نہیں بنا سکتے۔ لیانا نہیں جانتی کہ ایلی کون ہے لیکن میں اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کون ہے؟''

''میں نہیں سمجھا تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ایرک نے معصومیت سے کہا۔

بوشر اس کے قریب آیا اور ذرا جھک کر بولا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ایلی لڑکی نہیں ہے۔ ولسن شہر میں مر گیا ہے اور یہ اب اکیلی ہے۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت ہے اس لیے وہ تمہیں پھانس رہی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

ایرک ذرا پیچھے ہو گیا اور کسی قدر سرکش لہجے میں بولا۔ ''میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہا۔''

بوشر اسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ''جلد سمجھ جاؤ گے جب میں اسے فنا کر دوں گا۔''

ایرک نے بے یقینی سے اپنے سوتیلے باپ کو دیکھا۔ ''تم اسے قتل کرنے کی بات کر رہے ہو؟''

''قتل انسان کو کیا جاتا ہے۔ کسی جانور کو نہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو وہ انسان نہیں ہے۔'' بوشر نے کہا اور جھٹکے سے مڑ کر کمرے سے چلا گیا۔ اگلے دن ایرک اسکول جانے کے لیے نکلا لیکن وہ اسکول بس میں سوار نہیں ہوا۔ اس کے فلیٹ سے اسکول بس نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے اسے اطمینان تھا کہ اس کی ماں یا بوشر اسے بس میں سوار ہوتے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ عمارت کے کونے پر کھڑا بچوں کو اس میں سوار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اسکول بس حرکت میں آئی وہ واپس عمارت میں آیا لیکن سامنے والے زینوں کے بجائے اس نے عقبی زینوں کا رخ کیا۔ وہاں سے اسے کوئی تیسری منزل کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی فلیٹ والی گیلری میں آ کر پہلے اس نے سن گن لی۔ اسے خوف تھا کہ کہیں بوشر یا اس کی ماں عین اس وقت نہ نکل آئیں، جب وہ ایلی کے فلیٹ کا دروازہ بجا رہا ہو۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو وہ ایلی کے فلیٹ تک آیا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی۔ چند لمحے بعد وہ دوبارہ دستک دینے والا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامنے ایلی موجود تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو رہے تھے۔ ایرک ایک بار پہلے بھی ایلی کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا۔ جب وہ اس کے ساتھ باہر گئی تھی اور ایرک نے اسے بھوکا سمجھ کر چاکلیٹ کھلائی تھی۔ ایرک اندر آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

''تم بھوکی ہو؟''

ایلی نے سر ہلایا۔ ''مجھے مہینے میں ایک بار ضرورت ہوتی ہے اور مہینا ہو چکا ہے۔''

''اگر تمہیں تمہاری خوراک نہ ملے تو تم کیسا محسوس کرتی ہو؟'' ایرک نے بھی خون کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا۔

''میں کمزور ہو جاتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پھر میرا دل چاہتا ہے ہر وقت سوتی رہوں۔''

''تم کہاں سوتی ہو؟''

ایلی اسے فلیٹ کے ایک واش روم میں لائی اور وہاں موجود باتھ ٹب دکھایا۔ جس میں ایک تکیہ اور چھوٹا سا کمبل بھی تھا۔ کھڑکی کے شیشے پر یہاں بھی ایک بڑا سا پوسٹر چپکا ہوا تھا جو دھوپ کو اندر آنے سے روکتا تھا۔ فلیٹ کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں یہاں سردی بے پناہ تھی۔ ایرک نے پوچھا۔ ''تم اتنی سردی میں سو جاتی ہو۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ مجھے سردی یا گرمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ایرک کو اس پر ترس آنے لگا۔

''تمہیں خوراک کی ضرورت ہے؟''

''ہاں لیکن ولسن نہیں ہے وہی مجھے خوراک لا کر دیتا تھا۔'' ایلی ٹب کے کنارے بیٹھ گئی۔

ایرک کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''تم... میرا خون لے سکتی ہو۔''

ایلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایرک! تم دنیا میں واحد انسان ہو جس کو میں ذرا سی تکلیف بھی نہیں دے سکتی۔ اس کے مقابلے میں میرے لیے مرجانا آسان ہے۔''

''لیکن میں بھی تمہیں اس طرح نہیں دیکھ سکتا۔'' ایرک نے کہا۔

''کیا تم میرے لیے خون نہ سکتے ہو؟''

ایرک نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ہاں میں تمہارے لیے خون لاؤں گا اب تم آرام کرو۔''

ایرک نے اسے ٹب میں لٹا کر اسے کمبل اوڑھایا پھر اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ ''میں ضرور لاؤں گا۔''

ایلی سو گئی تھی۔ ایرک باہر آیا۔ اس نے فلیٹ کے دروازے کو ایسے ہی بند کر دیا اور باہر نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خون کہاں سے لائے؟ وہ باہر نکل آیا۔ کسی دوسرے انسان کو مار کر اس کا خون حاصل کرنا ایرک کے بس سے باہر تھا۔ وہ ایک طریقے سے خون حاصل کر سکتا تھا۔ وہ ایک اسٹور پر آیا اور اس نے وہاں سے ایک خالی بوتل اور زخموں پر چپکانے والی میڈیکیٹڈ پٹی حاصل کی۔ اسے لے کر وہ جھیل کے کنارے پارک میں آ گیا۔ آج دن خوشگوار تھا اور تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اس لیے جھیل کے کنارے آنے والوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اسے ایک گوشۂ عافیت تلاش کرنے میں خاصی دقت ہوئی۔ چند درختوں کے درمیان اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے بوتل اور چاقو نکالا اور بوتل کا منہ کھول کر چاقو سے اپنی انگلی میں کٹ لگایا۔ تکلیف سے اس کی سسکی نکل گئی تھی۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے اپنا خون بوتل میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ خون بہنے کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ مزید سست ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی مشکل سے بوتل ایک انچ بھری تھی کہ خون رک گیا۔ اسے انگلی میں زخم پر دوبارہ چرکا لگانا پڑا۔ اس نے کوئی نصف درجن بار چرکے لگا کر مشکل سے نصف بوتل بھری تھی۔ اتنا خون نکلنے پر اس کا اپنا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے ڈھکن مضبوطی سے بند کر کے بوتل بیگ میں رکھ لی۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں سے قصبے کی طرف چل پڑا۔ اس نے راستے میں ایک دکان سے رک کر پانی پیا تو اس کی حالت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ زخم کو بار بار گہرا کرنے سے خون مسلسل رس رہا تھا اور اس نے جو پٹی چپکائی وہ تر ہو چکی تھی۔ اس نے اسے اتار کر پھینک دیا اور دوسری پٹی چپکائی۔ وہ مرکزی سڑک کے بجائے عقبی گلیوں سے ہوتا ہوا اپنے فلیٹ کی عمارت تک آیا اور پھر عقبی سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ اس نے گیلری سے جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ بوشر کام پر جا چکا ہوگا۔ وہ ایلی کے فلیٹ کے دروازے کے سامنے پہنچا تو ٹھٹک گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں اندر آیا لیکن لاؤنج والے حصے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے کمرے میں جھانکا تو اسے واش روم کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہ آگے آیا اور اسے ٹب کے سامنے بوشر نظر آ گیا۔ بوشر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا چاقو تھا۔ ایلی کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ ایرک نے اپنا چاقو نکال لیا اور دبے قدموں آگے آنے لگا۔ اسے خوف تھا کہ بوشر کہیں پلٹ کر نہ دیکھ لے۔ وہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ بوشر نے چاقو والا ہاتھ نیچے ایلی کی طرف کیا ہوا تھا مگر اس کا انداز جارحانہ نہیں بلکہ دفاعی تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ کھڑکی پر تھا۔

ایرک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے لیکن جب اس نے کھڑکی سے چپکا پوسٹر اتارنا شروع کیا تو ایرک سمجھ گیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''نہیں۔''

بوشر چونکا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ اسی لمحے ایلی جاگ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے غراتی آواز نکالی اور اچھل کر ٹب سے باہر نکل آئی۔ ایرک لڑکھڑا کر واش روم سے باہر آ گیا۔ ایلی بوشر کی کمر پر سوار ہو گئی تھی اور دونوں ہاتھ اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیے۔ بوشر اسے اتار پھینکنے کے لیے گھوما تو ایلی کے پاؤں دروازے سے ٹکرائے اور دروازہ بند ہو گیا۔ ایرک اپنی جگہ کھڑا لرز رہا تھا۔ اندر سے ایلی کی غراہٹیں اور بوشر کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ پھر ایلی کی غراہٹیں رک گئیں اور صرف بوشر کی چیخیں سنائی دی رہی تھیں۔ اندر سے چیزیں گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں پھر بوشر کی چیخیں اور دوسری آوازیں رک گئیں صرف ایک آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کتا پانی میں زبان ڈال کر پانی پی رہا ہو۔ ایرک کو نہیں معلوم کہ وہ کتنی دیر کھڑا اسی طرح لرزتا رہا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔

اندر سے آنے والی تمام آوازیں تھم گئی تھیں پھر دروازہ کھلا اور ایلی باہر آئی۔ اس کے منہ پر خون لگا ہوا تھا اور آنکھیں بھی خونیں ہو رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر ایرک کے بدن پر طاری لرزہ بڑھ گیا تھا۔ ایلی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کی آنکھوں کی سرخی ختم ہو گئی اور خون سے رنگے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ آگے بڑھ کر ایرک کے گلے سے لگ گئی۔ ''شکریہ تم میرے لیے خوراک لے آئے۔''

ایرک پرسکون ہونے لگا جب اس کا لرزہ ختم ہو گیا تو ایلی پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ایک کپڑے سے اپنا منہ صاف کر لیا تھا۔ ایرک نے ہچکچاتے ہوئے بوشر کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ مر چکا ہے؟''

ایلی نے سر ہلایا۔ ''ہاں۔''

ایرک پریشان ہو گیا۔ ''پولیس تمہیں گرفتار کر لے گی۔''

''پولیس مجھے نہیں پکڑ سکتی لیکن پریشان کر سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

ایرک مزید پریشان ہو گیا۔ ''یہاں سے جانا ہوگا؟''

''ہاں اب تم یہاں کیسے رہ سکتے ہو۔ اس کے بارے میں کیا جواب دو گے؟'' ایلی نے کھلے دروازے سے اندر پڑی بوشر کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایرک ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

''لیکن کہاں؟''

''جنوب کی طرف۔'' ایلی نے شاید پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ ''جہاں تمہیں برف نہیں ملے گی اور نہ ہی کوئی بوشر جیسا شخص ہوگا۔''

''بوشر مر گیا ہے۔'' ایرک نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''ہاں لیکن تمہاری ہاں تو زندہ اور جوان ہے وہ پھر کسی سے شادی کر سکتی ہے اور وہ شخص بھی بوشر ہی ہوگا۔''

ایرک سوچتا رہا، پھر اس نے سر ہلا دیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

☆☆☆

ایک سال بعد:

ایرک نے بس سے اترنے کے بعد ایلی کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف تیز دھوپ تھی لیکن ایلی سر سے پاؤں تک ایسے لباس میں ڈھکی ہوئی تھی کہ اس کے جسم کا ذرا سا حصہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ خوف زدہ تھی اس نے منمنا کر ایرک سے کہا۔ ''پلیز جلدی سے کسی ایسی جگہ چلو جہاں دھوپ نہ ہو۔''

ایک سال میں ایرک کا قد لمبا ہو گیا تھا اور جسم بھر گیا تھا۔ اب وہ اپنی عمر سے بڑا نظر آتا تھا۔ اس نے اعتماد سے ایلی سے کہا۔ ''فکر مت کرو کچھ دیر میں ہم محفوظ جگہ پر ہوں گے۔''

وہ گزشتہ ایک سال سے سفر میں تھے کیونکہ ابھی وہ ایرک کی کم عمری کی وجہ سے کہیں ٹھکانا بنا کر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک دو سال بعد وہ ایسا کر سکتے تھے۔ انہوں نے جنوب کی طرف سفر کیا اور گھومتے گھماتے امریکا پہنچ گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی کاغذ نہیں تھا لیکن انہیں کسی نے روکا بھی نہیں تھا۔ ایلی کی خوراک کا مسئلہ یہاں جا بجا پائے جانے والے بدمعاشوں نے حل کر دیا تھا۔ ایلی کو دیکھ کر وہ خود پیچھے آتے تھے اور پھر وہ موقع دیکھ کر انہیں قابو کر لیتی۔ وہ خوش تھی کیونکہ اس کے سابق ساتھیوں کے مقابلے میں ایرک کم عمر ہونے کے باوجود ذہین تھا اور اس نے دن میں ایلی کے باہر نکلنے کا مسئلہ بھی حل کر دیا تھا۔ وہ ایک چھوٹے شہر پہنچے تھے اور کسی ہوٹل کی تلاش میں جا رہے تھے کہ ایک لفنگا شخص ان کے پیچھے آنے لگا۔ ایلی نے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے ایرک سے کہا۔

''ایک آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔''

ایرک مسکرانے لگا۔ ''یہ تو اچھی بات ہے تمہیں آخری بار خوراک لیے ایک مہینا ہونے والا ہے۔''

ایلی بھی مسکرانے لگی۔ ''ہاں یہ اچھی بات ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

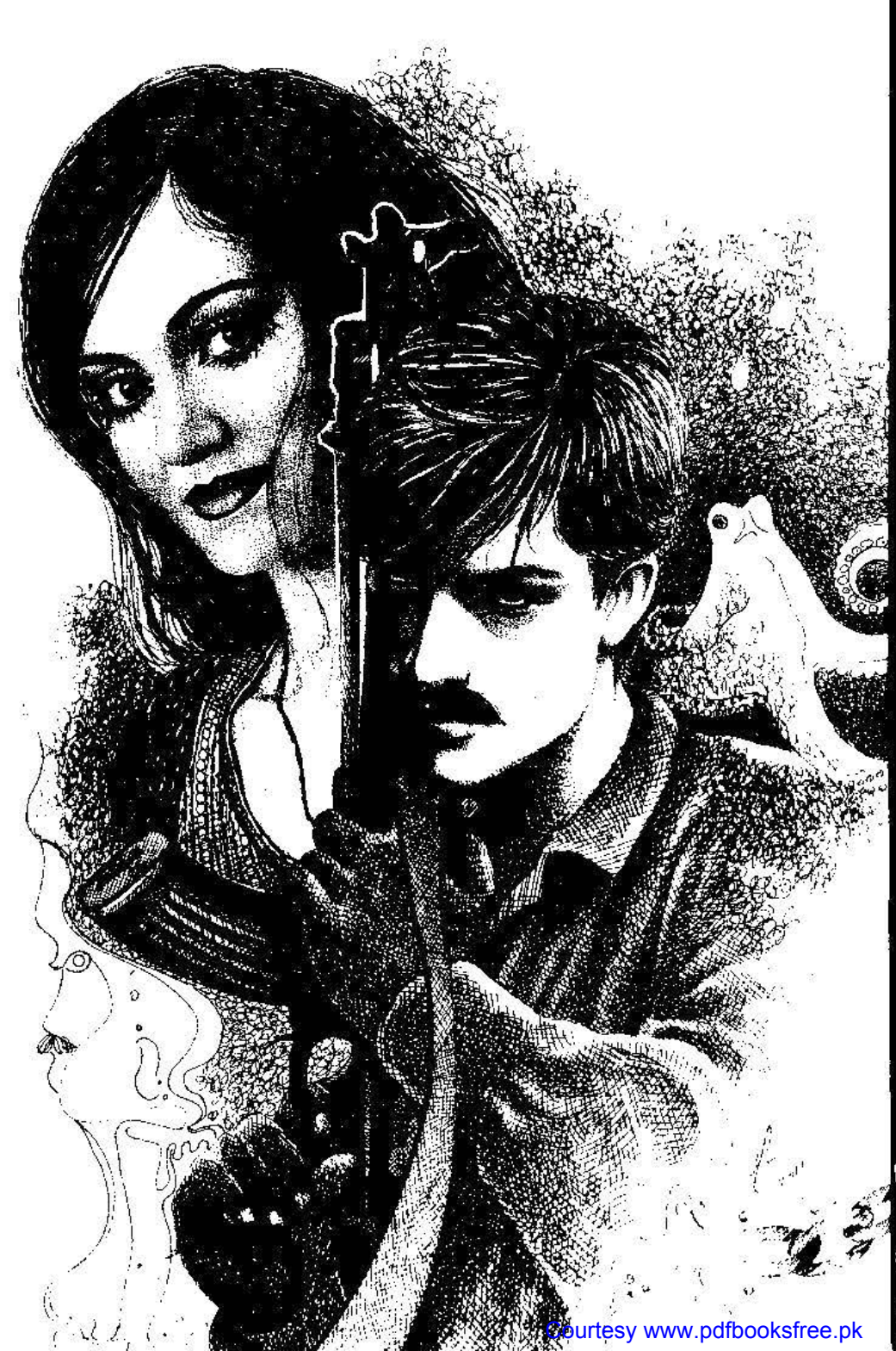

کشکول

انوار صدیقی

تیسری قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

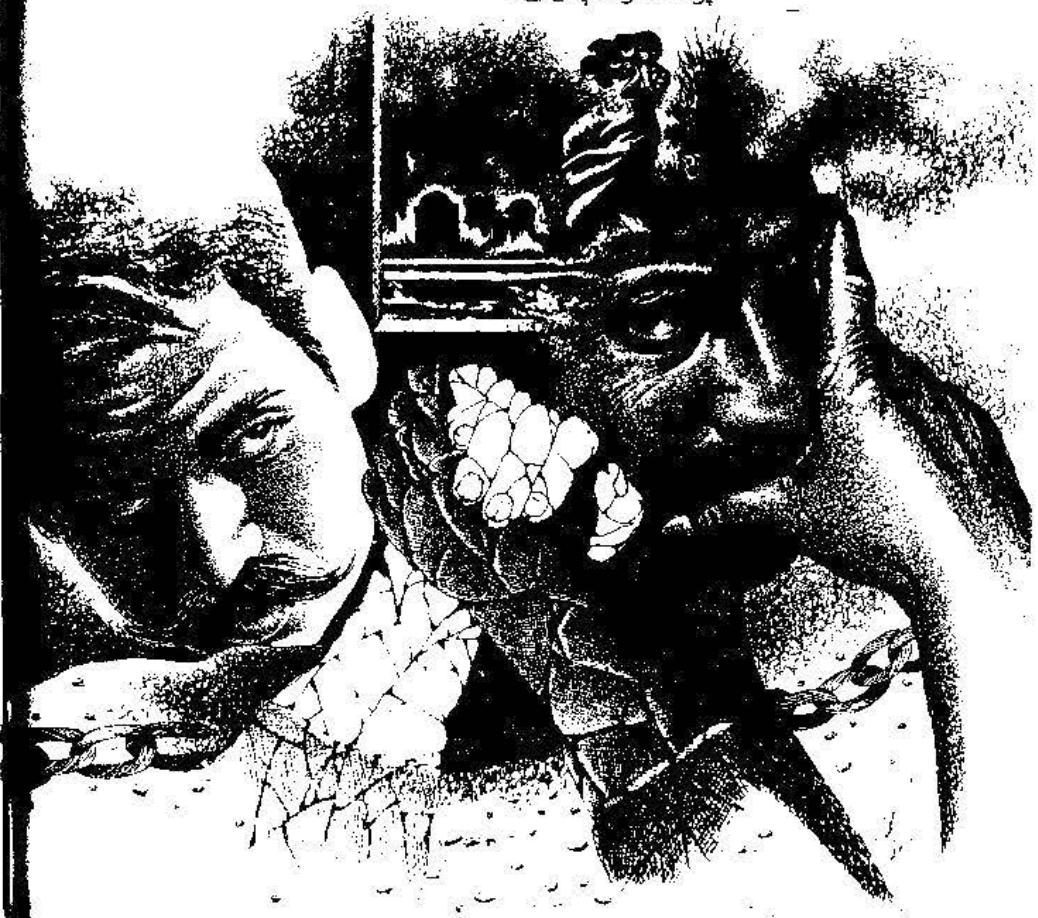

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیسے کہتا صاحب؟......" لیاقت نے بے بسی سے کہا۔ "اگر کسی سے کہتا تو وہ بھی مجھے دیوانہ یا پاگل ہی سمجھتا۔"

"ٹھیک ہے...... تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر مجھے یقین ہے لیکن......" سراج نے پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "تم ان نشانات کے بارے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

لیاقت نے بڑی معصومیت سے اقرار کر لیا پھر کسمسا کر پوچھا۔ "صاحب، اس خاتون کا کیا بنا؟...... کیا اس کے دشمن اسے اغوا کر کے لے گئے؟"

"نہیں......" سراج نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "وہ خاتون اسپتال میں داخل ہے۔ پولیس نے ان دو افراد کو گرفتار کر لیا ہے جو خاتون کو اغوا کرنا چاہتے تھے لیکن...... تم اس سلسلے میں کسی اور سے کچھ مت کہنا۔"

"صاحب...... ایک بات بولوں؟" لیاقت حسین کے لہجے میں انکساری تھی۔

"بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"صاحب...... میں آپ کا اور اس گھر کا غلام ہوں پھر آپ لوگوں کے بارے میں کسی اور کے سامنے زبان کس طرح کھول سکتا ہوں؟ میں نمک حرام نہیں ہوں صاحب۔"

"پریشان مت ہو لیاقت۔" سراج نے اس کے جواب اور اس کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ "میں بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔"

"خدا آپ کو خوش رکھے صاحب۔" لیاقت حسین نے دل سے دعا دی پھر...... سراج کے جانے کے بعد بھی اس دیوانے کے بارے میں غور کرتا رہا جو اسے پراسرار صلاحیت سے نواز کر کہیں اور نکل گیا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ شبنم کو متعلقہ سب انسپکٹر کے آنے سے پیشتر ہی میڈم روبی سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی نے اسے دروازے پر روکا ضرور تھا لیکن ریڈ کراس کے عملے کے جونیئر ڈاکٹر کی سفارش پر اسے اجازت مل گئی۔ یہ وہی وقت تھا کہ جب سب انسپکٹر کو اچانک ایس پی آغا منظور نے فوری طور پر طلب کر لیا تھا۔

میڈم روبی اس وقت اپنے بستر پر لیٹی گزرے ہوئے حادثے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔ اپنے مرحوم شوہر کی موت کے بارے میں اس نے پہلی بار افضل خان کو اصلیت سے آگاہ کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ افضل خان، شیخ حامد کے سب سے قریب ہے، اسی لیے اس نے افضل کی شخصیت میں دلچسپی لینی شروع کی تھی اور بالآخر ایک جوا کھیلنے کا ارادہ کر کے اس کے اپارٹمنٹ بھی چلی گئی تھی، اسے علم تھا کہ ان دنوں شیخ حامد ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ ہر چند کہ افضل خان نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ روبی کی پرکشش آفر سے انکار کرنے کے بارے میں بھی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرے گا۔

افضل خان کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہی اچانک دو آدمیوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک فرشتہ صفت انسان نے اچانک اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسے بچا لیا تھا۔ وہ موقعے سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل جانے کی خاطر اپنی کار کی سمت لپکی تھی لیکن اس کے بائیں بازو میں جیسے کسی نے ناقابل برداشت قسم کی آگ بھر دی تھی، اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے ہوش ہو گئی۔ پھر اس کی بے ہوشی ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق پورے سترہ گھنٹے گزر جانے کے بعد ختم ہوئی تھی اور...... اب وہ بڑی سنجیدگی سے کچھ سوالوں کا جواب تلاش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ کون لوگ تھے جو اسے اغوا کرنا چاہتے تھے؟ کیا ان کا تعلق بھی شیخ حامد سے تھا یا وہ اسے موٹی آسامی سمجھ کر تاوان حاصل کرنے کی غرض سے اغوا کی تاک میں کسی مناسب موقعے کی تلاش میں تھے؟ کیا اس واردات میں افضل خان پر بھی شبہ کیا جا سکتا تھا؟ اور وہ خدا کا نیک بندہ کون تھا جس نے جان پر کھیل کر اسے بچانے کی کوشش کی تھی؟ وہ زندہ بھی تھا یا ملزموں نے اسے راستے کی دیوار سمجھ کر ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا تھا؟ وہ انہی خیالات میں گم تھی جب اس نے ایک خاتون کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا، چہرہ کچھ شناسا تھا لیکن وہ پہلے باقاعدہ اس سے کبھی نہیں ملی تھی۔

"ذہن پر زور نہ دیں۔" شبنم نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کے قریب جا کر کہا۔ "میں یہاں ایک ڈاکٹر سے ملنے آئی تھی، آپ کے حادثے کی خبر سنی تو خیریت دریافت کرنے آ گئی۔"

"میرا خیال ہے کہ...... میں تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں؟" میڈم روبی نے مدھم مگر مترنم آواز میں کہا۔

"ضرور دیکھا ہو گا۔" شبنم مسکرائی۔ "ایک دو بار کسی سہیلی ممبر کے ساتھ میں بھی ریمبو کلب آ چکی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ ہوش میں آ گئیں۔" شبنم نے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا۔ "باہر پولیس کا پہرہ ہے لیکن میں ایک ... کی وجہ سے آپ تک آ گئی...... اب اجازت چاہتی ہوں۔"

"...ایک منٹ۔" میڈم روبی نے اسے روکتے ہوئے ... "تم نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔"

"...میرا نام شبنم ہے۔"

"...پیارا نام ہے۔ ویسے تم کام کیا کرتی ہو؟"

"ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ٹیلی فون آپریٹر ہوں۔"

ملٹی نیشنل کمپنی کے حوالے پر میڈم روبی نے چونک کر پوچھا۔ "کیا نام ہے اس کمپنی کا؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ کو شاید اس کا نام سن کر زیادہ خوشی نہ ہو گی۔" شبنم نے بڑی ڈپلومیسی سے ہچکچا کر کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ "میں شیخ حامد کی کمپنی کے ہیڈ آفس میں ملازم ہوں۔"

"آئی سی۔" میڈم روبی شیخ حامد کا نام سن کر کسمسائی پھر اس نے شبنم کو متوحش نظروں سے دیکھا۔ "تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ تمہاری کمپنی کا نام سن کر مجھے خوشی نہیں ہو گی؟"

"فی الحال میں جلدی میں ہوں اس لیے صرف اتنا عرض کروں گی کہ ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں......؟" میڈم روبی کے ذہن کو شبنم کا جواب سن کر جو ذہنی جھٹکا لگا، وہ قدرتی امر تھا۔

"اس وقت میں آپ کے پاس ایک مختصر سی درخواست لے کر آئی ہوں۔" شبنم نے کمرے میں چاروں طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔ "آپ کو جن لوگوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی ان کا مقصد شاید تاوان حاصل کرنا ہو لیکن افضل خان بہت گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی درخواست ہے کہ اگر آپ اس سے ملاقات اور اس کے اپارٹمنٹ میں جانے کا ذکر کسی طرح اپنے بیان میں شامل نہ کریں تو وہ آپ کا شکر گزار رہے گا۔"

"ٹھیک ہے......" روبی نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "میں اس کا نام خود بھی درمیان میں لانا پسند نہیں کروں گی۔"

"بہت بہت شکریہ......"

"کیا تم میرے اسپتال سے ریلیز ہونے کے بعد دوبارہ کسی وقت مل سکتی ہو؟"

"آپ کو اس وقت جو تجسس ہو رہا ہے، میں اسے سمجھتی ہوں۔" شبنم بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ "میں یقیناً کوشش کروں گی کہ کوئی مناسب موقع نکال کر آپ سے کم از کم ایک تفصیلی ملاقات کروں۔ چلتے چلتے یہ ضرور عرض کروں گی کہ میں نے ... جواب کچھ سوچ سمجھ کر ہی حاصل کی ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر دشمن کو میری حقیقت یا اصلیت کا علم ہو گیا تو وہ مجھے کسی پاؤں کے نیچے آئی چیونٹی سمجھ کر کچل ڈالنے میں ایک پل کی بھی تاخیر نہیں کرے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ایک بات یہ بھی کبھی نہ بھولنا کہ مارنے والے کے حق میں بچانے والا زیادہ طاقت رکھتا ہے۔"

"میں اب اجازت چاہوں گی۔" شبنم ہاتھ ملانے کے بعد جانے کے لیے پلٹی تو روبی نے تیزی سے کہا۔

"مجھے ایک اہم بات اور معلوم کرنی ہے۔"

"پوچھیے۔ اگر میرے علم میں ہوئی تو بتانے سے گریز نہیں کروں گی۔"

"تھینکس...... تم نے اخبارات میں میرے حادثے کی تفصیل ضرور پڑھی ہو گی۔ ایک نامعلوم شخص نے جو سادہ سے لباس میں تھا، حیرت انگیز طور پر نہتا ہونے کے باوجود مجھے اغوا کرنے والوں کے شکنجے سے کھینچ لیا تھا، وہ کون تھا؟"

"اخبارات میں صرف علاقہ پولیس اور سب انسپکٹر کے علاوہ کسی اور کا کوئی ذکر نہیں ہے۔" شبنم نے جواب دیا۔ "وہاں سادہ لباس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہو گا بھی تو اخبارات میں اس کا ذکر نہیں ہے۔"

"کسی لاش کی اطلاع بھی نہیں شائع ہوئی؟"

"جی نہیں......"

"او کے۔" میڈم روبی نے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔ "اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ اسپتال کے جھمیلوں سے نجات ملنے کے بعد میں تمہاری ملاقات کا انتظار بڑی شدت سے کروں گی۔"

شبنم نے دوبارہ وعدہ کیا پھر وہ خاموشی سے نکلتی چلی گئی۔ اسے خوشی تھی کہ وہ کسی بہانے میڈم روبی سے ذاتی طور پر بھی مل لی تھی، اس خوشی کے پشت پر اس کی زندگی کا ایک راز تھا جس نے اسے اپنے بدترین دشمن کے دفتر میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ روبی کی طرح وہ بھی کسی اپنے کے لیے شیخ حامد سے پرانا حساب کتاب چکتا کرنے کے لیے بے حد مضطرب تھی۔

☆☆☆

اخبار نے علاقہ سب انسپکٹر کے حوالے سے میڈم روبی کے بارے میں جو مزید خبر شائع کی تھی، اس میں یہی لکھا تھا کہ میڈم روبی جو ایک کروڑ پتی بیوہ ہے، پوش علاقے کے فلک نور اپارٹمنٹس میں اپنی ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی، تقریباً ایک گھنٹے تک وہ اپنی سہیلی کے اپارٹمنٹ میں رہی۔ واپسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں وہ اپنی کار میں بیٹھنے جارہی تھی جب اسے دو افراد نے اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس کی گشتی پارٹی نے اسے بروقت بچالیا۔ پولیس کو اپنے بیان میں اس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کا کوئی دشمن نہیں ہے جس پر وہ شبے کا اظہار کرسکے۔ اس کا ذاتی خیال بھی یہی ہے کہ کسی پیشہ ور گروہ نے اسے تاوان کی خاطر اغوا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ آخر میں یہ بھی درج تھا کہ میڈم روبی نے متعلقہ سب انسپکٹر کو اپنی جیب خاص سے بیس ہزار بطور انعام دیے ہیں اور آئی جی سے اس کی ترقی کی سفارش بھی کی ہے۔ جن دو افراد کو پولیس نے گرفتار کیا تھا انہوں نے عدالت کے روبرو اپنا جرم تسلیم کرلیا۔ اس سے پیشتر بھی وہ ایک بار چھ ماہ قید بامشقت کی سزا بھگت چکے ہیں۔

افضل خان نے پوری تفصیل پڑھنے کے بعد سکون کا سانس لیا۔ میڈم روبی نے اس کے اپارٹمنٹ یا اس سے ملاقات کے سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ شبنم نے گزشتہ روز اسے میڈم سے اپنی ملاقات کے بارے میں جو تفصیل بتائی تھی وہ غلط نہیں تھی، افضل خان نے شبنم کی اس مہربانی کو بھی اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا تھا کہ وہ بھی افضل خان کو پسند کرتی تھی۔ دبی زبان میں اور اشاروں کنایوں میں اس کا اظہار بھی کرچکی تھی لیکن افضل خان نے ابھی تک اس طرح کا قدم اٹھانے سے محض اس لیے گریز کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک ہی دفتر میں کام کرتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ خود بھی اسے پسند کرتا تھا مگر بگ باس کے اچانک نازل ہونے والے عتاب سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔ بہرحال، اخبار تفصیل سے پڑھنے کے بعد اس نے سکون کا گہرا سانس لیا تھا لیکن اس کا یہ اطمینان دوسری صبح دفتر پہنچتے ہی ختم ہوگیا۔ وہ وقت پر دفتر پہنچا تھا، اس کے سیٹ پر بیٹھنے کے آدھے گھنٹے بعد چپراسی نے اسے بگ باس کی آمد کی اطلاع دی پھر پندرہ بیس منٹ میں اس کی طلبی کا حکم بھی آگیا۔

حسب معمول اس وقت بھی شیخ حامد اپنے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے میں موجود تھا۔ اس کے تیور اچھے نظر نہیں آرہے تھے، افضل خان کے سلام کا جواب بھی اس نے اشارے سے دیا، پھر اسی کے اشارے پر وہ سامنے والی خالی نشست پر بیٹھ گیا۔

شیخ حامد کچھ دیر خاموش بیٹھا سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کو میز کے شیشے پر دباتا اٹھاتا رہا پھر اس نے افضل خان سے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔ ''میری غیر موجودگی کے درمیان کوئی خاص رپورٹ؟''

''باقی سب ٹھیک رہا لیکن......''

''میڈم روبی کے اغوا کی تفصیل میں سن بھی چکا ہوں اور اس کی تفصیلات اخبار میں بھی دیکھ چکا ہوں۔'' شیخ حامد نے اس کا جملہ کاٹ کر بدستور خشک انداز میں کہا۔ ''اخبار میں جس اپارٹمنٹ کا ذکر ہے وہ شاید تمہارے اپارٹمنٹ کے بہت قریب ہے۔''

''یس باس۔'' افضل خان نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

''میڈم روبی کے بارے میں تم کیا جانتے ہو......؟''

''وہ ایک کروڑ پتی بیوہ ہے...... اس کے شوہر کا انتقال کہیں بیرون ملک ہوا تھا، شوہر کی زندگی میں وہ ایک مکمل گھریلو عورت تھی لیکن اس کے بعد ادھر غالباً ایک یا ڈیڑھ ماہ سے وہ بالکل ماڈرن انداز میں منظر عام پر آئی ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے بینکویٹ ہالز اور کئی وی آئی پی ٹائپ کلبوں کی ممبر بھی ہے۔''

''تمہاری اس سے کوئی ذاتی واقفیت......؟'' شیخ حامد کی عقابی نظریں بدستور افضل خان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی......'' افضل خان نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''وہ میرے لیول سے خاصی اونچی چیز ہے، مردوں سے زیادہ گھلنا ملنا بھی پسند نہیں کرتی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم بھی رینبو کلب کے باقاعدہ ممبر ہو اور وہاں کے منیجر سے تمہاری خاصی بے تکلفی بھی ہے۔''

''یس باس، لیکن......''

''میں چاہتا ہوں کہ تم روبی سے دوستی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔'' شیخ حامد کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ ''جس حد تک بھی جاسکو، میری طرف سے اس کی پوری اجازت ہے۔''

''او۔کے باس۔'' افضل خان نے کسمسا کر مدھم آواز میں کہا۔

''تم نے میرے اس نئے حکم کی کوئی وجہ نہیں پوچھی؟''

''میرا کام آپ کے حکم کی پیروی کرنا ہے۔'' افضل خان نے سعادت مندی کا اظہار کیا۔ ''میں نے وجہ جاننے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی۔''

''اچھا کیا تم نے۔'' شیخ حامد پہلی بار مسکرایا۔ ''میں آئندہ بھی تمہیں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ کسی بات کو کریدنے کی کوشش کرو لیکن...... میڈم روبی کے بارے میں تم کو یہ ضرور بتانا پسند کروں گا کہ وہ بھی میرے مخالف گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔''

''ایسی صورت میں تو اسے راستے سے

''نہیں......'' شیخ حامد کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ''ناگن کا پھن کچل دینے کے بجائے اسے بین کی لے پر ناچتے ہوئے دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے، تم سمجھ گئے میری بات؟''

''یس سر......'' افضل خان نے بھی زیرلب مسکرا کر کہا۔ ''ایس تھوری کی بلیک میلنگ اسٹف جو اس ناگن کی [illegible] ہمیشہ تیار رکھے۔''

''کام ہوشیاری سے کرنا......'' شیخ حامد یک لخت سنجیدہ ہوگیا۔ ''میں میڈم روبی کے سلسلے میں تمہاری ناکامی کی کوئی وجہ نہیں سنوں گا۔''

''ایسا بھی نہیں ہوگا باس......''

''میرے پاس ایک اطلاع اور بھی ہے......''

''وہ کیا باس؟'' افضل خان نے دریافت کیا۔

''وحید کی ناکامی کا سبب کون تھا؟ اس کا نام جانتے ہو؟''

''وہ...... سیٹھ عثمان کا ملازم لیاقت حسین تھا جو اب وہاں ڈرائیوری کے فرائض......''

''میڈم کے سلسلے میں اخبارات میں جو تفصیل آئی ہے وہ مکمل نہیں ہے۔'' شیخ حامد نے افضل خان کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس رات میرے مخبر کی اطلاع کے مطابق ڈی ایس پی سراج بھی کہیں قریب ہی گاڑی میں بیٹھا اس خوبصورت ناگن کی نقل و حرکت واچ کر رہا تھا، اس کے ساتھ لیاقت حسین بھی تھا۔'' شیخ حامد ایک پل کو خاموش ہوا پھر ''انہی کی محنت کی وجہ سے خوبصورت ناگن ہمارے ہاتھ سے نکل آتے آتے رہ گئی۔''

''یہ بات میرے علم میں نہیں ہے۔'' افضل خان نے [illegible] بگ باس کے جملے کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔ ''[illegible] نے میڈم روبی کی نگرانی کررہا تھا؟''

''یہ بھی معلوم ہوجائے گا لیکن اب لیاقت حسین پر بھی نظر رکھو۔'' شیخ حامد نے کسی زخمی ناگ کی طرح بل کھا کر حکم [illegible] ''وہ کہاں رہتا ہے؟ اس کے ساتھ اور کتنے نمک حلال [illegible]؟ کس وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے؟ کس وقت جاتا ہے؟ [illegible] تفصیل درکار ہے۔ جو شخص دوبار میرا راستہ کاٹ [illegible] سے زیادہ دنوں برداشت کرنے کا عادی نہیں [illegible]''

''[illegible] سمجھ رہا ہوں باس لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم [illegible]''

''[illegible]'' شیخ حامد کے تیور اچانک ہی

خطرناک ہوگئے۔ ''جتنا حکم دیا جائے صرف اسی پر عمل کیا کرو...... میں نے تم سے کوئی مشورہ طلب نہیں کیا تھا...... ناؤ گیٹ لاسٹ۔''

''سوری سر......'' افضل خان نے سہمے انداز میں کہا پھر تیزی سے اٹھ کر کسی پالتو کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

گل خان، زرینہ اور فرحین کو لاری اڈے پہنچانے کے بعد لیاقت حسین ٹھیک ساڑھے دس بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ اس نے بس کے ٹکٹ اور سیٹس دو روز پہلے ہی بک کرالیے تھے۔ ایک دن پہلے اندر کی پرانی ملازمہ اور گارڈ کو بھی مطلع کردیا تھا کہ وہ ڈیوٹی پر ڈیڑھ دو گھنٹے لیٹ آئے گا۔ اسے فرحین کے چلے جانے کی خوشی بھی تھی اور اپنی تنہائی کا احساس بھی۔ وہ چاہتا تھا کہ طرح فرحین کو جن خوابوں نے پریشان کررکھا تھا وہ ان سے کچھ دور ہوجائے اور مہینے ڈیڑھ مہینے گھر والوں سے بھی مل آئے۔ یہ بھی جانتا تھا کہ فرحین اور گل خان کی غیر موجودگی میں اس کا وقت گزارنا مشکل ہوجائے گا۔

فرحین کی خواہش تھی کہ لیاقت حسین کی ماں کے لیے جمع کی ہوئی رقم بھی ساتھ لے جائے لیکن لیاقت حسین نے اسے سمجھا بجھا کر وہ رقم ایک روز پہلے ہی منی آرڈر کردی تھی، اس نے اپنے گھر والوں کو بھی فرحین کی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی، اس لیے کہ فرحین کو اچانک دیکھ کر گھر والوں کو جو خوشی ہوتی، اسے وہ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ڈیوٹی پر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے پرانی ملازمہ کو اطلاع دی پھر حسب معمول کوٹھی کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد چاچا غفور کے پاس آگیا۔ اس نے ایک روز قبل ہی گل خان کے توسط سے جوان مالی کا انتظام کرلیا تھا۔ راؤنڈ لیتے وقت اس نے نئے ملازم رب نواز کو کام میں بھی مصروف دیکھا تھا۔

''اب طبیعت کیسی ہے غفور بابا......؟''

''اوپر والے کا کرم اور تیری مہربانی ہے پتر، ڈاکٹر کی دوائی سے آرام بھی ملا اور......'' غفور نے لیاقت کو شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو نے نئے مالی رب نواز کو رکھ کر میرا کام بھی ہلکا کردیا ہے۔ رب تیرا بھلا کرے۔''

''بھروسے کا آدمی ہے بابا...... میں نے ٹھونک بجا کر اطمینان کرلیا تھا، میرے دوست کا واقف کار بھی ہے۔''

''اپنا کام بھی ہنسی طرح جانتا ہے پتر۔'' غفور نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''نہیں تو سوچنے کی بات ہے۔'' گل خان نے ہاتھ مسلتے ہوئے جواب دیا۔ ''گاڑی میں اور بھی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں لیکن میرا دل ہوتا ہے کہ وہ کسی کے اشارے پر صرف ہماری آبرو کا جنازہ اٹھانے آئے تھے۔ خدا ان نامرادوں کا بیڑا غرق کرے۔''

لیاقت حسین کے ذہن میں بھی قسم قسم کے شبہات ابھر رہے تھے۔ وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے گل خان کو ساتھ لے کر دوبارہ بس اڈے پر پہنچ گیا۔ رات تک وہ وہاں دکانداروں، ٹھیلے والوں، ٹکٹ گھر والوں اور دوسری بسوں میں کام کرنے والے لوگوں سے اس بارے میں پوچھتے رہے لیکن کسی سے بھی کوئی مفید معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ سراج کے دفتر پہنچ گیا لیکن اس وقت وہاں صرف ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ وہ لیاقت کو ایک دوبار دیکھ چکا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔ ''صاحب کا ڈیوٹی تو شام چھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔''

''پھر...... اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟'' لیاقت نے پوچھا۔

سپاہی نے تھوڑی حیل وحجت کے بعد اسے گھر کا پتا بتا دیا۔ گل خان نے ساتھ نہیں چھوڑا تھا، وہ اس کا واقف کار بھی تھا اور قریب ہی بستی میں رہتا تھا۔ لیاقت اس کے ساتھ سیدھا سراج کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔ اسے یقین تھا کہ سراج ہی اس کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں وہ اور گل خان کہاں کہاں بھٹکتے پھرتے۔

رات کے تقریباً پونے گیارہ بجے سراج نے لیاقت حسین اور گل خان کو دیکھا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔ لیاقت حسین نے ایک ہی سانس میں اسے ساری کہانی سنا ڈالی پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''کچھ کرو صاحب...... ورنہ ہم دونوں برادری میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

سراج ان دونوں کے ساتھ لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ فوری طور پر وہ کچھ کر گزرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، تاہم وہ لیاقت حسین کی سنائی ہوئی کہانی پر غور کرتا رہا پھر اس کے ذہن میں ایک خیال بڑی سرعت سے ابھرا، جو لوگ چند روز میں پوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کی پشت پر کسی کا ہاتھ بھی ضرور ہوگا۔ وحید ڈرائیور کی غداری اگر کام آئی تو عثمان کی موت یقینی تھی لیکن لیاقت نے بروقت پہنچ کر سب ہی بنا پر تائم بم کی اطلاع دے کر مجرموں کی کوششوں پر پانی ڈال دی تھی۔ اس کے بعد میڈم روبی نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

کہا۔ ''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے پردوں سے محبت بھی ہے۔''

لیاقت حسین کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اندر سے بلاوا آ گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب گھر کی دیکھ بھال کرنے والی بیگم صاحبہ نے اسے طلب کیا تھا۔ وہ کوٹھی کے دروازے پر پہنچا تو وہاں ایک ملازمہ اس کی منتظر تھی، اسے اندر بلا لیا گیا۔ سامنے ایک ادھیڑ عمر کی خاتون کھڑی تھیں۔ لیاقت حسین نے ان پر نظر پڑتے ہی سلام کرنے کے ساتھ ساتھ نظریں بھی جھکا لیں۔ پہلی نظر میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ نیک دل اور بردبار خاتون تھیں۔

''سنا ہے تم آج دو گھنٹے لیٹ آئے ہو؟''

''جی ہاں، میں نے گل......''

''مجھے علم ہو چکا ہے کہ تم نے بیوی کو اس کے گھر بھیجا ہے۔'' خاتون نے مہذب لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہارے گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟''

''جی نہیں......'' لیاقت نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ''اور تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''میں یہی معلوم کرنا چاہتی تھی۔'' خاتون نے جواب کے ساتھ ایک حکم بھی سنا دیا۔ ''آج سے دونوں وقت کا کھانا اور ناشتا تم ادھر کوٹھی پر ہی کرو گے۔ میں کسی قسم کا انکار نہیں سنوں گی، کل راحیلہ اور عثمان کا فون آیا تھا، ان دونوں کا بھی یہی حکم ہے۔''

''آپ لوگوں کا حکم سر آنکھوں پر۔'' لیاقت حسین نے بڑی عقیدت سے جواب دیا۔ ''اب میں وقت پر آؤں گا لیکن رات کو زرا دیر سے جایا کروں گا۔''

''یہ تمہاری مرضی ہے لیاقت حسین۔'' اس بار بے حد اپنائیت اور پیار بھرے لہجے میں کہا گیا۔ ''عثمان اور راحیلہ بھی تمہیں ملازم نہیں، بلکہ گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے ہیں' اور بھی کسی قسم کی ضرورت ہو تو کسی تکلف سے کام نہ لینا۔ مجھے خوشی ہوگی۔''

''بڑی مہربانی بیگم صاحب۔'' لیاقت نے کہا پھر سلام کر کے نظریں جھکائے جھکائے واپس آ گیا۔ نئی بیگم صاحبہ نے اس سے جس محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا تھا وہ بھی اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔

اس روز اس نے دوپہر کا کھانا بوڑھے مالی غفور کے ساتھ اسی کے کمرے میں کھایا۔ کھانا ختم کر کے وہ گھر کے باہر چکر لگانے نکلا۔ گیٹ سے نکلتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گل خان کو گھر کے سامنے دیکھ کر اس کے ذہن میں بے شمار وسوسے سر ابھارنے لگے۔ گل خان بھی اسے دیکھ کر لمبے لمبے قدم اٹھاتا قریب آ گیا۔

''کیا بات ہے گل خان؟'' لیاقت نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ''کیا تم لوگ گئے نہیں......؟''

''لیاقت...... میرے یار......'' گل خان پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''بس روانہ ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ہم حاجت پوری کرنے کو ذرا ادھر گیا واپس آیا تو پتا چلا کہ کچھ نقاب پوش ایک لینڈ کروزر جیسی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر آیا۔ جب وہ باہر نکلے تو ان کی تعداد چار تھی، سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ...... وہ تیری فرحین اور اپنی زرینہ کو زبردستی گھسیٹ کر لے گئے۔ کنڈیکٹر نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو اسے بھی رائفلوں کے بٹ مار کر نیچے گرا دیا...... مسافروں میں سے بھی کوئی مدد کے لیے سامنے نہیں آیا۔ جانے وہ کون خدائی خوار تھے؟''

لیاقت حسین کو زمین اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہوئی۔ اس کا چہرہ غصے سے تپ کر سرخ ہونے لگا۔

☆☆☆

غصے کی شدت سے لیاقت حسین کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ گل خان نے زرینہ اور فرحین کے اغوا کی خبر سنا کر ایک لمحے کو اسے بالکل گنگ کر دیا تھا، اس کے اندر طوفان ٹھاٹیں مار رہا تھا، اس شہر میں اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی، اتنا دولت مند بھی تھا نہیں کہ وہ معمولی تاوان کی ادائیگی ہی کر سکتا پھر؟ ان دونوں کو کیوں اغوا کیا گیا؟ کس نے اغوا کیا؟ اس کے ذہن میں مختلف خیالات ابھر رہے تھے' جب گل خان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''کیا سوچ رہے ہو لیاقت، ہمیں فوری طور پر اس معاملے کی رپورٹ تھانے میں درج کرانی چاہیے۔''

''نہیں...... ہم کو سب سے پہلے سراج صاحب سے بات کرنی ہوگی لیکن...... کسی نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟''

''کدھر سے کرتا......'' گل نے جھلا کر جواب دیا۔ ''ان خنزیر کے بچوں نے نمبر پلیٹ کے اوپر سیاہ چمڑے کا کور ڈال رکھا تھا۔ ان کے چہرے بھی نقاب میں چھپے ہوئے تھے، خدا جانے وہ دونوں کس حال میں ہوگا......؟''

''تمہاری ادھر کسی سے کوئی پرانی دشمنی تو نہیں چل رہی تھی؟''

''نہیں''

''پھر...... ان کو ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟''

اغوا کی ناکامی میں بھی لیاقت حسین نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ممکن ہے ان دونا کامیوں کی وجہ سے کسی دشمن نے لیاقت حسین کو وقتی طور پر ایک وارننگ دینے کی خاطر فرحین اور زرینہ کو اغوا کرا لیا ہو۔ زرینہ ساتھ تھی اس لیے وہ بھی لپیٹ میں آ گئی۔

سراج کا ذہن کسی نتیجے پر پہنچنے کی خاطر تانے بانے بنتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ وحید کی غداری کی پشت پر شیخ حامد اور افضل خان کا ہاتھ شامل تھا، اسی لیے اس نے وقتی طور پر سیٹھ عثمان اور راحیلہ کو دو مہینے کے لیے بیرون ملک بھیج دیا تھا، ڈی آئی جی کرائمز کو اعتماد میں لے کر اس نے شیخ حامد کو زیپ کرنے کا خطرہ بھی مول لے لیا تھا لیکن میڈم روبی کے اغوا سے شیخ حامد کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ یک لخت سراج کے ذہن میں ایک نئے شبہے نے سر ابھارا۔ ہو سکتا ہے کہ میڈم روبی کے اغوا میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد ہی کا ہاتھ شامل ہو، اسے بھی ایسے وقت اغوا کیا جا رہا تھا جب خود شیخ حامد ملک سے باہر تھا۔ اس نئے خیال نے سراج کو اور بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

''ہمارے لیے کیا حکم ہے صاحب۔'' لیاقت نے سراج کی طویل خاموشی سے تنگ آ کر دبی زبان میں پوچھا۔

''میں تمہارے ہی معاملے پر غور کر رہا تھا۔'' سراج نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو تمہاری اور گل خان کی بیوی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ انہیں لے گئے ہیں وہ تم سے کسی وقت رابطہ کرنے کی کوشش بھی کریں۔ اگر ایسا ہو تو تم ان سے سنبھل کر بات کرنا، خود کو قابو ہی میں رکھنا ورنہ بات پھر بڑھ بھی سکتی ہے۔''

''صاحب.....'' لیاقت حسین نے ہاتھ جوڑ کر منت کی۔ ''اگر آپ کو کسی پلید پر شبہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں فرحین اور زرینہ بہن کی خاطر موت سے بھی ٹکرانے کو تیار ہوں۔''

''پریشان مت ہو۔'' سراج نے اسے سمجھایا۔ ''جو لوگ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر آئے تھے ان کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہیں۔ تم ان کے قریب بھی نہیں جا سکو گے۔''

''لیکن ان خدائی خواروں کا ہم سے کیا دشمنی ہے؟'' اس بار گل خان نے سوال کیا۔

''میرے کہنے پر صرف چوبیس گھنٹے صبر سے کام لو۔'' سراج نے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اس کے بعد میں تمہارے ساتھ شریک ہونے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔''

''سراج صاحب، آپ مجھے خالی'' لیاقت نے پہلو بدل کر کچھ کہنا چاہا۔

''میرے ساتھ آؤ.....'' سراج لیاقت کا ہاتھ تھام کر ایک طرف لے گیا۔ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''جن لوگوں نے تمہارے صاحب کی گاڑی میں ٹائم بم فٹ کرایا تھا۔ مجھے یہ ان ہی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔'' پھر اس نے میڈم روبی کے حوالے سے بھی دبی زبان میں کہا۔ ''تم نے جس طرح اس خاتون کو اغوا ہونے سے بچایا وہ تمہیں بھی یاد نہیں رہا۔'' سراج سانس لینے کے بعد بولا۔ ''تم کوئی خاص بات زبان تک نہیں لانا چاہتے تو میں اصرار بھی نہیں کروں گا لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو..... جو کچھ ہوا کیا وہ تمہارے لیے کسی عجوبے سے کم ہے؟''

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہو صاحب وہ میں بھی سمجھ رہا ہوں لیکن آپ یقین کرو کہ میں اس دن گاڑی سے نیچے نہیں اترا تھا۔'' لیاقت نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ لیکن ان باتوں کا فرحین اور زرینہ کے اغوا سے کیا تعلق تھا؟ یہ بات اس کے دماغ میں نہیں آ رہی تھی۔

''مجھے تمہاری بات کا یقین ہے لیکن تم میری خاطر صرف چوبیس گھنٹے خاموش رہو..... کسی سے کچھ نہ کہنا۔ اس دوران اگر کوئی تم سے کسی ذریعے سے رابطہ کرے تو مجھے فوری اطلاع دینا۔ میں جس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اگر وہ درست ہوا تو پھر میں چوبیس گھنٹے کے بعد وہی کروں گا جو تم کہو گے لیکن اس وقت تک تمہارا گرمی دکھانا تمہاری بیوی اور زرینہ دونوں کے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب..... جو آپ کا حکم لیکن میرے اندر جو آگ بھڑک رہی ہے وہ میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔'' لیاقت حسین کی آواز رندھ گئی۔ سراج نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''فکر مت کرو..... فرحین اور زرینہ میرے لیے بھی اتنی ہی قابل احترام ہیں جتنی تم دونوں کے لیے لیکن میں نے جو مدت مقرر کر دی ہے اس کے دوران کوئی جلد بازی نہ کر بیٹھنا۔ میں تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ وہ جہاں بھی ہوں گی، ان کی عزت پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کرے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو صاحب ورنہ ہم اپنی عزت کی خاطر کسی قربانی دینے سے منہ نہیں موڑے گا۔''

سراج نے جو باتیں اس کے دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کسی حد تک لیاقت حسین کی سمجھ میں آ رہی تھیں لیکن گل خان ابھی تک بھی دل ہی دل میں کھول رہا تھا۔ اس نے لیاقت سے پوچھا بھی تھا۔

''پولیس والا آفیسر تم کو علیحدہ لے جا کر کیا بات کر رہا تھا؟''

''چوبیس گھنٹے تک دل پر پتھر رکھ لو گل خان۔'' لیاقت حسین نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کے دل پر ایک ہی جیسا گھاؤ لگا ہے، جس نے بھی ہماری عزت اور آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے وہ جب بھی بے نقاب ہوگا میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، بعد میں پھانسی کا پھندا بھی برداشت کر لوں گا۔''

''مگر تمہارے سراج صاحب نے.....''

''وہ تجربہ کار آفیسر ہے۔'' لیاقت نے گل خان کو مطمئن کرنے کی خاطر جواب دیا۔ ''اس کی مدد کے بغیر ہم اپنا خون جلانے کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔''

گل خان نے پھر کوئی سوال نہیں کیا لیکن وہ لیاقت حسین کی بات سے پوری طرح مطمئن بھی نہیں ہوا۔

☆☆☆

افضل خان اس وقت شغلِ مے نوشی میں مصروف تھا۔ شیخ حامد کا ایک اور نیا معاملہ نمٹانے کے بعد وہ ٹھیک آٹھ بجے اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا تھا۔ نیم گرم پانی سے نہا لینے کے بعد اس کی دن بھر کی تھکن دور ہو گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھا ہوا ٹی وی دیکھ رہا تھا، ایک پیگ ختم ہو جاتا تو دوسرا تیار رہتا لیکن ان تمام مشغولیت کے باوجود اس کا ذہن اس وقت بھی بگ باس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیاقت حسین کے بارے میں اس نے تمام معلومات حاصل کر کے بگ باس سے ملنے والی ہدایت کے مطابق لیاقت حسین کی بیوی کے اغوا کے سلسلے میں ان افراد کی ٹیم تشکیل دی تھی جن کو محض غیر قانونی سرگرمیوں کی خاطر پالا جا رہا تھا۔ شیخ حامد کے الفاظ اس کے ذہن میں گونج رہے تھے..... ''جو شخص دو بار میرا راستہ کاٹ جائے میں اسے زیادہ دنوں برداشت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔''

افضل خان کو اس بات کا علم تھا کہ لیاقت حسین نے ہی سیٹھ عثمان کی گاڑی میں نصب شدہ ٹائم بم کا کھوج نکال کر سیٹھ عثمان کو موت کا لقمہ بننے سے بچا لیا تھا لیکن یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ اسی لیاقت حسین نے میڈم روبی کے اغوا کی بھی حیرت انگیز طور پر بروقت ناکام بنا دیا تھا۔ اس اطلاع کے ساتھ بگ باس نے ایک اہم بات اور کہی تھی۔ ''لیاقت حسین کی وجہ سے ایک ناگن ہمارے پنار سے میں آتے آتے رہ گئی۔ ناگن سے حوالے سے اس نے میڈم روبی کا ذکر کیا تھا اسے راستے سے ہٹا دینے سے بہتر یہ بھی کہا تھا کہ ''ناگن کا پھن کچل دینے کے بجائے اسے بین کی لے پر ناچتے ہوئے دیکھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔'' اس کے بعد بگ باس نے اسے میڈم کو محبت کے جال میں پھانس کر حد سے گزر جانے کی اجازت بھی دے دی تھی اور..... بگ باس کی وہ باتیں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں کہ اسی نے میڈم روبی کے شوہر کو کسی بزنس ڈیلنگ کے سبب اپنے راستے سے ہٹا دیا ہوگا۔

افضل خان کا ذہن ان باتوں کے ساتھ ساتھ روبی کے بارے میں بھی سوچنے لگا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے شوہر کا انتقام لینے کی خاطر اسے جو پیشکش کی تھی وہ بھی خود اسی کی طرح حسین تھی اب زیادہ پرکشش بن گئی تھی اس لیے کہ بگ باس نے روبی کے ساتھ کھلنے ملنے اور اسے بے آبرو کر کے ایسی تصاویر حاصل کرنے کا اشارہ دیا تھا جس کے بعد روبی جیسی باعزت عورت بھی اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہو جاتی۔ افضل خان کے تصور میں روبی کا حسین اور گداز جسم ابھرا تو اس کے ہونٹوں پر شرابی مسکراہٹ پھیل گئی۔ گلاس خالی کرنے کے بعد وہ دوسرا پیگ تیار کر رہا تھا جب قریب رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ افضل خان نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''کام خیر و خوبی سے انجام پا گیا جناب۔'' دوسری طرف سے کسی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے انہیں لاری اڈے سے دبوچ لیا، لیکن گیہوں کے ساتھ ایک گھن بھی پس گیا۔''

''کیا مطلب.....؟'' افضل خان نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ اکیلی نہیں تھی جناب، اس کے ساتھ اس کی ایک سہیلی اور اس کا مرد بھی تھا۔'' دوسری جانب سے بے پروائی سے جواب ملا۔ ''اس نے ہمارے ارادے کو بچانے کی کوشش کی تو ہم نے اسے بھی اچک لیا۔ کنڈیکٹر نے ہیرو بننے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے چار چھ بٹ مار کر اس کی ساری تن تنی بھی نکال دی۔''

''کہاں رکھا ہے دونوں کو.....؟''

''وہیں جہاں ایسی خوبصورت تتلیاں رکھی جاتی ہیں۔ نمبر تھری..... انڈر گراؤنڈ، ویسے دونوں ہی تر و تازہ مال ہیں۔ کیا آپ کی طرف سے اجازت ہے؟'' آخری جملے بڑے بازاری انداز میں کہے گئے۔

''نہیں..... '' افضل خان نے کھنکھتے لہجے میں کہا۔ ''باس کے اشارے کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کا مطلب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف موت ہوتا ہے۔ ورنہ ڈاک موت۔"

"چارہ پانی کیا جائے۔ ...؟"

"وہی جو سب کو ملتا ہے، ویسے بگ باس انہیں زیادہ دن نہیں رکھے گا۔"

"پھر..."

"اپنے کام سے کام رکھو... اوپر سے جو آرڈر ملے گا وہ بھی تمہیں پہنچا دیا جائے گا۔ کوئی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ..." افضل خان نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لائن کاٹ دی۔

پھر اس نے سب سے پہلے بگ باس کو فرحین اور زرینہ کے قابو میں آجانے کی اطلاع دی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دو چار لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر کچھ سوچ کر روبی کے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسے اطلاع مل گئی تھی کہ روبی کو صبح ہی اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ تین چار گھنٹوں کے بعد کسی خاتون نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو..."

"مجھے میڈم سے بات کرنی ہے۔"

"وہ اس وقت آرام کر رہی ہیں۔" فون اٹھانے والی نے جواب دیا۔

"میں افضل خان بول رہا ہوں......" اس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "تم میڈم کو میرا نام بتا دو۔ اٹ از ارجنٹ۔"

"ہیلو..." ایک منٹ بعد روبی کی آواز سنائی دی۔ "اس وقت کیسے کال کرلیا...؟"

"اسپتال آنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا لیکن آپ کی طرف سے فکرمند ضرور تھا۔" افضل خان نے بڑے پیار سے کہا۔ "آپ بھولنے والی چیز بھی نہیں ہیں۔"

"لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو۔ ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ رسمی تکلف......"

"یاد آگیا......سوری......اب بتاؤ کہ تم کیسی ہو؟" افضل خان نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی سے کہا۔ "میں اس وقت تمہارے حادثے کی منحوس خبر کو بلیک ڈاگ کے لمبے لمبے گھونٹوں کے ذریعے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"گڈ... ویسے تم نے میری آفر پر کہاں تک غور کیا؟" دوسری جانب سے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا گیا۔

"فون پر یہ بات مناسب نہیں ہوگی۔"

"میں جانتی ہوں... چلو پرسنٹیج ہی میں بتا دو۔"

"فی الحال اسی فی صد..."

"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔" دوسری جانب سے محبت بھرا انداز اختیار کیا گیا۔ "باقی بیس فیصد پورا کرنے میں کتنا وقت لو گے؟"

"یہ آپ پر منحصر ہے۔" افضل خان نے گلاس خالی کرکے لہراتے ہوئے بڑی نشیلی آواز میں کہا۔

"ایڈوانس؟"

"غلط سمجھیں، میں تمہارے صحت مند ہونے پر باقاعدہ سیلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"سوری... میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ ویسے بھی لوگوں کے درمیان اٹھنا بیٹھنا اور گھلنا ملنا مجھے پسند نہیں ہے۔" روبی نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے تمہاری ماڈرن دنیا میں کیوں قدم رکھا ہے؟ تم جان چکے ہو۔"

"او۔کے۔" افضل خان نے چارہ ڈالنے میں دیر نہیں کی۔ بڑی اپنایت سے بولا۔ "یہ جشن صحت مخصوص ہوگا۔ بالکل ایکس کلیوسیو (Exclusive) صرف تم اور میں۔ میرے اپارٹمنٹ میں۔"

"تھوڑی سی ترمیم کرلو۔" روبی نے بھی بے تکلفی کا اظہار کیا۔ "تمہارے اپارٹمنٹ کی شرط منظور نہیں۔ ایک بار آکر جو بھگت چکی ہوں اسے دوبارہ افورڈ نہیں کر سکتی۔ ایسا کرتی ہوں کہ تاریخ اور کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا ارینج میں کروں گی باقی سیلی بریشن تمہاری جیب پر منحصر ہے۔"

"او۔کے۔ مجھے تمہاری یہ شرط بھی پسند ہے۔"

"یہ شرط نہیں، صرف تجویز تھی۔" اس بار صاف گوئی سے کہا گیا۔ "شرط یہ ہوگی کہ تم بار بار کی ملاقاتوں پر اصرار نہیں کرو گے اور... باقی بیس فیصد پر بھی اپنی آمادگی ظاہر کردو گے۔"

"اوکے ڈارلنگ......" افضل خان نے بڑی جسارت سے اسے ڈارلنگ کہا۔ "ڈن، مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔"

"ٹھیک ہے... ڈاکٹر نے جیسے ہی مجھے صحت مند سمجھ کر چلنے پھرنے کی اجازت دی، سب سے پہلے تمہیں اس کی اطلاع دوں گی۔"

"تھینکس... ویسے اب زخم کیسا ہے؟"

"کس زخم کی بات کر رہے ہو تم......" روبی کے جواب میں کسک تھی، شاید اس سوال کے ذریعے وہ اسے یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ جب تک اس کے مرحوم شوہر کا قاتل زندہ ہے اس کی روح پر لگا زخم بھی تازہ رہے گا۔

"ڈونٹ وری سویٹ ہارٹ..." افضل خان نے دل میں خوش ہوتے ہوئے اسے لفظوں میں تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "بات جب ہنڈرڈ پرسنٹ ڈن ہو جائے گی تو

تمہارے سارے زخم ایک ایک کرکے بھر جائیں گے، ...باقی..."

"...افضل..." دوسری جانب سے بھی افضل خان ... کے لیے پیار کا اظہار کیا گیا۔

"اب بات از ہنڈرڈ پرسنٹ کریکٹ (Correct)۔" افضل خان نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے ایک فاتحانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر معنی خیز انداز میں ... مرچنے کے بجائے اس کا سپیرے کی بین پر ... جھومنا، پھن مارنا اور بے بسی میں رقص کرتے رہنا ... مقدر ہوتا ہے۔"

افضل خان نے اپنی کامیابی کا تصور کرکے تیسرا پیگ حلق سے نیچے اتارا تو اسے اپارٹمنٹ میں اپنی تنہائی کا احساس ہونے لگا، روبی سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد وہ ترنگ میں آگیا تھا۔ شباب کے بنا شراب اس وقت اسے بے چین کر رہی تھی، اس نے گھڑی کی سمت نظر ڈالی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے، اس کے ذہن میں اپنی تنہائی دور کرنے کی خاطر کئی نام ابھرے لیکن دروازے پر ابھرنے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ حسب معمول وہ اپنا آٹومیٹک ریوالور لے کر اٹھا۔ دروازے کے قریب جا کر تجسس آئی کے ذریعے باہر دیکھا تو ریفو کلب کی ماریا اسکرٹ اور ٹنگ بلاؤز میں باہر راہداری میں کھڑی تھی۔ وہ استعمال شدہ فہرست میں درج تھی لیکن اس وقت افضل خان کو نشے کی حالت میں وہ بھی کوئی حور نظر آئی۔

افضل خان نے دروازہ کھولا تو ماریا کے لباس اور جسم سے اٹھتی مہک نے اسے دیوانہ کر دیا۔ اپنا آٹومیٹک ریوالور صوفے کی طرف اچھال کر اس نے لات مار کر دروازہ بند کیا پھر ماریا کو اپنی کشادہ بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"ہم... میں ابھی تمہاری ہی طرف کلب آنے کا سوچ رہا تھا۔" اس نے ماریا سے جھوٹ بولا۔

"آج تم بھی مجھے بہت یاد آرہے تھے ڈیئر، اس لیے میں کلب سے اٹھ کر سیدھی تمہاری طرف آگئی۔"

پھر افضل خان اور بے باک ماریا دروغ گوئی کرتے ہوئے شرافت کے تمام لبادے اتار کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں حد سے گزر گئے۔ ابلیس بھی خوشی میں رقص کرنے لگا۔

☆☆☆

سراج کی چوبیس گھنٹوں والی شرط نے لیاقت حسین اور گل خان کو مجبور کر دیا تھا۔ ویسے بھی شہر میں ہزاروں کی تعداد میں اس قسم کی گاڑیاں تھیں جس میں فرحین اور زرینہ کو اغوا کیا گیا تھا۔ سراج کے گھر سے واپسی کے بعد بھی گل خان اور لیاقت حسین سر جوڑے بیٹھے اس دشمن کے بارے میں غور کرتے رہے، سراج کی وجہ سے لیاقت حسین کی پھر بھی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی لیکن گل خان رہ رہ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا، اس دشمن سے انتقام کی صورت نظر نہیں آرہی تھی اس لیے وہ اپنی مادری زبان میں اغوا کرنے والوں کو مغلظات سنا رہا تھا۔ "کیوں اپنی زبان گندی کرتا ہے گل خان؟" لیاقت نے کہا۔ "خدا سے دعا مانگ کہ وہ ساتھ خیریت سے واپس آجائیں۔"

"تم کیا بات کر رہا ہے لیاقت حسین؟ اگر ان کو ساتھ خیریت سے آنا ہوتا تو وہ خنزیر کے تخم بس اڈے پر اس طرح سیکڑوں آدمیوں کے سامنے سے زرینہ اور فرحین بہن کو نہ لے جاتے اور......لوگوں کا خون بھی اتنا سفید ہو گیا ہے کہ کوئی مدد کو سامنے نہیں آیا۔"

"کیسے آتا......؟" لیاقت حسین نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "ان کے پاس تمہارے کہنے کے مطابق چار چار رائفلیں تھیں، جو بھی سامنے آتا وہ اسے فوراً بھون دیتے۔ تم عام آدمیوں کی بات کرتا ہے، ایسے موقعوں پر تو پولیس والے بھی ادھر ادھر چھپ جاتے ہیں، مجرم فرار ہو جائے تو سینہ تان کر مرد بچوں کی طرح سامنے آجاتے ہیں، دو چار موٹے مرغوں کو پکڑتے ہیں پھر جیب گرم کرکے انہیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔"

"خدا جانے وہ دونوں کس حال میں ہوں گی؟" گل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے بسی نمایاں تھی۔

"دعا کرو کہ ان دونوں کی عزت محفوظ رہے۔ ایک بار وہ مل جائیں تو پھر ہم دشمنوں کا کھوج لگا کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔"

رات دو بجے تک گل خان، لیاقت کے مکان پر بیٹھا رہا پھر تھک ہار کر اپنے گھر چلا گیا۔ لیاقت حسین چارپائی پر لیٹ کر سراج کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ زرینہ مفت میں فرحین کے ساتھ لپیٹے میں آگئی ورنہ وہ صرف فرحین کو اٹھانے آئے ہوں گے۔ ان کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں اور رائفل والے ڈیکیت شامل تھے تو وہ خود بھی بڑے لوگ ہوں گے۔ سراج نے کہا تھا کہ وہ اغوا کی جانے والی عورتوں کو بے عزت نہیں کریں گے۔ جلدی ہی انہیں زندہ یا مردہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ یہ حرکت صرف اسے دھمکی دینے کے لیے کی گئی تھی۔ سراج نے... ہم سے سیٹھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عثمان کی جان بچانے کا حوالہ بھی دیا تھا۔ جن لوگوں نے وحید ڈرائیور کا ایمان خرید کر غداری پر اکسایا تھا، اسے پولیس سے بچانے کی خاطر ملک سے باہر بھیجا تھا، وہی لیاقت کے دشمن بھی بن گئے لیکن وہ چاہتے تو لیاقت حسین کو جان سے مار کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکتے تھے لیکن فرحین نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟

لیاقت حسین کو معلوم تھا کہ سیٹھ عثمان کو مروانے میں اس کے دوست نما دشمن بزنس مین شیخ حامد کا ہاتھ تھا لیکن میڈم روبی والی بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ذاتی طور پر اسے یہی یاد تھا کہ وہ گاڑی سے نیچے نہیں اترا تھا، سراج نے اسے یہی حکم دیا تھا۔ وہ اس کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا مگر سراج کا کہنا تھا کہ اس نے گاڑی سے اتر کر ان بدمعاشوں سے لڑکی کو چھڑا لیا تھا۔ لیاقت حسین اسے دیوانے سے ملاقات کا کرشمہ سمجھ رہا تھا مگر نابینا بزرگ کی تاکید کے بعد وہ اس سلسلے میں زبان نہ کھولنے کا عہد کر چکا تھا۔

رات گئے تک وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلتا رہا مگر فرحین کی یاد اسے کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح فرحین سے دشمنی کا بدلہ لینے والوں کے بارے میں عقل گھوڑے دوڑا رہا تھا... جب قبرستان کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے کسی نے اس کا نام لے کر آواز دی، وہ آواز سراج کی تھی جسے لیاقت حسین ہزاروں میں پہچان سکتا تھا، وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آ گیا، سامنے سراج سادہ لباس میں کھڑا تھا۔

"صاحب... آپ؟" لیاقت نے تعجب سے پوچھا۔

"گل خان تو نہیں ہے اندر...؟"

"نہیں صاحب... وہ ابھی آدھے گھنٹے پہلے اپنے گھر گیا ہے۔ دشمنوں کا کوئی سراغ ملا صاحب؟" لیاقت حسین نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

"میں اسی سلسلے میں تمہیں ساتھ لینے آیا ہوں۔ خاموشی سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاؤ جہاں سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہے، گل خان کو ساتھ لانے کی حماقت نہ کرنا۔"

"ابھی آیا صاحب۔"

سراج کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا تو لیاقت حسین جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے باہر نکلا، دروازے کو باہر سے کنڈی لگائی پھر تیزی سے کچی پکی آبادی کی تنگ گلیاں طے کرتے ہوئے باہر سڑک پر آ گیا جہاں سراج سیاہ رنگ کی کار میں موجود تھا۔ لیاقت خاموشی سے دروازہ کھول کر اگلی نشست پر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ سراج نے گاڑی چلاتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے اپنا ہتھیار ساتھ لے لیا ہے؟"

"وہ آپ کا تحفہ ہے صاحب، میں جب بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں وہ میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔"

"مجھے ایک سراغ ملا ہے کہ اغوا کرنے والوں نے تمہاری عورتوں کو کہاں رکھا ہے۔" سراج نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سادہ لباس میں اپنے ساتھیوں کو ادھر پہلے سے روانہ کر دیا ہے تاکہ مجرم کسی اور طرف نہ نکل سکیں۔"

"خدا کرے آپ کی اطلاع درست ہو صاحب۔"

"ایک بات دھیان سے سنو لیاقت حسین، تم وہاں کسی سے الجھنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ اگر تمہاری عورتیں مل جائیں تو انہیں خاموشی سے لے کر نکل چلیں گے۔ گھر پہنچنے سے پہلے اپنی عورتوں سے بھی کوئی بات نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے صاحب، ہماری عورتیں اگر عزت سے مل گئیں تو ابھی ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

"کل صبح تم ڈیوٹی پر جانے سے پہلے گیارہ بجے مجھ سے آفس میں ملو گے۔ اس کے بعد ہی میں اغوا کنندگان کے خلاف کسی قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کروں گا۔"

لیاقت حسین نے اس بار بھی سراج کی بات مان لی۔ "ہم آپ کے کسی حکم سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کریں گے صاحب۔"

راستے میں سراج اس کو مختلف تدابیر کے بارے میں اونچ نیچ سے آگاہ کرتا رہا۔ تقریباً چالیس منٹ بعد سراج کی گاڑی صنعتی علاقے کے ایک ایسے حصے میں جا کر رکی جہاں مختلف کمپنیوں کے گودام بنے ہوئے تھے۔ سراج تھوڑی دیر تک گاڑی میں بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اس نے لیاقت کو ایک گودام کی طرف دور سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس گودام کے صدر دروازے پر سرخ بڑے دائرے کے اندر تین کا ہندسہ لکھا ہوگا۔ تم پشت کی طرف سے اندر جانا۔ اندر پہنچ کر بائیں ہاتھ پر ایک آفس ہوگا۔ اس آفس کے واش روم کے اندر سے ایک خفیہ راستہ نیچے تہ خانے میں جاتا ہے، میری اطلاع کے مطابق... تمہاری عورتوں کو وہیں رکھا گیا ہے۔"

"مجھے نیچے جانے کا راستہ کدھر سے ملے گا؟" لیاقت حسین نے بڑی مستعدی سے سوال کیا، وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔

"آفس کے اندر [illegible] رکھی ہے تمہیں [illegible] ہوگا۔ پشت پر [illegible] ایک طرف سے [illegible] ایک طرف ہو جاتا ہے۔ اندر [illegible]

پش بٹن ہوگا، تم اسے دبانا تو نیچے جانے کا راستہ بھی واش روم میں خود بخود کھل جائے گا لیکن ایک بار پھر غور سے سن لو تم وہاں کسی بھی صورت میں کسی کو جان سے مارنے کی کوشش نہیں کرو گے۔ چپ چاپ اپنی عورتوں کو لے کر نکل آنا۔ باقی فیصلے کل ہو لیں گے۔''

''اور اگر کسی نے مجھے زبردستی روکنے کی کوشش کی تو.....؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں میدان صاف ملے گا۔ شاید وہ اس قابل ہی نہ ہوں کہ تمہارا راستہ روک سکیں۔'' سراج نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں ادھر گاڑی میں ہی تمہارا انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے صاحب.....'' لیاقت حسین مشینی انداز میں دروازہ کھول کر گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ اس کی نظروں میں عقابی چمک موجود تھی، گاڑی سے اتر کر وہ اس گودام کی طرف بڑھنے لگا جس کی طرف سراج نے اشارہ کیا تھا، گیٹ کے قریب پہنچ کر اسے وہ سرخ رنگ کا گول دائرہ بھی نظر آ گیا جس کے درمیان تین لکھا تھا، گیٹ پر ایک مسلح گارڈ بھی تھا جس نے لیاقت حسین کو ایک نظر دیکھا پھر گشت لگانے میں مصروف ہو گیا۔ لیاقت لمبے لمبے قدم اٹھاتا گودام کی پشت پر آ گیا جہاں قد آدم دیوار تھی، ایک گیٹ بھی تھا جو اندر سے بند تھا، ایک لمحے کو لیاقت نے صورت حال کا جائزہ لیا پھر اس نے گیٹ سے دور جا کر دیوار پھلانگ کر اندر جانے کا منصوبہ بنایا۔ ایک دو بار کوشش کے بعد وہ دیوار کے آخری حصے کو تھام کر کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اوپر پہنچ گیا، دور دور تک سناٹا تھا اس لیے وہ آہستہ سے دوسری طرف لٹک کر زمین پر آ گیا، زمین پر قدم جمانے کے بعد اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا، پھر بھی اس نے نیفے سے پستول نکال کر اسے لوڈ کیا اور اس کے دستے پر گرفت مضبوط کر کے سیاہ رنگ کے اس لمبے چوڑے گیٹ کی جانب پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہے۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ اس سے چپک کر کھڑا اندر کی سن گن لیتا رہا پھر پنجوں کے بل اندر داخل ہو گیا۔ ایک مدھم بلب چھت سے لٹکا ٹمٹما رہا تھا، لیاقت کے قدم اس آفس کی جانب بڑھنے لگے جو شیشے کا بنا ہوا تھا لیکن اس وقت خالی نظر آ رہا تھا۔ اسی آفس میں وہ الماری بھی موجود تھی جس کی بابت سراج نے اسے بتایا تھا۔ لیاقت حسین نے الماری کو چھیڑنے سے پیشتر ایک نظر واش روم میں جھانکا جو خالی پڑا تھا۔ واش روم کی دیواروں پر ٹائلز لگے تھے، بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرش ماربل کا بنا ہوا تھا۔ لیاقت حسین نے باہر آ کر الماری کو زور لگا کر ایک طرف ہٹایا تو اس کے پیچھے دیوار پر ایک سبز رنگ کا ٹائل لگا ہوا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اس نے ٹائل کے ایک کونے پر ہاتھ رکھ کر دبایا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس نے دوسرے کونے پر اسی عمل کو دہرایا تو کسی میکینکی نظام کے تحت وہ دیوار سے ابھر کر ایک طرف کھسکنے لگا پھر وہ پش بٹن بھی سامنے آ گیا۔ سراج کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے لیاقت حسین نے پش بٹن کو دبایا تو ہلکی سی گھر گھراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ پستول پر گرفت جما کر دوبارہ واش روم میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے کی دیوار کا پانچ..... بائی تین فٹ کا حصہ اندر کی طرف دب کر ایک طرف چلا گیا تھا۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچا پھر اس نے خدا کا نام لے کر ان سیڑھیوں پر پنجوں کے بل نیچے اترنا شروع کیا۔ دس سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اس نے زمین کے چار بائی چار حصے پر قدم رکھا تھا تو بائیں جانب کی دیوار کا حصہ بھی دروازے کی صورت میں سلائیڈ ہو کر کھل گیا، اندر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی، لیاقت حسین نے دروازے سے گزر کر اندر دیکھا تو چونک اٹھا، چار بستر کے فرد سامنے فرش پر مدہوش پڑے تھے، ان کے ساتھ ہی ایک غیر ملکی لڑکی بھی اسی عالم میں تھی۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور گلاس نظر آ رہے تھے، شاید وہ زیادہ پینے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے تھے، لڑکی کا نیم عریاں جسم دیکھ کر یہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ان چاروں نے اس تنہا لڑکی کو درندوں کی طرح جگہ جگہ سے بھنبھوڑا تھا۔

لیاقت حسین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اس نے قدم آگے بڑھایا تو سیدھے ہاتھ پر ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اس نے لپک کر اسے کھولا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اندر فرش پر فرحین اور زرینہ قریب قریب پڑی تھیں، ان کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ لیاقت نے قریب جا کر دیکھا، دونوں کی سانسیں چل رہی تھیں لیکن ان کے لباس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اغوا کرنے والوں نے شاید انہیں قابو کرنے کے لیے کوئی خواب آور دوا ضرور پلا دی تھی لیکن ان کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ لیاقت کے لیے اکیلے ان دونوں کو باہر لے جانا ممکن نہیں تھا، اسے جلدی بھی تھی اس لیے کہ باہر جو بدمعاش بے ہوش پڑے تھے ان کے قریب ہی ان کی رائفلیں بھی پڑی تھیں۔ کوئی ایک بھی ہوش میں آ جاتا تو لیاقت کے لیے زندگی یا موت کا کھیل نا گزیر ہو جاتا۔

اس نے جھک کر فرحین کا بازو تھام کر دو تین بار ہلایا تو اس نے نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون ہے..... مم..... مجھے..... کس..... سونے دو۔''

''میں لیاقت ہوں جان جگر، ہوش میں آؤ..... ہمیں یہاں سے بہت کم وقت میں نکلنا ہے ورنہ میں بھی مارا جاؤں گا۔''

لیاقت کی آواز دو تین بار سن کر فرحین جھومتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''تم..... تم یہاں..... کیسے آ گیا.....؟'' اس نے بدستور غنودگی کے عالم میں پوچھا۔

''ہمت کرو لیاقت کا جان.....'' اس نے فرحین کے ہاتھ کھولتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں زرینہ کو بھی سنبھالنا ہوگا۔''

''ہم..... ادھر کیسے..... آ..... آ گیا؟'' فرحین نے یہ مشکل جملہ مکمل کیا۔

لیاقت حسین کے لیے ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی تو اسے پانی کا بھرا ہوا ایک جگ اور گلاس نظر آ گیا، اس نے جگ میں پانی بھر کر دو تین زوردار چھپاکے فرحین کے چہرے پر مارے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ اس نے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔ ''وہ..... لوگ مدہوش غرق ہو گیا..... جو ہم کو ادھر اٹھا لایا تھا؟''

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد پانی کے چھینٹوں سے زرینہ بھی نیم بیدار ہوئی تو لیاقت کی مشکل کچھ آسان ہو گئی، اس نے فرحین کو ہاتھ تھام کر اٹھایا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ زرینہ کو فرحین نے سنبھالا۔ وہ تینوں باہر آئے تو فرحین نے بے ہوش پڑے آدمیوں کی طرف تھوک کر کہا۔

''یہی تھے وہ ماں کے خصم جو..... ہم کو ادھر لائے تھے تم..... ان سب کو گولی مارو۔''

''پہلے تم دونوں کو چل کر گھر چھوڑ دوں پھر ان چاروں کو بھی جہنم رسید کرنا نہیں بھولوں گا۔''

گرتے پڑتے وہ کسی نہ کسی طرح باہر آ گیا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ فرحین اور زرینہ کو دیوار پر کس طرح چڑھائے گا لیکن گودام سے باہر نکل کر اسے وہ بغلی دروازہ بھی نظر آ گیا جو غالباً عام ورکرز کے لیے بنایا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے دروازے کو صرف اندر سے بولٹ کیا گیا تھا۔ لیاقت حسین باہر نکلا تو سراج سامنے ہی گاڑی لیے کھڑا تھا۔ لیاقت نے دونوں عورتوں کو پچھلی سیٹ پر کسی طرح بٹھا کر دروازہ بند کیا پھر اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہی سراج نے گاڑی کو تیز رفتاری سے چلانا شروع کیا، راستے بھر ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ گھر کے قریب گلی کے کونے پر پہنچ کر اس نے سراج سے بڑی عاجزی سے کہا۔

''صاحب آپ کا یہ احسان لیاقت بھی نہیں بھولے گا۔''

''ٹھیک ہے جلدی کرو، مجھے ابھی اور بہت سے معاملے بھی نمٹانے ہیں۔''

لیاقت، فرحین اور زرینہ کو لے کر گلی میں داخل ہوا جو بالکل سنسان پڑی تھی، وہ گل خان کے گھر کے سامنے سے گزر کر اپنے گھر میں داخل ہوا۔ پانچ منٹ بعد فرحین بھی زرینہ کو اس کے مکان کے اندر چھوڑ کر واپس آ گئی۔ اس پر اب بھی غنودگی طاری تھی، چارپائی پر لیاقت کے برابر لیٹ کر وہ بھی اس طرح بے سدھ ہوئی کہ کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔ لیاقت پہلے ہی بے سدھ نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔

☆☆☆

شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر صبح ہی صبح چار اشتہاری مجرموں اور ایک کلب کی کال گرل کی لاش پائے جانے سے ہر طرف سنسنی پھیل گئی۔ ایس پی علاقہ آغا منظور کے علاوہ ایس ایچ او بھی پولیس والوں کی ٹیم کے ہمراہ صبح آٹھ بجے سے ضروری قانونی کارروائی میں مصروف تھے۔ ڈی ایس پی سراج کو کال کر کے بلا لیا گیا، ان پانچ لاشوں کو دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ جائے وقوعہ پر ایمبولینس کے علاوہ فنگر پرنٹس لینے والا عملہ بھی موجود تھا۔ اخباری نمائندے بھی فوٹو گرافرز کے ساتھ موجود تھے، لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ٹریفک پولیس نے آنے جانے والی گاڑیوں کو متبادل راستوں کی طرف موڑنا شروع کر دیا۔

سراج کے آتے ہی ایس پی آغا منظور اسے ایک طرف لے گیا، اس کے چہرے پر بھی تشویش اور الجھن کے ملے جلے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ ''یہ لاشیں کب دریافت ہوئیں.....؟'' سراج نے تفصیل معلوم کرنے کی خاطر پوچھا۔

''ہمارے لیے جو پریشانیاں کھڑی کی گئی ہیں وہ کسی سوچی سمجھی اسکیم سے متعلق نظر آتی ہیں۔'' آغا منظور نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''چاروں اشتہاری مجرم ہیں، ان میں سے دو کے لیے حکومت کی طرف سے انعام کا اعلان بھی کیا گیا لیکن ان حرام زادوں کی گرفتاری عمل میں نہیں آ سکی اور اب ان کی لاشوں کا اس طرح سر عام پایا جانا ہماری نیندیں بھی حرام کر سکتا ہے۔ ان کے جسموں پر گولیوں سے چھلنی کرنے کے بعد یہاں پھینکا گیا ہے، جبکہ کال گرل کو محض دل دہلانے کے مقام پر ایک گولی مار کر زندگی سے نجات دلائی گئی ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں آپ سے متفق ہوں سر، لیکن ایسا کون شخص کرسکتا ہے؟''

''جو بھی ہو لیکن..... اب وہ شاید اپنا دماغی توازن یقیناً کھو بیٹھا ہے جس کا علاج ضروری ہے۔''

سراج نے فوراً ہی کوئی دوسرا سوال نہیں کیا، ایس پی کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اصل مجرم کا نام ضرور کلبلا رہا تھا۔ وہ کون ہوسکتا تھا؟ سراج صرف سوچ کر رہ گیا۔

''میں فی الحال آفس جا رہا ہوں، ادھر بھی اوپر والوں کے فون کھڑکھڑا رہے ہوں گے۔'' ایس پی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی نگرانی میں ساری کارروائی مکمل کر کے پانچوں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرا دیجیے گا۔''

''رائٹ سر..... لیکن کیا آپ کے ذہن میں کوئی ایسا نام ہے جس کے بارے میں ان لاشوں سے متعلق.....''

''سوری..... اس وقت کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔''

ایس پی آغا منظور نے کسی مصلحت کے پیش نظر رازداری سے کام لیا پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا تو کچھ رپورٹروں نے سراج کو گھیر لیا۔

''جناب..... آپ ان لاشوں کے سلسلے میں کچھ عرض کریں گے؟''

''آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ابھی پہنچا ہوں۔'' سراج نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ ''آپ حضرات تو اپنی معلومات کے مطابق خبریں شائع کر دیں گے، ہمیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

''ہم جو کچھ لکھیں گے وہ ان پانچوں کی تصویر کے ساتھ ہی شائع ہوگا۔'' دوسرے رپورٹر نے بھرپور طنز کیا۔ ''چاروں مرد اشتہاری ملزم تھے، لڑکی بھی بدکار تھی۔ اس کے علاوہ یہ لاشیں آسمان سے تو نہیں ٹپکی ہوں گی، اس کی پشت پر بھی بڑے بڑے لوگوں کا ہاتھ ضرور شامل ہوگا جو صبح صبح ان کو کراچی کی مصروف سڑک کے درمیان پھینک گئے ہیں۔ یہ دیدہ دلیری نہیں تو اور کیا ہے؟''

''آپ درست فرما رہے ہیں لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور مکمل تفتیش کے بغیر میں کچھ بھی کہنے سے معذور ہوں۔'' سراج نے غصے کے بجائے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر لاشوں کے قریب آگیا جہاں پولیس کی بھاری نفری نے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔ ساڑھے گیارہ تک اسے جائے حادثہ پر رکنا پڑا پھر ملاقات اس ایچ او کی نگرانی میں لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرنے کے بعد ہی وہ

بڑی مشکل سے اخباری نمائندوں کو ٹالتے ہوئے سوا بارہ بجے آفس پہنچا۔ لیاقت حسین وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے لیاقت، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟'' سراج نے اعصابی تھکن دور کرنے کی خاطر ہاتھوں کو دونوں اطراف پھیلا کر ایک خاص انداز میں ورزش کی پھر کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''صاحب ... وہ..... وہ دونوں رات کو کسی وقت گھر آ گئی ہیں؟'' لیاقت نے کچھ عجیب انداز سے کہا۔

''تم کیا اپنی بیوی اور اس کی سہیلی کی بات کر رہے ہو؟'' سراج نے چونک کر سوال کیا۔

''جی ہاں صاحب.....'' لیاقت نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''وہ فرحین بولتی ہے کہ رات، میں کسی گودام کے تہ خانے سے انہیں بچا کر لایا ہوں جبکہ میں تو رات بھر گھر پر ہی تھا۔''

سراج دوبارہ چونکا پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے لیاقت حسین کے سلسلے میں میڈم روبی کو اغوا کرنے والوں سے بچانے کی بات یاد آ گئی۔ اس وقت بھی لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے اس سچائی کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر کچھ ویسے ہی تاثرات نظر آ رہے تھے۔ لیاقت حسین جو باتیں کر رہا تھا انہیں وہ مافوق الفطرت واقعات کے سوا اور کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

''تمہاری بیوی نے اور کیا بتایا ہے؟'' سراج نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''یہی کہ اسے اور زرینہ کو چار لوگ لاری اڈے سے گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ انہیں شہر سے دور کسی تہ خانے میں رکھا گیا تھا جہاں چار بدمعاش نقاب میں چہرہ چھپائے اور رائفلیں لیے ساتھ ساتھ تھے۔'' لیاقت نے فرحین کی سنائی ہوئی تفصیل دہراتے ہوئے کہا ''گاڑی میں بٹھانے کے بعد ان دونوں کی آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اس لیے وہ کوئی راستہ نہیں بتا سکتیں۔ آنکھوں کی پٹیاں تہ خانے والے کمرے میں لے جانے کے بعد کھول دی گئی تھیں۔ صرف ان کے ہاتھوں کو ظالموں نے پیچھے باندھ دیا تھا۔ وہاں ایک آوارہ لڑکی بھی پہلے سے موجود تھی، شراب کباب کا دور بھی چلا تھا، فرحین اور زرینہ نے شور کرنے کے لیے آوازیں نکالیں تو انہیں زبردستی پانی میں کوئی نشہ آور شے کی دوا ملا کر پلا دی گئی تھی۔ فرحین اور زرینہ کا بیان ہے کہ میں نے ان دونوں کو وہاں سے نکال کر گھر پہنچایا تھا اور''

لیاقت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''اور کیا..... تم خاموش کیوں ہوگئے؟''

''صاحب..... وہ بولتی ہے کہ آپ ہی ہم سب کو اپنی کار میں گھر کے نکڑ تک چھوڑ کر گئے تھے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فرحین کی سنائی ہوئی پوری کہانی دہرا دی۔

''اوہ'' سراج نے دیدہ و دانستہ مسکرا کر بڑے تحمل سے کہا۔ ''دیکھو لیاقت حسین..... جو کچھ تم یا تمہاری بیوی کہہ رہی ہے ممکن ہے وہ اپنی جگہ غلط نہ ہو مگر تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا پڑے گا۔''

''آپ حکم دو صاحب..... لیاقت آپ پر جان قربان کرنے کو بھی تیار ہے۔''

''مجھے سوچ کر بتاؤ..... کیا کوئی روحانی قوت تمہارے علم میں ہے جو تمہاری مدد کرتی ہو.....؟''

''روحانی قوت.....'' لیاقت حسین نے نابینا بزرگ کو زبان بند رکھنے کا جو قول دیا تھا، وہ اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔

''کیا بات ہے۔ تم چپ کیوں ہو؟'' سراج نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔

''صاحب..... جب ہم اپنے شہر سے چلا تھا اس وقت ہماری ماں نے ایک دعا دی تھی کہ اوپر والا ہر ہر قدم پر غیب سے تیری مدد کرے۔'' اس نے اصل باتوں کو دہرانے کے بجائے معصومیت سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے ایک ماں کی دعا مجھے لگ گئی ہو۔ اوپر والا تو مالک کل ہے صاحب..... کوئی بات بھی اس کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے.....'' سراج نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ ''ماں کی دعائیں اولاد کے لیے بڑی بابرکت ہوتی ہیں لیکن..... تمہیں ایک بات کا اب خیال رکھنا ہوگا۔''

''وہ کیا صاحب.....''

''جو کچھ تمہاری گھر والی کہہ رہی ہے اسے مان لو..... نصیحت کرو کہ اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہو ورنہ تاثیر جاتی رہے گی، میں نے بزرگوں سے یہی سنا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب..... اب میں ایسا ہی کروں گا۔''

''ایک بات تمہیں اور بتا دوں لیکن اس سلسلے میں بھی تم زبان بند ہی رکھنا۔'' سراج نے پہلو بدل کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''جن چار آدمیوں کا ذکر تمہاری بیوی نے کیا ہے وہ اشتہاری مجرم تھے جن کی لاشیں آج صبح ایک معروف سڑک پر پائی گئی ہیں۔ کل تک ان کی تصویریں بھی اخبار میں چھپ جائیں گی۔ اپنی بیوی کو وہ تصویریں دکھا کر معلوم کرنا کہ وہ وہی تھے جنہوں نے زرینہ اور اسے اغوا کیا تھا؟''

حضرت عمار بن یاسرؓ کی شیطان سے جنگ

حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر جنات اور انسانوں سے جنگ کی ہے۔ پوچھا (جن سے) کس طرح جنگ کی؟ فرمایا ایک جنگ میں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے چنانچہ ہم ایک منزل پر اترے اور میں نے اپنا مشکیزہ اور ڈول پانی کے لیے اٹھایا تو..... آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''تمہارے سامنے پانی کے پاس کوئی (شخص) آئے گا وہ تمہیں پانی لینے سے منع کرے گا تم اس سے خبردار رہنا۔''

چنانچہ جب میں کنویں کی منڈیر پر پہنچا تو ایک کالا سیاہ، انتہائی بدصورت شخص نظر آیا۔ اس نے کہا اللہ کی قسم تم آج کنویں سے پانی کا ایک ڈول بھی نہیں لے سکتے۔ اس طرح سے ہماری جھڑپ ہوگئی اور میں نے اس کو چت کر دیا پھر ایک پتھر اٹھایا اور اس کی ناک اور منہ توڑ دیے پھر اپنا مشکیزہ بھرا اور نبی کریم دو جہاں ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوگیا۔

آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں روکنے تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟''

میں نے عرض کیا۔ ''جی ہاں''..... اور پھر آپ ﷺ کو سارا واقعہ سنا دیا۔

آپ ﷺ نے پوچھا۔ ''جانتے ہو وہ کون تھا؟''

میں نے عرض کیا۔ ''نہیں۔''

آپؐ نے فرمایا۔ ''وہ شیطان تھا۔''

ایک روایت میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ ہم عمار سے ملے اور ان کو کہا۔ ''ابوالیقظان، تم تو شیطان پر غالب آ گئے۔''

حضور ﷺ نے (اس کے متعلق) ایسے ارشاد فرمایا ہے۔ ''شیطان عمار کے اور پانی کے درمیان کالے حبشی کی شکل میں رکاوٹ ڈال رہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے عمار کو غالب کر دیا۔'' حضرت عمارؓ نے فرمایا۔ ''اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ شیطان ہے تو میں اس کو قتل کر دیتا، اگر اس سے سخت بدبو نہ آ رہی ہوتی تو میں اس کی ناک ضرور کاٹ دیتا۔''

علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب ''تاریخ جنات و شیاطین'' سے اقتباس

مرسلہ: تقسیم میاں ...... [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ٹھیک ہے صاحب.....''

''ایک خوش خبری میرے پاس بھی ہے تمہارے لیے۔'' سراج نے کہا۔ ''تمہارے صاحب اور بیگم صاحب ایک ہفتے بعد واپس آ رہے ہیں۔''

نیاقت حسین نے خوشی کا اظہار کیا، پھر سراج سے دو چار باتیں کرنے کے بعد کام پر چل گیا لیکن ..... اس کے ساتھ دو بار جو حیرت انگیز واقعات رونما ہو چکے تھے وہ اس کے ذہن میں انتشار پیدا کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہے کہ جو کارنامے وہ کر گزرتا ہے اس کا پتا دوسروں کو چل جاتا ہے لیکن وہ خود بے خبر رہتا ہے؟ یہ بات خود اس کے لیے بھی ایک معما بن گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن شائع ہونے والے اخباروں نے معروف شاہراہ پر پائی جانے والی پانچوں لاشوں کی تصویروں کے ساتھ، پولیس کے خلاف نمک مرچ لگا کر جو خبریں پہلے صفحات پر نمایاں طور پر شائع کی تھیں اس نے نہ صرف پورے شہر میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا بلکہ مرکزی حکومت کے متعلقہ ذمے داروں نے بھی صوبائی پولیس کے آئی جی، ڈی آئی جی اور پولیس افسروں سے سختی سے باز پرس شروع کر دی تھی۔ سراج صبح سے دفتر میں بیٹھ مستقل ایس پی آغا منظور سے رابطے میں تھا، اسی کے مشورے کی روشنی میں وہ فون کالز کا جواب بھی دے رہا تھا۔ تقریباً بارہ بجے آغا منظور کا فون پھر موصول ہوا، غالباً اس کی قوتِ برداشت اعلیٰ حکام کی سرزنش سن سن کر جواب دے چکی تھی۔

''مسٹر سراج۔'' اس نے بے انتہا جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی فون کا ریسیور اٹھا کر ایک طرف ڈال دیں۔ اٹ از ٹو مچ (It is too much)، جو حکام مجرموں کے لنگوٹیا یار ہیں اس وقت وہ بھی اس طرح باز پرس کر رہے ہیں جیسے ان سے زیادہ معصوم اور فرض شناس کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ نان سنس۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے فون انگیج کر دیں تاکہ سکون کے ساتھ کچھ سوچ سکیں، میں نے ڈی آئی جی صاحب سے بھی بات کر لی ہے۔''

''سر..... کیا آپ مجھے بھی بتائیں گے کہ وہ کون لوگ ہیں جو مجرموں کو بے نقاب کرنے کے بجائے ہم پر غرا رہے ہیں؟''

''ہم اور آپ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، اس لیے ان کے نام لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ دیٹ از آل۔'' دوسری جانب سے بھلا کر کال منقطع کر دی گئی۔ سراج نے ایس پی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے نہ صرف فون کا ریسیور میز پر رکھ دیا بلکہ اپنے ڈیوٹی کانسٹیبل کو بھی بلا کر تاکید کر دی کہ جو بھی ملنا چاہے اس سے کہہ دے کہ وہ کسی افسر سے مصروف گفتگو ہے۔

سنتری کے جانے کے بعد سراج نے بھی ذہنی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے۔ ان باتوں کے سلسلے میں اسے بہرحال کچھ نہ کچھ قانونی کارروائی تو کرنی تھی۔ سوچوں کے زاویے اس کے ذہن میں پھیلے تو اسے گزشتہ روز ایس پی کا کہا ہوا ایک جملہ بھی یاد آ گیا۔ ''ہمارے لیے جو پریشانیاں کھڑی کی گئی ہیں وہ کسی سوچی سمجھی اسکیم سے متعلق نظر آتی ہیں۔'' اس نے اس جملے کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ..... ''اب وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے جس کا علاج ضروری ہے۔'' سراج نے ان جملوں کی وضاحت چاہی تو جواب میں یہی کہا گیا۔ ''سوری..... اس وقت کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔''

ایس پی آغا منظور کے جملوں سے یہی لگتا تھا کہ وہ کسی مخصوص شخص پر شبہ ضرور کر رہا ہے۔ سراج نے الجھی ہوئی کڑیاں تلاش کرنے کی خاطر ذہن پر زور دیا تو اسے میڈم روبی کے اغوا کے سلسلے میں اپنے ایس پی کا کہا ہوا ایک اور جملہ یاد آ گیا۔ اس وقت بھی اس نے سراج کی ایک بات کو ٹالنے کی خاطر گول مول جواب دیا تھا۔ ''سوری، میں اس وقت زبان کھولنے سے قاصر ہوں، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میڈم کے سلسلے میں باقاعدہ پلاننگ کرنے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا ہوگا۔''

ایس پی کے جملے سراج کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے، اسی حوالے سے اچانک اس کے ذہن میں شیخ حامد کا خیال ابھرا جس نے ایس پی کو باقاعدہ خرید رکھا تھا، اس کے اس خیال کی تصدیق دبی زبان میں ڈی آئی جی کرائمز علیم احمد نے بھی کی تھی۔ سراج یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا ایس پی آغا منظور بھی میڈم روبی کے طلب گاروں میں سے ہے، نہ ہوتا تو وہ سراج کو اپنے دفتر بلا کر اسے روبی کی خفیہ طور پر نگرانی کرنے کی ہدایت بھی نہ دیتا۔

ان تمام باتوں کے پیشِ نظر سراج نے شیخ حامد کو ٹٹولنا بھی ضروری سمجھا، خود شیخ حامد نے سراج کو ایک لاکھ روپے میں خریدنے کے بعد کہا تھا۔ ''ایک بار واقفیت ہو گئی ہے تو اب آتے جاتے رہے گا۔''

سراج نے کافی غور و خوض کے بعد ریسیور اٹھایا اور شیخ حامد کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ پوری طرح محتاط ہو کر بیٹھ گیا

تھا، اسے شبہ تھا کہ شیخ حامد کے نمبروں پر کی جانے والی کالیں ٹیپ بھی ہوتی ہوں گی جسے بعد میں بطور بلیک میلنگ کے استعمال کیا جاتا ہوگا۔

''ہیلو..... شبنم فرام حامد گروپ آف کمپنیز۔'' دوسری جانب سے ٹیلی فون آپریٹر کی مترنم آواز ابھری تو سراج کو اس کی آواز کچھ آشنا سی لگی۔ اس نے خود کو بے پروا ظاہر کرتے ہوئے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''آپ شاید ٹیلی فون آپریٹر بول رہی ہیں؟''

''یس پلیز..... آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

''شیخ حامد سے کال ملا دیں۔'' سراج نے قدرے رعب دار آواز میں کہا۔

''مے آئی نو یور گڈ نیم پلیز (کیا میں آپ کا نام جان سکتی ہوں)'' اس بار بھی مہذب لہجے میں سوال کیا گیا۔

''سراج.....'' سراج نے مختصر نام بتایا۔

''آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟'' شبنم کے لہجے کا تجسس محسوس کر کے سراج کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ اسے پوری طرح یاد آ گیا کہ شبنم نامی آپریٹر کی آواز اس نے پہلے..... کب اور کس موقعے پر سنی تھی۔

''آپ مسٹر حامد کو صرف اتنا بتا دیں جو میں نے کہا ہے۔'' سراج نے دیدہ و دانستہ الجھنے والا انداز اختیار کیا۔ ''میں کوئی مزید حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

''ون منٹ پلیز۔'' اس بار شبنم نے روایتی جواب دیا۔ ''میں چیک کر کے آپ کو جواب دیتی ہوں۔''

سراج کا ذہن پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسی آواز نے میڈم روبی کے اغوا کے سلسلے میں اسے کسی پبلک فون بوتھ سے فون کر کے کہا تھا۔ ''کچھ لوگ میڈم کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔'' سراج کے وضاحت کرنے پر اس نے جواب دیا تھا کہ..... ''ابھی میں اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتی۔ اس وقت میں آپ کو جو کلیو دے رہی ہوں اس کو ذہن میں محفوظ رکھیں تاکہ بوقتِ ضرورت آپ کے لیے کارآمد ثابت ہو۔'' اس کے ساتھ ہی پبلک فون کا حوالہ دے کر لائن منقطع کر دی گئی تھی۔ سراج کے ذہن میں کچھ کڑیاں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں جب شبنم کی آواز دوبارہ ابھری۔

''بات کریں پلیز.....'' اس نے جواب دے کر لائن شیخ حامد سے ملا دی تھی۔

''ہیلو ڈی ایس پی صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟'' شیخ حامد نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بہت دنوں بعد آپ نے یاد کیا۔''

''ایک بار پہلے بھی آنے کا ارادہ کیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ آپ تین چار روز کے بیرونِ ملک کے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔''

''بزنس میں آئے دن ادھر ادھر آنا جانا تو لگا ہی رہتا ہے۔ آپ سنائیں، اس وقت میری یاد کیسے آ گئی؟''

''آپ کو ایک ممکنہ خطرے کے تحت حفظِ ماتقدم کے طور پر فون کرنے کی جسارت کی ہے۔'' سراج نے جان بوجھ کر انکساری سے کہا۔ ''آج کا اخبار تو آپ نے دیکھا ہوگا؟''

''ہاں..... ایک سرسری نظر ڈالی تو تھی لیکن مجرم اور کیڑے مکوڑے تو آئے دن ہلاک ہوتے رہتے ہیں۔'' شیخ حامد نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ ''آپ کو کیا تشویش لاحق ہے؟''

''اوپر سے سخت باز پرس ہو رہی ہے سر.....'' سراج نے پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر درخواست کی۔ ''بہت سے پولیس آفیسروں کی اکھاڑ پچھاڑ اور دور دراز علاقوں میں تبادلے کی خبریں بھی مل رہی ہیں۔ آپ کو اسی وجہ سے کال کیا ہے کہ.....''

''ڈونٹ وری مسٹر سراج۔'' بڑے یقین سے جواب دیا گیا۔ ''ہم جس کو ایک بار دوست کہہ دیں تو اس کا خیال بھی ضرور رکھتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ کیا ہوگا آپ اس کا غم نہ کریں لیکن آپ کا تبادلہ نہیں ہوگا۔''

''بہت بہت شکریہ شیخ صاحب۔'' سراج نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی اس نوازش کو بھی یاد رکھوں گا۔''

''تو تھینکس مسٹر سراج۔ دوستوں کا حساب دل میں ہوتا ہے۔'' اس جملے کی ادائیگی کے ساتھ ہی لائن کاٹ دی گئی۔

سراج نے ریسیور پھر میز پر رکھ دیا اور بے چینی سے اٹھ کر اپنے دفتر میں ٹہلنے لگا۔ جو کڑیاں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں وہ صرف اور صرف شیخ حامد کو مشکوک ثابت کر رہی تھیں لیکن وہ اب بھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ افضل خان کے ساتھ شبنم کا بھی شیخ حامد گروپ آف کمپنیز میں کام کرنا اس کے لیے زیادہ حیرت انگیز نہیں تھا، مگر جو بات اسے بار بار کھٹک رہی تھی، وہ شبنم کا سراج کو فون کال کر کے میڈم روبی کے سلسلے میں یہ بتانا تھا کہ..... ''کچھ لوگ میڈم روبی کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے۔'' یہ جملہ اس بات کی ترجمانی کر رہا تھا کہ خود شبنم نے بھی شیخ حامد کے خلاف زبان کھولنے کی کوشش کی تھی۔ ''کیا وہ بھی کسی خاص مقصد کی وجہ سے وہاں کام کر رہی تھی؟ وہ مقصد کیا تھا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سراج کچھ دیر تک غور وفکر کرتا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر فون پر لیاقت حسین سے رابطہ کیا، دس منٹ کے انتظار کے بعد دوسری جانب سے لیاقت حسین کی آواز سنائی دی تو اس نے تیزی سے سوال کیا۔

''آج کے اخبار میں جو تصویریں چھپی ہیں اس کے بارے میں تمہاری بیوی کا کیا کہنا ہے؟''

''اس نے ان سب کو شناخت کرلیا ہے صاحب۔''

''کیا تمہاری بیوی اگر کوشش کرے تو اس جگہ کا پتا بتا سکے گی۔ میرا مطلب ہے کہ ممکن ہے واپسی میں اس نے شاید کچھ ایسے علاقوں کو دیکھا ہوگا جنہیں دوبارہ دیکھنے پر وہ اس کی تصدیق کرسکے؟''

''میں آج اس سے یہ بھی معلوم کرلوں گا صاحب۔'' لیاقت حسین نے کہا۔ ''ویسے وہ بار بار ایک ہی بات بتاتی ہے کہ جہاں اسے رکھا گیا تھا وہ ...... علاقہ نہیں جانتی۔ اسے اغوا کرنے والوں نے جس جگہ رکھا تھا وہ گودام لگتا تھا۔''

''ٹھیک ہے...... تم آج اس سے تفصیل سے بات کر لو، میں کل کسی وقت کوٹھی پر آ کر تم سے ملاقات کروں گا۔''

سراج نے لائن کاٹ دی۔ وہ فون پر زیادہ کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو بات کر چکا تھا شاید وہ بھی اسے براہ راست لیاقت حسین سے مل کر کرنی چاہیے تھی لیکن......

لیاقت حسین سے بات کرنے کے بعد اس کی نظروں میں ابھرنے والی چمک اس بات کی غماز تھی کہ شاید اس نے اصل مجرم تک پہنچنے کی خاطر کوئی خاص پلان اپنے ذہن میں ضرور مرتب کرلیا تھا۔

اسی شام سراج اور ایس پی آغا منظور کو ڈی آئی جی کرائمز کے دفتر میں طلب کرلیا گیا۔ مرکزی حکومت نے بطور خاص چاروں اشتہاری مجرموں کا کیس حافظ علیم احمد کے حوالے کر دیا تھا۔ سراج آغا منظور کو اپنی گاڑی میں لیتے ہوئے گیا، راستے میں ایس پی کا موڈ خاصا خراب ہی دکھائی دے رہا تھا۔

''خدا جانے یہ ڈی آئی جی کرائمز ہر خاص معاملے میں ہوم منسٹر کی نظروں کا تارا کیوں بن جاتا ہے؟ کیا کیس فائل کو اس کے نام مارک کر دینا ہمارے لیے باعث توہین نہیں ہے؟''

''سب اوپر والوں کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے سر......'' سراج نے غیر جانب داری سے کام لیا۔ ''جس کو پیا چاہے وہی سہاگن والی مثال ہے۔''

''مطلب یہ کہ وہ آپ کو خاص طور پر پسند ...... ہے۔''

''افسر کا بلاوا آجائے تو جانا پڑتا ہے سر...... اس وقت آپ کو بھی جانا پڑ رہا ہے۔'' سراج نے دبی زبان میں کہا۔ ''پسند اور ناپسند والی بات بھی افسری کی مرضی ہے۔ ہمیں ہر حال میں تابعداری کرنا پڑتی ہے۔''

ڈی آئی جی کرائمز نے اٹھ کر بڑے اہتمام سے ان دونوں سے ہاتھ ملایا پھر ایس پی سے بولا۔

''میں نے ذاتی طور پر اس کیس کو لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن پھر بھی فائل میرے نام مارک کر دی گئی۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ دونوں حضرات کو محض اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ بھی اگر میرے ساتھ تعاون کریں تو ذاتی طور پر میں آپ دونوں کا شکر گزار ہوں گا۔''

''ہم نے پہلے بھی کبھی تعاون کرنے سے انکار نہیں کیا جناب۔'' ایس پی نے اس وقت بھی کسمسا کر جواب دیا۔

''یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' ڈی آئی جی نے حسب عادت مہذب لہجے میں کہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی آگئی ہے۔ اس میں وہی کچھ ہے جس کی توقع ایسے موقعوں پر کی جاتی ہے۔ مجرموں کو اس وقت شوٹ کیا گیا جب وہ بے ہوشی بوجہ کثرت شراب نوشی کے عالم میں تھے۔ موت کا وقت لاش ملنے سے قبل یعنی رات تقریباً ڈھائی اور تین کے درمیان کا ظاہر کیا گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟ اور ان چاروں کو گولی مارنے کی وجہ کیا تھی؟''

''میں آف دی ریکارڈ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس قسم کے اشتہاری مجرموں کی پشت پناہی میں بڑے بڑے لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔'' ایس پی نے جز بز ہو کر کہا۔ ''وہی ایسے قاتلوں کو پالتے ہیں اور کسی ناکامی کی وجہ سے ٹھکانے بھی لگا دیتے ہیں، بعد میں سارا کچرا ہم پولیس والوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔''

''میں آپ کی رائے سے سو فی صد متفق ہوں لیکن کاغذ کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کارروائی تو بہرحال کرنی ہوتی ہے۔''

''بہرحال۔'' ڈی آئی جی نے اس بار قدرے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے کل شام چھ بجے اپنے آفس میں پریس کے مخصوص نمائندوں کو بلایا ہے، اگر آپ دونوں بھی شرکت کریں تو بہتر ہوگا۔ عوام کو مطمئن کرنے کی خاطر یہ سب کچھ بھی ضروری ہے۔''

ایک گھنٹے کے بعد وہ ڈی آئی جی آفس سے نکلے، ایس

پی کی گاڑی اس کا ڈرائیور لے کر آ گیا تھا، اس نے گاڑی میں بیٹھتے وقت سراج سے کہا۔ ''کل کی کانفرنس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟''

''رپورٹرز ہم سب سے دھواں دھار سوالات کریں گے۔'' سراج نے شانے اچکا کر جواب دیا۔ ''بال کی کھال نکالنا ان کا حق بھی ہے، اس سے پیشتر بھی سنگین معاملات میں ہمیں ڈپلومیسی سے کام لینا پڑا ہے۔ اس بار بھی ہمیں اپنی پوزیشن بچانے کی خاطر کچھ نہ کچھ تو جواب بہرحال دینا پڑے گا۔ خاموش رہے تو یہ رپورٹرز ہمارا جینا بھی دوبھر کر دیں گے۔''

''میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ کل ہمیں ہنگامی صورت حال سے واسطہ پڑے گا لیکن...... میرا ذاتی خیال ہے کہ اب فائل چونکہ اسپیشل کرائمز برانچ کے حوالے کر دی گئی ہے اس لیے ہمارا جواب ایک ہی ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''وہ کیا سر......؟''

''یہی کہ لاشیں ہم نے دیکھی تھیں، مگر اصل مجرم کون ہے؟ لاشیں آسمان سے ٹپکی تھیں یا کسی تاڑ کے درخت سے اس کا اندازہ ضروری قانونی کارروائی اور تفتیش کے بعد ہی لگایا جاسکتا تھا مگر...... اب چونکہ کیس کو زیادہ ذمے دار افسران کو مارک کر دیا گیا ہے اس لیے میرا ذاتی مشورہ ہے کہ کل ہمارا خاموش رہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ زیادہ تر جوابات ڈی آئی جی کرائمز ہی دیں تو مناسب ہوگا۔''

''رائٹ سر......'' سراج نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ''میں خیال رکھوں گا کہ توپوں کا رخ کس سمت مڑتا ہے۔''

''ایک بات اور......'' ایس پی نے اس بار مدھم آواز میں پوچھا۔ ''میڈم روبی کے اغوا کے سلسلے میں کیا پروگریس ہوئی؟''

''ابھی تک یہ بھی ایک معما ہے سر...... لیکن۔'' سراج نے ایک لمحے کے توقف کے بعد وہی جملہ دہرا دیا جو اس نے فون پر سنا تھا۔ ''میرا ذاتی خیال ہے کہ کچھ لوگ میڈم کو زندہ رہتا پسند نہیں کرتے...... جو لوگ ایک بار ناکام ہوگئے وہ دوبارہ زیادہ منظم طریقوں سے اپنی مذموم حرکت کو کامیاب بنانے کی کوشش سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔''

''آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟''

''یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا...... مگر قیاس یہی ہے کہ بڑی مچھلیوں کا شکار صرف تجربے کار ماہی گیر ہی کرتے ہیں۔''

''میری ایک ذاتی ریکوئسٹ ہے۔'' ایس پی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''آپ میڈم کی حفاظت کا خیال رکھیں۔ رہا ماہر شکاریوں کا معاملہ تو ان سے بھی بعد میں حساب کتاب ضرور ہوگا۔''

ایس پی اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کی کار کے حرکت میں آنے کے بعد سراج کے ہونٹوں پر ابھرنے والی مسکراہٹ بھی کچھ کم معنی خیز نہیں تھی۔

☆☆☆

شبنم کی شخصیت کچھ کچھ بے نقاب ہوجانے کے بعد سراج کو بحیثیت ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے، سب سے زیادہ فکر اسی کروڑ پتی بیوہ کی تھی جسے کچھ لوگ زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ میڈم روبی کی حفاظت کے ساتھ اب اس کے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ لیاقت خان کی رہائش گاہ کے آس پاس بھی کچھ قابل اعتماد سادہ لباس میں پولیس والے تعینات کرائے جائیں، اس نے فون پر ملنے والی کسی نامعلوم شخص کی مخبری کی روشنی میں فرحین اور زرینہ کو جس گودام تین سے لیاقت خان کے ذریعے بازیاب کرالیا تھا وہ شیخ حامد کے سوا کسی اور کی ملکیت نہیں تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کر گھر جاتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں کچھ سوالات چھڑ رہے تھے۔ ''اگر لیاقت کی بیوی کو اغوا کرانے میں براہ راست شیخ حامد ہی ملوث تھا تو اس کی لیاقت حسین سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی؟ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ فرحین کے اغوا میں شیخ حامد کے کسی ایسے ورکر کا ہاتھ ہو جو لیاقت کے مکان کے آس پاس کہیں رہتا ہو اور فرحین کے بارے میں جانتا ہو کہ وہ گھر پر تنہا رہتی ہے، پھر کوئی موقع غنیمت دیکھ کر اسے اٹھا دیا ہو لیکن...... اس کے ساتھ زرینہ کو اغوا کرنے کا کیا جواز بنتا تھا جو لیاقت حسین کے سب سے قریبی دوست کی بیوی تھی؟'' سراج ہر پہلو سے عقل گھوڑے دوڑانے میں مصروف تھا لیکن گھوم پھر کر اس کے ذہن میں شیخ حامد ہی کی شخصیت ابھرتی تھی اس لیے کہ فرحین اور زرینہ کی بازیابی کے بعد ہی ان چار اشتہاری مجرموں کی لاشیں منظر عام پر آئی تھیں جن کی تصویریں دیکھنے کے بعد فرحین نے بھی ان کو بحیثیت اغوا میں ملوث قرار دیا تھا۔ اس کے بعد کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی تھی۔

شیخ حامد جیسے گھاگ آدمی کے لیے ان چاروں کی موت ضروری تھی ورنہ کسی وقت قانون کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد ان کی زبان بھی کھل سکتی تھی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ سیٹھ عثمان اور راحیلہ کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپسی کی اطلاع کے بعد سراج کے لیے ان کی حفاظت کا مسئلہ بھی بے حد اہم تھا۔ اگلے دن ہونے والی پریس کانفرنس کے سلسلے میں ایس پی آغا منظور نے جو خاموشی اختیار رکھنے کی بات کی تھی وہ بھی سراج کے ذہن میں چبھ رہی تھی۔ ایس پی روز اول سے ڈی آئی جی کرائمز کو پسند نہیں کرتا تھا جس کی وجہ علیم احمد کی دیانت داری تھی، مگر سراج نے شیخ حامد کو ٹریپ کرنے کے سلسلے میں بھی صرف اور صرف علیم احمد کی شخصیت پر اعتماد کیا تھا۔ ایس پی کی خاموش رہنے کی تاکید سے اسے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ خاصی دیر تک ذہنی طور پر کسی ایسے درمیانی راستے کے بارے میں غور کرتا رہا جو اس کی ذاتی پوزیشن کو بھی تحفظ فراہم کر سکے اور متوقع خطرات سے قانونی حیثیت میں بھی عہدہ برآ ہونے میں کام آ سکے۔

گھر پہنچ کر رات کے کھانے کے بعد بھی وہ درپیش معاملات پر غور و فکر کرتا رہا پھر کچھ سوچ کر اس نے ڈی آئی جی کرائمز کے ان لسٹڈ نمبروں پر کال کیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد دوسری جانب سے خود علیم احمد نے کال ریسیو کی۔ سراج نے چند رسمی جملوں کے بعد اسے فرحین اور زرینہ کی بازیابی کی تمام روداد پوری تفصیل سے سنا دی۔

"گڈ..." دوسری جانب سراج کو سراہتے ہوئے کہا گیا۔ "گویا ہم دونوں نے جو اندازے قائم کیے تھے وہ بالآخر درست ثابت ہوئے۔"

"میرا ایمان ہے سر کہ انسان اگر اپنے فرائض میں کی نیت سے کام لے تو اس کے نتائج بھی بہتر ہی نکلتے ہیں۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"سر..." سراج نے قدرے ہچکچا کر کہا۔ "آپ سے ایک ذاتی درخواست اور کرنا چاہتا ہوں۔"

"کہو..." دوسری جانب سے بے تکلفی اور بزرگانہ شفقت کا اظہار کیا گیا۔

"سر... آپ اگر ایک دو روز میرے ایس پی صاحب کی موجودگی میں مجھ سے اپنی خفگی کا اظہار کر دیں تو بڑی نوازش ہوگی۔"

"خیریت...؟"

"مجھے کل کی کانفرنس میں خاموش رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔" سراج نے دبی زبان میں وجہ بتا دی۔

"کی ہی... " علیم احمد نے اس بار بھی بے تکلفی سے کہا۔ "میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ بھی چوروں... [illegible] نظر میں نظر آنے والی شخصیت و بھانپ... [illegible]

پیش نظر وہ اپنے منظور نظر کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہے۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے سر۔ اس کے علاوہ ہمارے ایس پی صاحب میڈم روبی کی وجہ سے بھی فرسٹریشن کا شکار ہیں۔"

"کیا مطلب؟" دوسری جانب سے حیرت کا اظہار ہوا۔ "یہ میڈم روبی کا نام درمیان میں کہاں سے آ گیا؟" سراج نے جواب میں میڈم روبی کے اغوا کی کہانی سناتے ہوئے کہا۔ "مجھے خاص طور پر ہدایت دی گئی ہے کہ میں میڈم کو پروٹیکشن دینے کا خیال رکھوں۔"

"اس کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟"

"جی سر... دراصل ایس پی صاحب دوبارہ اپنا گھر آباد کرنے کے خواہش مند ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں کسی قسم کی فکر بھی نہیں رہے گی۔"

"ونڈرفل..." ڈی آئی جی نے بے تکلفی سے کہا۔ "گویا شادی کے ساتھ ساتھ وہ میڈم کی کروڑوں کی جائداد پر بھی نظر جمائے ہوئے ہے۔"

"خیال تو یہی ہے سر لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا آسانی سے ہمارے مطلوبہ شخص سے دشمنی افورڈ کر سکتا ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے اس لیے کہ جو جرائم پیشہ ہوں وہ کسی نہ کسی طرح ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ ان کے درمیان دوبارہ بھی پھوٹ پڑ سکتی ہے۔ یہی جرائم پیشہ لوگ اکثر اپنی ذاتی رنجشوں کے سبب ہمارے لیے کارآمد بھی ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ دشمنا مخبر پھر ہمارے کام آئے گا۔"

"ابھی تک تو اس نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔"

"ڈونٹ وری۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ آپ کو ایک بار اپنے لیے کارآمد سمجھ لینے کے بعد دوبارہ پھر کسی نہ کسی مقصد کی خاطر ضرور کال کرے گا۔ او کے۔ بائی۔"

دوسری جانب سے فون منقطع ہو گیا۔ سراج ڈی آئی جی کی کہی بات پر غور کرنے لگا۔

☆☆☆

شیخ حامد اس وقت اپنے آفس میں کسی بھوکے درندے کی طرح ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ چہرے کے تاثرات سے یوں لگتا کہ شدید غصے اور اشتعال کی حالت سے دوچار ہے۔ ایک کرسی پر افضل خان بھی دم سادھے بیٹھا "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

[illegible] پہنچ [illegible] سے [illegible] [illegible] تھے۔ [illegible]

فرحین سے مرکزی حکومت کی جانب سے شدید باز پرس ہو رہی تھی۔ عوامی نمائندے بھی احتجاج کر رہے تھے۔ انہیں افضل خان ہی نے شیخ حامد کے حکم پر اپنے خاص آدمیوں سے [illegible] دیا تھا جس روز کسی نہ کسی طرح فرحین [illegible] ان کے قبضے سے نکل گئی تھیں، کال گرل کو اس لیے [illegible] بعد میں زبان بھی کھول سکتی تھی۔

[illegible] شیخ حامد کے خطرناک تیور دیکھ کر افضل خان [illegible] تھا۔

"[illegible] یہ ہے کہ وہ دونوں کس طرح وہاں سے نکل [illegible]" شیخ حامد نے کرسی پر بیٹھ کر میز پر دونوں ہاتھ [illegible] ہوئے افضل خان کو شدید غصے کے عالم میں گھورا۔ "[illegible] بے ہوشی کی دوا پلا دی گئی تھی۔ ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے، یہ بات تم نے ہی کہی تھی پھر ان کو بے ہوشی کی حالت میں کیا جن بھوت اٹھا کر لے گئے تھے؟"

"سر..." افضل خان نے بغلیں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے ان چوروں نے یہی بتایا تھا۔"

"[illegible]..." شیخ حامد دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ "[illegible] تھے پر وہ کال گرل وہاں کہاں سے نازل ہوئی؟ ان چوروں نے بے تحاشا پی ہوگی اور پھر بار بار اس [illegible] کرنے کے بعد خود بھی مردوں کی طرح اوندھے [illegible]"

"[illegible] درست فرما رہے ہیں لیکن اس کا جواب تو وہ [illegible] دے سکتے ہیں۔"

"[illegible]..." شیخ حامد حلق کے بل چلا کر بولا۔ "[illegible] ہوں میں اس قسم کے جواب سننے کا عادی نہیں [illegible] تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟... ذمے داری تمہاری [illegible] جا کر صورت حال کا جائزہ لے کر اپنا [illegible] تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"[illegible] میں اپنی غلطی تسلیم [illegible]..."

"[illegible]..." شیخ حامد غرایا۔ "آئی ڈونٹ [illegible] پہلی [illegible] (مجھے صرف دم ہلاتے ہوئے کتے پسند نہیں [illegible] آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری باتوں کا [illegible]

[illegible] اس نے جب اس کی آنکھوں کی [illegible] سے سب ہی کی مرتا نظر آ رہی تھیں۔

[illegible] شیخ [illegible] پکار [illegible] نکلے کا اس کی اپنی [illegible] شیخ حامد [illegible]

ماہنامہ پاکیزہ
اکتوبر 2011ء کے
شمارے کی نمایاں

عمیرہ احمد — عکس
عکس در عکس پھیلے سلسلۂ زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کی کھوج و جستجو کا سفر

شیریں حیدر
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
مسائل حیات سے متعلق مختلف زاویۂ نظر کو اجاگر کرتا ایک پُر تاثر ناول

عالیہ بخاری — خوشبو کا سفر
[illegible]

راحت وفا — ایک ننھی نیناں
[illegible] احساسات کے گرد گھومتا ناول

رضوانہ پرنس اور سدرۃ المنتہیٰ
[illegible]

ناہید سلطانہ اختر، لبنیٰ عروج
تحسین اختر، بشریٰ ستار، ثریا انجم
عروسہ وحید، شمیم فضل خالق
[illegible]

آپ کی آرزو کا رشتہ مستقل سلسلے
کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں تو ضرور پڑھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ ''میڈم روبی کے سلسلے.... میں تم نے کیا تیر مارا ہے؟''

''آپ جو چاہتے ہیں سر، وہ تین چار روز میں ہوجائے گا۔''

''گڈ.... اب یہ زیادہ اہم ہے، تصویریں میرے قبضے میں ہوں گی تو کل وہ ذرتی ڈاگ بھی میرے سامنے آنکھ ملاکر بات نہیں کرسکے گا۔''

باس کا اشارہ کس کی طرف تھا؟ افضل خان نے اس بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

''ایک خاص انفارمیشن اور بھی ہے تمہارے لیے۔'' شیخ حامد نے کہا۔ ''عثمان اور اس کی بیوی ایک ہفتے کے اندر آنے والے ہیں۔''

''مجھے آپ کا حکم یاد ہے سر....'' افضل خان نے مستعدی سے جواب دیا۔

''جو کچھ ایک بار ہوگیا اسے ریپیٹ نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے افضل خان کو خطرناک نظروں سے گھورا، اس بار تم کو بھی شکار کے ساتھ اس وقت تک موجود رہنا ہوگا جب تک میں اجازت نہ دوں۔''

''اوکے، سر۔''

''گودام کے گارڈ نے بھی ان چاروں.... کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو بتایا ہوگا؟''

''اس کا یہی کہنا ہے کہ وہ چاروں، دونوں عورتوں کے ساتھ عقبی راستے سے اندر گئے تھے، اس کی اطلاع انہوں نے گارڈ کو بھی دی تھی۔'' افضل خان نے کسمسا کر کہا۔ ''سر، اگر آپ کی اجازت ہو تو میں لیاقت کی بیوی کو دوبارہ....''

''نہیں....'' شیخ حامد نے تیزی سے کہا۔ ''ابھی اس کو دوبارہ چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا، ممکن ہے کہ ان کی خفیہ طور پر نگرانی کی جارہی ہو لیکن لیاقت حسین....''

''آپ اشارہ کریں تو اسے اوپر پہنچا دیا جائے۔''

''فی الحال کسی کو چھیڑنا مناسب نہیں ہے مگر.... میں لیاقت حسین کو زیادہ دنوں برداشت بھی نہیں کرسکتا۔''

افضل خان خاموش ہوا تو شیخ حامد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

''ڈی آئی جی کرائمز کی نگرانی ضروری ہے، مجھے یہ اطلاع ملتی رہنی چاہیے کہ وہ کیا تیر مارنے کی کوشش کررہا ہے؟''

''سر....'' افضل خان سنبھل کر بولا۔ ''وہ کسی قیمت پر بکنے والی چیز نہیں ہے ورنہ

''میں جانتا ہوں اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتا دوں کہ میں ایسے ایماندار اور فرض شناس افسروں کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ایک حد تک ان کا خیال بھی رکھتا ہوں۔ ہاں، اگر میں نے اس کی تفتیش کا رخ کسی خاص طرف دیکھا تو فائل کسی اور کے نام بھی کراسکتا ہوں۔ صرف ایک فون کال کافی ہوگی۔''

شیخ حامد رفتہ رفتہ نارمل ہورہا تھا اسی لیے افضل خان نے دبی زبان میں میڈم روبی کے جشن صحت منانے والی بات بھی پوری تفصیل سے بتادی، خاص طور پر اس شرط کا ذکر بھی کردیا کہ وہ کسی ہوٹل کا انتخاب خود کرے گی۔

''ڈونٹ وری.... وہ جس ہوٹل کا انتخاب کرے تم مجھے بتا دینا۔ وہاں بھی تمہیں اپنے اپارٹمنٹ جیسی سہولتیں دلوانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا لیکن.... میں کوئی ناکامی برداشت نہیں کروں گا۔ کام جتنی جلدی ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے۔''

''ایسا ہی ہوگا باس....''

''ناؤ گٹ لاسٹ....'' شیخ حامد نے حسب معمول اپنی زبان میں جانے کو کہا تو افضل خان خاموشی سے اٹھا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے تیزی سے اس آفس سے باہر نکل گیا جہاں داخل ہوتے ہوئے اب اس کی روح بھی لرز اٹھتی تھی۔ وہ اتنا ملوث ہوچکا تھا کہ اب اسے چھٹکارے کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

میڈم روبی اس وقت سونے کا ارادہ کررہی تھی جب اس کی خاص ملازمہ نے سامنے آکر کہا۔

''شبنم نامی ایک لڑکی باہر کھڑی آپ سے ملنے کی ضد کررہی ہے، میں نے اسے بہت سمجھایا لیکن....''

''اس وقت میڈم کے آرام کا وقت ہے۔'' کمرے میں موجود نرس نے ملازمہ سے کہا۔ ''بڑے ڈاکٹر نے جو ٹائم ٹیبل دیا ہے اس پر سختی سے عمل کرنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔''

''پلیز نرس....'' میڈم روبی نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تمہاری فرض شناسی سے بہت خوش ہوں لیکن اس وقت جو لڑکی مجھ سے ملنے آئی ہے، میں اسے کسی قیمت پر ٹال نہیں سکتی۔''

''لیکن ڈاکٹر....''

''میں تمہیں تفصیل نہیں سمجھا سکتی لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت میں ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہیں کرسکتی۔''

میڈم کا فیصلہ کن جواب سن کر نرس مجبوراً خاموش ہوگئی۔ ملازمہ نے پوچھا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی کسی قریبی بنگلے میں کام کرنے والی ملازمہ لگتی ہے۔''

''تم اس لڑکی کو میرے پاس لے آؤ اور اس بات کا خاص خیال رہے کہ جب تک وہ لڑکی میرے کمرے میں ہے تم باہر دور دور سے اس بات کی نگرانی کروگی۔ کوئی تیسرا فرد میرے کمرے کے قریب نہ آئے.... وہ لڑکی میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس کے یہاں آنے کا ذکر بھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔''

نرس نے میڈم روبی کے چہرے پر اچانک نمودار ہونے والی گہری سنجیدگی دیکھی تو وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میڈم تھوڑا سا بستر پر اوپر کھسک کر نیم دراز ہوگئی۔ دو تکیوں کا سہارا لے کر.... اس نے اپنے آرام کا بھی خیال رکھا تھا۔ شبنم کو اسی نے ملاقات کی دعوت دی تھی لیکن اتنی رات گئے۔ اس نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی، رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شبنم کمرے میں داخل ہوئی تو میڈم روبی کو ایک لمحے کے لیے تعجب ہوا پھر وہ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرسکی۔ شبنم نے اپنے چہرے کی خوبصورتی دور کرنے کے لیے جو میک اپ کیا تھا اور لباس زیب تن کر رکھا تھا اس سے بظاہر ایسا ہی لگتا تھا کہ وہ گھریلو ملازمہ ہے جس کے بائیں گال پر زخم کا ایک گہرا نشان بھی نظر آرہا تھا جو بھر جانے کے بعد بھی بدنما دکھائی دیتا تھا۔

اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد ملازمہ نے دروازہ اندر آکر بند کیا پھر پچھلے دروازے سے نکل کر باہر چلی گئی۔ میڈم نے اسے ایک بار پھر یہی تاکید کی تھی وہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرے گی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے شبنم کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''بیگم صاحب جی۔ میرا بچہ ادھر گاؤں میں بیمار ہے، اگر آپ ہمارے صاحب کو فون کرکے سفارش کردیں تو وہ مجھے چھٹی دے دیں گے، میرا گاؤں جانا بہت ضروری ہے۔''

''فائن....'' میڈم نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تمہیں اداکاری کا شوق رہ چکا ہے.... [illegible] انداز گفتگو بدل لینے کے بعد تم نے آواز پر بھی [illegible]''

''[illegible] پڑتا ہے۔'' شبنم نے اس بار اپنی اصل آواز

میں کہا پھر کرسی گھسیٹ کر میڈم کے بستر کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''جب شکاری کتے ہر طرف گھوم رہے ہوں تو پھر احتیاط تو کرنی پڑتی ہے۔''

''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔'' میڈم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''آپ نے گھر آنے کا اصرار نہ کیا ہوتا تو بھی میں کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر آپ سے ایک بار ملنے کی کوشش ضرور کرتی۔'' شبنم نے یک لخت سنجیدگی اختیار کرلی۔

''ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے اتنی اہمیت دے رہی ہو....؟''

''سوری.... آپ شاید بھول رہی ہیں کہ میں نے اسپتال میں کہا تھا کہ شاید میرا اور آپ کا دشمن ایک ہی ہے۔''

میڈم روبی جواب سن کر کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوگئی۔

''تم نے اس بات کا یقین کیسے کرلیا کہ میرا کوئی دشمن بھی ہوسکتا ہے؟''

''آپ کے اس سنجیدہ سوال کے جواب میں ایک بات میں بھی پوچھنے کا حق رکھتی ہوں۔'' شبنم نے کسمسا کر کہا۔ ''جس مہذب خاتون نے پیرس کی تفریح گاہوں میں کبھی بغیر حجاب کے جانا پسند نہ کیا ہو۔ وہ شوہر کے انتقال کے سال بھر بعد اس قدر ماڈرن کیوں بن گئی؟.... اور، اسے افضل خان جیسے خطرناک شخص کے اپارٹمنٹ میں تنہا جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟''

میڈم روبی اس طرح چونکی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو، شبنم کو سنجیدگی سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم میرے بارے میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی ہو، میری پیرس کی زندگی کے بارے میں تمہیں کس طرح معلوم ہوا؟''

آپ کے دونوں سوال کا ایک ہی جواب ہے۔'' شبنم معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''ہم دونوں کا دشمن ایک ہی ہے۔ نہ ہوتا تو میں جان پر کھیل کر کسی آدم خور درندے کے اتنے قریب جانے کی کبھی بھول کر بھی غلطی نہ کرتی۔''

''لیکن....'' میڈم نے کچھ کہنا چاہا۔

''آپ نے میرے کہنے پر افضل خان کے اپارٹمنٹ میں جانے کی حقیقت کو بھی اپنے پولیس کو دیے جانے والے بیان میں بدل دیا تھا۔'' شبنم نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا۔ ''کوئی نہ کوئی تو وجہ ضرور ہوگی؟''

''تم نے ابھی تک میرے سب سے اہم سوال کا جواب نہیں دیا۔'' میڈم نے کسمسا کر اپنی بات دہرائی۔ ''تمہیں میری پیرس کی باتیں کا علم کس طرح ہوا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک لمحے کے لیے بیڈروم میں خاموشی طاری رہی پھر شبنم نے دبی زبان میں کہا۔

''کیا آپ کو پیرس کے کسی فیشن شو میں انجلا نامی کوئی ماڈل پسند آئی تھی جسے آپ نے بطور خاص اس کی خوبصورت پرفامنس پر انعام بھی دیا تھا؟''

میڈم کی نظروں میں تجسس جاگنے لگا، کچھ توقف سے بولی۔

''ہاں ... مجھے وہ خوبصورت ہندوستانی ماڈل یاد ہے جس نے فیشن ماڈلنگ میں بہت ساری ماڈلز کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن تم انجلا کو کس طرح جانتی ہو؟''

''اس طرح کہ اسے اپنے شوہر کی دردناک موت کے بعد انجلا کا نام دوسری بار اختیار کرنا پڑا تھا۔'' شبنم نے ایک سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ''شاید اس لیے کہ وہ اگر دوبارہ انجم آرا کا نام اختیار رکھتی تو پھر اس کے اپنے بھی اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔ شاید اس کا انجام بھی اپنے شوہر کی موت سے زیادہ اذیت ناک ہوتا۔''

میڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بدستور حیرت سے شبنم کو دیکھتی رہی۔

''انجلا خوبصورت جسم کی مالک تھی شاید اسی لیے بہت جلد ٹاپ ماڈل میں شمار ہونے لگی۔ دنیا میں ماڈلز کی زندگی بڑے ٹھاٹ باٹ سے بسر ہوتی ہے۔ اس کے چاہنے والے اس کو قریب سے ایک نظر دیکھنے کے لیے ترستے ہیں لیکن انجلا ... وہ بدنصیب عورت ہر ہفتے کی رات اپنے بستر پر بچھی چادر کی طرح روندی جاتی تھی۔ اس کے عوض اسے یورو یا اس کے جسمانی حسن کو سراہنے والے خوبصورت جملوں کے بجائے گندی گندی فحش گالیوں سے نوازتے تھے۔ وہ اس طرح بھنبھوڑی جاتی تھی جس طرح شیر کے شکار کو اس کا پیٹ بھر جانے کے بعد لکڑ بگھے بھی بے دردی سے نوچتے کھسوٹتے ہیں۔ جنگل میں صرف شیر، چیتوں اور لکڑ بگھوں کا قانون چلتا ہے، مردار احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔'' شبنم کی آواز رندھ گئی۔ ''جب جسم اور روح کا رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر مردے پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہوتا ... اس کی زبان بند ہوتی ہے، صرف روح آہ و بکا کرتی ہے جسے انسان کے کان سننے کی قوت نہیں رکھتے۔''

''تم ... تم انجلا کو کس طرح جانتی ہو ... ؟'' میڈم نے حیرت سے پوچھا۔

''میں انجلا کو نہیں ... صرف انجم آرا کو جانتی ہوں جو میری معصوم ماں تھی۔'' شبنم کی خوبصورت آنکھیں بے اختیار آنسو چھلکنے لگیں۔ میڈم اس کے دل کا غبار چھٹ جانے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو رہی تھیں۔ یہ سن لینے کے بعد انجلا کو دوبارہ اپنا نام تبدیل کرنا پڑا اور وہ شبنم کی ماں تھی، اس کا تجسس بھی بڑھنے لگا۔

تین چار منٹ تک شبنم کی سسکیاں ابھرتی رہیں پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''میرے باپ نے انجلا سے شادی کی یہی ایک شرط رکھی تھی کہ وہ مسلمان ہو جائے، اس نے اپنے پیار کی خاطر وہ شرط قبول کر لی۔ وہ بڑے گھرانے کے ایک جاگیردار کی اکلوتی راج کماری تھی، بات پھیلی تو جاگیر کے تمام ہندو، پنڈت اور پجاری میرے باپ کے دشمن بن گئے لیکن میری ماں نے دوراندیشی سے کام لیا، اس نے اپنے گھر والوں کو وشواس دلایا کہ کچھ حاسدوں نے غلط خبر اڑا دی ہے۔ جاگیردار نے فوری طور پر پنڈتوں سے مہورت نکلوا کر اس کا رشتہ اپنے برابر والوں میں کر دیا، میری ماں خاموش رہی، خاموشی سے اپنے حصے کی دولت اور قیمتی زیورات جمع کرتی رہی پھر لگن منڈپ سجنے سے تین رات پہلے وہ خاموشی سے اپنا سب دھن دولت سمیٹ کر ائرپورٹ پہنچ گئی جہاں اس سے محبت کرنے والا پہلے سے موجود تھا۔ میرا باپ بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، اس کے پاس بھی دولت کی فراوانی تھی۔ دونوں نے مل کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی دوسرے ملک میں جا کر زندگی بسر کریں گے۔'' شبنم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''میرے ماں باپ کو کسی واقف کار نے یہ مشورہ دیا تھا کہ لندن یا امریکا جانے کے بجائے فرانس کی طرف نکل جائیں۔ انہوں نے دوست کا مشورہ قبول کر لیا۔ شادی کے تین سال بعد میں بدنصیب اس دنیا میں آ گئی، میرے والدین بہت خوش تھے۔ دو سال بعد میرے والد ہمیں لے کر سوئٹزرلینڈ آ گئے، انہوں نے فرانس جا کر جو کاروبار اختیار کیا وہ خوش قسمتی سے بے حد کامیاب رہا، والد صاحب نے ایک دو کمرے کا خوبصورت اپارٹمنٹ پیرس میں بھی خرید لیا تھا، ان کا ارادہ تھا کہ میرے بالغ ہو جانے کے بعد سوئٹزرلینڈ سے پیرس شفٹ ہو جائیں گے اور دشمنوں سے بہت دور پرسکون زندگی گزاریں گے لیکن ... قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔''

شبنم سانس لینے کے لیے رکی پھر سرد آہ بھر کر اپنی کہانی کا دردبھرا حصہ سنانے لگی۔

''اس وقت میری عمر سات سال تھی، میں سوئٹزرلینڈ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ایک ایسے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں امیر کبیر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کا محض خواب دیکھا کرتے ہیں۔ میرے والد کو کاروباری سلسلے میں آس پاس کے ملکوں کا سفر کرنا پڑتا تھا، اس لیے انہوں نے میرے لیے اسکول کے قریب ہی ایک بورڈنگ ہاؤس میں میرا بندوبست کر دیا تھا۔ بیرون ملک کی غیر آلود فضا میں میری ماں کا حسن روز بروز نکھرتا جارہا تھا، ایک بار کسی بے تکلف دوست نے مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر میری ماں پیرس جا کر شوقیہ طور پر ہی ماڈلنگ شروع کر دے تو دو چار شوز کے بعد ہی ٹاپ ماڈلز میں شمار ہونے لگے گی۔ ایک ایک شو میں ہزاروں یورو کما سکتی ہے، میرے والدین نے اس مشورے کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔ انجلا سے انجم آرا بننے کے بعد میری ماں نے اسلامی تعلیم میں بھی خاص دسترس حاصل کر لی تھی، وہ باہر نکلتی تو ہمیشہ حجاب کا استعمال کرتی جس کے سبب اس کے قدرتی حسن اور رنگ وروپ میں اور نکھار آ جاتا تھا، ایک بار میں نے اپنے والد کو ماں سے کہتے سنا تھا۔ ''انجم، تم تو شادی کے بعد دس گیارہ سال بڑی لگنے کے بجائے اور زیادہ کمسن اور حسین ہوتی جارہی ہو۔'' میں اس جملے کو سن کر وہاں سے ہٹ گئی تھی، ماں نے کیا جواب دیا، میں نے سننے کی کوشش نہیں کی لیکن میرے باپ نے جو کہا وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔''

شبنم نے ایک لمحے رک کر درد بھری آواز میں اپنی کہانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''ان دنوں میرے والد میری ماں کے ساتھ لندن میں ایک کاروباری سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں یورا وی آئی پی سوٹ بک کرا رکھا تھا۔ وہ سفر میرے والد کی زندگی کا آخری سفر ثابت ہوا۔ جہاں انہیں ایک دوسرے بڑے اور عیاش سرمایہ دار نے میری ماں کے سامنے اس کے وی آئی پی سوٹ میں مار دیا تھا، مارنے سے پہلے اس بے غیرت قاتل نے میرے والد کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے بے بس کر دیا تھا۔ وہ کمینہ میری ماں کو اس کے شوہر کے سامنے برہنہ کر کے اس کی شرافت کی دھجیاں اڑاتا رہا، اس کے دو نقاب پوش بدمعاش بھی کمرے میں سائلنسر لگے پستول لیے کھڑے تھے۔ وہ حرامزادے بھی میری ماں کی عزت لٹنے کا تماشا دیکھتے رہے پھر انہوں نے اپنے حرامزادے ۔ لک کے اشارے پر میرے باپ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ میری ماں پر سکتہ طاری ہو گیا، اس رات دونوں نقاب پوش بھی میری ماں کو شکاری کتوں کی طرح بھنبھوڑتے رہے۔ ان کے جانے سے پیشتر ان کا باس دوبارہ کمرے میں آیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میری ماں کے نیم برہنہ جسم پر وہ تصاویر ڈال دیں جو نقاب پوشوں کے ساتھ اتاری گئی تھیں۔ یہ بھی حکم دیا گیا کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کا انجام بھی مرنے والے سے مختلف نہیں ہوگا۔ پھر وہ چلے گئے۔'' شبنم کی سسکیاں دوبارہ ابھرنے لگیں، میڈم اس کو دیکھتی رہی جب شبنم کے آنسو تھمے تو اس نے پوچھا۔

''کیا اس بے غیرت کا نام بھی شیخ حامد تھا۔'' اس کے لہجے میں دنیا جہان کی نفرتیں اور انتقامی جذبے مچل رہے تھے۔

''آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے......''

''پھر؟...... تمہاری ماں نے کیا کیا......؟''

''اسے کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں چھوڑا گیا تھا۔'' شبنم نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''اس نے میرے والد کی موت کو قتل ہی ظاہر کیا...... کسی کا نام زبان پر نہیں لائی۔ پولیس والوں کو اس نے مفروضہ قاتلوں کے حلیے بھی غلط بتائے۔ ایک ماہ تک اسے لندن ہی میں رکنا پڑا، پولیس کی جانب سے کلیئرنس ملنے کے بعد وہ پہلی فلائٹ سے سوئٹزرلینڈ پہنچی۔ اس نے وہاں کے مکان کو فروخت کر دیا پھر وہ پیرس جا کر دوبارہ انجلا بن گئی۔ کسی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد ہی اس نے اپنا غم غلط کرنے اور وقت گزارنے کی خاطر فیشن ماڈلنگ شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹاپ ماڈلز میں شمار ہونے لگی۔ لوگ اسے خوش قسمت سمجھتے رہے۔ اس کے اندر کا زخم کوئی نہ دیکھ سکا خود مجھے بھی ماں نے ہر اس موقع پر ٹالنے کی کوشش کی جب میں نے اس سے دوبارہ انجلا بننے کا سبب پوچھا۔ باپ کی قتل کی خبریں اخبار اور ٹی وی پر بھی سن چکی تھی لیکن مجھے اس بات کا یقین نہیں آ سکا کہ میرا باپ جو ہر پیچ وخم سے مردوں کی طرح مقابلہ کرنے کا عادی تھا۔ اسے قتل کیوں اور کس وجہ سے کیا گیا؟ پھر جب میری عمر بارہ سال ہوئی تو ایک روز ماں نے مجھے کال کی اور تمام اصلیتوں سے آگاہ کیا۔ اس نے رو رو کر یہ بھی کہا کہ وہ درندہ پیرس میں بھی اس کو کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا۔ اس روز اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اپنے باپ کے قاتل سے انتقام ضرور لوں جسے غالباً میرے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ ...... وہ میرے لیے میری ماں کی زندگی کی آخری کال تھی۔ اس لیے کہ دو روز بعد مجھے ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا کہ پیرس کی پولیس نے میری ماں کو اس کے اپارٹمنٹ سے مردہ حالت میں خود اسی کی سنا شن ۔ برآمد کیا تھا۔ شاید زہر ...... جانے کے بعد اس نے پولیس کو خود اپنی موت کی اطلاع دی تھی۔ لاش کے قریب ہی اس نے صرف میری زندگی کے تحفظ کی خاطر ایک تحریر بھی چھوڑی تھی جس میں لکھا تھا۔ ''میں زندگی کے ہنگاموں سے تنگ آ کر خود اپنی مرضی سے زہر کھا رہی ہوں، میری موت میں کسی کو ملوث نہ سمجھا جائے۔''

''یہ غلط بھی ہوسکتا ہے ...'' میڈم نے ہونٹ چباتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے ہمارے مشترکہ دشمن نے اسے خودکشی کرنے اور تحریر لکھنے پر مجبور کیا ہو۔''

''شاید ایسا ہی ہو......'' شبنم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ماں کی موت کے بعد میں نے پیرس جانے کی غلطی نہیں کی، میں بینک سے رقم نکلوانے گئی تو منیجر نے مجھے بتایا کہ میرے اکاؤنٹ میں کسی انجم نامی خاتون نے بیس لاکھ یورو کا پے آرڈر جمع کرایا تھا۔ میں وہ تمام رقم لے کر...... سوئٹزرلینڈ کو خیرباد کہہ کر فوری طور پر برلن چلی گئی۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ میں پانچ سال تک کسی مفرور مجرم کی طرح اپنے ٹھکانے شہروں شہروں بدلتی رہی پھر یہاں آ گئی اور خاصی دشواریوں کے بعد بالآخر اس سانپ کے دفتر میں بحیثیت ٹیلی فون آپریٹر کی آسامی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو میرے باپ اور میری ماں دونوں کو ڈس چکا ہے۔ اب مجھے اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا ہے۔''

''آئی سی......'' میڈم نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ''تم نے اس کی کمپنی میں ملازمت کیوں حاصل کی؟''

''اس شکاری کتے افضل خان کی وجہ سے جو میرے والدین کے قاتل سے سب سے نزدیک رہتا ہے۔'' شبنم نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اجازت چاہوں گی۔ جاتے جاتے یہ بھی مشورہ دوں گی کہ آپ بھی افضل خان سے محتاط رہیں۔ شیخ حامد کے ایک اشارے پر وہ خود آپ کو بھی گولی مارنے کی حد تک جا سکتا ہے، وہ مجھے گلے اس کی ...... میں پھنسا ہوا ہے لیکن وہی ایک ایسا شخص ہے جو ہمارے دشمن کو سب سے آسانی سے ٹھکانے بھی لگا سکتا ہے۔''

شبنم کے جانے کے بعد اس رات میڈم بھی نہیں سوئی، نرس نے اسے نیند کا انجکشن بھی دیا لیکن وہ بھی زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوا، البتہ اس کے سوتے جاگتے ذہن پر ایک ...... طاری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

افضل خان کے لیے میڈم روبی کو جلد از جلد ٹریپ کرنے اور اسے بلیک میل کرنے کی خاطر کیمرے کی خفیہ حالت میں اس کی شرمناک، حیا سوز اور فحش تصویریں حاصل کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا، شیخ حامد نے اسے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا حکم دیا تھا۔ ذاتی طور پر بھی وہ میڈم کا اسیر تھا اور اس کی وصل کی لذتوں سے سرشار ہونے کے لیے بے چین تھا۔

تین روز سے وہ برابر اس کی خیریت دریافت کرنے اور جشن صحت منانے کے لیے اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا، لیکن اسے کسی نہ کسی بہانے ٹالا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرحین اور زرینہ کے ہاتھ میں آ کر پراسرار طور پر نکل جانے کے سبب بگ باس کا غصہ عروج پر تھا، پانچ لاشوں کی کہانی نے اخبار کی زینت بن کر اس کے غصے کی شدت کو اور بھڑکا دیا تھا۔

اس وقت بھی بگ باس کی فرمائش کو جلد از جلد پورا کرنے کی خاطر وہ اپنے ذہن میں مختلف منصوبے بنا رہا تھا، لیاقت حسین نے درمیان میں آ کر اگر میڈم روبی کے اغوا کو ناکام نہ بنایا ہوتا تو شاید یہ دردسری بھی اس کے سر سے ٹل جاتی۔ ہر چند کہ بگ باس نے کھل کر اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ میڈم کو اغوا کرانے میں اسی کی کوشش کو دخل تھا لیکن افضل خان اتنا بچہ بھی نہیں تھا کہ ہوا کا رخ نہ بھانپ سکتا۔ بہرحال شبنم کی وجہ سے میڈم نے اس کے اپارٹمنٹ والی بات گول کر دی تھی ورنہ شاید حامد کا غصہ حد سے گزر جاتا۔ میڈم کے سلسلے میں ایک الجھن یہ بھی درپیش تھی کہ وہ زخمی ہونے کے بعد زیر علاج تھی، اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو شاید افضل خان اسے ریٹو کلب یا کسی اور جگہ آتے جاتے وقت راستے سے بھی اٹھوا کر وہ سب کچھ کر گزرتا جو شیخ حامد کے علاوہ اس کی اپنی دلی خواہش بھی تھی لیکن موجودہ صورت میں وہ میڈم کو اس کی کوٹھی سے اغوا کرانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ مختلف راستوں پر غور کرنے میں مصروف تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ افضل خان نے نفرت سے فون سیٹ کو گھورا جس نے اس کی محویت کو ڈسٹرب کیا تھا۔

''ہیلو......'' اس نے ریسیور اٹھا کر سرد لہجے میں کہا۔ ''افضل خان آن لائن۔''

''کیا بات ہے مائی ڈیئر...... تم اس وقت کچھ الجھے ہوئے لگتے ہو؟'' دوسری جانب سے میڈم روبی کی آواز سن کر اس کی ساری جھلاہٹ کافور ہو گئی۔

''تمہارے ہی بارے میں غور کر رہا تھا۔'' اس نے یکدم اپنا لہجہ تبدیل کر لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھ میں غور کرنے والی ایسی کیا بات ہے؟" میڈم کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔

"اس سوال کا جواب میں فون پر نہیں دے سکوں گا۔" وہ فری ہونے لگا۔ "تم سامنے ہوئیں تو تفصیل سے بتاؤں گا تم کیا ہو؟"

"اچھا! اگر یہ بات ہے تو پھر پرسوں کے جشن صحت کی تیاریاں ابھی سے شروع کردو۔" میڈم نے بے تکلفی سے کہا پھر سنجیدگی سے بولی۔ "اپنی شرط کے مطابق میں نے تاج محل کا انتخاب کیا ہے۔ تم وہاں کے منیجر مسٹر رابرٹ کلارک سے مل لو۔ وہ تمہیں کمرا نمبر بتا دے گا اور تمہارے ساتھ مکمل تعاون بھی کرے گا۔ میں نے اسے فون کر دیا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ ڈارلنگ۔" افضل خان نے خوشی کا اظہار کیا پھر مدھم لہجے میں بولا۔ "یہ دو روز کس طرح گزریں گے؟"

"ایک بات اور سن لو...... جو آفر میں نے تمہیں دی ہے اس کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کر کے آنا... بائی۔"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ افضل خان کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ چپکتی چلی گئی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "میڈم روبی... میں سارے فیصلے کر چکا ہوں۔ ایک آخری کام باقی رہ گیا ہے۔ اس کے بعد شاید تم افضل خان کے بوٹ کو بھی پالش کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ بگ باس تمہیں ناگن کہتا ہے اور افضل خان... ہاہا... ہاہا... افضل خان ناگنوں کا سارا زہر نکالنے میں بہت پہلے پی ایچ ڈی کر چکا ہے۔"

میڈم روبی کا فون آجانے کے بعد اس نے خوشی کے اظہار کے طور پر ایک ڈبل پیگ بنا کر دو تین لمبے لمبے گھونٹ لیے پھر تاج محل کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ آپریٹر کی آواز ابھرنے کے بعد اس نے جنرل منیجر رابرٹ کلارک سے لائن ملانے کی درخواست کی جو فوراً ہی قبول کر لی گئی۔ دس سیکنڈ بعد ہی رابرٹ کلارک لائن پر تھا۔

"مسٹر رابرٹ، میں افضل خان بول رہا ہوں۔"

"مجھے میڈم روبی کا فون مل چکا ہے۔" دوسری طرف بے تکلفی سے شستہ اردو میں جواب ملا۔ "میں نے فوری طور پر روم نمبر چار سو آٹھ بک کر دیا ہے۔ سنا ہے تم میڈم کا جشن صحت منانے کے لیے بے چین ہو؟"

"ہاں ہاں......" افضل خان نے [illegible] بے تکلفی سے کہا۔ "ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

"تم سے پرانی واقفیت کی بنا پر ایک بات قبل از وقت بتا دوں۔" دوسری جانب سے بھی دوستانہ انداز میں جواب ملا۔ "شی از اے ڈیفیکلٹ ٹارگٹ۔ تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔"

"آئی نو..." افضل خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "وہ بات نہیں جو تم سمجھ رہے ہو... او کے، میں تم سے کل کسی وقت ملتا ہوں پھر سارا پروگرام سیٹ کریں گے۔"

"ایز یو وش۔"

افضل خان نے رابطہ ختم کر کے شیخ حامد کے وہ نمبر گھمانے شروع کر دیے جو انتہائی اہم موقعے پر استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ دوسری جانب سے کال تقریباً تیس سیکنڈ بعد ریسیو کی گئی۔ خود شیخ حامد نے ریسیور اٹھایا تھا، جواب میں افضل خان نے میڈم سے ہونے والی تفصیل اور تاج محل ہوٹل کے علاوہ رابرٹ کلارک کا نام بھی بتا دیا۔

"میں ان انگریز نسل کے دوغلے کتوں پر زیادہ بھروسا نہیں کرتا لیکن تم فکر مت کرو...... میں ڈائریکٹ اس کے مالک سے بات کرتا ہوں، اس کے بعد رابرٹ بھی تمہارے اشاروں پر دم ہلانے پر مجبور ہو جائے گا۔ تمام کام خوبصورتی اور پوری مہارت سے انجام دینا۔ ٹارگٹ ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے اس کا خیال رکھنا۔"

دوسری جانب سے بات ختم کرنے کے ساتھ ہی ریسیور رکھنے کی آواز ابھری تو افضل خان نے سکون کا لمبا سانس لیا پھر اس نے دوسرے ہی دن روم نمبر چار سو آٹھ کی چابی لے کر حسب منشا اس کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ "ناگن کا زہر کشید" کرنے کے دوسرے انتظامات بھی نہایت مہارت سے شروع کر دیے۔ شیخ حامد نے غلط نہیں کہا تھا، رابرٹ کلارک سے افضل خان کی پرانی شناسائی تھی لیکن بگ باس کا فون مل جانے کے بعد وہ سچ مچ کی دم ہی تو ہلاتا پھر رہا تھا۔

افضل خان نے ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ اس رقیب کا بھی بندوبست کر دیا تھا جو افضل خان کے بعد میڈم کے ساتھ مزے لینے والا سلوک کرتا اور اس کی تصویر افضل خان تیار رکھتا پھر اس کے خیال کے مطابق زہریلی ناگن بھی اس کی بین پر لہرانے پر ہمیشہ مجبور رہتی۔

درمیان کا ایک دن اور گزر گیا پھر اگلے روز افضل خان ٹھیک مقررہ وقت سات بجے ریسپشن پر [illegible] موجود تھا۔ میڈم روبی حسب وعدہ ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل میں داخل ہوئی [illegible] خوبصورت ناگن ہی دکھائی دے رہی تھی۔ افضل

خان نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا پھر پانچ منٹ بعد ہی وہ روم نمبر چار سو آٹھ میں موجود تھے۔ میڈم روبی نے وہاں کی سجاوٹ دیکھی تو مسکرا کر بولی۔

"تم نے زبردست اہتمام کر ڈالا ہے۔"

"اٹ از مائی پلیزر..." افضل خان اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولا پھر دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ بائیں ہاتھ پر کھڑکی تھی جس پر خوبصورت پردے موجود تھے، اس کے ساتھ ڈبل بیڈ بھی تھا، دیگر سجاوٹ بھی ویسی ہی تھی جیسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوتی ہے۔ افضل خان نے خاص طور پر موتیا اور گلاب کے تازہ پھولوں سے پورے کمرے کو مہکا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا خوبصورت پھول عورتوں کی کمزوری ہوتے ہیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی، افضل خان نے بوتل کھول کر دو گلاس تیار کیے۔ شیشے کی گول میز پر وہ کیک بھی موجود تھا جسے جشن صحت کی علامت کے طور پر روبی کو کاٹنا تھا۔

"اور کیا کیا اہتمام کر ڈالے ہیں تم نے......؟" روبی نے بے تکلفی سے پوچھا، اس بے تکلفی میں بھی ایک وقار موجود تھا۔

"بس... پھر کیک تمہارے ہاتھوں کٹنے پر [illegible] ہوگا۔ آخر میں ڈنر ہوگا اور اس کے بعد [illegible]"

"آج میں شیری پینے پر اصرار کروں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا...؟" روبی نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت [illegible]

"[illegible] تم نے اپنی پسند کا اظہار تو کیا۔" افضل خان نے [illegible] اظہار کیا پھر اس نے فون سروس پر شیری کی [illegible] جو بمشکل دس منٹ میں آگئی، بیرے کے جانے کے بعد میڈم نے بوتل کی سیل پر ایک نظر ڈالی پھر [illegible] اسے کھول کر ایک پیگ تیار کیا، افضل خان [illegible]

"[illegible] سوری ڈارلنگ۔ مجھے یہ خیال پہلے [illegible] شیری خواتین کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔"

"[illegible] آئندہ خیال رکھنا......" روبی نے [illegible] سنجیدگی سے بولی۔ "میرا خیال ہے [illegible] ہم اپنے مطلب کی بات کر لیں تو [illegible]"

"[illegible]" افضل خان نے سر تسلیم خم کیا تو روبی [illegible] بولی۔ "تم نے میرے [illegible] ٹھکانے لگانے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"تم نے دور اندیشی سے کام لے کر میرا درست انتخاب کیا ہے۔" افضل نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "میں جتنا بگ باس سے قریب ہوں اتنا کوئی اور نہیں ہے۔ اس لیے میرے لیے یہ کچھ دشوار بھی نہیں ہوگا لیکن... ایک شرط میری بھی ہے..."

"مجھے تمہاری ہر وہ شرط منظور ہے جس میں ایک شریف عورت کی عزت کو شادی سے پہلے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔" روبی نے بے تکلفی سے جواب دیا۔

"دو روز کے اندر میں تمہیں کسی غیر ملکی بینک اکاؤنٹ کا ایک نمبر دوں گا۔ جس روز اس میں پچاس لاکھ کی رقم جمع کرا دی گئی اس کے چار روز کے اندر تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔ تمہارے دشمن کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گا۔"

"ڈن......" روبی نے پرجوش انداز اختیار کیا۔ "مجھے تمہاری یہ صاف گوئی پسند آئی۔"

"ایک بات اور......" اس بار افضل خان نے اس کے سراپا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خاصی بے تکلفی سے کہا۔ "آج اس جشن کے موقع پر مجھے ایک حد تک تمہاری پرستش کرنے کی اجازت بھی درکار ہوگی۔"

"او کے..." روبی نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ "ایک حد تک ہی اجازت ہوگی مگر تم اس کو پھلانگنے کی حماقت نہیں کرو گے۔"

"پروانہ شمع پر نچھاور ہونے کی خاطر اسے ہمیشہ روشن دیکھنا چاہتا ہے۔" افضل نے اٹھ کر روبی کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے قرب کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔"

اس نے روبی کا ہاتھ تھام لیا، میڈم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ افضل خان نے تیسرا پیگ ختم کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک ایک بھی ختم نہیں کیا، اسے ایک گھونٹ میں اپنے خوبصورت وجود میں اتار لو تو پھر کیک کاٹا جائے، اس کے بعد ہی میں ڈنر کا آرڈر دوں گا۔"

روبی نے ایک لمحہ تامل کیا پھر ایک ہی گھونٹ میں گلاس ختم کر دیا۔ افضل خان نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا تو روبی کو اپنا ذہن کچھ بوجھل بوجھل سا لگا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ کیک کاٹنے کے بعد افضل خان نے پرجوش انداز میں اسے دونوں بانہوں میں بھینچ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد افضل خان نے فون سروس پر ڈنر سرو کرنے کا آرڈر دے دیا۔

دوسری طرف میڈم بڑی تیزی سے سوچ رہی تھی۔ شیری کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محض ایک پیگ پینے کے بعد اسے اپنے ذہن پر بھاری پن بڑھتا کیوں محسوس ہو رہا تھا؟ ایسی صورت میں کہ جب اس نے بوتل کی سیل بھی خود اپنے ہاتھ سے توڑی تھی، پیگ بھی خود ہی تیار کیا تھا۔ اس سے پہلے ایک پیگ سے اسے کبھی اتنا خمار نہیں ہوا تھا۔

''کس سوچ میں گم ہوگئیں سویٹ ہارٹ۔'' افضل خان نے دوبارہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر ہلکے سے دباتے ہوئے پوچھا۔ ویسے وہ یہ دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا کہ سیل بند بوتل کے اندر جس بے ہوشی کی دوا کی ملاوٹ کی گئی تھی وہ اپنا اثر دکھانا شروع کر چکی تھی۔

''کچھ بھی نہیں......'' روبی نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''یہ سوچ رہی تھی کہ تم نے میری خاطر کتنا اہتمام کر ڈالا ہے۔''

دروازے پر دستک ہوئی تو افضل خان اٹھ کر دوسرے صوفے پر چلا گیا پھر اس کے ''کم ان'' کہنے پر ڈنر لا کر دوسری کھڑکی کے قریب سجی ٹیبل پر سرو کر دیا گیا۔ ہوٹل کے کارندوں کے جانے کے بعد افضل خان نے اپنے اور روبی کے لیے الگ بوتلوں سے دو پیگ تیار کیے تو روبی نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ فی الحال میرے لیے ایک پیگ ہی کافی تھا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈیئر'' افضل خان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کھانے کے دوران میں چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہنے میں زیادہ لطف آتا ہے..... کم آن ڈیئر، آج میری خوشی کی خاطر میری درخواست قبول کر لو۔ آئندہ میں مجبور نہیں کروں گا۔''

روبی نے مسکرانے پر اکتفا کیا لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بہت احتیاط سے کام لے گی۔ اس کے ذہن پر طاری ہونے والی ہلکی مگر بوجھل بوجھل سی غنودگی بھی اسے سنبھل کر قدم اٹھانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس غنودگی کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔

کھانے کی میز پر بیٹھ کر اس نے احتیاط سے کھانا شروع کیا، افضل خان ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہا تھا، بار بار روبی کو ایک چھوٹا گھونٹ لینے پر اکسا رہا تھا۔ ویسے اس کا تجربہ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ بے ہوشی کی دوا جس مقدار میں روبی کے جسم میں پہنچ گئی تھی وہ اگلے پندرہ منٹ کے اندر اندر اسے بالکل ہی ٹن کر دے گی جس کے بعد اسے اس ناگن کا سارا زہر کشید کرنے کا پورا پورا موقع ملے گا۔ وہ اپنی پیاس بجھانے کے بعد فحش تصویروں کے دو سیٹ تیار کرنے کا منصوبہ بھی بنا چکا تھا۔ ایک اپنے لیے تاکہ روبی بگ باس کے علاوہ اس کی بانسری کی لے پر بھی ناچنے پر مجبور رہے ...اور...

ٹھیک اسی وقت ڈی ایس پی سراج گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے منہ بنا کر ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو..... سراج اسپیکنگ...''

''لیاقت بول رہا ہوں۔'' دوسری جانب سے لیاقت حسین کی آواز ابھری۔ ''ایک بار میں نے میڈم روبی کی عزت بچا کر نیکی کمائی تھی، اس وقت یہ ذمے داری آپ کو سونپ رہا ہوں..... وقت بہت کم رہ گیا ہے۔''

''تم کہاں سے بول رہے ہو؟'' سراج کو لیاقت حسین کا انداز گفتگو کچھ بدلا بدلا سا لگا، جیسے وہ خواب کی حالت میں زبردستی بول رہا ہو۔

''تاج محل ہوٹل، کمرا نمبر چار سو آٹھ میں افضل خان نے دھوکے سے میڈم کو شراب میں بے ہوشی کی دوا پلا دی ہے۔ بیس منٹ بعد وہ بے ہوشی کی حالت سے دوچار ہو جائے گی پھر افضل خان شیخ حامد کے حکم پر نہ صرف اس کے ساتھ منہ کالا کرے گا بلکہ اس کی فحش اور بے ہودہ تصاویر بنا کر زندگی بھر اس کی پاکیزگی کو پامال کرتا رہے گا۔ یہ کام میں آپ کو سونپ رہا ہوں۔ وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک ایسی نیکی کر گزریں جس کا ثواب آپ کو دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔''

''لیکن تمہیں یہ اطلاعات کہاں......''

''خدا حافظ'' مختصر جواب کے بعد لائن کاٹ دی گئی۔

سراج بوکھلا کر رہ گیا لیکن پھر اسے لیاقت حسین کی پچھلے دو موقعوں پر کہی جانے والی عجیب اور حیرت انگیز باتیں یاد آئیں تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اس نے اسی وقت ایک انسپکٹر کو فون کر کے فوری طور پر تاج محل ہوٹل پہنچنے کے آرڈر جاری کیے پھر خود بھی بڑی عجلت میں اپنی کار میں بیٹھ کر تیز رفتاری سے تاج محل ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں لیاقت حسین کی شخصیت کا ایک پُراسرار پہلو اجاگر ہو رہا تھا جس کی ابھی تک وہ کوئی توجیہہ تلاش نہیں کر سکا تھا۔

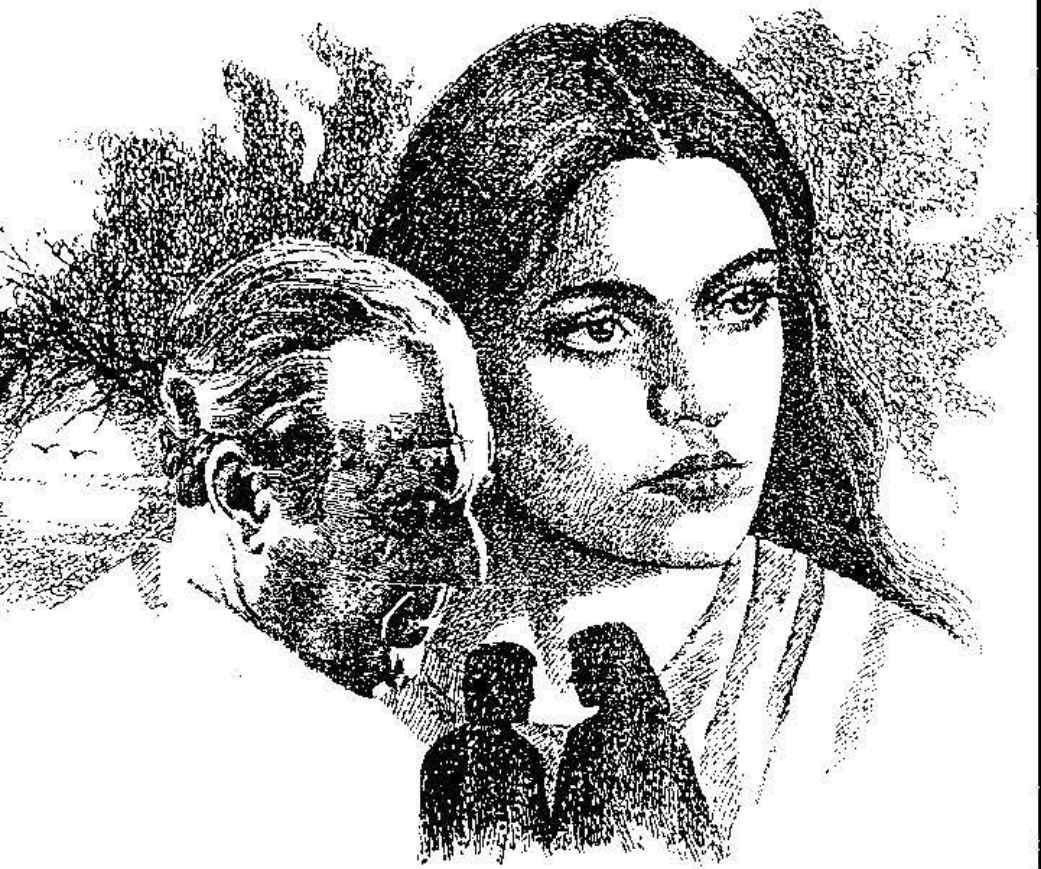

اس پُراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید
واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے

زادِ راہ

ش صغیر ادیب

جب چاندی جیسی صورت اور سونے جیسی عمر آپ کی دسترس سے نکل کر محض خواب و خیال میں ڈھل جائے اور پھر... ایک طویل مدّت کے بعد دامن خالی رہ جانے کا احساس جاگے تو انسان کس قدر بے بسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، اس کا اندازہ دلوں میں چٹکی لیتی اس تحریر کو پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔

ماضی کی خوشگوار یادوں میں گم ایک سچے عاشق کا فسانہ

شہاب نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بجنے ... تھے۔ ... شام کی روشنی ماند پڑ رہی تھی۔ نیم ... پرندوں کا شور بڑھ گیا تھا مگر یہ ... نہیں لگ رہا تھا۔

پرندے اسے ہمیشہ سے پسند تھے اور ان کی موسیقی ریز چہکار۔ بچپن میں بلبل، مینا اور کبوتر بڑے شوق سے پالا کرتا تھا۔ اب لڑکپن نہیں تھا، مگر پرندوں سے اس کی دلچسپی ابھی تک برقرار تھی۔ اس دلچسپی اور لگاؤ کا سبب کیا تھا؟ اس پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے کبھی غور نہیں کیا۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ پرندے آزادی اور خودمختاری کی علامت ہیں۔ پرندے کسی کے تابع فرمان نہیں ہوتے، نہ مجبور و محکوم ہوتے ہیں۔ وہ کھلے آسمانوں پر اڑتے ہیں۔ آزاد، خودمختار اور بے فکر۔ وہ اپنی زندگی خود جیتے ہیں اور بالکل اسی طرح، جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ جبکہ یہ آزادی اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ساری زندگی اسے ان راستوں پر چلنا پڑا تھا جو حالات نے اس کے لیے تراشے تھے اور ان فیصلوں کو ماننا پڑا تھا، جو وقت نے کیے تھے۔ زندگی کے اسٹیج پر اس کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ شاید یہ اسی محرومی اور مجبوری کا ردِعمل تھا کہ اسے کھلی فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں سے ایک فطری لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ پرندوں کی آزادی میں اسے اپنی محرومی کی تلافی کا عکس نظر آتا تھا۔ شاید یہ خودفریبی ہی ہو مگر یہ بھی تو ہے کہ کبھی کبھی خودفریبی زندگی کی بہت سی محرومیوں کا نعم البدل محسوس ہوتی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر نیم کے پیڑ کو دیکھا۔ گہری، سبز پتوں سے لدی پھندی...... ٹہنیوں میں چڑیاں اِدھر اُدھر پھدک رہی تھیں اور شور مچا رہی تھیں۔ وہ چند ثانیے مسکراتی نظروں سے چڑیوں کو دیکھتا رہا، پھر نگاہ خودبخود گھڑی پر چلی گئی۔ چھ بج کر دس منٹ۔ وہ قدرے بے چین ہوا۔ آخر یہ وقت گزر کیوں نہیں رہا؟ گھڑی کی سوئیاں اتنی سست کیوں ہیں؟ پھر وہ دھیرے سے ہنسا۔ حد ہوگئی، آخر اتنی بے چینی کیوں؟ وہ تو خود ہی وقت سے پہلے آگیا ہے۔ اکبری باجی نے بتایا تھا کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اب اگر وہ پونے چھ بجے ہی وہاں پہنچ گیا ہے تو یہ غلطی اس کی ہے۔ گھڑی کی سوئیوں کا کیا قصور۔

مگر وہ بھی کیا کرتا۔ چھتیس سال گزرے، گویا ایک عمر بیت گئی۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس طرح اچانک سلطانہ سے پھر ایک بار، چند منٹ کے لیے ہی سہی، ملاقات کی انہونی ممکن ہو سکے گی۔ یہ آس تو مدت ہوئی ختم ہوچکی تھی۔ اس نے صبر کرلیا تھا۔ زندگی جیسی بھی گزری، گزر گئی۔ جو باقی ہے، وہ بھی گزر ہی جائے گی۔ گئے دنوں کی یادیں اس کی پونجی ہیں، اس کی متاعِ حیات۔ انہی کے سہارے اس نے اس محروم و افسردہ زندگی کے بے کیف شب و روز گزارے ہیں۔ اسے کوئی غم نہیں، کوئی پچھتاوا نہیں۔ تقدیر کی جھولی میں اس کے لیے جو کچھ تھا، وہ اسے ملا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ یہ پونجی کچھ ایسی کم بھی تو نہیں۔ اس کارگاہِ شیشہ گری میں بے شمار لوگ بس کانچ کی طرح جیتے ہیں، ٹھیس لگی اور چُور چُور ہوگئے۔ انہیں اتنا بھی نہیں ملتا جتنا اسے ملا ہے۔ اس کے پاس تو سلطانہ کی یادیں ہیں اور یہ بھرم کہ وقت سلطانہ کے دل میں اس کی چاہت کم نہیں کی ہے۔ خود اس کے اپنے تصور میں بھی سلطانہ کا سراپا محفوظ تھا۔ اس کی جلترنگ جیسی میٹھی آواز، اس کی شام کے کاجل سے سنوری آنکھیں اور اس کا تراشیدہ منور چہرہ۔ چھتیس برسوں میں نہ تو اس کے دل میں بسی یادیں دھندلی ہیں اور نہ ہی سلطانہ کے رخ و نگار پر گرد جمی ہے۔ وہی آواز، وہی آنکھیں، وہی بال اور چہرہ آج بھی اس کے ذہن میں موجود ہے۔ یہ پونجی زندگی گزارنے کے لیے کچھ ایسی کم تو نہیں، بلکہ شاید ہفتِ اقلیم کی دولت سے بھی زیادہ ہے۔

سلطانہ کا خیال آیا تو دل میں ایک بھنور سا اٹھا۔ ہوگا؟ اتنی طویل مدت کے بعد جب سلطانہ سے سامنا ہوگا کیا محسوس ہوگا؟ کیا وہ اپنے دل کو سنبھال سکے گا؟ اس اضطراری انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مشکل ہے، سخت امتحان ہے۔ ہرچند کہ وہ اب ایک سنجیدہ، عمر رسیدہ آدمی ہے، پھر بھی سلطانہ سے سامنا کرنا آسان نہ ہوگا۔ خدایا، عجیب لمحہ ہوگا وہ۔ سلطانہ اس کے سامنے ہوگی اور وہ...... بار پھر اس نے زور سے سانس لی اور بے چینی سے بدلا...... وہ اسے دیکھے گا۔ خواب یا تصور میں نہیں بلکہ جاگتا، روبرو۔ تب کیا کرے گا وہ؟ کیا کہے گا؟ اور سلطانہ کہے گی؟...... ہرچند کہ اس کے پاس کہنے کے لیے بہت ہے۔ گزرے چھتیس برسوں کے روز و شب کی باتیں، ان گنت باتیں۔ دکھ درد اور محرومیاں اور یادوں کے سہارے زیست کرنے کا جتن اور سلطانہ کا دامن بھی تو خالی نہیں ہوگا۔ اس کے پاس بھی یقیناً بے شمار باتیں ہوں گی۔ اس کی باتیں۔ بال بچے اور شوہر۔ پردیس میں پینتیس چھتیس سال اس نے کیسے گزارے؟ مگر کیا وہ ایک دوسرے سے سب کہہ سکیں گے؟ شاید زبانیں ساتھ نہ دیں۔ شاید دل حوصلہ جائیں اور وہ ایک دوسرے سے کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔

اپنے اضطراب پر قابو پانے کی لاشعوری کوشش طور پر اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا برآمد کی مگر ڈبیا تو کوفت مزید بڑھ گئی۔ صرف ایک سگریٹ تھی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر خالی پیکٹ ایک طرف اچھال دیا۔ پھر ایک طویل کش لے کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ دھوپ کی چمک ماند پڑ چکی تھی اور اجالا ڈھیرے ڈھیرے معدوم ہو رہا اطراف کے بعض مکانوں سے گہرا کثیف دھواں اٹھ کر فضا میں پھیل رہا تھا۔ چھت کے اوپر پھیلی نیم کی

شاخوں میں جھٹپٹا نسبتاً زیادہ گہرا تھا اور ساتھ ہی چڑیوں کا شور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ چند لمحے چڑیوں کی چہکار سنتا رہا، پھر یکایک مسکرایا۔ پرندے...... سلطانہ کو بھی تو پرندے بہت پسند تھے۔ مینا، بلبل اور لعل...!

یکایک اس کے کانوں میں سلطانہ کی آواز گونجی۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

اور زندگی بھر اس نے صرف یہی کیا تھا کہ اپنا خیال رکھتا تھا۔ کیونکہ یہ سلطانہ کے آخری الفاظ تھے جو اس نے سنے تھے۔

پھر وہ چلی گئی تھی۔

☆☆☆

بچپن سے دونوں کا ساتھ رہا تھا۔ ساتھ کھیلے تھے، شرارتیں کی تھیں۔ کچھ عرصہ مدرسے میں بھی ساتھ رہا تھا۔ بچپن گزرا، جوانی میں قدم رکھا۔ دونوں کو کبھی احساس نہیں ہوا تھا لیکن جس طرح بلند پہاڑیوں کے درمیان گہری گہری کھائیوں میں خودرو گھاس خودبخود اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے بالکل اسی طرح ان کے دلوں میں بھی ایک دوسرے کی چاہت خودبخود پیدا ہوئی تھی اور چپکے چپکے بڑھتی رہی تھی لیکن دونوں بے خبر تھے۔ احساس اس وقت ہوا جب سلطانہ کی امی نے بتایا کہ اس کی نسبت کئی سال پہلے ہی طے ہوچکی ہے اور یہ کہ اس کا منگیتر خارجہ کے محکمہ میں ملازم ہو کر سویڈن گیا ہوا ہے۔

سلطانہ نے یہ اطلاع شہاب کو دی اور اس وقت پہلی بار دونوں اس محبت سے آگاہ ہوئے جو ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے تھی۔ زبان سے کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ آتی بھی کیسے؟ انہیں تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ شاید ان کے تحت الشعور میں خودبخود یہ خیال جاگزیں ہوچکا تھا کہ جس طرح بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے ہیں اسی طرح باقی زندگی بھی ساتھ رہیں گے۔ کبھی گمان تک نہیں گزرا کہ ان کے راستے کبھی الگ ہوسکتے ہیں۔ مگر اب منگنی کا انکشاف ہوا تو جدائی کا احساس بھی ہوا۔ شاید اس جان سوز احساس ہی نے انہیں بتایا کہ وہ ایک دوسرے سے چپکے چپکے محبت کرتے رہے ہیں۔ مگر دیر ہوچکی تھی...... بہت دیر ہوچکی تھی۔ دل کی بازی وہ اس طرح ہارے تھے کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔

وہ ملاقات اکبری کے گھر میں ہوئی تھی۔ اکبری باجی سے گھریلو مراسم تھے۔ اس کے علاوہ وہ ان دونوں کی بچپن کی دوست بھی تھیں۔ وہ اکثر وہاں آیا جایا کرتے تھے۔

اس وقت وہ دونوں چھت پر تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ بہت دور مغرب میں سورج آدھا ڈوب چکا تھا باقی نصف سورج ایک سرخ تھال کی طرح نظر آ رہا تھا، اس کی گہری سرخی افق پر دور تک پھیل گئی تھی جیسے ہزاروں لاکھوں محبت کے مارے دلوں کا خون ہوگیا ہو۔

دونوں دیر تک چپ رہے۔ شہاب وحشت بھری نظروں سے ڈوبتے سورج کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زور سے سانس لی۔

''یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا۔'' آخرکار اس نے کہا۔ اس کی آواز میں دل ٹوٹنے کی بازگشت تھی۔

''ہاں۔''

''اب کیا کریں؟''

''میں اماں ابا کو دکھی نہیں کرسکتی۔''

''ہاں، ٹھیک ہے۔'' شہاب نے مدھم آواز میں کہا۔ ''کیونکہ یہ جو ماں باپ ہوتے ہیں نا، یہ بڑے پیارے انسان ہوتے ہیں۔ بے لوث، بے غرض۔ دنیا میں شاید ہر شے کا نعم البدل ہے مگر ماں باپ کا نہیں۔ یہ لوگ صرف محبت کرتے ہیں۔ اپنا سب کچھ اپنے بچوں پر نچھاور کردیتے ہیں۔ دن کا سکھ، رات کا چین، اپنی خواہشیں اور ضرورتیں تیاگ دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اپنے دامن میں چھپا کر اس طرح پالتے ہیں کہ دنیا کا کوئی دکھ، کوئی آفت ان کے قریب نہیں پھٹک پاتی۔ بچے کی جان پر بن آئے تو اپنی زندگی کے عوض اس کی زندگی اور سلامتی کی دعا مانگتے ہیں اور بدلے میں کچھ نہیں چاہتے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ ماں باپ کی قوم بڑی انوکھی ہوتی ہے کہ ان کی محبت اور ایثار میں خدا کا پرتو نظر آتا ہے۔'' وہ یکایک رکا، آنکھوں میں جھلملاتے آنسو پونچھے، پھر افسردگی سے مسکرایا۔ ''انہیں دکھ دینے کے بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں۔''

سلطانہ نے محبت سے اسے دیکھا۔

پھر وہ دونوں چپ ہوگئے۔ دیر تک چپ رہے اور غمگین سناٹا ان کے چاروں طرف پھیلتا گیا اور بڑھتا گیا۔ سورج بجھا اور چھپ گیا۔ افق کی سرخی کچھ اور خون آلود ہوئی اور آسمان ایک سرے سے دوسرے سرے تک کچھ اور زیادہ ویران ہوگیا۔ سلطانہ نے سر اٹھا کر آسمان میں اڑتے اکا دکا بے آسرا، بے گھر، بے منزل پرندوں کو دیکھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''تمہاری نوکری کا کیا ہوا؟''

''ارے ہاں۔'' شہاب شدت سے چونکا۔ ''میں ذکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے ہی والا تھا۔ نوکری مل گئی ہے۔ اگلے ہفتے مجھے جانا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ بے معنی انداز میں ہنس پڑا۔

''ہنسے کیوں؟'' سلطانہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس کی ہنسی میں چھپا کرب کچھ اور نمایاں ہوگیا۔ ''ملازمت کا پروانہ ملا تھا تو یونہی خود بخود ایک خیال آیا تھا کہ وہاں جاؤں گا، ایک اچھا سا گھر بناؤں گا اور پھر...'' اس نے رک کر شکستہ نظروں سے سلطانہ کو دیکھا۔ ''اور پھر ہم دونوں اس میں رہیں گے۔ کتنی احمقانہ بات ہے۔ ہے نا؟''

سلطانہ کے ہونٹوں پر ایک زخمی مسکراہٹ نے دم توڑا۔

چند لمحے بعد سلطانہ نے کہا۔ ''وہاں رہائش کا بندوبست ہوگیا ہے؟''

''ابھی نہیں۔ لیکن ہوجائے گا۔''

سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی، مغموم نظروں سے اسے دیکھا۔ ''شہاب! سورج ڈوب رہا ہے۔''

''ہاں۔''

''ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا ہوجائے گا۔''

''ہاں۔'' شہاب کے سینے میں کوئی شے چٹخ کر ٹوٹ گئی۔ ''ہاں، بہت گہرا اندھیرا ہوجائے گا۔ پھر پتا نہیں کب اجالا ہو۔ ہو بھی کہ نہ ہو۔''

سلطانہ کے ہونٹ لرزے۔ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر پھر چپ ہوگئی۔ وہ بھی چپ رہا۔ حالانکہ ان کے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا اور جی بھی چاہتا تھا کہ ڈھیر ساری باتیں کرلیں۔ دل کی حسرت نکال لیں کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ کچھ دیر بعد وہ بچھڑ جائیں گے، اپنے اپنے راستوں پر چلے جائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہو، کون جانتا ہے۔ پھر ملاقات ہو نہ ہو۔ ہوسکتا ہے، پھر کبھی سامنا نہ ہو اور عمر گزر جائے۔ تو پھر کیوں نہ ان چند لمحوں کو جو انہیں ملے ہیں، امر کرلیں۔ مگر باوجود خواہش کے کچھ نہ کہہ سکے۔ اپنی اپنی ردائے دکھ میں لپٹے چپ چاپ کھڑے رہے اور ڈوبتے سورج کو یوں دیکھتے رہے جیسے سورج نہیں، وہ خود ڈوب رہے ہوں۔

یکایک سلطانہ نے کہا۔ ''اچھا شہاب! میں چلتی ہوں۔ اماں انتظار کررہی ہوں گی۔''

''اچھا۔'' اس نے شکستہ آواز میں کہا۔

سلطانہ سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی کہ معاً اس نے کہا۔

''سلطانہ!''

وہ رک کر گھومی۔ ''کہو......''

''بس چند پل یونہی کھڑی رہو۔'' اس نے کرب میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''اچھا......''

وہ چند قدم کے فاصلے پر سامنے کھڑی تھی۔ کاسنی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے اس کے گرد ایک ہالہ سا بنادیا تھا۔ اس ہالے کے درمیان وہ آکاش سے اتری کسی اپسرا کی طرح نظر آتی تھی۔ بلور کی طرح منور اس کی بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ترشے ہوئے نین نقش، پنکھڑیوں جیسے ہونٹ اور گہرے سیاہ بال۔ شہاب اسے دیکھتا رہا۔ اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے، تمام موجودات و مظاہر سے بے خبر ہوکر یوں دیکھتا رہا جیسے اس منظر کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتا ہو، اپنی روح میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔ لمحے ایک ایک کرکے گزر رہے لیکن وہ چند لمحے بے حد انمول تھے۔ اس کی زندگی کا حاصل۔ اب یہی لمحے اس کا زادِ راہ ہیں، اس کی بیساکھی کہ انہی کے سہارے اسے اپنی زندگی گزارنی ہے۔

وہ چند لمحے بے آواز گزر گئے تو اس نے معاً کہا۔

''اب جاؤ۔''

سلطانہ افسردگی سے مسکرائی، آگے بڑھی، مگر زینے کے پاس پہنچ کر پھر رک گئی۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''اپنا خیال رکھنا۔''

☆ ☆ ☆

اگلے ہفتے اس نے اس شہر کو خیرباد کہہ دیا جہاں زندگی کے ان گنت شب و روز گزرے تھے۔ پہلے گاؤں جاکر والدین سے ملا، پھر تین سو میل دور واقع اس چھوٹے سے شہر کا رخ کیا جہاں ملازمت ملی تھی۔ نیا شہر، نئے لوگ اور نیا ماحول۔ ابتدا میں اسے بڑی وحشت ہوئی۔ تنہائی اور بے گھر ہونے کا احساس گھیرے رہتا تھا مگر بتدریج اس نے اس نئے ماحول کو قبول کرلیا اور رفتہ رفتہ ایک معمول بھی بن گیا۔ دفتر، گھر۔ چند ایک دوست بن گئے اور وقت بہت سست روی سے ہی سہی، گزرنے لگا۔

اکبری باجی سے رابطہ تھا۔ ان کے خط سے معلوم ہوا کہ سلطانہ کی شادی ہوگئی ہے۔ پھر یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ سویڈن چلی گئی ہے۔

چند ماہ بعد اس کی اپنی شادی بھی ہوگئی۔ اس کی بیوی خاصی تعلیم یافتہ تھی۔ رنگ روپ بھی اچھا تھا اور گھر گرہستی بھی جانتی تھی۔ مگر دونوں کے درمیان مفاہمت، ہم آہنگی اور قربت پیدا نہ ہوسکی۔ کچھ تو اس بنا پر کہ اس کی بیوی شاکرہ کا اپنا مزاج تھا جس میں خود پسندی کا پہلو نمایاں تھا۔ بنیادی طور پر اس میں خود اپنے آپ سے محبت کرنے کی خو زیادہ تھی اور شاید اس سبب بھی کہ وہ خود اپنے آپ کو شاکرہ کی جانب ملتفت کرنے پر آمادہ نہیں کرسکا تھا۔ سلطانہ چلی گئی تھی۔ وقت گزر گیا تھا۔ مگر وہ شام اس کے تصور میں زندہ تھی، آخری ملاقات کی شام۔ اداس، پرسکوت شام۔ ڈوبتا ہوا سورج اور نارنجی کرنوں کے ہالے میں گھری ہوئی سلطانہ اور اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے آخری الفاظ ''اپنا خیال رکھنا۔'' گو ان گنت شب و روز گزر چکے تھے مگر وہ منظر جوں کا توں اس کے تصور میں زندہ تھا۔ اس پر وقت کی گرد نہیں جمی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ منظر ماضی کے سیاہ خانوں میں گم ہوجائے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی آس، کوئی خوشی حتیٰ کہ کوئی شکوہ بھی نہیں۔ لے دے کے بس وہ ایک منظر ہی تو تھا اس کے پاس۔ اس کی کل پونجی، اس کی متاعِ حیات، اس کا زادِ راہ کہ اس کے سہارے اسے اپنی زندگی گزارنی تھی۔ چنانچہ وہ ہر حال میں اس شام کو اپنے احساس، اپنے تصور میں زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور آدمی تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو، خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں، قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اپنی اخلاقی ذمے داری کو پہچانتا تھا۔ چنانچہ باوصف اس کے کہ اس کے دل میں شاکرہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی، اس نے اسے شکایت کا موقع کبھی نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے خفیف سا اشارہ بھی نہیں دیا کہ اس کے دل کے نگار خانے میں کسی اور کی تصویر آویزاں ہے۔ اپنی ذمے داریاں نبھانے اور اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کی مگر کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ فاصلہ بڑھتا گیا۔ دھیرے دھیرے سے دونوں نے اپنے لیے الگ الگ ایک غیرمرئی دنیا تخلیق کرلی اور اس میں مگن ہوگئے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے مگر اس طرح گویا دونوں کے درمیان محض رسمی شناسائی ہو۔ نہ وہ شاکرہ کے معاملات میں دخل دیتا تھا اور نہ شاکرہ اس کی مصروفیات میں مخل ہوتی۔ اکثر وہ اپنے میکے چلی جاتی تھی، وقت گزار کر واپس آتی لیکن اسے کوئی شکایت نہ ہوتی۔

وقت کی انگلیوں میں شب و روز کی تسبیح گردش کرتی رہی۔ دن، مہینے، سال۔ دھیرے دھیرے سے بہت کچھ بدل گیا۔ چہرے، مزاج، قدریں۔ زندگی جو اس کے بچپن میں ایک نرم رو ندی کی طرح بہتی تھی، اب ایک تیز اور سرکش آبشار کے مانند بہنے لگی۔ وہ زندگی اور وقت کے ساتھ نہیں چل سکا بلکہ پیچھے رہ گیا۔ اتنا پیچھے کہ اس لمحے سے آگے بڑھ ہی نہیں سکا۔ جب اس نے آخری بار سلطانہ کو شام کے نارنجی دھندلکے میں دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک اسی لمحے میں زندہ تھا۔ سلطانہ سامنے کھڑی تھی اور وہ اپنے آپ سے غافل ہوکر سلطانہ کو دیکھ رہا تھا اور شام رفتہ رفتہ ڈوب رہی تھی۔

مگر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔ نہ پچھتاوا اور نہ ہی کوئی شکوہ۔ جو کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، ٹھیک ہے۔ شکایت کیوں اور کس سے؟ ایک زندگی ہی تو گزارنی ہے، گزر جائے گی۔ چنانچہ وہ زیست کرتا رہا۔ سلطانہ کے بارے میں کبھی کوئی اطلاع مل جاتی تھی، کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ معلوم ہوا کہ کئی سال سویڈن میں گزارنے کے بعد اس کے شوہر کا تبادلہ پہلے ناروے اور پھر افریقا کے کسی ملک میں ہوگیا تھا۔ وہاں سے پھر وہ انگلینڈ آئی اور چند سال وہاں خدمات انجام دینے کے بعد اس کے شوہر نے کچھ وجوہ کی بنا پر ملازمت چھوڑ دی اور انگلینڈ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس کے بعد اطلاع

سادگی

ایک سردار ٹی وی خریدنے گیا۔ دکاندار نے ایک ٹی وی دکھایا۔

''سر، یہ لے لیں اس کا ریموٹ گلی کے کونے سے ہی چینل پکڑ لیتا ہے۔'' کچھ دنوں بعد سردار ٹی وی واپس کرنے آگیا۔

دکاندار نے کہا۔ ''سر، کیا خرابی ہے؟''

سردار نے کہا۔ ''خرابی تو کوئی نہیں ہے بس بندہ بار بار گلی کی نکڑ پر جائے تو اچھا نہیں لگتا۔''

☆☆☆☆☆☆

لاعلاج

ڈاکٹر۔ ''آپ کے شوہر ٹھیک ہوسکتے ہیں اگر آپ ان کا خیال رکھیں، ٹینشن نہ دیں، لڑائی نہ کریں اور ان کی دیکھ بھال کریں۔''

شوہر۔ ''ڈاکٹر نے کیا کہا؟''

بیوی: ''لاعلاج ہو تم۔''

☆☆☆☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملنے کا سلسلہ تقریباً منقطع ہوگیا۔

پینتیس چھتیس سال گزر گئے۔ ان گزرے ماہ و سال نے اپنا خراج وصول کیا۔ وہ جو کبھی بڑا وجیہ، صحت مند اور زندگی سے بھرپور تھا، دھیرے دھیرے خود اپنا سایہ بن گیا۔ قویٰ مضمحل ہوئے، بالوں میں چاندی اتر آئی۔ عمر نے ساٹھ کے دروازے پر دستک دی تو انحطاط اور بھی بڑھا۔ حتیٰ کہ اسے چلنے پھرنے کے لیے کبھی کبھی چھڑی کے سہارے کی ضرورت بھی پڑنے لگی۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا۔ زندگی جیسی بھی گزری، بری نہیں گزری۔ گو اسے سب کچھ نہیں ملا۔ پھر بھی جو کچھ ملا کچھ ایسا کم بھی نہ تھا مگر اطمینان کے باوجود پچھلے کچھ برسوں سے ایک خواہش، ایک آرزو اس کے دل میں سر ابھارنے لگی تھی۔ سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ کس شہر میں رہتی تھی؟ اس کے بچے کیسے ہیں؟ جب بھی سلطانہ کا خیال آتا، دل میں ایک حسرت سر اٹھانے لگتی۔ برسوں پہلے کا وہ منظر آنکھوں میں منعکس ہوجاتا اور اس کی آواز کانوں میں گونجتی۔

''اپنا خیال رکھنا۔''

وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ ایسا کیوں ہے مگر یہ سچ ہے کہ اس کے دل میں سلطانہ کو دیکھنے کی خواہش نے جنم لیا تھا اور بالکل اسی طرح جنم لیا تھا جیسے اونچے پہاڑوں کے درمیان چھپی گہری گھاٹیوں میں خود رو گھاس خود بخود اگتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے۔ بالکل غیر محسوس طور پر اس کی یہ آرزو بھی چپکے چپکے بڑھتی اور شدید ہوتی گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی۔ آخر کیوں؟ لیکن وہ سمجھ نہ پاتا۔ شاید سبب یہ ہو کہ زندگی کی شام سر پر تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس احساس نے کہ اب غروب میں شاید کچھ وقت نہیں ہے، اس کے من میں اس تمنا کو ابھارا تھا کہ وہ ایک بار پھر سلطانہ کو دیکھ لے۔ ایک بار اور اس کی میٹھی آواز سن لے، پھر اسے اطمینان ہوجائے گا۔ دل کی حسرت نکل جائے گی اور اسے محرومی کا احساس نہیں رہے گا مگر یہ سوچ کر کبھی کبھی اسے پچھتاوا اور ملال ہوتا کہ اس حسرت کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ سلطانہ بہت دور انگلستان میں بیٹھی ہے۔ اپنے گھر بار میں مگن ہے۔ عرصے سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر اس صورت میں اس سے ملاقات کا کیا امکان ہے؟ نہیں، اب یہ ممکن نہیں۔ شاید یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی اور سورج غروب ہوجائے گا۔ تاہم جب وہ اپنے دل کو ٹٹولتا تو محسوس کرتا کہ اگر سلطانہ سے پھر کبھی سامنا نہ ہو تو اسے قسمت سے کچھ ایسی زیادہ شکایت نہ ہوگی۔ اس کے لیے اتنا اطمینان کافی ہے کہ سلطانہ جہاں بھی ہے، خوش اور مطمئن ہے۔

لیکن جب اکبری باجی نے یکایک کہا کہ سلطانہ سے ملو گے؟ تو اس کے پیروں تلے سے گویا زمین سرک گئی۔

اسے اپنے پرانے شہر میں اتفاقیہ طور پر ایک کام پڑ گیا تھا چنانچہ اسے تین سو میل کا سفر کرنا پڑا۔ اس بار اس کی آمد برسوں بعد ہوئی تھی اور یہ دیکھ کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا کہ شہر کافی حد تک بدل گیا تھا۔ ان گنت نئی نئی عمارتیں کھڑی ہوگئی تھیں۔ پبلک پارک جو پہلے بہت خوبصورت اور وسیع تھا، نصف سے زیادہ غائب ہوگیا تھا۔ گندگی بہت زیادہ تھی۔ سڑکوں پر ہجوم بہت زیادہ تھا اور شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح چند دن گزارے اور مسلسل ان بیتے دنوں کو یاد کیا جب یہ شہر بہت خوبصورت، صاف ستھرا اور پرسکون ہوا کرتا تھا۔ لیکن گئے دنوں نے بہت کچھ چھین لیا تھا۔ نہ صرف انسانوں سے بلکہ آبادیوں سے بھی۔ اب انسانوں کے پاس محبت اور مروت نہیں رہی تھی اور آبادیاں سکون اور تحفظ کی ضمانت سے محروم ہوگئی تھیں۔

شام کی گاڑی سے اس کی واپسی تھی۔ صبح وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اچھا خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کباب، سموسے اور اس کا پسندیدہ بیسن کا حلوا۔ ابھی وہ چائے پی ہی رہا تھا کہ معاً اکبری باجی نے کہا۔

''شہاب! سلطانہ سے ملو گے؟''

لیکن اسے یوں لگا جیسے زمین پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔ ہاتھ اس بری طرح کانپا کہ چائے چھلک گئی۔ اس نے عجلت سے پیالی میز پر رکھی اور سٹپٹا کر اکبری باجی کو دیکھا۔

''سلطانہ سے......؟''

''ہاں......''

''مگر وہ......''

''آج کل وہ یہیں ہے۔ عزیزوں سے ملنے آئی ہے۔ اب شاید دو چار دن میں واپس جانے والی ہے۔''

''مگر اسے کیا علم کہ میں یہاں ہوں؟''

''میں نے بتایا تھا۔ پرسوں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔''

شہاب چند لمحے چپ بیٹھا رہا اور بے یقینی سے اکبری باجی کو دیکھتا رہا پھر اس نے پیالی اٹھائی اور چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ دل کی شوریدہ سر دھڑکنوں اور اعصابی انتشار پر قابو پانے کے لیے اسے چند منٹ کی مہلت درکار تھی۔ چائے ختم کرکے اس نے سگریٹ جلائی، ایک کش لیا، پھر زور سے سانس نے کر بولا۔

''ٹھیک تو ہے وہ......؟''

''ہاں۔''

چند ثانیے چپ رہ کر اس نے کہا۔ ''اب تو کافی عمر ہوگئی ہوگی اس کی۔''

اکبری باجی زور سے ہنسیں۔ ''لو...... کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم بھی...... برسوں گزر گئے۔ تم بوڑھے ہوگئے، تمہارے چہرے پر بھی لکیریں پڑ گئیں۔ تو کیا وہ ابھی تک جوان ہی رہے گی؟''

وہ جھینپ کر مسکرایا۔ ''ہاں خیر، یہ تو ہے۔ پینتیس چھتیس برس تو ہوگئے اسے باہر گئے ہوئے۔'' لمحہ بھر رک کر پھر بولا۔ ''مگر باجی! میں تو آج شام کی ٹرین سے واپس جا رہا ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟ جانے سے پہلے چند منٹ کے لیے مل لو۔''

''لیکن کیا یہ مناسب ہوگا؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ممکن ہے وہ پسند نہ کرے۔''

''ارے نہیں۔'' اکبری باجی مسکرا کر کہنے لگیں۔ ''میں نے تمہارا ذکر کیا تو دیر تک تمہارے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ تمہاری خیریت پوچھتی رہی۔ جب میں نے ذکر کیا کہ تم ایک دو دن میں واپس جانے والے ہو تو اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔''

''اچھا......'' اس کے دل کی دھڑکن دفعتاً بڑھ گئی۔ ''ملنے کی خواہش ظاہر کی؟''

''ہاں...... کہنے لگی، میں چند دن میں واپس چلی جاؤں گی۔ پھر کون جانے کبھی ایسا اتفاق ہو نہ ہو۔ لہٰذا چند منٹ کے لیے مل لوں۔ خیریت پوچھ لوں۔ پھر کہنے لگی کہ ایک نظر شہاب کو دیکھنے کے لیے بہت جی چاہتا ہے۔'' اکبری باجی رکیں، پھر بولیں۔ ''میں نے آج شام کو اسے چائے پر بلایا ہے۔ تم بھی آجانا اور چند منٹ کے لیے ملاقات کر لینا۔''

وہ حیرت اور بے یقینی کے حصار میں گھرا بیٹھا تھا۔ سلطانہ سے ایک بار پھر ملاقات ہوسکتی ہے۔ ایک بار پھر وہ اس کی من موہنی صورت دیکھ سکتا ہے اور اس کی آواز کی جلترنگ سن سکتا ہے۔ خدایا، یہ کیسا عجیب اتفاق ہے؟ اس نے زور سے سانس لی اور اضطراری حالت میں آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو معاً وہ منظر سامنے آگیا جو اس کے ذہن کی تختی پر نقش ہوچکا تھا۔ جس کے سہارے اس نے عمر بھر کا سفر طے کیا تھا۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ سلطانہ سامنے کھڑی ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ پورا منظر، اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ۔ سلطانہ کا سراپا، اس کا خوبصورت چہرہ، اس کی متورم آنکھیں اور...... اس نے اضطراری حالت میں ایک اور سگریٹ جلائی۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔'' اکبری باجی نے پوچھا۔

''خیر، یہ تو ٹھیک ہے کہ چند منٹ کے لیے مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' آخر کار اس نے کہا۔ ''میں آجاؤں گا۔''

مگر جب وہ اکبری باجی کے گھر پہنچا تو انہوں نے اطلاع دی کہ سلطانہ سات بجے تک آئے گی۔ اس نے کہا کہ وہ اوپر چھت پر جا رہا ہے۔ جب سلطانہ آئے گی تو نیچے آجائے گا۔ چھت پر پہنچا تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ برسوں پہلے اسی چھت پر وہ سلطانہ سے آخری بار ملا تھا۔ گو چھت وہی تھی مگر اب چند تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ اردگرد کئی بلند عمارتیں بن گئی تھیں۔ گلی میں ایستادہ نیم کا درخت بڑھ کر اب چھت سے بھی اوپر نکل گیا تھا اور اس کی گھنی شاخوں نے نصف چھت کو ڈھانپ لیا تھا۔ ایک اور تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ اکبری باجی نے چھت پر ایک کمرا بنوا لیا تھا۔ وہ کچھ دیر حیرت اور تاسف سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ یہ تبدیلیاں اسے اچھی نہیں لگی تھیں۔ ایک خلش اور پچھتاوے نے دل میں چٹکی لی تھی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی کوئی عزیز شے اس سے چھین لی گئی ہو۔ کم از کم ایک شے تو ضرور چھن گئی تھی۔ ڈوبتا ہوا سورج جسے نیم کی گھنی شاخوں نے اب مغربی افق میں چھپا لیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ سات بجنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔ وہ معاً اٹھ کھڑا ہوا اور اضطراری انداز میں چھت پر ٹہلنے لگا۔ اس خیال نے کہ کچھ ہی دیر میں سلطانہ آنے والی ہے، اس کے دل میں ہیجان اور تذبذب کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ ابھی سلطانہ آئے گی تو کیسا لگے گا؟ کیسا محسوس ہوگا؟ سلطانہ کیا کہے گی؟ وہ کیا کہے گا؟ اس نے چشم تصور سے اس لمحے کو دیکھنے کی کوشش کی جب وہ ایک دوسرے کا سامنا کریں گے۔ سلطانہ اور وہ...... ایک دوسرے کے روبرو۔ تقریباً چھتیس سال بعد۔ خدایا، کیسا ہوگا؟ وہ لمحہ قیامت سے کم تو نہ ہوگا۔

اس نے بیزاری سے چند قدم اٹھائے۔ پھر یکایک دھیرے سے ہنس دیا۔ حد ہوگئی۔ ارے بھئی اس میں اس قدر گھبراہٹ کی کیا بات ہے؟ وہ کوئی نوجوان لڑکا لڑکی تھوڑا ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ دونوں سنجیدہ اور باشعور انسان ہیں اور چند منٹ کے لیے ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں تو پھر پریشانی کیسی؟ نہیں، اسے اتنا مضطرب نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر کو ہولے سے جھٹکا۔ نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھے گا اور اطمینان سے گفتگو کرے گا۔ سلطانہ کی خیریت پوچھے گا اور اس کے بچوں کا حال، لندن کی باتیں۔ لندن میں اس کا گھر کیسا ہے؟ وہاں اس کی دلچسپیاں اور مصروفیات کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ یوں جیسے اسے اطمینان کا احساس ہوا ہو۔

ٹہلتے ٹہلتے معاً وہ رک گیا۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ سامنے دیوار پر ایک بڑا آئینہ نصب تھا۔ وہ بے خیالی میں آگے بڑھا، کمرے میں گیا۔ ہاتھ بڑھا کر بتی جلائی اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ تب یکلخت اس کا دل ڈوب سا گیا۔

آئینے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی کے سر پر گنتی کے بال تھے۔ کچھ سلیٹی، کچھ سفید۔ ایک بوڑھا بے رونق چہرہ تھا جس پر ان گنت گہری پرچھائیاں تھیں..... حسرتوں اور محرومیوں کا مرثیہ۔ یہ آدمی وہ نہیں تھا جس نے چھتیس سال قبل ایسی ہی ایک شام میں، اسی چھت پر سلطانہ سے آخری ملاقات کی تھی۔ وہ آدمی تو بڑا وجیہہ تھا۔ دراز قد اور توانا، زندگی سے بھرپور۔ اس آدمی کے چہرے پر بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں اور گھنے سیاہ بال اور دمکتی ہوئی رنگت۔ وہ آدمی کہاں گیا؟ ماضی کی قبر میں کہیں دفن ہوگیا اور یہ آدمی جو آئینے میں کھڑا ہے، یہ تو اس کی پرچھائیں بھی نہیں۔ خدایا، یہ کیا ہوا.....؟ وہ حیرت اور صدمے کے حصار میں گھرا ہوا آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا رہا اور اس کا دل ڈھیرے ڈھیرے ڈوبتا گیا۔ آنکھوں کے سامنے وہ منظر ابھر آیا جب آخری بار سلطانہ سے ملا تھا۔ اس کا شاداب اور منور چہرہ، اس کے سیاہ بال اور مرمر سے تراشا ہوا اس کا سراپا، جیسے کوئی دیوی ہو۔ جواں سال، پُرجمال، پُرشکوہ۔ کیا وہ اب بھی ویسی ہوگی.....؟ اس نے سہم کر اپنے چہرے کو دیکھا اور دہشت سے اس کا دل کانپ گیا۔ نہیں، شاید وہ ویسی نہیں ہوگی۔ جب وہ خود اپنا سایہ بن گیا ہے تو وقت نے اس سے بھی اپنا خراج ضرور وصول کیا ہوگا۔ بہاریں رخصت ہوچکی ہوں گی۔ تنویریں ماند پڑ گئی ہوں گی۔ شاید اس کے چہرے پر بھی لکیریں ہوں۔ شاید اس نے بھی چشمہ لگا رکھا ہو۔ اس نے تصور میں سلطانہ کو دیکھنے کی کوشش کی اور اسے مزید ڈر لگا۔

وہ ایک عالمِ وحشت میں کمرے سے باہر آیا اور کشمکش و پیچ کے عالم میں سوچنے لگا، کیا کرے؟ سلطانہ کو دیکھے گا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ سلطانہ جو چھتیس سال سے اس کے تصور میں رہتی ہے، اس کی اپنی ہے۔ جبکہ یہ سلطانہ پرائی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس پرائی سلطانہ کو دیکھے تو اس کی اپنی سلطانہ مر جائے۔ ہاں، یقیناً وہ مر جائے گی۔ کیا وہ اس کی موت کو برداشت کر سکے گا؟ کیا اس صدمے کو جھیل سکے گا؟ نہیں، بہت مشکل ہے یہ۔ کڑا امتحان ہے۔ وہ اس سلطانہ کو کفن میں نہیں لپیٹ سکتا۔ وہ اسے زندہ رکھے گا کہ اس ایک جواں سال، دلکش اور حیات افروز شبیہ، کے سہارے ہی تو اس نے شب و روز کا دکھ بھرا سفر طے کیا ہے۔ وہ شبیہ اس کا کل سرمایہ ہے، اس کی بیساکھی ہے، اس کا زادِ راہ۔ اگر وہ شبیہ مر گئی تو زندگی کے باقی دن کیسے گزارے گا؟

تو پھر کیا کرے؟

کیا اپنا زادِ راہ لٹ جانے دے؟

اس نے بیزاری سے گھڑی دیکھی۔ سات بج رہے تھے۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ عجلت سے سیڑھیاں طے کیں، نیچے آیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ اکبری باجی صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے حیرت سے کہا۔

''ارے شہاب! کہاں جا رہے ہو؟..... سلطانہ تو بس اب آہی رہی ہوگی۔''

''باجی! میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ لے کر ابھی آتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

تیز تیز قدموں سے گلی طے کی، سڑک پر پہنچ کر دائیں جانب مڑا اور عجلت کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت سات بج کر چند منٹ ہو چکے تھے۔ کوئی سوا سو قدم چل کر وہ خود بخود رکا اور غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔ گلی کے سامنے ایک کار آ کر رکی تھی اور اس میں سے ایک عورت جو گہری رنگ کی شال اوڑھے تھی، اتر رہی تھی۔ ایک جوان عورت اور ایک بچہ پہلے ہی کار سے اتر چکے تھے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور ذرا غور سے دیکھا۔ فاصلہ بھی تھا اور شام کا گہرا دھندلکا بھی، اس بنا پر پہچاننے سے قاصر تھا۔ تاہم اسے یقین کی حد تک شبہ ہوا کہ شال والی عورت سلطانہ ہی ہو سکتی ہے۔ وہ چند لمحے گم صم اور حسرت آمیز نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ گلی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اس نے ایک طویل سانس لی اور شکستہ قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

پرایا مال

منظر امام

معاشرے میں یہ رویّہ بہت عام ہے کہ... ''رام رام جپنا، پرایا مال اپنا...'' مگر یہ پرایا مال ہر ایک کو راس نہیں آتا... کچھ لوگ بدہضمی کا شکار ہو جاتے ہیں... انہیں بھی کچھ ایسی ہی مشکل درپیش تھی اور پھر... ایک روز جب انہوں نے رام رام جپنا کی مالا توڑ ڈالی تو مشکل آسان ہوگئی۔

گرد و غبار کے گھیرو میں چھپے ایک پُرخلوص جذبے کی کتھا

اطہر اور اس کی بیوی تسنیم کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا تھا۔

''معاہدہ یہ تھا کہ خاندان کے کسی بچے کو گود نہیں لیا جائے گا۔ چاہے وہ خاندان تسنیم کا ہو یا اطہر کا کیونکہ خاندان کا بچہ لے جا کر کوئی گل بھی کھلا سکتا تھا۔

... بے اولاد تھے اور انہیں اب ایک بچے کی خواہش ... تھی۔ شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے اور اب تک اولاد کے کوئی آثار نہیں تھے اس لیے انہوں نے معاہدہ کر لیا کہ خاندان کا کوئی بچہ گود نہیں لیا جائے گا حالانکہ دونوں کے خاندانوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس قسم کا ایثار کرنا چاہتے تھے۔

اب سوال یہ تھا کہ باہر سے بچہ کہاں سے لایا جائے؟ ایسے ادارے تو تھے لیکن ان کی شرائط بہت لمبی چوڑی ہوا کرتی تھیں۔ ہزار قسم کی قانونی پیچیدگیاں۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کون ان بکھیڑوں میں پڑتا۔ اسی لیے انہوں نے اخبار میں اشتہار دے دیا۔

اشتہار کے جواب میں ایک صاحب تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر کے، معقول صورت۔ ''تو آپ دونوں کو کسی بچے کی ضرورت ہے؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔'' اظہر نے جواب دیا۔

''بلڈ گروپ کیا ہے آپ دونوں کا؟''

''بلڈ گروپ! بلڈ گروپ سے آپ کو کیا لینا؟''

''بھئی بات یہ ہے کہ بچہ نجیب الطرفین ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایرے غیرے گھر میں پرورش پائے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ ہماری رگوں میں بھی خالص خون دوڑ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ان صاحب نے گردن ہلا دی۔ ''اب یہ فرمائیں کہ اس کی شادی کس خاندان میں کریں گے؟''

''شادی!'' تسنیم نے چونک کر پوچھا۔ ''ابھی سے کہاں شادی ہونے لگی۔''

''ماشاءاللہ پچیس سال کا ہو چکا ہے۔ شادی کی یہی عمر تو ہوتی ہے۔''

''دیکھیں جناب۔ ہم نے بچے کے لیے اشتہار دیا ہے۔ ہمیں کسی جوان مرد کی پرورش نہیں کرنی۔'' اظہر نے وضاحت کی۔

''حد ہو گئی۔ بچے کے اشتہار کے جواب میں آپ ایک جوان لڑکے کو ہمارے گھر بھیج رہے ہیں۔'' تسنیم ناراضی سے بولی۔

وہ صاحب برا مان گئے تھے۔ ''دیکھیں صاحب۔ والدین کے لیے ان کا بیٹا بچہ ہی ہوتا ہے۔ چاہے اس کی عمر کچھ بھی ہو۔ ہم اسے بچہ ہی سمجھتے ہیں۔''

''آپ سمجھتے ہوں گے، ہم نہیں سمجھ سکتے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ ہمیں نومولود بچے کی ضرورت ہے۔'' اظہر نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

وہ صاحب برا بھلا کہتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

دوسرے دن ایک اور آدمی آیا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور نمونے کے طور پر ایک شیرخوار اس کی گود میں تھا۔

''ہم تو بس اس بچے کو آپ کے حوالے کرنے آئے ہیں۔'' اس مرد نے کہا۔ ''یہاں اچھی دیکھ بھال ہو جائے گی۔ تعلیم حاصل کرے گا۔ بڑا آدمی بنے گا۔''

''چلو یہ تو اچھی سوچ ہے۔'' اظہر نے کہا۔

''لیکن ہماری ایک شرط ہے جی۔'' وہ عورت جلدی سے بولی۔ ''اور وہ شرط یہ ہے کہ ہم بھی اس کے ساتھ ہی رہیں گے۔''

''کیا کہا..... تم دونوں ساتھ رہو گے؟''

''ہاں تو کیا ہوا، ہمارا خاندان کوئی زیادہ بڑا نہیں ہے۔'' مرد نے کہا۔ ''میرے ماں باپ، میری بیوی کے ماں باپ اور ہم دو..... بس۔''

تسنیم غصے سے بے حال ہو گئی تھی۔ ''دیکھو۔ ہم نے پورے محلے کے لیے اشتہار نہیں دیا ہے۔ ہمیں صرف بچے کی ضرورت ہے۔''

''تو پھر کون اپنی اولاد کو اس طرح غیروں کے حوالے کرے گا؟'' عورت نے کہا۔ ''ہم تو اپنے چاند کو ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر رکھو اس کو اپنے ساتھ اور یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اس طرح تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' تسنیم نے ان کے جانے کے بعد کہا۔ ''ہم کوئی بچہ Adopt نہیں کر سکیں گے۔''

''گھبراؤ نہیں۔ کوئی نہ کوئی مناسب بچہ ضرور مل جائے گا۔'' اظہر نے تسلی دی۔

پھر پورے ہفتے کوئی نہیں آیا لیکن ایک دن ایک معقول صورت عورت آ ہی گئی۔ وہ پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ بچہ اسی کا ہے اور وہ اسے کسی کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔

''لیکن کیوں۔ کیا تم اس کی پرورش نہیں کر سکتیں۔'' اظہر نے پوچھا۔

''کر تو سکتی ہوں لیکن اس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے شوہر پر بہت قرض چڑھ گیا ہے جسے اتارنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔''

''میں سمجھ گیا۔ یعنی تم یہ چاہتی ہو کہ اس کے بدلے تمہیں معاوضہ دیا جائے۔''

''ہاں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''آپ اس سے ہماری مجبوری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔''

''کتنے پیسوں کی ضرورت ہے تمہیں؟''

''صرف دو لاکھ۔'' عورت نے بتایا۔

اظہر اور تسنیم کے لیے دو لاکھ کی رقم کوئی اتنی بڑی نہیں تھی۔ ''ٹھیک ہے۔'' اظہر نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ ''اب

تم اس بچے اور اپنے شوہر کو یہاں لے آنا۔ یہ کام باقاعدہ لکھت پڑھت کے ساتھ ہوگا کیونکہ یہ لاکھوں کا معاملہ ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔ ہم کل ہی آ جائیں گے۔''

دوسری شام وہ دونوں بچے کو لے کر آ گئے تھے۔ بہت گول مٹول، خوبصورت سا بچہ تھا۔ تسنیم اسے دیکھتے ہی نہال ہو گئی تھی۔ ''ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ بہت پیارا ہے۔ ہم اسے لینے کے لیے تیار ہیں۔''

''دیکھو۔ تم اپنی اولاد ہمارے حوالے تو کر رہے ہو لیکن تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا ہوگا۔'' اظہر نے اس کے شوہر سے کہا۔

''جی جناب! ہم کم ظرف نہیں ہیں۔ ہم اس طرف زندگی بھر نہیں آئیں گے۔ اب یہ آپ کا ہو گیا۔''

''تو پھر چلو۔ کورٹ میں چل کر کاغذی کارروائی کر لیتے ہیں۔''

''کورٹ کی کیا ضرورت ہے جناب!'' اس آدمی نے کہا۔ ''جب ایک دفعہ کہہ دیا سو کہہ دیا۔ آپ چاہیں تو آپ کے اطمینان کے لیے میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔''

''چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔'' تسنیم نے کہا۔ ''ہمیں تم دونوں پر اعتماد سا ہو گیا ہے۔''

اظہر نے کاغذات تیار کر رکھے تھے جس پر ان دونوں نے دستخط کیے اور دو لاکھ لے کر چلے گئے۔ جاتے وقت وہ عورت بلک بلک کر رو رہی تھی۔ پھر اس کا شوہر اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

اس بچے نے ان کی زندگی میں خوشیاں بھر دی تھیں۔ گول مٹول سا جس کی ہنسی بھی بہت خوبصورت تھی۔ اظہر اس کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کر لایا تھا۔

ان کی خوشی دوسرے دن اس وقت ختم ہو گئی۔ جب بچے کا باپ پولیس والوں کے ساتھ ان کے گھر آ گئے۔ اظہر اور تسنیم حیران رہ گئے تھے۔ ''اوئے تلاشی دو۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔

''کس بات کی تلاشی؟'' اظہر نے پوچھا۔

''ہسپتال سے بچے چوری کرتے ہو اور پوچھتے ہو کس بات کی تلاشی؟''

''تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ میں ایک عزت دار آدمی ہوں۔ میں کیا بچہ چرانے جاؤں گا؟''

''بچہ ہسپتال سے چرایا گیا ہے اور ہماری اطلاع ہے کہ وہ بچہ تمہارے گھر میں ہے۔'' پولیس والے نے کہا۔

''ہاں۔ ہمارے پاس ایک بچہ ہے اور ہم نے اسے باقاعدہ Adopt کیا ہے۔''

''کہاں سے Adopt کر لیا؟''

تسنیم بچے کو اندر سے لے آئی تھی۔ اس بچے کو دیکھتے ہی وہ عورت چلا اٹھی تھی۔ ''ہاں ہاں۔ یہی ہے میرا لعل۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔''

ان دونوں میاں بیوی کی پوزیشن بہت خراب ہو گئی تھی۔ اظہر نے وہ کاغذات دکھائے جو اس آدمی نے دستخط کر کے دیے تھے۔ ''یہ دیکھیں۔ ان دونوں نے باقاعدہ سائن کر کے اپنی خوشی سے یہ بچہ ہمارے حوالے کیا ہے۔''

''پھر ایک بات اور بھی ہے۔'' تسنیم نے کہا۔ ''آپ لوگ خود سوچیں۔ اگر ہمیں یہی حرکت کرنی ہوتی تو ہم اخبارات میں بچے کے لیے اشتہارات کیوں دیتے؟''

تسنیم کی یہ بات معقول قرار پائی تھی۔ پھر دونوں میاں بیوی شریف اور معزز دکھائی دے رہے تھے۔ محلے والوں نے بھی ان کی شرافت کی گواہی دی تھی اس لیے ان کی جان بچ گئی۔

وہ لوگ بچے کو لے کر چلے گئے۔

اظہر اور تسنیم کو بہت زبردست سبق ملا تھا۔ دو لاکھ روپے بھی گئے اور بے عزتی الگ ہوئی۔ محلے والے بھی عجیب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ہاں بھئی اب کیا کہتی ہو؟'' اظہر نے تسنیم سے پوچھا۔ ''بچہ چاہیے۔''

''نہیں، اب نہیں چاہیے۔'' تسنیم نے اپنے کان پکڑ لیے۔ ''اچھا خاصا سبق مل چکا ہے۔''

''تو پھر۔ بغیر بچے کے کیسے گزر ہوگی؟''

''جس طرح اب تک ہوتی آئی ہے۔'' تسنیم نے کہا۔ ''ویسے میرے ذہن میں ایک راستہ ہے۔''

''اب بھی کوئی راستہ ہے؟''

''ہاں اور وہ یہ ہے کہ یہاں ایسے کئی ادارے ہیں جو بے سہارا بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔''

''تم یہ چاہتی ہو کہ ہم وہاں سے کسی کو لے آئیں؟''

''نہیں، لائیں نہیں۔ اسے وہیں رکھیں۔ بس اس کے اخراجات برداشت کرتے رہیں اور اگر لانا بھی ہو تو کبھی کبھی لے آئیں اور ہفتے میں ایک دن اس کو دیکھ آیا کریں۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔'' اظہر نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ ''میں نے بھی ایسے اداروں کے بارے میں سن رکھا ہے۔ دو چار دن ٹھہر جاؤ۔ میں کسی معقول ادارے کا پتا چلا لوں پھر وہاں چلیں گے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک ہفتے کے بعد دونوں ایک ادارے کے دفتر میں تھے۔ اس ادارے کی بہت شہرت تھی۔ اس کا منیجر ایک ادھیڑ عمر باتونی سا انسان تھا جو، ان دونوں کی یہ خواہش سن کر بہت خوش ہوا تھا۔ ''واہ جناب۔ یہ تو کارِ خیر ہے۔ ارے آپ ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا چل رہی ہے ورنہ کب کی ٹھکانے لگ جاتی۔''

''ہمیں کسی بچے کو adopt کرنا ہے۔'' اظہر نے کہا۔ ''جو بالکل بے سہارا ہو۔''

''ضرور، ضرور۔ یہ بہت ثواب کا کام ہے۔''

''لیکن ہم اسے اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے بلکہ وہ یہیں رہے گا۔'' تسنیم نے کہا۔

''چلیں جیسی آپ کی مرضی۔'' منیجر نے اپنی گردن ہلا دی۔ ''پھر آپ کو اس کے پورے اخراجات ادا کرنے ہوں گے، وہ بھی ہر ماہ پابندی کے ساتھ۔''

''جی ہاں۔ ہم یہی سوچ کر آئے ہیں۔'' اظہر نے کہا۔

''آپ ہمیں اس کے اخراجات بتا دیں۔ اس کی تعلیم، ٹیوشن، کپڑے، خوراک۔ اس کے اپنے چھوٹے موٹے اخراجات۔ مگر اس کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے اور اسے کبھی کوئی پرابلم نہیں ہونی چاہیے۔'' تسنیم نے بات مکمل کی۔

منیجر نے کچھ دیر حساب کتاب کرنے کے بعد ایک بجٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ''آٹھ ہزار روپے ماہانہ۔''

''آٹھ ہزار!'' اظہر کچھ حیران ہو گیا تھا۔ ''یہ رقم زیادہ نہیں ہے؟''

''اس کی پرورش بھی تو اسی انداز کی ہوگی۔'' منیجر نے کہا۔

''چلیں ٹھیک ہے۔ لیکن آپ وہ بچہ تو دکھا دیں بلکہ ہم خود select کریں گے۔''

''نہیں جناب۔ آپ کو select کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ یہاں جتنے بچے ہیں۔ وہ تقریباً سب کے سب گود لیے جا چکے ہیں۔ صرف دو بچے رہ گئے ہیں۔ ایک ابھی ایک سال کا ہے جبکہ دوسرا پانچ چھ سال کا۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوسرا والا آپ دونوں کے لیے مناسب رہے گا۔''

''آپ اس سے ملوا تو دیں۔''

''آج نہیں۔ وہ آپ سے کل مل سکے گا۔'' منیجر نے بتایا۔ ''آج کچھ بچے پکنک کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہے۔''

''او کے۔ تو ہم کل آ جائیں گے۔''

دوسرے دن وہ بچہ منیجر کے کمرے میں موجود تھا۔ اظہر اور تسنیم اسے دیکھتے ہی پھڑک اٹھے تھے۔ وہ چھ سات سال کا بہت کیوٹ سا بچہ تھا جو معصوم نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''یہ ہے وہ بچہ۔'' منیجر نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم نے اس کا نام عمران رکھا ہے۔ بیٹے سلام کرو۔''

بچے نے بہت ہی پیار بھرے انداز میں دونوں کو سلام کیا تھا۔ اظہر نے تو باقاعدہ اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ ''بس جناب۔ یہ بچہ ہمارا ہوا۔'' اس نے منیجر سے کہا۔ ''اب اس کے سارے اخراجات ہمارے ذمے۔''

''مبارک ہو۔ لیکن آپ اسے مہینے میں صرف ایک بار اپنے ساتھ لے جا سکیں گے۔'' منیجر نے بتایا۔ ''وہ بھی ہمارا ادارہ پوری طرح چھان بین کر کے اس کی اجازت دے گا کیونکہ یہ بچے ہماری بہت بڑی ذمے داری ہیں۔ ہمیں اوپر والے کو اپنا منہ دکھانا ہے۔''

''جی ہاں۔ ایسا ضرور ہونا چاہیے۔'' تسنیم نے کہا۔ ''آپ لوگ اچھی طرح اطمینان کر لیں۔''

''ہاں آپ چاہیں تو ہفتے میں ایک بار اس سے آ کر مل سکتے ہیں۔'' منیجر نے شرائط بتائیں۔ ''اور وہ بھی صرف دو گھنٹوں کے لیے اور ایک خاص دن آپ کو مقرر کرنا ہوگا۔''

''جناب۔ آپ کی اس قسم کی ہر شرط ہمیں منظور ہے۔'' اظہر نے کہا۔ ''آپ بس کاغذی تیاری مکمل کریں۔''

کاغذی تیاری کے طور پر ایک فارم پر ان دونوں سے دستخط کروائے گئے۔ اس کے بعد عمران ایک طرح سے ان دونوں کا بچہ ہو گیا۔

اظہر نے اسی وقت اس کے دو مہینے کے اخراجات ایک ساتھ ادا کر دیے تھے۔

دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔

''کاش ہم عمران کو اپنے ساتھ ہی رکھ سکتے۔'' تسنیم نے کہا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس ادارے کے اپنے اصول ہیں۔'' اظہر نے بتایا۔ ''لیکن جب وہ کالج میں ہوگا تو پھر ہمارے پاس آ سکتا ہے۔''

''ہم اسے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوانے کی کوشش کریں گے۔''

''ہاں۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ بھی ہوگا۔ ہم اس کے لیے کرتے رہیں گے۔''

''ایک بات بتائیں۔ کیا ہم عمران کے لیے تحفے لے جا سکتے ہیں؟''

''ہاں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔'' اظہر نے کہا۔ ''ہم کل ہی اس کے لیے شاپنگ کریں گے۔''

دوسرے دن انہوں نے مارکیٹ جا کر اچھی خاصی شاپنگ کر ڈالی تھی۔ قیمتی کھلونے، کپڑے، جوتے، کہانیوں کی رنگین کتابیں اور نہ جانے کیا کیا۔

زندگی میں پہلی بار انہیں ایسی شاپنگ کرتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ خریدے جانے والی ہر چیز میں انہوں نے اپنا اپنا پیار سمو کر رکھ دیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد دونوں لدے پھندے ادارے میں پہنچ گئے تھے۔ منیجر نے عمران کو پہلے سے بٹھا رکھا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر دوڑتا ہوا ان سے آ کر لپٹ گیا۔

اظہر اور تسنیم دونوں نے جی بھر کر اسے پیار کیا تھا۔ عمران اپنے لیے لائی ہوئی چیزیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھ کر ان دونوں کو ایسا لگا جیسے وہ اب تک اسی کے لیے جیتے رہے ہوں۔

دو گھنٹے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔

بہت ڈھیر سا پیار اور دعائیں دے کر وہ واپس آ گئے تھے۔

بالآخر وہ دن آ گیا جب انہیں عمران کو اپنے گھر لانا تھا۔

اس بچے کے لیے ایک کمرے کو خوب اچھی طرح سجا دیا تھا۔ طرح طرح کے کھلونے اور وڈیو گیمز۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ پروگرام بنا لیا تھا کہ وہ عمران کو لے کر پہلے کسی پارک میں جائیں گے پھر کسی اچھے سے ہوٹل میں ڈنر ہوگا۔

رات کو اسے کہانیاں سنائی جائیں گی۔ دن کے وقت پھر ساحل پر جائیں گے اور جب شام ہوگی تو اسے ادارے کو واپس کر دیا جائے۔ بس اتنی ہی دیر کی اجازت ملی تھی لیکن ان کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔

عمران ان کے ساتھ آ گیا۔

پروگرام کے مطابق وہ پہلے اسے پارک لے گئے جہاں اس نے خوب انجوائے کیا۔ اس کی ہنسی دیکھ دیکھ تسنیم خوش ہوئے جا رہی تھی۔ ''نہ جانے اس بے چارے کو اس طرح ہنسنے کا موقع بھی ملا ہوگا یا نہیں؟''

''کہاں سے ملے گا موقع۔'' اظہر نے کہا۔ ''اس کے ساتھ تو ظلم ہی ہوا ہے۔''

''لیکن اب بہت کچھ ہے۔ ہم اس کی زندگی میں رنگ بھر دیں گے۔''

وہ پارک میں بہت دیر تک رہے تھے۔ پھر جب مغرب ہو گئی تھی تو اس کے بعد ایک ہوٹل میں آ گئے۔ بہت خوبصورت اور بڑا ہوٹل تھا۔

ان کا ارادہ تھا کہ وہ ہر بار عمران کو مختلف ہوٹلز میں لے جایا کریں گے۔ وہ بھی ان کے ساتھ بہت خوش تھا۔

ہوٹل ہی میں ان کی ملاقات اظہر جاوید سے ہو گئی۔ وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ کھانا کھانے آیا ہوا تھا۔ اظہر اور اظہر ایک دوسرے کے پرانے دوست تھے۔ دونوں بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔ ''بھئی ہم تو اپنے بیٹے کو ڈنر کے لیے لے کر آئے ہیں۔'' اظہر نے عمران کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارا بیٹا!'' اظہر نے حیرت سے عمران کی طرف دیکھا۔ ''اس کو تو میں جانتا ہوں۔ اس کا نام عمران ہے۔''

''ہاں۔ عمران ہی ہے لیکن.....''

''ارے بھئی۔ ہمارے ایک جاننے والے ہیں ابرار صاحب، جو بچوں کی دیکھ بھال کے ایک ادارے کے منیجر ہیں۔ یہ ان ہی کا تو بیٹا ہے۔''

''کیا!'' اظہر اور تسنیم دونوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ''یہ... یہ ان کا بیٹا ہے؟''

''ہاں بھئی۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ آدمی اس بچے کو بے سہارا بنا کر جانے کتنوں کے حوالے کر چکا ہے۔ تم لوگ بھی شاید اسی چکر میں اسے اٹھا کر لے آئے ہو۔ کیوں؟''

اظہر اور تسنیم ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے۔

انہوں نے عمران کو اسی رات اس ادارے میں پہنچا دیا تھا۔ جب انہوں نے منیجر کو ڈانٹنا شروع کیا تو اس نے شرمندگی سے گردن جھکا لی۔ ''ہاں، یہ میرا ہی بیٹا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ اتفاق ہے کہ آپ کے سامنے پہلے ہی دن اس کی پول کھل گئی ورنہ بعض فیملیز تو ایسی ہیں جو کئی کئی برسوں سے اس کے خرچے اٹھا رہی ہیں۔''

وہ دونوں منیجر کو لعنت ملامت کرتے ہوئے واپس آ گئے تھے۔

اب جب انہیں بچے کی خواہش ہوتی ہے تو ایک دوسرے کو تسلی دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پرایا مال ہمیشہ پرایا ہی ہوتا ہے۔ ہم کچھ بھی کر لیں، کسی اور کے بچے کو اپنا نہیں بنا سکتے، کبھی نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

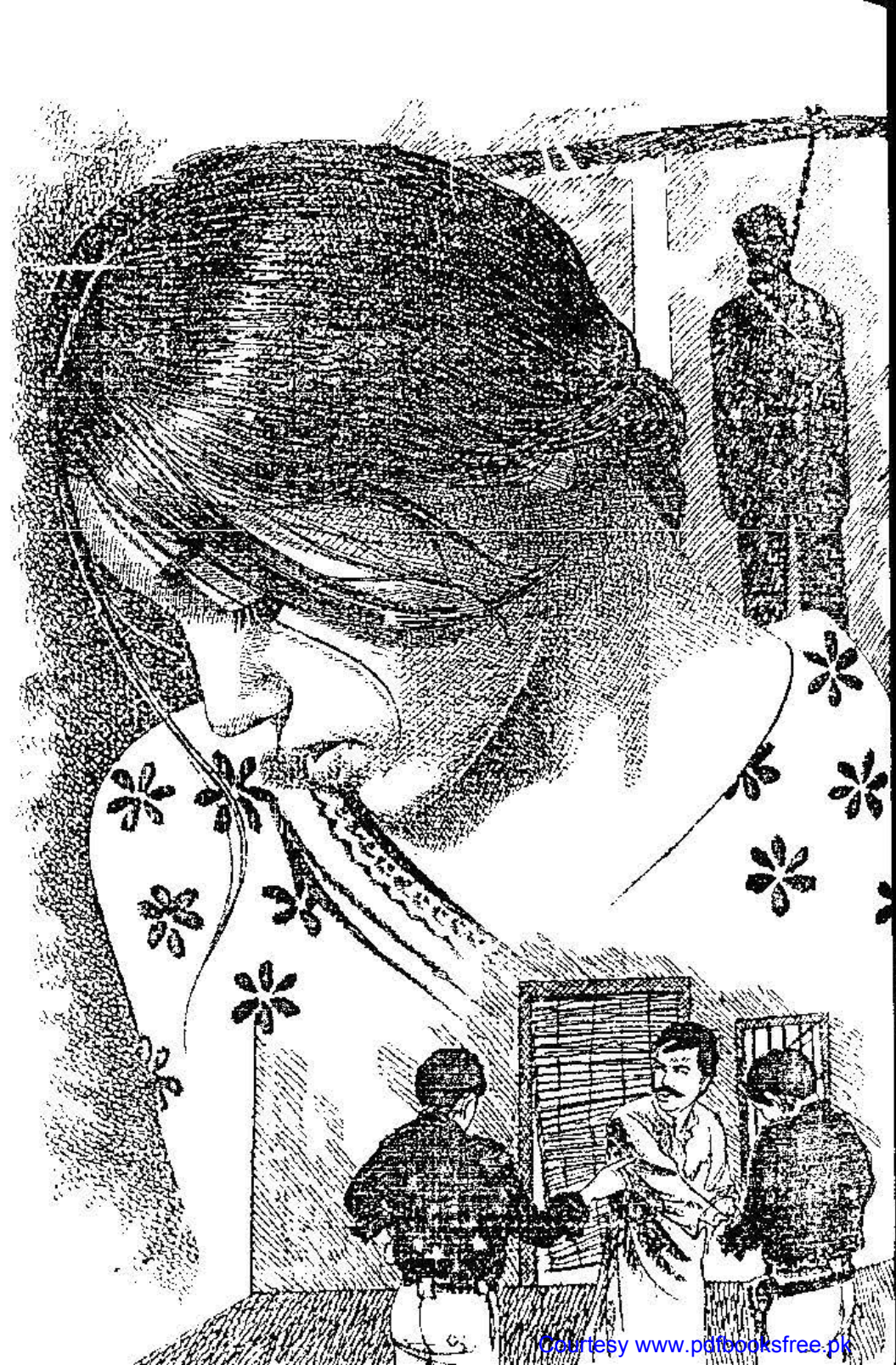

جرم اقبال

ملک صفدر حیات

جیسے عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے اسی طرح خونِ ناحق بھی پکار پکار کر اپنے قاتل کی نشاندہی کرتا ہے۔ خواہ کتنی ہی رازداری برتی جائے مگر جستجو کے آگے کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ ہوشیاری کے باوجود مجرم سے کوئی نہ کوئی خطا ضرور سرزد ہو جاتی ہے... خطا ہو اور سزا نہ ملے... یہ سب قدرت کے قانون میں شامل نہیں... اور جب قانون کے رکھوالے ملک صفدر حیات جیسے مخلص افسران ہوں تو انصاف ملنے کی امید آخر دم تک قائم رہتی ہے۔

مخبری سے واردات کرنے والے ایک بے حس مجرم کی کتھا

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انتہائی بزدل اور کمزور قوت ارادی کے مالک انسان خودکشی کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اس نظریے کے حامل ہیں کہ اپنی جان لینا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بڑے دل گردے اور آہنی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خودکشی بہادری کا علم بردار ایک جرأت مندانہ اقدام ہے۔

آپ ان دونوں نظریات اور ان کے حامل افراد کو اپنے ذہن میں رکھیں اور میں آپ کو اصل واقعے کی طرف لے چلتا ہوں۔ وہ ماہ جولائی کے آخری ایام تھے۔ ساون کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ برسات کے موسم نے ہوا، فضا، ماحول اور دھرتی...... ہر شے کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ ایک صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ قلعہ معصوم شاہ سے دو بندے کوئی بری خبر لے کر آئے ہیں۔

قلعہ معصوم شاہ ایک متوسط سا گاؤں تھا۔ جہاں بہ مشکل دو سو گھر آباد ہوں گے۔ نفوس کا محتاط اندازہ کوئی آٹھ سو کے قریب لگایا جا سکتا تھا۔ یہ گاؤں میرے تھانے سے لگ بھگ دو میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔

میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ "حنیف! ... کی خبر کا کوئی جغرافیہ یا تاریخ بھی ہے؟"

"ملک صاحب! ان بندوں نے مجھے بتایا ہے کہ ادھر قلعے میں ایک نوجوان نے خودکشی کر لی ہے۔" کانسٹیبل وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

میں چونک اٹھا اور اضطراری لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ان دونوں بندوں کو تم میرے پاس بھیج دو۔"

دو منٹ کے بعد وہ دونوں میرے سامنے حاضر تھے۔ وہ وضع قطع، بول چال اور صورت شکل سے عام دیہاتی نظر آتے تھے۔ میں نے ان کے نام دریافت کیے اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ ان میں سے ایک معراج دین اور دوسرا رحمت علی تھا۔

وہ دونوں بیٹھ چکے تو میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "ہاں بھئی، کس نے خودکشی کی ہے ادھر...؟"

"جناب اس گبرو کا نام ہے ظہیر جندرا...!" معراج دین نے بتایا۔

"جندرا...!" میں نے زیرلب دہرایا پھر پوچھا۔ "اس جوان نے اپنے نام کے ساتھ جندرا کیوں لگا رکھا تھا...؟"

جندرا بمعنی تالا... مقامی دیہاتی زبان میں تالے کو جندرا کہا جاتا ہے۔ رحمت علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "تھانے دار صاحب! اس کی بڑائی پھرتی اور... تھی خصوصاً اس کی پکڑ بڑی مشہور تھی۔ وہ یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدمقابل کی کمر میں اپنی ٹانگوں کی قینچی ڈالتا تھا اور یا پھر اس کے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا۔ ایک بار جو کھلاڑی اس کے قابو میں آجاتا، پھر اس کا چھوٹنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا تھا۔ انہی فنی خصوصیات کی بنا پر اس کا نام جندرا پڑ گیا تھا، گویا وہ اپنے سامنے والے کو تالا لگا کر رکھ دیتا تھا...''

''ٹھیک ہے...'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تم دونوں طاہر جندرا کے کیا لگتے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں جناب۔'' حنیف بولا۔ ''ہم بھی قلعے ہی میں رہتے ہیں۔''

قلعہ معصوم شاہ کو عرف عام میں صرف ''قلعہ'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ میں نے سوال کیا۔ ''طاہر جندرا کے گھر والوں میں سے کوئی تمہارے ساتھ کیوں نہیں آیا؟''

''تھانے دار صاحب! طاہر جندرا کے ماں باپ اور چھوٹی بہن اس واقعے کی وجہ سے بڑے دکھی اور غم زدہ ہیں۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رکھا ہے۔'' حنیف نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اسی لیے ہم آپ کو اطلاع دینے یہاں آئے ہیں۔'' اس نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''گاؤں میں بسنے والوں کا ایک دوسرے پر بہت حق ہوتا ہے جناب...''

''بالکل درست... واقعی بہت حق ہوتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''قلعہ معصوم شاہ میرے تھانے سے لگ بھگ دو میل دور ہے۔ تم دونوں برستی بارش میں کس طرح یہاں تک پہنچے ہو؟''

''جناب ہم تانگے میں آئے ہیں۔'' رحمت علی نے جواب دیا۔ ''ہمارا تانگا تھانے کے باہر کھڑا ہے... کوچوان کے ساتھ...!''

''کوچوان کے ساتھ'' کے الفاظ رحمت نے اس انداز میں جوڑ کر بیان کیے تھے جیسے تانگا اور کوچوان دو گہرے دوست ہوں۔ میں نے آئندہ چند منٹ میں ان دونوں سے دو چار ضروری سوالات پوچھے پھر ان کے ساتھ قلعے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جب ہم تھانے سے نکلے تو موسلادھار بارش، بوندا باندی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

☆☆☆

''قلعہ معصوم شاہ'' میں خاصے کی شے حضرت معصوم شاہ کا مزار تھا۔ یہ مزار قبرستان کے ایک کونے میں موجود تھا۔ تھانے سے اگر قلعہ معصوم شاہ کی طرف آئیں تو پہلے قبرستان پڑتا تھا، اس کے بعد گاؤں۔ معصوم شاہ صاحب کے مزار کا سبز گنبد دور ہی سے نظر آجاتا تھا۔ حضرت معصوم شاہ اپنے وقت اور دور کے جید عالم اور مستند ولی اللہ تھے۔ ان کا شمار خالص اور سچے بزرگان دین اور اولیائے کرام میں ہوتا تھا۔

میں نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے، خلوص نیت کے ساتھ حضرت معصوم شاہ کے مزار پر ''حاضری'' دی پھر ہم جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

وہ دس ضرب بارہ فٹ کا ایک چھوٹا سا کچا کمرا تھا جہاں کبڈی کے ماہر طاہر جندرا نے چھت سے لٹک کر اپنی جان لے لی تھی۔ چھت کے شہتیر میں سے گزر کر ایک مضبوط اور موٹی رسی نیچے آرہی تھی۔ اس رسی کا ایک سرا مذکورہ شہتیر کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر بنے ہوئے پھندے میں گبرو جوان طاہر جندرا کی گردن فٹ تھی۔ لٹکاؤ کے باعث اس کی گردن کی لمبائی میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر پھٹی پڑ رہی تھیں اور ان میں موت کی اذیت نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے جھولتے ہوئے پاؤں کے نیچے، کمرے کے فرش (کچے) پر ایک ڈرم الٹا پڑا تھا۔ شواہد سے پہلی نظر میں یہی اندازہ ہوتا تھا کہ طاہر جندرا نے شہتیر سے رسی باندھ کر اس کا پھندا نیچے لٹکایا ہوگا۔ پھر ڈرم کے اوپر چڑھ گیا ہوگا۔ اس نے پھندے کو اپنی گردن میں ڈال کر ڈرم کو پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے ایک جانب الٹ دیا ہوگا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہوگا، اس کا نتیجہ سامنے تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ طاہر جندرا نے اپنے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟

یہ ایک بڑا گمبھیر اور سنسنی خیز سوال تھا جس کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔

میں اپنے ساتھ کانسٹیبل وحید کو بھی لایا تھا اور بارش کے باوجود بھی جائے وقوعہ پر نصف درجن سے زیادہ افراد جمع تھے۔ ان میں سے ایک دو کے پاس چھتریاں تھیں، باقی خود کو بارش سے بچانے کے لیے موم جامے کی بنی ہوئی دیسی برساتیاں اوڑھے ہوئے تھے۔ مذکورہ کچا کمرا گاؤں سے باہر، کھیتوں میں بنا ہوا تھا اور اس میں ایک دیوار کے ساتھ دو عدد گدھے بھی بندھے ہوئے تھے۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ کمرا منظور حسین نامی ایک شخص کا تھا جو پیشے کے اعتبار سے ایک کمہار تھا۔ یہ دونوں گدھے بھی اسی کی ملکیت تھے۔

میرے حکم پر طاہر جندرا کی لاش کو پھندے میں سے نکال کر کمرے کے فرش پر ڈال دیا گیا۔ یہ کام زیادہ مشکل

نہیں ہوا تھا۔ کانسٹیبل وحید ڈرم سیدھا کر کے اس کے اوپر چڑھ گیا تھا۔ دو افراد نے نیچے کھڑے کھڑے طاہر کی لاش کو پاؤں کی طرف سے سہارا دیے رکھا اور وحید نے اس کی گردن میں سے پھندا نکال دیا تھا۔

اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ طاہر جندرا زندگی سے بہت دور، موت کی وادی میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ یا آپ تقدیر نے اس کی زندگی پر جندرا لگا کر اسے تالا بند کر دیا تھا۔ طاہر جندرا کی عمر بائیس سال رہی ہوگی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس کا قد چھ فٹ سے دو تین انچ زیادہ ہی رہا ہوگا۔ وہ ایک وجیہہ و شکیل اور صحت مند جوان تھا۔ اپنے قد کاٹھ، صحت اور وجاہت کی بنا پر اسے بلاشبہ گبرو کہا جا سکتا تھا لیکن اس وقت اس کا وجود ہر خوب صورتی، رعنائی، طاقت، صحت اور توانائی سے خالی ہو چکا تھا۔

میں نے سرسری انداز میں اس کی لاش کا جائزہ لیا۔ بظاہر کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی خودکشی کی واردات تھی، تاہم میرے ذہن میں ایک نامعلوم سی الجھن ضرور پیدا ہوئی مگر میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی اور ضابطے کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے کانسٹیبل وحید کے ساتھ سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔

جائے وقوعہ پر جو آٹھ دس افراد موجود تھے ان میں طاہر جندرا کا باپ اللہ رکھا بھی شامل تھا۔ اللہ رکھا کی عمر پینتالیس اور پچاس برس کے درمیان رہی ہوگی۔ جوان بیٹے کی ناگہانی موت نے اللہ رکھا کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ میں نے سب لوگوں کی موجودگی میں اس سے پوچھ گچھ مناسب نہ سمجھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''اللہ رکھا! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔''

اس کے آنسو نکل آئے، بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! پتا نہیں، طاہر نے اتنا سنگین قدم کیوں اٹھایا... اس کی زندگی میں تو کوئی غم اور پریشانی نہیں تھی...''

''حوصلہ رکھو اللہ رکھا...'' میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے گھر میں بیٹھ کر تمہارا بیان لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

جب کوئی شخص اپنے ہاتھوں سے خود کو ختم کرتا ہے تو یہ کام بلاسبب نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا دکھ یا پریشانی چھپی ہوئی ہے... کوئی ایسا روگ جس سے ساتھ زندہ رہنا ممکن نہ رہے اور موت ہی میں عافیت اور سلامتی نظر آئے۔ یقیناً طاہر جندرا کے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ رہا ہوگا جبھی میں نے اللہ رکھا سے علیحدگی میں بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اسے دوسرے لوگوں کی موجودگی میں نہیں کریدنا چاہتا تھا۔

جائے وقوعہ پر حاضر افراد سے میں نے پوچھ گچھ کی لیکن کوئی اہم اور خاص بات سامنے نہ آئی۔ ان سب کی نظر میں طاہر جندرا ایک امن پسند اور صلح جو جوان تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی غم فکر یا پریشانی نہیں تھی۔ وہ کبڈی کا ایک نامور کھلاڑی تھا۔ اس نے قلعہ معصوم شاہ کی ٹیم کو کئی مرتبہ فتح دلائی تھی... وغیرہ وغیرہ!

یہ تمام تر معلومات ایسی تھیں کہ خودکشی کا جواز واضح نہیں ہوتا تھا اور بلاجواز یا بے سبب اس کائنات میں کوئی ننھے سے ننھا واقعہ بھی ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ مجھے کچھ ایسا خاص تلاش کرنا تھا جو خودکشی کے جواز تک راہنمائی کر سکے...! میں نے وہاں موجود افراد پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ ''تم میں سے منظور حسین کمہار کون ہے؟''

یہ کمرا منظور حسین کمہار کی ملکیت تھا لہٰذا اس کا بیان بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ خودکشی والا یہ اندوہناک واقعہ اسی کمرے میں پیش آیا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں ایک شخص نے بتایا۔

''جناب! منظور حسین آپ کے آنے سے پہلے تو ادھر ہی تھا لیکن شاید اب وہ اپنے گھر جا چکا ہے۔''

''کیا اس کا گھر بھی قلعہ معصوم شاہ ہی میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...!'' مجھ سے مخاطب شخص نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''وہ ادھر بلال مسجد والی گلی میں رہتا ہے جناب۔''

میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا پھر اس کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں پر دو گدھوں کی موجودگی کے باعث کمرے کو لاک نہیں کیا جا سکتا تھا اور ان بے زبان جانوروں کو برساتی موسم میں باہر ہانک دینا بھی غیر انسانی بلکہ غیر اخلاقی سلوک ہوتا لہٰذا میں نے تمام افراد کو تاکید کر دی کہ جب تک میں منظور حسین کمہار سے مل کر اس کمرے کو لاک نہیں کر دیتا، کوئی یہاں قدم نہیں رکھے گا۔ جو چیز جہاں ہے، جیسی ہے اسے ویسا ہی رہنے دیا جائے گا۔

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں اللہ رکھا کی راہنمائی میں اس کے گھر کی جانب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆

اللہ رکھا کا گھر قلعہ معصوم شاہ کے مغربی حصے میں واقع تھا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان تھا البتہ گھر کا صحن خاصا کشادہ اور سرسبز و شاداب تھا۔ سرسبز و شاداب ان معنوں میں کہ وہاں پھلوں اور دیگر سایہ دار درختوں نے بہار بلا رکھی تھی۔ آم، جامن، امرود اور شہتوت کے درختوں کے علاوہ ٹاہلی (شیشم) اور پیپل کا بھی ایک ایک درخت موجود تھا۔

اللہ رکھا ایک چھوٹا کاشتکار تھا لہٰذا صحن کے ایک کونے میں ہل اور پنجالیاں وغیرہ بھی رکھی نظر آ رہی تھیں۔ صحن ہی کی ایک دیوار کے ساتھ دو بھینسیں اور تین بکریاں بھی کنڈیوں پر بندھی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ پانچ ایکڑ زمین کا مالک تھا اور گزر بسر کھیتی باڑی ہی کی رہین منت تھی۔ اس کام میں طاہر جندرا اس کا بھرپور ہاتھ بٹاتا تھا۔ اس کے گھر کا سیٹ اپ بالکل ویسا ہی تھا جیسا چھوٹے زمیندار گھرانوں کا ہوتا ہے۔

میں اللہ رکھا کی معیت میں اس کے گھر میں داخل ہوگیا۔ باقاعدہ بارش کا سلسلہ تو رک گیا تھا تاہم ہلکی پھوار پڑ رہی تھی جو وقفے وقفے سے بوندا باندی میں بدل جاتی تھی۔ ساون کی جھڑی کا اپنا ایک الگ مزہ ہے جس میں انسان کے اندر اور باہر کا موسم مکمل طور پر بھیگ کر رہ جاتا ہے۔

اللہ رکھا کی بیوی کا نام کلثوم تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی اور دراز قامت عورت تھی۔ کلثوم کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ ان کی چھوٹی بچی کا نام عابدہ تھا جس کی عمر دس سال تھی۔ اللہ رکھا، اس کی بیوی اور بچی تینوں طاہر جندرا کی الم ناک موت پر دل گرفتہ اور ملول تھے۔ بوندا باندی کے باعث صحن میں بیٹھنا ممکن نہیں تھا لہٰذا اللہ رکھا مجھے برآمدے میں لے آیا۔ مکان کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو دو کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے آگے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک برآمدہ تھا جہاں تین، چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک چارپائی پر اللہ رکھا نے مجھے بٹھایا پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''کلثوم! تھانے دار صاحب کے لیے کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو.....!''

''اس تکلف کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی یہ ایسا موقع ہے کہ میری خاطر تواضع کی جائے۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر دونوں کو اس انداز میں منع کر دیا۔ ''تم لوگ مجھے طاہر کے بارے میں جو بتا سکتے ہو، وہ بتاؤ۔ یہی تمہاری سب سے بڑی خدمت ہوگی۔''

''جناب! طاہر نے تو ہمیں جیتے جی مار دیا ہے۔''

کلثوم نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا؟ وہ تو بالکل خوش باش اور ٹھیک ٹھاک تھا۔''

''خوش باش اور ٹھیک ٹھاک انسان کبھی خود کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کلثوم.....!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''کوئی تو ایسی وجہ ہوگی جس نے اسے اس کام کے لیے مجبور کیا؟''

''پتا نہیں جناب.....'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''اللہ ہی جانے، اس کے دل میں کیا تھا.....!''

''اللہ تمہارا بھلا کرے کلثوم!'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں بھی یہی جاننا چاہتا ہوں، آپ لوگوں کے بیٹے کے دل اور دماغ میں کیا تھا.....؟''

''دل اور دماغ کی باتیں تو سوہنا رب ہی جانتا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''اس نے ہم سے تو کبھی اپنا دکھ بیان نہیں کیا..... ہم نے ہمیشہ اسے ہنستے مسکراتے اور خوش ہی دیکھا ہے۔''

''کلثوم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے تھانے دار صاحب!'' اللہ رکھا تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس کے سینے میں کوئی ایسا غم بھی چھپا ہوگا جو اسے اپنی جان لینے پر مجبور کر دے گا۔''

''مجھے آپ تینوں سے گہری ہمدردی ہے۔'' میں نے باری باری اللہ رکھا، کلثوم اور عابدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں لیکن.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔

''لیکن..... ایک تھانے دار ہونے کے ناتے مجھے اس بات کا پتا لگانا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے جن کے ہاتھوں مجبور ہونے کے بعد آپ کے بیٹے نے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کیا اور..... میرا یہ مقصد آپ لوگوں کے تعاون کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا.....''

''ہم تو ہر تعاون کے لیے تیار ہیں۔'' اللہ رکھا نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''آپ حکم کریں جناب.....!''

میں نے انٹرویو کے انداز میں ان سے سوال و جواب شروع کر دیے۔ ابتدا میں میں نے عابدہ کو وہاں سے اٹھا دیا تھا۔ وہ بڑی فرماں برداری اور شرافت کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ دس گیارہ برس کی رہی ہوگی۔ یہ ایک

ایسی عمر ہوتی ہے جس میں انسان کا شعور پوری طرح بیدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بچی کا وہاں سے ہٹ جانا ہی ٹھیک تھا۔

''اللہ رکھا!'' میں نے طاہر جندرا کے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ کھیتی باڑی کے کام میں طاہر تمہارا ہاتھ بٹایا کرتا تھا.....؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جناب! وہ بہت ہی فرماں بردار اور محنتی لڑکا تھا۔ میرا تو بس نام ہی تھا ورنہ کھیتی باڑی کا زیادہ تر کام تو وہی کرتا تھا۔''

''پتا نہیں، کس دشمن کی نظر کھا گئی میرے بچے کو.....'' کلثوم نے دل گیر آواز میں کہا۔ ''تھا بھی تو کتنا سوہنا گبرو جوان!''

میں نے روئے سخن کلثوم کی جانب موڑا اور روا روی میں پوچھ لیا۔ ''کیا طاہر کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی تھی؟''

''نہیں جناب، وہ تو یاروں کا یار تھا۔'' اللہ رکھا نے بتایا۔ ''بزرگوں کا احترام کرنے والا اور بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنے والا.....''

''میرے پتر میں ذرا سا بھی غرور نہیں تھا تھانے دار صاحب!'' اللہ رکھا کی بات کو کلثوم نے آگے بڑھایا۔ ''پورے قلعے میں اور آس پاس کے گاؤں میں طاہر جتنا تگڑا اور ہنرمند کبڈی کا کوئی کھلاڑی نہیں تھا لیکن مجال ہے، اس نے کبھی اس بات پر گھمنڈ کیا ہو.''

میں نے کلثوم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دشمن کے حوالے سے اس لیے پوچھا ہے کہ تھوڑی دیر پہلے تم نے کسی دشمن کی نظر کا تذکرہ کیا تھا.....!''

''وہ تو جناب میں نے طاہر کی جوانی، صحت اور کبڈی میں مہارت کی وجہ سے کہا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''طاہر نے بڑے مشکل مقابلے بھی جیت کر دکھائے تھے۔ یوں سمجھیں کہ کبڈی کے معاملے میں وہ قلعے کی آبرو تھا.....'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''جہاں جیت کی خوشی میں دوستوں کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں وہیں ہارنے والوں کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، کسی بدخو نے اسے بری نظر سے دیکھا ہو اور اس دشمن کی بری نظر میرے طاہر کو کھا گئی''

کلثوم جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ ایک دکھی ماں کے دل کی آواز تھی۔ ایک ایسی ماں جس کا جوان جہان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا ہو۔ بہرحال میں ایک دل گرفتہ ماں کے جذبات کو نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس نے طاہر جندرا کی موت کے حوالے سے کسی ''دشمن'' کا ذکر کیوں کیا تھا لیکن میرے ذہن کا سوال ابھی تک جوں کا توں کھڑا تھا۔ طاہر جندرا اپنی جان لینے پر کیوں مجبور ہوا؟

میں دوبارہ اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہوا اور کہا۔ ''اللہ رکھا! میں نے اسپتال بھجوانے سے پہلے تمہارے بیٹے کی لاش کا معائنہ کیا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کی موت آدھی رات کے آس پاس واقع ہوئی ہے۔ کیا پچھلی رات طاہر گھر میں موجود نہیں تھا؟''

''جناب! یہی تو حیرت کی بات ہے۔'' اللہ رکھا آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''کل شام سے پہلے طاہر ٹھیک ٹھاک کھیتوں سے واپس آیا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق بھینسوں اور بکریوں کو چارا وغیرہ ڈالا پھر ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہوگیا۔ ہم چاروں نے ایک ساتھ رات کا کھانا کھایا پھر سونے کے لیے لیٹ گئے تھے.....'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، دو چار گہری سانسیں لے کر اپنے تنفس کو درست کیا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''صبح جب میری آنکھ کھلی تو طاہر کا بستر خالی تھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل جایا کرتا تھا۔ علی الصباح دوڑ لگانا اور مختلف قسم کی ورزشیں کرنا اس کے معمول میں شامل تھا۔ وہ کبڈی کے لیے ہمیشہ خود کو فٹ رکھتا تھا۔ جہاں روزانہ صبح ہی صبح ورزش کے لیے جانا اس کی عادت تھی، وہیں وہ سورج طلوع ہونے سے پہلے واپس بھی آ جایا کرتا تھا۔ ہم ایک ساتھ مل کر ناشتا وغیرہ کرتے پھر میں اور طاہر کھیتوں کی طرف نکل جاتے اور یہ دونوں ماں بیٹیاں گھر میں رہتی تھیں لیکن آج صبح سارا معمول بگڑ کر رہ گیا.....'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوا۔ ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں میں اتر آنے والے آنسوؤں کو صاف کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہم ناشتے پر اس کا انتظار کرتے رہے۔ وہ نہیں آیا..... اس کی موت کی خبر آ گئی.....!''

وہ بڑے دل گرفتہ لمحات تھے۔ ایک باپ مجھے اپنے جوان بیٹے کی موت کے بارے میں بتا رہا تھا اور اس بیان کے دوران میں اس کی آنکھیں بار بار چھلک آتی تھیں۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کی حالت سنبھلی اور وہ بات کرنے کے قابل ہوا تو میں نے پوچھا۔

''تمہیں طاہر کی موت کے بارے میں کس نے بتایا تھا؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ طاہر جندرا کی لاش کو منظور حسین کمہار نے دریافت کیا تھا۔ وہ جب حسبِ معمول اس کمرے میں پہنچا جہاں اس کے دو گدھے بندھے ہوئے تھے تو اس نے چھت سے طاہر کی لاش کو جھولتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ اللہ رکھا کے بیٹے طاہر جندرا نے چھت سے لٹک کر خودکشی کرلی ہے۔ ابھی تک منظور حسین کمہار سے میری بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھا لیکن میں نے سوچ رکھا تھا کہ یہاں سے اٹھنے کے بعد میں سیدھا منظور کمہار کے گھر ہی جاؤں گا۔

اللہ رکھا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جناب! ادھر گلی کے ہی ایک بندے نے یہ اطلاع دی تھی۔ اس کا نام ولی محمد ہے......''

''ٹھیک ہے......'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب میں آپ دونوں سے بہت ہی اہم سوال پوچھنے والا ہوں۔ بہت ہی سوچ سمجھ کر جواب دینا ہے......ورنہ بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔''

میں نے سنسنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

''کیا طاہر کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر وغیرہ تھا......؟''

''چکر......'' کلثوم تکتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

''نہیں جی، میرا پتر اس قسم کا نہیں تھا۔ وہ تو گاؤں کی تمام لڑکیوں اور عورتوں کو اپنی مائیں بہنیں سمجھتا تھا......کیا مجال ہے کہ وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا ہو......''

''تھانے دار صاحب!'' اللہ رکھا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آپ نے یہ لڑکی والی بات کس وجہ سے پوچھی ہے؟''

''میں دراصل طاہر کی خودکشی کا سبب جاننے کی کوشش کررہا ہوں، کوئی بھی شخص بلاوجہ اپنی جان نہیں لیتا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تک کی میری تحقیق کے مطابق طاہر جندرا کی زندگی میں کوئی غم، دکھ، تکلیف اور پریشانی نہیں تھی۔ وہ ہنستا مسکراتا ایک خوش باش شخص تھا......تو......تو پھر اس نے خودکشی کیوں کی؟''

میں نے لمحے بھر کو توقف کرکے ایک بوجھل سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اب آجا کر زندگی کا ایک ہی نازک گوشہ باقی رہ جاتا ہے۔ محبت، عشق وغیرہ...... ہوسکتا ہے، آپ کے بیٹے نے اس راہ میں کوئی گہری چوٹ کھائی ہو اور اس واقعے سے دل برداشتہ ہوکر اس نے خودکشی کرلی ہو......؟''

''جہاں تک میرا ذہن کام کرتا ہے......'' اللہ رکھا آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''طاہر کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ میں نے اس حوالے سے اس کی کوئی بات نہیں سنی۔ آگے رب بہتر جانتا ہے جی۔''

''نہیں جی، میرا طاہر اس قسم کا نہیں تھا۔'' کلثوم نے جلدی سے کہا۔ ''وہ تو بڑا ہی شرمیلا تھا جناب......لڑکیوں اور عورتوں سے بات کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ یہ عشق اور محبت اس کے بس کا روگ نہیں تھا تھانے دار جی۔''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کہا۔ ''کیا طاہر جندرا لڑکوں اور مردوں سے بات کرتے ہوئے بھی شرماتا تھا؟''

''نہیں جناب......ایسی کوئی بات نہیں!'' اللہ رکھا نے کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے، لڑکوں میں اس کے دوست ہوں گے؟''

''اس کا جگری یار تو ادھر کھرل کوٹ میں رہتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''نواز نام ہے اس کا......''

''کھرل کوٹ'' نامی یہ گاؤں، قلعہ معصوم شاہ کی مشرقی سمت میں کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے پوچھا۔

''یہاں قلعہ میں اس کا کوئی دوست نہیں کیا؟''

''یہاں تو اس کی یاری صرف آفتاب سے تھی۔'' اللہ رکھا نے بتایا۔ ''آفتاب بھی بڑی ستھری کبڈی کھیلتا ہے......''

''جائے وقوعہ پر میں نے جن لوگوں کا بیان لیا ہے ان میں شاید آفتاب شامل نہیں تھا۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا اندازہ غلط تو نہیں اللہ رکھا؟''

''نہیں جناب......آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تصدیقی انداز میں بولا۔ ''آفتاب پچھلے تین دن سے گاؤں میں موجود نہیں۔ وہ اپنے چاچا کے پاس شیخوپورہ گیا ہوا ہے۔''

''آفتاب کی واپسی کب تک ہوگی؟''

''یہ تو اس کے گھر والوں ہی سے پتا چل سکتا ہے جناب۔''

میں نے آفتاب کے گھر کے بارے میں سوال کیا۔ اللہ رکھا نے مجھے مذکورہ گھر کا پتا سمجھا دیا۔ آفتاب بلال مسجد کے پچھواڑے رہتا تھا۔ میں نے اس پتے کو ذہن نشین کرلیا کہ جب منظور حسین کمہار سے ملنے جاؤں گا تو ادھر بھی جھانک کر دیکھ لوں گا۔

اللہ رکھا کا گھر چھوڑنے سے پہلے میں نے اس سے دو تین اہم سوال کیے جن میں سرفہرست یہ تھا کہ طاہر آدھی رات کو گھر سے نکلا تو انہیں اس بات کی خبر کیوں نہ ہوئی؟

''اللہ رکھا!'' میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے بیٹے کی لاش کی حالت سے میں نے جو اندازہ قائم کیا ہے، اس کے مطابق اس کی موت آدھی رات کے وقت واقع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے، وہ آدھی رات یا اس سے تھوڑا پہلے گھر سے نکل کر اس کمرے تک پہنچا ہوگا جہاں اس نے خود کو پھانسی پر لٹکا کر موت کے حوالے کیا ہے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''جناب......آپ تھانے دار ہیں اور ان کاموں کا آپ کو زیادہ تجربہ ہے۔'' وہ بےبسی کے عالم میں بولا۔ ''آپ جو بھی فرمارہے ہیں وہ غلط کیسے ہوسکتا ہے۔''

''اگر میرا کہا درست ہے تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ آدھی رات سے پہلے ہی گھر سے نکلا ہوگا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم لوگوں میں سے کسی کو احساس نہیں ہوا کہ وہ اپنے بستر سے اٹھ کر کہیں جارہا ہے؟''

''اگر احساس ہوجاتا جناب تو ہم......اس سے پوچھتے نہیں کہ وہ آدھی رات کو کہاں جارہا ہے؟'' اللہ رکھا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو صبح ہی پتا چلا تھا کہ وہ اپنی چارپائی پر موجود نہیں اور یہ بالکل معمول کے مطابق تھا۔''

''یہ بالکل معمول کے مطابق تھا۔'' میں نے اسی کے بولے ہوئے الفاظ کو زیرِلب دہرایا پھر پوچھا۔ ''طاہر جب روزانہ صبح ورزش وغیرہ کے لیے گھر سے نکلتا تھا تو کیا گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہی چھوڑ جایا کرتا تھا؟''

''نہیں جناب! اس نے جاتے ہوئے گھر کے دروازے کو کبھی کھلا نہیں چھوڑا۔'' اللہ رکھا نے بڑی رسان سے وضاحت کی۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ ہمارے گھر کے بیرونی دروازے پر ایک ایسی کنڈی لگی ہوئی ہے جو اندر باہر دونوں جانب سے کھولی اور بند کی جاسکتی ہے۔ طاہر جب بھی صبح ورزش وغیرہ کے لیے گھر سے نکلتا تھا تو اس کنڈی کی مدد سے دروازہ بند کردیا کرتا تھا۔''

''کیا آج صبح بھی ایسا ہی ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

''میرا مطلب ہے، جب آج صبح تم معمول کے مطابق بیدار ہوئے تو کیا گھر کا بیرونی دروازہ اسی طرح کنڈی چڑھا بند تھا جیسا کہ عموماً بند ہوا کرتا ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''اللہ رکھا! اس پوچھ گچھ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کسی حوالے سے آپ لوگوں پر شک کررہا ہوں۔ میں دراصل اس وجہ کی تلاش میں ہوں جس نے طاہر جندرا کو خودکشی پر مجبور کیا۔''

''ٹھیک ہے جناب، آپ ضرور اپنا فرض پورا کریں۔''

''اس سلسلے میں میری آپ دونوں میاں بیوی سے ایک درخواست ہے۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں استعجابیہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے ان کی حیرت اور الجھن کو دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میں ابھی تو جارہا ہوں لیکن بعد میں بھی چکر لگاتا رہوں گا۔ اگر آپ لوگوں کو اپنے بیٹے کی خودکشی کے حوالے سے کوئی بھی اہم یا غیر اہم بات پتا چلے تو آپ فوراً مجھے اس کی اطلاع دیں گے......ٹھیک ہے؟''

وہ بہ یک زبان ہوکر بولے۔ ''جی ٹھیک ہے......''

میں رخصت ہونے لگا تو اللہ رکھا نے پوچھ لیا۔ ''تھانے دار صاحب! طاہر کی لاش ہمیں کب تک مل جائے گی؟''

''میرا خیال ہے، کل شام تک یا اس سے تھوڑا پہلے......'' میں نے ایک اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگ اسی حساب سے اس کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کریں۔''

انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں ان کے گھر سے نکل آیا۔

☆☆☆

میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کررہا تھا اور اس وقت تک میری الجھن، سلجھن میں نہیں بدل سکتی تھی جب تک میں یہ نہ جان لیتا کہ طاہر جندرا کی خودکشی کا سبب کیا تھا؟ جب اس نے دیدہ دانستہ خود کو موت کے حوالے کیا تھا تو اس فعل کے پیچھے کوئی نہ کوئی ذہنی دباؤ تو ہوگا نا......!

جب میں اللہ رکھا کے گھر سے نکلا تو اس نے پیشکش کی تھی کہ وہ آفتاب اور منظور کمہار کے گھروں تک میری راہنمائی کے لیے ساتھ چلنے کو تیار ہے لیکن میں نے شکریے کے ساتھ اس کی پیشکش کو واپس کردیا تھا۔ قلعہ معصوم شاہ کوئی بہت بڑا گاؤں نہیں تھا جو مجھے ان دو مذکورہ افراد کے گھر تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس گاؤں میں صرف ایک ہی مسجد تھی اور وہ تھی بلال مسجد۔ یہ دونوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افراد اسی بلال مسجد کے قرب وجوار میں رہائش پذیر تھے۔

آفتاب کے گھر والوں نے بتایا کہ وہ دو دن کے بعد شیخوپورہ سے واپس آجائے گا اور ایک آدھ دن زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ چار روز کے بعد یقیناً قلعہ معصوم شاہ میں موجود ہوگا۔

میں ایک گلی گھوم کر منظور حسین کمہار کے گھر پہنچ گیا۔

اس دوران میں بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ کبھی بوندا باندی ہونے لگتی اور کبھی اس میں تیزی آجاتی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ موسم کے تیور دیکھتے ہوئے میں چھتری اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس وقت بہت کام آرہی تھی۔ دروازہ منظور حسین ہی نے کھولا تھا۔ میں اس کا صورت آشنا تو نہیں تھا لیکن جب بعد میں اس نے اپنا نام بتایا تو تعارف ہوگیا۔ وہ اپنے دروازے پر ایک پولیس والے کو دیکھ کر پریشان نہیں ہوا۔ شاید وہ اس بات کی توقع کر رہا تھا کہ طاہر جندرا والے معاملے میں اس سے پوچھ گچھ کے لیے پولیس ضرور اس کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "میں اس علاقے کا تھانا انچارج ہوں..."

"آئیں جناب... بسم اللہ!" وہ گھر کے اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑتے ہوئے بولا۔ "بیٹھک میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

ایک منٹ کے بعد میں منظور حسین کمہار کی بیٹھک میں موجود تھا۔ منظور مجھے وہاں بٹھا کر گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہوگیا... تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے دکھائی دی۔ جب مذکورہ ٹرے نے ایک چوبی میز پر لینڈنگ کی تو پتا چلا کہ اس میں کٹے ہوئے آم اور کچی لسی کا جگ مع دو کنگ سائز چینک کے گلاس سجا ہوا تھا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی منظور...!" میں نے بے ساختہ کہا۔

"جناب! آپ پہلی مرتبہ میرے گھر تشریف لائے ہیں، تھوڑی خاطر تواضع تو ہونی ہی چاہیے۔" وہ جگ اٹھا کر دو گلاسوں میں کچی لسی انڈیلتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی یہ جاتے ہوئے آموں کا موسم ہے۔ اگلے سیزن میں پتا نہیں، ہم ہوں گے یا نہیں اس لیے جی بھر کر اس پھل کا لطف اٹھا لینا چاہیے۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہم اللہ کریں جناب... میں بھی آپ کا ساتھ دے رہا ہوں۔"

اور میں نے "بسم اللہ" کردی۔

آم کو پھلوں کا سردار مانا جاتا ہے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا انسان ہو جو آم کا نام سنے اور اس کا جی اسے کھانے کو نہ مچلے۔ اگر یہ پھل آنکھوں کے سامنے ہو تو اس کی جانب ہاتھ بڑھانے کو دل نہ چاہے۔ اگر واقعی ایسا کوئی شخص دنیا میں موجود ہے اور کسی ڈاکٹری ہدایت کے بغیر وہ آم کو پسند نہیں کرتا تو ایسے انسان کو بدذوق ہی کہا جاسکتا ہے۔

چوسا (چونسا) آم کی لمبائی کے رخ بڑی بڑی قاشیں کاٹی گئی تھیں۔ میں نے کوئی تکلف نہیں کیا اور اس عظیم پھل سے انصاف کرنے لگا۔ تمیز دار اور عقل مند لوگ آم کے ساتھ یا تو جامن کا استعمال کرتے ہیں اور یا پھر کچی لسی (دودھ اور پانی کا ملاپ) استعمال کی جاتی ہے۔ آپ چاہے کتنے بھی آم کھا جائیں، اس کے بعد اگر دس بارہ جامن یا ایک دو گلاس کچی لسی کے چڑھا جائیں تو آموں کی ساری گرمی ٹھکانے لگ جائے گی اور آپ کے معدے کو کسی آزمائش سے نہیں گزرنا پڑے گا لیکن ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک وقت میں صرف ایک چیز کا استعمال ہونا چاہیے، کچی لسی یا پھر جامن!

آم خوری اور لسی نوشی کے دوران میں ہم بات چیت بھی کر رہے تھے۔ جب طاہر جندرا کی المناک موت پر ہم اپنے اپنے انداز میں اظہار افسوس کر چکے تو میں نے پوچھا۔ "منظور! تم مجھے جائے وقوعہ پر نظر نہیں آئے حالانکہ تمہیں وہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کمرا تمہاری ملکیت ہے جہاں یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے؟"

"جناب! جیسا کہ آپ کو پتا چلا ہوگا، طاہر جندرا کی لاش آج صبح میں نے ہی دریافت کی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں کافی دیر تک وہاں کھڑا رہا تھا۔ میں نے ہی معراج اور رحمت کو تھانے کی طرف دوڑایا تھا۔ مجھے ایک مجبوری کے تحت گھر آنا پڑا تھا اور اب تک گھر سے نکل نہیں سکا ہوں۔"

"کیسی مجبوری منظور حسین؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"جناب! میرے چھوٹے بیٹے رضوان کو کل رات سے بڑا تیز بخار ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اسے آج حکیم جی کو دکھانا تھا۔ اسی لیے میں کچھ جلدی ہی اس کمرے کی طرف چلا گیا تھا جہاں میرے گدھے بندھے ہوتے ہیں لیکن وہاں کی صورتِ حال نے تو مجھے بوکھلا کر رکھ دیا اور بچے کی بیماری تو اس افراتفری میں، میں اپنے بیٹے کی

بیماری کو بھی بھول گیا تھا...." وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"جب یاد آیا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف جانا کی لیے، یہاں ہماری ملاقات نہیں ہوسکی۔ میں نے گھر آ کر رضوان کو سنبھالا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اسے حکیم جی کو دکھا کر آیا ہوں۔"

"تمہارے بیٹے کی عمر کیا ہوگی؟" میں نے برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔

"رضوان ساڑھے پانچ سال کا ہے جناب!"

"اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ابھی تو کوئی خاص فرق نہیں ہے جی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "حکیم جی نے کہا ہے کہ شام تک انشاء اللہ! بخار اتر جائے گا۔"

"اللہ تمہارے بچے کو صحت دے۔" میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"جناب! یہ آج کل کے بچے کسی کی سنتے بھی تو نہیں۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "لاکھ چیختے چلاتے رہو لیکن مجال ہے جو والدین کی آواز ان کے کانوں تک پہنچے۔ آج کل تو ویسے بھی برسات کا موسم ہے۔ بارش میں نہاتے پھرتے ہیں اور بھیگے ہوئے کپڑوں ہی میں گھنٹوں گلیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ بخار نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا۔"

آخری جملہ منظور کمہار نے اس انداز میں ادا کیا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی سوال کر رہا ہو۔ میں نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "ہاں...... یہ بات تو ہے منظور حسین..." میں جلد ہی منظور حسین کو اصل موضوع کی طرف لے آیا اور پوچھا۔ "یہ تو بتاؤ، تم نے کھیتوں کے پاس صرف ایک کمرا کیوں ڈال رکھا ہے؟"

"جناب! دراصل، وہ میری زمین ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں آگے چل کر وہاں اپنے لیے ایک گھر تعمیر کرنے والا ہوں، گاؤں سے تھوڑا ہٹ کر۔ ابھی صرف ایک کمرا ہے جو میرے گدھوں کے کام آرہا ہے۔ انشاء اللہ! بہت جلد آپ اسی زمین پر میرا مکان بھی دیکھیں گے۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی منظور حسین!" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "تم نے اس کمرے میں دو گدھے باندھ رکھے ہیں لیکن اس ڈرم کا وہاں کیا کام ہے جس پر کھڑے ہو کر طاہر جندرا نے خود کو پھانسی پر لٹکایا ہے؟"

"جناب... یہ بات میری بھی سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں، وہ ڈرم کہاں سے آگیا؟"

"کیا مطلب؟" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ ڈرم تمہارا نہیں.....؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس ڈرم سے میرا کوئی تعلق نہیں۔"

طاہر جندرا نے اپنی گردن کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے جس ڈرم کا استعمال کیا تھا وہ درحقیقت تیل وغیرہ کے لیے استعمال ہونے والا ڈرم تھا۔ اس کی اندرونی دیواریں اور بیرونی حالت بتاتی تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ زیر استعمال نہیں رہا تھا۔

میں نے منظور حسین سے پوچھا۔ "اگر وہ ڈرم تمہاری ملکیت نہیں تو پھر وہ کہاں سے آگیا؟"

"جناب یہی تو وہ معما ہے جو ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔" وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ "رات کو جب میں اپنے گدھوں کو کمرے میں باندھ کر اپنے گھر کی طرف آیا تھا تو وہ ڈرم وہاں موجود نہیں تھا۔ صبح جب میں وہاں پہنچا تو اس ڈرم کو لڑھکا ہوا پایا۔ اب ایک ہی بات ہوسکتی ہے جناب......" اس نے لمحاتی توقف کیا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اور وہ بات یہ ہے کہ طاہر جندرا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے خود ہی اس ڈرم کو کہیں سے اٹھا لایا ہوگا۔"

"لیکن کہاں سے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میرے ذہن میں ایک عجیب سی الجھن سرسرا رہی تھی جیسے چھٹی حس چپکے چپکے سمجھا رہی ہو کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کہاں..... اور ..... کیا..... یہ واضح نہیں تھا بھی ذہن الجھن کا شکار ہو رہا تھا۔ یہ غیر معمولی احساس اس وقت سے میری سوچ کا ہم سفر تھا جب میں نے طاہر جندرا کو پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیکھا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس قوی اور قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔

منظور حسین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "جناب ادھر کھیتوں میں کچھ فاصلے پر ٹیوب ویل ہے۔ ٹیوب ویل والے کمرے میں تیل کے کئی ڈرم رکھے رہتے ہیں۔ کچھ بھرے ہوئے اور کچھ خالی۔ میرے خیال میں طاہر جندرا وہیں سے یہ ڈرم چرا کر لایا ہوگا۔"

"چرا کر لایا ہوگا یا اٹھا کر لایا ہوگا" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اپنے اس کمرے کو تالا کیوں نہیں لگایا... [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی مرضی ہو، وہ اس میں گھس جائے......؟''

''ایسی بات نہیں ہے جناب!'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ہمیشہ اس کمرے کو بند کر کے آتا ہوں۔ باقاعدہ دروازے کو کنڈی لگانے کے بعد اس پر تالا بھی چڑھاتا ہوں۔ میں نے کمرے کی ایک دیوار میں آہنی سلاخوں والی کھڑکی بھی بنوا رکھی ہے تاکہ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے ہوا کی آمد و رفت رہے اور وہاں بند ھے ہوئے گدھوں کی زندگی کے لیے کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ بغیر پٹ کی سلاخوں والی وہ کھڑکی آپ نے بھی دیکھی ہوگی۔''

''ہاں، دیکھی ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''منظور حسین! کیا پچھلی رات بھی تم نے اس کمرے کے دروازے پر کنڈی تالا وغیرہ لگایا تھا؟''

''جی ہاں، بالکل لگایا تھا۔'' اس نے پُروثوق انداز میں جواب دیا۔

''میں جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جب تم آج صبح اس کمرے کی طرف گئے تو وہاں کی صورتِ حال کیا تھی؟''

''جناب! مجھے بھی وہ دروازہ کھلا ہوا ہی ملا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''تالا وغیرہ غائب تھا۔ میں سمجھتا ہوں، طاہر جندرا نے دروازے کا تالا توڑ کر کہیں پھینک دیا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس نے خودکشی والی کارروائی کی ہوگی......!''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ''اگر سب کچھ ویسے ہی پیش آیا ہو جیسا تم بیان کر رہے ہو تو پھر یہ بات بھی یقینی ہے کہ طاہر جندرا نے بہت سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ واردات کی ہے۔ اس نے چند روز پہلے تمہارے معمولات اور کمرے کا بیرونی واندرونی جائزہ لیا ہوگا۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔

''کیا پچھلے دنوں تم نے اسے اپنے کمرے کے آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا؟''

''آپ کی بات دل کو لگتی ہے تھانیدار صاحب!'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولا۔ ''اس نے یقیناً ایسا ہی کیا ہوگا لیکن میں نے اسے اپنے کمرے کے آس پاس چکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔''

''تم نے جس ٹیوب ویل کا ذکر کیا ہے منظور حسین......!'' ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔ ''وہ کس کی ملکیت ہے؟''

''جناب! قلعہ معصوم شاہ کے سب سے بڑے زمیندار کا نام ہے برکت باجوہ...... لوگ انہیں ''چودھری صاحب'' بھی کہتے ہیں'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ٹیوب ویل باجوہ صاحب نے اپنے ڈیرے پر لگا رکھا ہے اور انہی کی ملکیت ہے۔ اس کے پانی سے وہ اپنی زمین کو سیراب کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو پانی بیچتے بھی ہیں۔''

ڈیرا اور ٹیوب ویل برکت باجوہ کی ملکیت تھا اور تیل والے خالی اور بھرے ڈرم اسی ٹیوب ویل والے کمرے میں رکھے ہوئے تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ طاہر جندرا وہ ڈرم اسی ڈیرے سے لے کر آیا ہو، چرا کر یا مانگ کر، اس کا فیصلہ ڈیرے پر موجود لوگوں کے بیان کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا۔ اسی سوچ کے تناظر میں، میں نے منظور کمہار سے پوچھا۔

''تم نے جس ڈیرے کا ذکر کیا ہے وہاں برکت باجوہ نے اپنے بندے بھی رکھے ہوں گے؟''

''جی ہاں، وہاں باجوہ صاحب کے دو بندے رہتے ہیں جو ڈیرے کا نظام اور ٹیوب ویل کے معاملات دیکھتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ان میں سے ایک کا نام امتیاز اور دوسرے کا ریحان ہے۔ باجوہ صاحب کا بیٹا بھی اکثر ادھر ڈیرے پر ہی نظر آتا ہے۔''

''کیا نام ہے، باجوہ کے بیٹے کا؟'' میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''ضیا...... ضیا باجوہ!'' منظور کمہار نے بتایا۔ ''ضیا بھی کبڈی میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔''

''کیا طاہر جندرا سے بھی زیادہ مہارت؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

میں آج صبح سے طاہر جندرا کا ذکر سن رہا تھا۔ کبڈی کے حوالے سے ہر شخص نے اس کی تعریف کی تھی لہٰذا میں نے برسبیل تذکرہ ضیا کے بارے میں بھی پوچھ لیا تھا۔ منظور کمہار نے جواب دیا۔

''نہیں جناب...... طاہر جندرا تو طاہر جندرا تھا...... کبڈی کے میدان میں کوئی اس کے برابر تو کیا، ثانی بھی نہیں ہوسکتا۔ قلعہ معصوم شاہ میں جندرا جیسا پھرتیلا اور صاف ستھرا کبڈی کا کھلاڑی کوئی اور کبھی پیدا نہیں ہوا......''

میں مزید دس پندرہ منٹ تک منظور کمہار سے سوال و جواب کرتا رہا پھر اس کے گھر سے نکل آیا۔ اب میرا ارادہ ٹیوب ویل والے ڈیرے کی طرف جانے کا تھا۔ منظور نے خلوصِ نیت سے پیشکش بھی کی کہ وہ میرے ساتھ چلتا ہے لیکن

میں نے یہ سوچتے ہوئے منع کر دیا کہ اس کا پانچ، ساڑھے پانچ سال کا بیٹا بخار میں تپ رہا ہے۔ اسے میری راہنمائی کرنے کے بجائے اپنے بیٹے کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ اس گاؤں میں ایک ہی برکت باجوہ تھا، ایک ہی ڈیرا تھا اور ایک ہی ٹیوب ویل تھا۔ اس ٹیوب ویل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے قطعاً کسی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

بارش تقریباً رک چکی تھی لیکن آسمان کا بنا ہوا منہ اس بات کا غماز تھا کہ کسی بھی وقت یہ رکنے والا سلسلہ دوبارہ شروع ہوسکتا ہے اور وہ بھی بڑے دھواں دھار اور خطرناک انداز میں......!

میں منظور کمہار کے گھر سے نکل کر کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے ٹیوب ویل کی جانب بڑھ رہا تھا کہ مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ جب سے میں قلعہ معصوم شاہ میں تھا، یہ احساس پہلے بھی ایک آدھ مرتبہ ہوا تھا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی مگر اس بار یہ احساس قوی تھا لہٰذا میں نے یکایک رک کر اپنے عقب میں دیکھا۔

مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر ایک شخص میرے پیچھے آ رہا تھا۔ مجھے اچانک رکتے دیکھ کر وہ بھی ٹھٹک کر رک گیا تھا۔ میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اس شخص کے چہرے کا جائزہ لیا اور وہاں مجھے اس بات کے واضح آثار نظر آئے جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ وہ بندہ خاصا الجھ کر رہ گیا تھا۔

وہ عام سی شکل صورت کا مالک ایک دیہاتی تھا۔ دراز قامت، گورا چٹا اور کاٹھی کا مضبوط۔ میں نے اس کی عمر کا تخمینہ تیس کے قریب لگایا۔ اس کو ٹھٹکتے دیکھ کر میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کون ہو تم اور...... میرا تعاقب کیوں کر رہے ہو؟''

''ن...... نہیں......'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ایسی...... تو کوئی بات...... نہیں جی......'' پھر وہ ایک ہاتھ اپنی پیشانی کی طرف لے جاتے ہوئے قدرے سنبھل کر بولا۔

''سلام تھانے دار صاحب......!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فوری طور پر میرے ذہن نے اس کے بارے میں یہ اندازہ قائم کیا۔

نمبر ایک...... وہ خاصا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ نمبر دو...... وہ مجھے تھانے دار کی حیثیت سے جانتا تھا۔ نمبر تین...... اس نے سلام کرنے کی آڑ میں میرے سوالات کے جوابات گول کر دیے تھے اور...... نمبر چار...... وہ باقاعدہ کسی خاص مقصد سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں تو پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ''اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ تم تعاقب تو میرا ہی کر رہے ہو......؟''

''وہ جی...... آپ اسے اتفاق سمجھ لیں۔'' وہ بڑی خوبصورتی سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''میں تو ادھر ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔''

''ڈیرے'' کے ذکر پر میں چونک اٹھا اور اسے کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم برکت باجوہ کے ڈیرے کی بات کر رہے ہو جہاں ٹیوب ویل بھی لگا ہوا ہے؟''

''جی...... جی ہاں......'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

''جی، میں تو ڈیرے پر ہی ہوتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں باجوہ صاحب کا ملازم ہوں جناب......!''

میرے ذہن میں منظور کمہار کی بات تازہ ہوگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ برکت باجوہ نے ڈیرے کا نظم و نسق چلانے کے لیے دو ملازم رکھے ہوئے تھے اور باجوہ کا اکلوتا بیٹا ضیا بھی اکثر و بیشتر ڈیرے پر ہی پایا جاتا تھا۔ منظور کمہار نے مجھے ان ملازمین کے نام بھی بتائے تھے۔

''تم ریحان ہو یا امتیاز......؟'' میں نے اپنے سامنے کھڑے دراز قامت شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میرا نام امتیاز ہے جناب......'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''آپ کو میرا نام کیسے پتا چلا جی......؟''

''صرف نام ہی نہیں، مجھے تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آؤ، ادھر ڈیرے پر ہی چل کر بات کرتے ہیں۔''

''کیا آپ ابھی ڈیرے کی طرف جا رہے تھے؟'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگے۔ اس مختصر سے ساتھ میں، میں نے امتیاز کا بھرپور انٹرویو کر ڈالا۔ مجھے پتا چلا کہ طاہر جندرا نے خودکشی والی واردات میں جو تیل والا ڈرم استعمال کیا تھا وہ ڈیرے ہی سے لے جایا گیا تھا۔ پچھلی رات بارش کے سبب امتیاز اور ریحان کو ڈیرے کے ایک کمرے کے اندر سونا پڑا تھا اور غلطی سے ہی...... گیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ ٹیوب ویل والے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے کا تو دروازہ ہی نہیں تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوں تو مذکورہ کمرا سیدھے ہاتھ پر پڑتا تھا۔ امتیاز نے مجھے بتایا کہ اسے اور ریحان کو بالکل پتا نہیں چلا کہ طاہر جندرا کب چپکے سے ڈیرے پر آیا اور کب وہ ڈرم چرا کر لے گیا۔ وہ ڈرم چونکہ خالی تھا اور فی الحال استعمال میں نہیں آرہا تھا لہٰذا صبح بھی ان کا اس طرف دھیان نہیں گیا۔ پھر جب طاہر جندرا کی خودکشی کی خبر عام ہوئی اور لوگوں نے اس کمرے کا رخ کیا جہاں یہ المناک واقعہ پیش آیا تھا تو پتا چلا کہ مذکورہ ڈرم برکت باجوہ کے ڈیرے سے تعلق رکھتا تھا۔ امتیاز ہی کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ برکت باجوہ کا بیٹا ضیا باجوہ اس وقت ڈیرے ہی پر موجود تھا۔

ہم بات چیت کرتے ہوئے ڈیرے پر پہنچ گئے۔

وہ ایک روایتی قسم کا ڈیرا تھا۔ ٹیوب ویل والے کمرے کے علاوہ نیچی چھتوں کے حامل تین مزید کمرے بھی وہاں موجود تھے جن میں سے ایک کمرے میں جانوروں کا خشک چارا اسٹاک کیا گیا تھا۔ دوسرے کمرے میں مختلف نوعیت کے آلات کھیتی باڑی اور زراعت کا دیگر سامان بھرا ہوا تھا جبکہ تیسرا کمرا دونوں ملازمین نے اپنے اٹھنے بیٹھنے اور رہنے سہنے کے لیے سیٹ کر رکھا تھا۔ ڈیرے کے وسیع و عریض صحن میں مال مویشی بھی نظر آرہے تھے اور چند دراز قامت درخت بھی ایستادہ تھے۔

برکت باجوہ کے بیٹے کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک وجیہہ و شکیل اور خوب رو جوان تھا تاہم قد میں تھوڑی مار کھاتا تھا۔ اس کی رنگت گندمی اور جسم کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔ اس نے خاصی صحت مند مونچھیں پال رکھی تھیں جن کا اسٹائل رستم زماں گاما پہلوان سے ملتا جلتا تھا۔

ریحان ایک پستہ قامت اور سانولا شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں عیاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں راستے میں امتیاز کا بھرپور انٹرویو کر چکا تھا۔ وہی سوالات میں نے ریحان سے بھی کیے اور کم و بیش اس نے بھی ویسے ہی جواب دیے جو اس سے پہلے امتیاز دے چکا تھا۔ اسی سلسلے میں، میں نے ضیا باجوہ سے بھی بات کی۔

رسمی علیک سلیک تو اسی وقت ہوگئی تھی جب میں ڈیرے میں داخل ہوا تھا اور یہ جان کر کہ میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں، میرے "نہ نہ" کرنے کے باوجود بھی ضیا نے امتیاز کو میری خاطر تواضع کا بندوبست کرنے بھیج دیا تھا۔ میں جب براہ راست ضیا باجوہ سے مخاطب ہوا تو ریحان بھی کمرے سے باہر نکل گیا۔

پہلے تو ضیا باجوہ نے اس واقعے پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ملک صاحب! مجھے جندرا کی موت کا سخت افسوس ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، ہماری کبڈی کی ٹیم کے سر سے سایہ اٹھ گیا ہو۔ جندرا کی کبڈی بڑی ستھری اور قابل تعریف تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کبڈی ٹیم میں کپتان کی حیثیت رکھتا ہوں لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے بہت آگے، بہت اوپر تھا۔''

''میں اب تک جس جس سے بھی ملا ہوں اس نے طاہر جندرا کی کبڈی کی تعریف ہی کی ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ اس نے خودکشی کیوں کی..... ابھی تک اس سلسلے میں کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگا۔''

''صحیح کہتے ہیں آپ.....!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''واقعی، جندرا کی موت ایک انوکھی بجھارت ہی بن کر رہ گئی ہے۔''

''باجوہ صاحب!'' میں نے ضیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو طاہر کے بہت قریب تھے۔ وہ آپ کی کبڈی ٹیم کا ایک ایسا ہونہار کھلاڑی تھا جس پر پورا قلعہ معصوم شاہ فخر کرتا تھا۔ آپ سے زیادہ اس کے معاملات کی خبر اور کس کو ہوگی؟''

''کون سے معاملات.....؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''عشق و محبت کے معاملات۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''جناب! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

میری چھٹی حس نے فوراً مجھے بتایا کہ وہ میری بات کا مطلب تو بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہے لیکن جانتے بوجھتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کر رہا ہے لہٰذا میں نے اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کھنے کی کوشش کی۔

''باجوہ صاحب! ہر انسان اپنی زندگی سے بہت محبت کرتا ہے۔ اگر کوئی خود ہی اپنی جان لے بیٹھے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ پتا نہیں وہ کن حالات سے مجبور ہو کر خود کو موت کے حوالے کرتا ہے۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب.....!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

اسی وقت امتیاز سامانِ خورد ونوش سے سجی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور ہمیں اپنی گفتگو کو عارضی بنیادوں پر روکنا پڑا۔

ضیا باجوہ نے اپنے ملازم سے پوچھا۔ ''امتیاز! باہر کا موسم کیسا ہے؟''

''بہت خوشگوار ہے باجوہ صاحب'' اس نے بتایا۔ ''بارش کافی دیر سے رکی ہوئی ہے اور ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی ہے۔ آسمان پر بادل بھی چھائے ہوئے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے۔'' باجوہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمارے بیٹھنے کے لیے باہر بندوبست کردو، کمرے کے اندر تو حبس ہورہا ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد میں اور باجوہ ڈیرے کے صحن میں، ایک دوسرے کے آمنے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ امتیاز نے ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی چوبی میز رکھ کر اس پر کھانے والی ٹرے سجادی۔ مذکورہ ٹرے میں پوریاں اور آم کا جوس آیا تھا۔ یہ بالکل دیہاتی اور دیسی قسم کا آم کا جوس تھا جو ایک مخصوص طریقے سے نکالا جاتا ہے۔ امتیاز ہمیں تنہائی فراہم کرتے ہوئے ڈیرے کے بیرونی گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ریحان بھی اس وقت ڈیرے سے باہر ہی تھا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا لہٰذا ہلکی ہلکی بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے نعمتِ خداوندی کے ساتھ انصاف جاری رکھتے ہوئے ضیا باجوہ کو اصل موضوع کی طرف لاکر پوچھا۔

''تو آپ میرے اس خیال سے مکمل اتفاق کرتے ہیں کہ کسی بہت بڑی مجبوری ہی کی بنا پر انسان خودکشی کا راستہ اپناتا ہے......؟''

''جی ہاں، یہ حقیقت ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اور آپ کی سمجھ کے مطابق طاہر جندرا کے ساتھ ایسی کون سی مجبوری تھی کہ اس نے خود کو ختم کرلیا؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ یقیناً وہ کوئی نہایت ہی اہم بات ہوگی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''باجوہ صاحب! میں نے اب تک جو تحقیق و تفتیش کی ہے اس کی روشنی میں طاہر جندرا کا کسی بھی لڑکی یا عورت کے ساتھ عشق و محبت کا کوئی معاملہ نہیں تھا جو سمجھا جائے کہ کسی ناآسودگی یا نامرادی کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے خودکشی کی ہو......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کی زندگی میں کوئی اور محرومی بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ وہ ایک خوش باش اور زندہ دل انسان تھا۔ جس شخص کو کسی بھی قسم کا کوئی روگ نہ ہو وہ بیٹھے بٹھائے یوں خوامخواہ خودکشی کیوں کرے گا؟''

''تھا اسے ایک روگ......'' ضیا باجوہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے بےساختہ اضطراری انداز میں پوچھا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ''ایک ایسا روگ جندرا کو لگ گیا تھا کہ وہ کسی سے اپنی تکلیف کا اظہار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی پریشانی صرف مجھے ہی پتا تھی۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بڑی تسلی دی تھی لیکن اس کے دل میں جیسے ایک وہم سا بیٹھ گیا تھا......!''

''کیسا وہم؟'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

''یوں سمجھیں ملک صاحب کہ لوہے کے جندرے کو زنگ لگنے لگا تھا......!''

''ضیا صاحب! بجھارتیں نہیں ڈالیں!'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کے دل اور ذہن میں جو کچھ بھی ہے کھل کر بیان کریں۔''

''آئندہ دس منٹ میں ضیا باجوہ نے وضاحت کردی۔

اس کے مطابق طاہر جندرا کی کبڈی کی صلاحیت نے زنگ پکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی کمزوری سے واقف ہوچکا تھا اور پریکٹس کے موقعے پر ایک دو مرتبہ جندرا کی یہ کمزوری ضیا باجوہ نے بھی پکڑ لی تھی۔ طاہر جندرا اس حوالے سے بےحد خوف زدہ ہوگیا تھا۔

''جناب! جندرا بہت ہی حساس اور جذباتی بندہ تھا۔'' اپنی وضاحت کے اختتام پر ضیا باجوہ نے بتایا۔ ''میں نے اسے سمجھایا تھا کہ کوئی بھی انسان ہمیشہ نمبر ون نہیں رہ سکتا۔ انسان کی صلاحیت اور کارکردگی میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ وہ فکر نہ کرے۔ میں خود اسے اپنے ساتھ پریکٹس کراؤں گا اور میں نے اسے پریکٹس کرائی بھی لیکن......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''لیکن کیا باجوہ......؟''

''لیکن جناب، حقیقت یہ ہے کہ میں صرف اسے پریکٹس کراسکتا تھا، تسلیاں دے سکتا تھا لیکن اس کے بزدلی سے مردہ ہوتے ہوئے خود پر اعتماد کا علاج نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یقین ہے...... سو فیصد یقین ہے کہ جندرا نے اپنے اس مسئلے سے دل برداشتہ ہوکر خودکشی کی ہے۔''

''ہوں......!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ بولا۔ ''جندرا کو کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی پٹ میں آیا ہوا کھلاڑی خود کو چھڑا کر نکل جائے یا یہ کہ جب وہ کبڈی ڈالنے جائے تو کوئی اس پر ہاتھ بھی رکھ سکے۔ اس کے بےحد جذباتی پن نے اس کے لیے انا کا مسئلہ کھڑا کردیا تھا اور یہ مسئلہ اس کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔''

وہ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''ایک منٹ کے لیے ہم فرض کرلیتے ہیں کہ طاہر جندرا نے ناکامی کے خوف سے دل برداشتہ ہوکر خود کو ختم کرڈالا ہے لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ اتنی آسانی سے تیل کا خالی ڈرم یہاں سے چرا کر لے گیا اور آپ کے ملازمین کو کانوں کان خبر نہ ہوئی؟ پھر یہ کہ اس کی پلاننگ میں ڈرم ہی کیوں شامل ہوا؟ وہ کسی اور شے پر چڑھ کر بھی تو پھانسی کے پھندے کو اپنی گردن میں فٹ کرسکتا تھا؟ میں اس کمرے سے ڈیرے تک کے فاصلے کو بھی جان گیا ہوں جہاں چھت سے لٹک کر اس نے جان دی ہے۔ اس نے آخر کس بنا پر ڈرم چرانے اور ڈیرے سے لڑھکا کر اتنی دور تک لے جانے کا رسک لیا؟! اگر وہ ڈرم چراتے ہوئے یا اسے لڑھکا کر لے جاتے ہوئے پکڑا جاتا تو......؟''

''دیکھیں ملک صاحب!'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ نے فرمایا تھا کہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی...... اور آپ نے دس سوالیہ باتیں کرڈالی ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ......''

''یہ دس سوالیہ باتیں دراصل ایک ہی بات کی شاخیں ہیں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر اس نے خودکشی کے بارے میں سوچ ہی لیا تھا تو اس کام کے لیے اتنا پیچیدہ طریقہ کار اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی جس میں سراسر پکڑے جانے کا اندیشہ کسی ننگی تلوار کے مانند ہر لمحہ سر پر لٹکتا رہے......؟''

''جناب! ان تمام سوالات کے جوابات تو صحیح معنوں میں جندرا ہی دے سکتا تھا جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے مشاورت کے بعد خودکشی کا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ مجھے اس کے ارادے کی خبر ہو۔ ہاں البتہ......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''البتہ...... جہاں تک میرے ملازموں کی کوتاہی اور عدم توجہی کا تعلق ہے تو میں نے صبح سے لے کر اب تک تین چار مرتبہ انہیں بری طرح جھڑکا ہے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ ہونے والی بات ہوکر ہی رہتی ہے...... چاہے اس کا بہانہ کسی کی کوتاہی اور بےپروائی بنے یا کسی کا ظلم اور زیادتی...... میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا ملک صاحب!''

اس بات سے میں بھی متفق تھا کہ ہونے والی بات کو کوئی نہیں روک سکتا اور یہ بات بھی طے تھی کہ اس قسم کی صورتِ حال پیش آجائے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا جو کہ ضیا باجوہ اس سلسلے میں کہہ چکا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈیرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے کیس کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ خودکشی کا نہیں بلکہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس تھا......!

مذکورہ رپورٹ کے مطابق طاہر جندرا کی موت وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ خوراک کی مدد سے ایک زود اثر زہر اس کے معدے میں پہنچا تھا جس نے چند سیکنڈ میں کبڈی کے ایک عظیم الشان کھلاڑی کی زندگی کا چراغ گل کردیا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور سنسنی خیز انکشاف یہ تھا کہ جب طاہر کو پھانسی کے پھندے سے لٹکایا گیا، وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا تھا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ طاہر جندرا نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ ایک گہری سازش کے تحت اسے زہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور بعدازاں اس کی لاش کو پھانسی دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ طاہر جندرا نے خودکشی کی ہے۔ اب میں نے جانا کہ شروع ہی سے میری چھٹی حس غیر محسوس انداز میں مجھے کیوں تنبیہہ کررہی تھی کہ اس واقعے میں کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ طاہر جندرا کا قاتل کون ہے......؟

یہ خاصا گمبھیر سوال تھا جس نے اس کیس کو پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ بنادیا تھا۔ میری اب تک کی تفتیش کے مطابق طاہر کا کوئی دشمن منظرِ عام پر نہیں آسکا تھا۔ یہی صورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حال میرے لیے الجھن کا باعث تھی۔ اس نوعیت کا سنگین اقدام کوئی دوست تو اٹھا نہیں سکتا تھا۔

میں نے طاہر جندرا کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش اللہ رکھا کے حوالے کرنے سے پہلے اس سے چند سوالات پوچھنا ضروری سمجھے۔

''اللہ رکھا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نے مجھے بتایا تھا کہ وقوعہ کی رات گھر کے تمام افراد نے ایک ساتھ مل کر کھانا کھایا تھا اور اس کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے تھے.....؟''

''جی ہاں، میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور یہی حقیقت بھی ہے۔''

''تم صبح جب سو کر اٹھے تو طاہر کا بستر خالی پڑا تھا۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''تم یہی سمجھے کہ وہ ورزش وغیرہ کے لیے نکلا ہوا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد واپس آجائے گا؟''

''میں نے یہی سوچا تھا جناب!'' وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن وہ واپس نہیں آیا بلکہ اس کی موت کی خبر.....'' اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے استفسار کیا۔ ''اللہ رکھا! کیا تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ آدھی رات کو کوئی اسے بلانے نہیں آیا تھا؟''

''اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آتا تو جناب، میں آپ کو ضرور بتاتا۔'' وہ زخمی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ آدھی رات کے حوالے سے یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، تمہارے بیٹے کی موت وقوعہ کی رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ بھی جان لو کہ یہ خودکشی والا معاملہ نہیں.....!''

''جی.....!'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں اللہ رکھا!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''طاہر جندرا کو زہر دے کر موت کی وادی میں دھکیلا گیا ہے اور اس کی موت کے بعد پھانسی پر لٹکا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمہارے بیٹے نے خودکشی کی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور طاہر کے معدے کے لیبارٹری ٹیسٹ نے زہر سے موت واقع ہونے کی تصدیق کی ہے۔ تمہارے بیٹے کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت باقاعدہ قتل کیا گیا ہے۔''

''ایسا کس نے کیا ہے..... اس کا تو کوئی دشمن بھی نہیں تھا.....؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''اسی بات کا تو پتا چلانا ہے.....'' میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔ ''اور میں بہت جلد اس کا پتا چلا لوں گا۔''

وہ ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگا۔

میں نے کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لیے دو چار مزید ضمنی سوالات کیے۔ ''اللہ رکھا! وقوعہ کی رات تمہارے گھر میں کیا پکا تھا؟''

''سالن روٹی اور گڑ والے چاول بنے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''سالن کس چیز کا تھا؟''

''آلو مینگن کا۔''

''تم سب لوگوں نے ایک ہی کھانا کھایا تھا نا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''اور کھانا کھانے کے بعد حسبِ معمول سو گئے تھے؟''

''جی ہاں.....'' اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے آخری سوال کیا۔ ''وقوعہ کی رات آپ لوگوں نے لگ بھگ کتنے بجے کھانا کھایا تھا؟''

''یہی.. کوئی آٹھ بجے.....'' اس نے بتایا۔

میں نے طاہر جندرا کی لاش اللہ رکھا کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اطمینان سے اپنے بیٹے کی تدفین وغیرہ سے فارغ ہولو۔ میں بعد میں تمہارے پاس آؤں گا۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر تاسفی انداز میں کہا۔

''یہ زہر والی بات میں نے صرف تمہیں بتائی ہے۔ گاؤں میں کسی اور کو اس کی بھنک نہیں پڑنا چاہیے ورنہ تمہارے بیٹے کا قاتل محتاط ہو جائے گا۔ میں اسے چپ چاپ پکڑنا چاہتا ہوں۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اس کے گھر سے نکل آیا۔

کھانے کے حوالے سے میں نے اللہ رکھا سے جو سوالات کیے تھے وہ احتیاط کا تقاضا تھا ورنہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں واضح طور پر لکھا تھا کہ ایک سریع الاثر زہر نے طاہر جندرا کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اگر اس کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ موت سے چند منٹ

پہلے اسے زہر دیا گیا تھا، گویا..... رات کا کھانا اس کی موت کا سبب نہیں تھا۔

☆☆☆

طاہر جندرا کی تدفین سے اگلے روز ایک نوجوان مجھ سے ملنے تھانے آیا۔ اس نے اپنا نام آفتاب بتایا لیکن فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آسکا کہ وہ کون سا آفتاب ہے۔ یہی سوال جب میں نے اس سے کیا تو وہ رنجیدہ لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! میں طاہر جندرا کا دوست ہوں۔ آج ہی شیخوپورہ سے واپس آیا ہوں۔ اللہ رکھا نے آپ سے میرا ذکر کیا ہوگا.....!''

مجھے فوراً یاد آگیا کہ اللہ رکھا نے طاہر جندرا کے ایک گہرے دوست کا تذکرہ کیا تھا جو اپنے چاچا کے پاس شیخوپورہ گیا ہوا تھا۔

''اچھا..... تو تم وہ آفتاب ہو!'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار صاحب! یہ سب کیا ہوگیا!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''میں تو طاہر جندرا کو بھلا چنگا چھوڑ کر گیا تھا.....؟''

''یہ جو کچھ بھی ہوا ہے، بہت ہی افسوس ناک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کیس کو حل کرنے کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے آفتاب کیونکہ میری معلومات کے مطابق قلعہ معصوم شاہ میں طاہر جندرا سب سے زیادہ تمہارے قریب تھا۔''

آفتاب کی عمر پچیس کے آس پاس تھی۔ وہ چھوٹے قد اور متناسب بدن کا مالک تھا۔ رنگت گوری اور بائیں بازو میں مہین سا ٹیڑھ تھا، بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ''ٹیڑھ'' کبڈی کے کھیل کا تحفہ تھا۔ ڈاکٹر کی غفلت نے جوڑ صحیح طور پر نہیں بٹھایا تھا جس کے نتیجے میں اس کے بائیں بازو میں لنگ سا پیدا ہوگیا۔ آفتاب کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں اور شکل وشباہت کی بنا پر پہلی نظر میں وہ میجر عزیز بھٹی شہید دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جس پر میں اعتماد کر سکتا تھا۔

آفتاب نے میری بات کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''طاہر جندرا میرا سچا دوست تھا جناب۔ آپ تعاون کی بات کر رہے ہیں۔ اس کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے.....''

''تمہارے پُرخلوص جذبات ہیں اپنے دوست کے لیے۔'' میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن فی الحال تمہاری جان کی ضرورت نہیں۔ اگر تم اپنے سارے کام چھوڑ کر میری مدد کے لیے تیار ہو جاؤ تو طاہر جندرا کے لیے یہ تمہاری سب سے بڑی قربانی ہوگی۔''

''جی حکم کریں.. مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

یہ چیک کرنے کے لیے کہ اللہ رکھا نے زہر والی بات آفتاب سے شیئر کی ہے یا نہیں، میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا تم جانتے ہو، طاہر جندرا کی موت کس طرح واقع ہوئی ہے؟''

''اس نے پھانسی لگا کر خود کو ختم کر لیا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''یعنی اس نے خودکشی کی ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں، میں نے یہی سنا ہے۔''

''اور تم نے یقین بھی کر لیا؟''

''نہیں!'' اس نے بڑی شدت سے گردن کو نفی میں جھٹکا۔ ''یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوئی۔''

''مجھے بھی ہضم نہیں ہوئی تھی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے طاہر جندرا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجا تھا.....''

اس نے ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''پھر جناب! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا بتاتی ہے؟''

''اس رپورٹ کے مطابق تمہارے دوست کو ایک خطرناک زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''یہ خودکشی کا نہیں بلکہ قتل کا کیس ہے.....''

''طاہر کو کس نے زہر دیا ہوگا.....؟'' وہ تشویش ناک انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہی تو مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہاری مدد اور راہنمائی مجھے طاہر جندرا کے قاتل تک پہنچا سکتی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔

''تمہارے خیال میں طاہر کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟''

وہ گہری تشویش میں ڈوب گیا۔

میں نے اس کی مشکل کو آسان کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میری تحقیق کے مطابق طاہر نے وقوعہ کی رات اپنے گھر والوں کے ساتھ حسبِ معمول رات کا کھانا کھایا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سونے کے لیے لیٹ گیا۔ آدھی رات کو وہ گھر سے نکلا۔ وہ خود نکلا یا کسی نے اسے بلایا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال، وہ گھر والوں کو بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔ وہ جن لوگوں کے پاس پہنچا انہوں نے اسے ایک خطرناک زہر کھانے کی کسی شے میں ملا کر دیا جس سے جھٹ پٹ اس کی موت واقع ہوگئی۔ بعدازاں انہی لوگوں نے منظور حسین کمہار کے کمرے میں طاہر کو پھانسی پر لٹکا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے خودکشی کی ہے حالانکہ درحقیقت انہوں نے طاہر جندرا کی لاش کو پھانسی دی تھی......"

"آپ نے بار بار 'انہی لوگوں' کا ذکر کیا ہے۔" میرے خاموش ہونے پر آفتاب نے سوال کیا۔ "کیا آپ کے خیال میں وہ کئی افراد تھے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، طاہر کے ساتھ جو کچھ پیش آیا ہے وہ اکیلے آدمی کے بس کا کام نہیں۔ ایک لاش کو پھانسی پر لٹکانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!" وہ سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاہر کا اتنا خطرناک دشمن کون ہوسکتا ہے؟"

"تم طاہر جندرا کے سب سے گہرے دوست ہو۔" میں نے آفتاب کی غلافی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لہٰذا اس کے دشمن کی نشاندہی بھی تمہیں کرنا ہوگی......" میں نے تھوڑی دیر رک کر ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اب تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح یہ مت کہہ دینا کہ طاہر جندرا کا کوئی دشمن ہی نہیں تھا۔ سب لوگ اسے چاہتے تھے، اس کے پرستار تھے اور عقیدت کی حد تک اس سے محبت کرتے تھے......وغیرہ وغیرہ!"

"جناب! حقیقت تو یہی ہے لیکن......!"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر طاہر کوزہر دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے تو یقیناً یہ اس کے کسی دشمن ہی کا کام ہوسکتا ہے۔"

"بالکل......!" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ہمیں اسی نقطے پر غور کرتے ہوئے طاہر کے قاتل تک پہنچنا ہے۔"

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں ضیا باجوہ کی کہی ہوئی ایک بات چمکی۔ اس نے طاہر جندرا کی خودکشی کا ٹھوس جواز پیش کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ وہ ان دنوں اپنی کبڈی کی کم ہوتی ہوئی صلاحیت سے سخت پریشان تھا۔ اسے اس بات کا خوف تھا کہ اگر کبڈی کے میدان میں کسی مرحلے پر اس کی ہتک ہوگئی تو یہ اس کے زندہ درگور ہونے کے مترادف ہوگا۔ وہ کسی بھی قیمت پر شکست کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے آج تک کامیابی کے سوا اور کسی شے کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ ناکامی اس کے لیے موت کا دوسرا نام تھا لہٰذا اسی خوف سے طاہر نے خودکشی کرلی تھی کہ سیکڑوں پرستاروں کے سامنے شکست کھا کر ذلت کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ چپ چاپ خاموشی سے خودکشی کرلی جائے۔

یہ وہ توجیہہ تھی جو ضیا باجوہ نے طاہر جندرا کی خودکشی کے ذیل میں دی تھی لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے ثابت کردیا تھا کہ طاہر جندرا نے خودکشی نہیں کی۔ یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس تھا۔ میرے جی میں آئی کہ میں طاہر جندرا کی تیزی سے کم ہوتی کبڈی کی صلاحیت کے بارے میں آفتاب سے بھی تصدیق کرلوں۔

"آفتاب! تم بھی تو کبڈی کے بڑے ستھرے اور پھرتیلے کھلاڑی ہو۔" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں طاہر کے ساتھ پریکٹس وغیرہ کا بھی اتفاق ہوتا رہتا تھا؟"

"کیوں نہیں جناب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ہم نے ہمیشہ مل کر ہی پریکٹس کی ہے بلکہ ہم تو روزانہ ہی ایسی مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو تیاری کروانے کے لیے ہم نئے نئے داؤ پیچ کا استعمال کرتے تھے تاکہ مقابلے میں کسی کمی یا کمزوری کا احساس نہ ہو۔"

"تم نے آخری مرتبہ طاہر کے ساتھ کب پریکٹس کی تھی؟"

"شیخوپورہ جانے سے ایک روز پہلے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اس سے پہلے تم روزانہ اس کے ساتھ پریکٹس کرتے رہے ہو؟"

"جی ہاں بالکل۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ "لیکن آپ اس بات پر اتنی تشویش...... کیوں کررہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے آفتاب!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "تمہیں بہت سوچ کر میرے سوالات کے جوابات دینا ہیں تاکہ میں جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔"

"جی...... پوچھیں جناب!" وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا طاہر جندرا صرف تمہارے ساتھ ہی کبڈی کی پریکٹس کیا کرتا تھا یا اس کام کے لیے وہ پارٹنر تبدیل کرتا رہتا تھا؟"

"کسی ٹورنامنٹ سے پہلے تو ہم سب لوگ مل کر پریکٹس کیا کرتے تھے۔" آفتاب نے بتایا۔ "لیکن عام دنوں میں سب اپنے اپنے طور پر تیاری جاری رکھتے تھے۔ ہم سب نے اپنا جوڑا بنا رکھا تھا۔ جیسے میرا اور طاہر جندرا کا جوڑا......"

"کیا ابھی حال ہی میں کبڈی کا کوئی ٹورنامنٹ ہونے والا تھا؟"

"نہیں جناب۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ایک ماہ پہلے ہی تو ہم ٹورنامنٹ جیت کر آئے ہیں۔ اگلا ٹورنامنٹ دسمبر میں ہوگا۔"

"گویا آج کل آپ لوگ ایک ساتھ مل کر نہیں بلکہ جوڑوں کی شکل میں محنت کررہے ہو؟" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "گزشتہ ٹورنامنٹ میں طاہر جندرا کی کارکردگی کیسی رہی تھی؟"

"نمبرون......!" اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ "بلکہ یہ ٹورنامنٹ ہم نے اسی کی وجہ سے جیتا تھا۔ اس کی کارکردگی مثالی اور نمایاں رہی تھی۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔ "میرا پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ کیا اس دوران میں تم نے اس کی کبڈی میں کسی کمی یا کمزوری کو محسوس کیا، اسے کسی فکر یا پریشانی میں مبتلا دیکھا؟"

"نہیں جناب، بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "آپ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور پوچھا۔ "کیا اس ایک ماہ کے دوران میں طاہر جندرا نے ضیا باجوہ کے ساتھ مل کر بھی کبڈی کی پریکٹس کی تھی؟"

"اس ایک ماہ میں کیا، طاہر نے تو کبھی بھی ضیا کے ساتھ پریکٹس نہیں کی تھی۔" آفتاب نے بڑے وثوق سے بتایا۔ "ضیا باجوہ کی تو اپنی کبڈی بس ایویں سی ہے، وہ طاہر کو پریکٹس کرا سکتا تھا۔ وہ چونکہ گاؤں کے چوہدری صاحب کا بیٹا ہے اسی لیے اسے ٹیم کا کپتان بھی بنا دیا گیا ہے۔ ہم سب کھلاڑی اسے کپتان کی حیثیت سے برداشت کرنے پر مجبور ہیں ورنہ اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے۔"

آفتاب کی وضاحت نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔

"تھانیدار صاحب! کیا بات ہے۔" آفتاب نے پوچھا۔ "آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟"

جواب میں، میں نے اسے ضیا باجوہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔

"میں سمجھ گیا جناب، اس نے ایسی بات کیوں کی ہے......" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

"کیوں کی ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔" وہ رازدارانہ انداز میں بولا۔

میں نے تجسس آمیز انداز میں پوچھا۔ "کون سی دو وجوہات؟"

"نمبر ایک......!" وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ "ضیا کی کبڈی چونکہ واجبی سی ہے اس لیے وہ طاہر کی ماہرانہ صلاحیت سے حسد کرتا ہے۔ اسے اس بات کی بھی جلن ہے کہ ٹیم کا کپتان ہونے کے باوجود بھی وہ فن کے میدان میں طاہر سے بہت پیچھے ہے۔ اسی جلن اور رقابت میں وہ طاہر کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن اس صفائی کے ساتھ کہ کسی کو اس کی نیت بلکہ بدنیتی کا پتا نہ چلے جیسا کہ اس نے آپ کو بتایا ہے۔ اس نے طاہر کی خودکشی کا جواز بیان کرتے ہوئے اپنے حاسدانہ جذبات کا اظہار بھی کردیا۔"

"اس غلط بیانی پر میں اس سے ضرور بازپرس کروں گا۔" میں نے پرعزم انداز میں کہا۔ "اب تم دوسری وجہ کی وضاحت کرو؟"

"دوسری وجہ بھی حسد اور رقابت ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن اس کا سبب کبڈی نہیں......!"

"پھر کیا سبب ہے؟" میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

"غزالہ!"

اس کے یک لفظی جواب نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "غزالہ...... یہ کون ہے؟"

"غزالہ، ضیا باجوہ کے چاچا کی اکلوتی بیٹی ہے اور ادھر لاہور میں رہتی ہے۔" آفتاب نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "غزالہ کے ساتھ اس کی منگنی بھی ہوچکی ہے اور اگلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال ان کی شادی ہونے والی ہے۔''

''لیکن ضیا کی منگیتر کا طاہر جندرا کے ساتھ کیا واسطہ؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم نے ضیا کے حسد اور رقابت کا حوالہ کیوں دیا ہے؟''

''جناب قصہ کچھ یوں ہے کہ.....'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ایک ماہ پہلے والے جس کبڈی ٹورنامنٹ کا ذکر کیا ہے نا، وہ یہاں قلعہ معصوم شاہ ہی میں منعقد ہوا تھا اور اتفاق سے ان دنوں لاہور سے غزالہ بھی آئی ہوئی تھی۔ کبڈی ٹورنامنٹ کو گاؤں والے بڑے ذوق وشوق اور جوش وجذبے سے دیکھتے ہیں، اس میں مرد وزن اور بچے بوڑھے کی کوئی تفریق نہیں بلکہ تماشائی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے الگ سے تنبو (ٹینٹ) لگا کر بیٹھنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس ٹورنامنٹ کو غزالہ نے بھی دیکھا تھا اور طاہر جندرا کی پھرتیوں نے اس کے حواس اور جذبات پر اپنی محبت کا جندرا لگا دیا۔ وہ اس گبرو جوان پر بری طرح مرمٹی تھی.....!''

''اوہ.....!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''تو یہاں یہ پیچ پڑا ہوا ہے.....''

''غزالہ جب تک قلعہ معصوم شاہ میں رہی، طاہر کی کبڈی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی اور اس کا یہ عمل ضیا کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ اسی دوران میں غزالہ نے کوشش کر کے طاہر جندرا سے ایک دو ملاقاتیں بھی کر لی تھیں اور طاہر کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے بلکہ اس نے طاہر کو اپنی پسندیدگی کے طور پر ایک انگوٹھی بھی دی تھی۔ طاہر چونکہ مجھ سے اپنا ہر معاملہ بیان کر دیتا تھا لہٰذا اس نے غزالہ اور اس کی انگوٹھی والی تمام کہانی بھی مجھے سنا ڈالی تھی۔''

''کیا ضیا کو اپنی منگیتر کی اس جرأت کا علم تھا؟'' آفتاب خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

''انگوٹھی اور طاہر سے ملاقاتوں کا تو شاید اسے علم نہ ہو۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن وہ غزالہ کے تیور دیکھ کر بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ گنگا کس سمت بہنے لگی ہے۔''

''ہوں.....!'' میں نے گمبھیر انداز میں ہنکارا بھرا پھر پوچھا۔ ''کیا طاہر نے تحفے والی انگوٹھی تمہیں بھی دکھائی تھی؟''

''جی ہاں، دکھائی تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''طاہر نے بتایا تھا کہ غزالہ کے مطابق یہ انگوٹھی وہ ضیا کے لیے لائی تھی لیکن طاہر کی کبڈی سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس انگوٹھی کا اصلی حقدار اس کی نظر میں طاہر جندرا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔''

''وہ کس قسم کی انگوٹھی تھی۔'' میں نے پوچھا۔ ''مجھے اس کی ساخت وغیرہ کے بارے میں بتاؤ؟''

''وہ سونے کی مردانہ انگوٹھی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ساخت بس، ویسی ہی تھی جیسی عام طور پر انگوٹھیاں ہوتی ہیں۔''

''میں نے جب طاہر جندرا کی لاش کو پھانسی کے پھندے سے نکال کر پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھجوایا تھا تو اس کی کسی انگلی میں مجھے کوئی انگوٹھی نظر نہیں آئی تھی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جناب! طاہر بہت ہی محتاط اور شرمیلا بندہ تھا۔'' آفتاب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''اس نے ایک دن بھی وہ انگوٹھی نہیں پہنی بلکہ وہ اس انگوٹھی اور غزالہ کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔''

''پریشان کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا کہنا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔'' آفتاب نے جواب دیا۔ ''اس نے غزالہ کے اصرار پر وہ انگوٹھی تو لے کر اپنے پاس رکھ لی تھی لیکن وہ کئی مرتبہ اس انگوٹھی کو واپس کرنے اور غزالہ کو سمجھانے کے بارے میں مجھ سے کہہ چکا تھا۔ اس بزدلی پر میں نے اس کا مذاق بھی اڑایا تھا اور کہا تھا کہ جب غزالہ دوبارہ گاؤں آئے گی تو وہ خود اس سلسلے میں اس سے بات کر لے.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! طاہر جندرا ہرگز ہرگز بزدل نہیں تھا۔ یہ اس کی شرافت تھی کہ وہ غزالہ کی بیباکی کے سامنے گویا بچھ کر رہ گیا تھا۔ ایسے کاموں کا اسے کبھی تجربہ نہیں رہا تھا۔ وہ عشق ومحبت والے معاملات سے بہت دور رہتا تھا۔''

''ہاں، مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اللہ رکھا نے اس کے شرمیلے پن کی تفصیل مجھے بتائی ہے۔''

''جناب! میرا ذہن تو کسی اور ہی انداز میں سوچ رہا ہے۔'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا اور متذبذب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تمہارا ذہن کس انداز میں سوچ رہا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ سر سہلاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہیں طاہر جندرا کی موت میں ضیا باجوہ کا تو ہاتھ نہیں.....؟''

''تمہارے سوچنے کا انداز مجھے پسند آیا۔'' میں

زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔''

''لیکن ضیا باجوہ پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''کیوں؟'' میں نے استعجابیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کیا ضیا باجوہ کسی چھلاوے کی اولاد ہے.....؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب.....!'' وہ بوکھلا گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟''

''وہ جناب.....'' وہ قدرے سہمے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ضیا اس گاؤں کے چودھری صاحب کا بیٹا ہے۔ ان لوگوں کا اپنا اثر رسوخ ہے اور.....''

''تم نے ابھی تک قانون کی طاقت نہیں دیکھی آفتاب!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے ان چھوٹے موٹے چودھریوں کے اثر رسوخ سے مرعوب ہو۔ میں نے بڑے بڑے سورماؤں اور پھنے خانوں کو نتھ ڈالی ہے۔ تم دیکھتے جاؤ، میں اس چودھری زادے کے ساتھ کیا کرتا ہوں.....'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ضیا کو گھیرنے کے لیے میں ایک چھوٹا سا گیم کروں گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ کس خطرناک جال میں قدم رکھ چکا ہے۔ میں شاطر مجرموں پر کچا ہاتھ ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔ انہیں بڑے طریقے سلیقے سے قابو کرتا ہوں۔ یہاں بھی میں ایک نفسیاتی چال چلوں گا اور بے خیالی میں ضیا آگے بڑھتا چلا آئے گا پھر میں اسے ٹھوس ثبوت کے ساتھ گرفتار کر کے اس کی زبان سے حقیقت اگلوا لوں گا۔''

''پھر تو ٹھیک ہے جناب!'' وہ قدرے اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''لیکن اس کھیل کے لیے مجھے تمہاری معاونت کی ضرورت ہوگی۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔''

''ویری گڈ.....!''

☆☆☆

جب کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پیش نظر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ یا تو وہ کسی ایسی بات کو چھپانے کی کوشش میں ہوتا ہے جو آگے چل کر اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہونے والی ہو یا پھر وہ اس جھوٹ کے توسط سے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھانے کی تگ ودو میں ہوتا ہے، بہرحال..... یہ بات طے ہے کہ جھوٹ چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو، یہ مجرمانہ فعل ہی کہلائے گا کیونکہ بعض اوقات ایک معمولی سا جھوٹ بھی بہت بڑی قیامت برپا کر دیتا ہے۔

آفتاب کے بیان سے یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ طاہر جندرا کی گرتی ہوئی فنی صلاحیت کے بارے میں ضیا باجوہ نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا اور منظور حسین کمہار کے کمرے میں ضیا باجوہ کے ڈیرے سے تعلق رکھنے والے، تیل کے خالی ڈرم کی موجودگی بھی اسی جانب اشارہ کرتی تھی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ضیا باجوہ اس معاملے میں کتنا ملوث تھا۔

اگلے روز میں علی الصباح مقتول طاہر جندرا کے گھر پہنچ گیا۔ اللہ رکھا سے ملاقات پر میں نے اسے بتایا کہ میں طاہر کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ اس نے میری بات پوری توجہ سے سنی اور بولا۔

''اس کے سامان میں ایسی کون سی خاص شے ہو سکتی ہے جناب؟''

''یہ تو سامان کو دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔'' میں نے کہا۔

وہ کوئی سوال کیے بغیر چپ چاپ مجھے گھر کے اس کمرے میں لے گیا جو طاہر جندرا کے استعمال میں رہا کرتا تھا پھر ایک جستی ٹرنک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''طاہر کا سارا سامان اسی ٹرنک میں رکھا رہتا تھا۔''

میں نے مذکورہ ٹرنک کھول کر اندر کا جائزہ لیا۔ اس میں طاہر جندرا کے کپڑے بھرے ہوئے تھے یا پھر چھوٹا موٹا سامان تھا۔ میں نے پورا ٹرنک کھنگال ڈالا اور بالآخر کپڑوں کے نیچے رکھی (چھپا کر) اس طلائی انگوٹھی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جو ضیا باجوہ کی منگیتر غزالہ نے طاہر جندرا پر فریفتہ ہونے کے بعد تحفے میں نشانی کے طور پر دی تھی۔

اللہ رکھا میرے ہاتھ میں وہ انگوٹھی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس کے بیٹے کے سامان میں سے اس قسم کی کوئی شے بھی برآمد ہو سکتی ہے۔ لرزتی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے جناب؟''

''سونے کی انگوٹھی ہے.....'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ ''لیکن یہ طاہر کے سامان میں کس طرح پہنچی..... میں نے تو کبھی اس کے پاس ایسی انگوٹھی نہیں دیکھی تھی.....؟''

''یہ انگوٹھی ایک حسینہ نے طاہر کو اپنی محبت کی نشانی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طور پر دی تھی۔'' میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اس نے محبوبہ کی اس نشانی کو ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا تھا اس لیے تمہیں کبھی اس کے پاس نظر نہیں آئی۔''

''مجھے تو اس انگوٹھی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یہ یقین نہیں آرہا کہ طاہر نے عشق و عاشقی والا کوئی چکر پال رکھا تھا۔'' وہ کبھی طلائی انگوٹھی کو اور کبھی مجھے دیکھ رہا تھا۔ ''میرا بیٹا ایسا تو ہرگز نہیں تھا۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں اللہ رکھا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''واقعی، یہ کام طاہر چندرا کے بس کا تھا بھی نہیں۔ وہ تو بہت ہی شرمیلا اور سیدھا سادا انسان تھا۔ یہ لڑکی خود ہی اس کے پیچھے پڑ گئی تھی اور زبردستی اس بے چارے کو طلائی انگوٹھی کا تحفہ بھی دے دیا۔''

''کون ہے وہ؟'' اللہ رکھا نے بآوازِ بلند سوال کیا۔

اس وقت اتفاق سے وہ گھر میں اکیلا ہی تھا۔ کلثوم اور اس کی بیٹی عابدہ، طاہر کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان گئی ہوئی تھیں۔ میں نے اللہ رکھا کے سوال کے جواب میں بتایا۔

''اس لڑکی کا نام غزالہ ہے......!''

''غزالہ؟'' اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے پھر متذبذب لہجے میں اس نے کہا۔ ''ہمارے گاؤں میں تو اس نام کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو اللہ رکھا!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''غزالہ کا تعلق قلعہ معصوم شاہ سے نہیں۔''

''تو پھر......؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

''غزالہ لاہور کی رہنے والی ہے۔''

''پر طاہر تو کبھی لاہور گیا ہی نہیں......!'' اللہ رکھا کی حالت دیدنی تھی۔

''طاہر تو لاہور نہیں گیا لیکن غزالہ مہینا، ڈیڑھ مہینا پہلے یہاں قلعہ معصوم شاہ آئی تھی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اس نے طاہر کی کبڈی کے کمالات دیکھے اور اس پر عاشق ہوگئی پھر... محبت کی نشانی کے طور پر، یہ انگوٹھی اسے دے کر واپس لاہور چلی گئی۔''

''جناب! آپ جو کچھ بھی بتا رہے ہیں، اس کا مجھے یقین تو نہیں آرہا لیکن ظاہر ہے، آپ بھی غلط کیوں کہیں گے۔'' وہ بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''اتنا تو بتا دیں کہ غزالہ یہاں کس کے گھر آئی تھی؟''

''چودھری برکت باجوہ کے گھر......!'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''ک...ک...کیا......؟'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔

''ہاں اللہ رکھا......!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''غزالہ، چودھری برکت باجوہ کی بھتیجی اور ضیا باجوہ کی منگیتر ہے۔ اگلے سال غزالہ اور ضیا کی شادی ہونے والی ہے۔''

''او خدایا......!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ''یہ کیا غضب ہوگیا۔ چودھری برکت باجوہ تو......''

''کچھ نہیں ہوگا اللہ رکھا!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے جوان جہان بیٹے کی جان چلی گئی۔ اس سے زیادہ تمہارے ساتھ اور کیا زیادتی ہوگی۔ اللہ رکھا! مجھے یقین ہے کہ طاہر چندرا کو غزالہ والے معاملے ہی کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے لیکن تم فکر نہ کرو...... میں بہت جلد قاتل کو گرفتار کرلوں گا۔''

اللہ رکھا کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''اگر اس واردات میں چودھریوں کا ہاتھ ہوا تو......؟''

''تو کیا اللہ رکھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جناب! میں بہت غریب آدمی ہوں۔'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ''بہت کمزور ہوں میں۔ میں چودھری کی طاقت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''تمہیں مقابلہ کرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں تو پتا بھی نہیں کہ پولیس کس نوعیت کی کارروائی میں مصروف ہے۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ طاہر چندرا نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے زہر دے کر قتل کیا گیا ہے۔ تم تو اپنے بیٹے کی تدفین کے بعد غمزدہ اور دکھی ہو کر گھر میں بیٹھے ہوئے ہو۔ تم نے کسی کی شکایت نہیں کی۔ پولیس جو کچھ بھی کرتی پھر رہی ہے، اس کی تمہیں مطلق خبر نہیں...... تم میری بات تو سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تھانیدار صاحب! آپ کتنے اچھے ہیں، آپ نے تو میرے دل و دماغ کا سارا بوجھ اتار دیا ہے۔''

''بس، تمہیں اسی طرح غمزدہ اور بے خبر بنے رہنا ہے۔ تم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے کہ تمہارے بیٹے نے خودکشی کی ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''باقی کے تمام معاملات تم مجھ پر چھوڑ دو...... اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ اگر میں نے طاہر چندرا کے قاتل کو عبرت ناک انجام سے دوچار نہ کیا تو میرا نام بھی ملک صفدر حیات نہیں......!''

وہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں اس کے گھر سے نکل کر تھانے پہنچا اور اے ایس آئی سلیمان شاہ کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ اس دوران میں ہلکی پھلکی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔

سلیمان شاہ کو مجھ سے بہت ساری شکایات تھیں۔ مثلاً یہ کہ میں اس کا اور اس کی صلاحیتوں کا استحصال کر رہا ہوں۔ اسے کام کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ اسے بے کار اور فضول کاموں پر لگائے رکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کی ترقی ہو لہٰذا اسے کوئی بھی اہم مشن نہیں سونپتا وغیرہ وغیرہ۔ اسی حوالے سے اس نے ایک دوبار اعلیٰ افسران سے بھی اپنا دکھڑا رو یا تھا لیکن کہیں سے بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی تھی۔ اس ناکامی سے اس نے یہ پروپیگنڈا شروع کردیا تھا کہ میں نے اس کے خلاف اوپر تک کان بھر رکھے ہیں۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔

سلیمان شاہ کی اس بدگمانی کا میرے پاس کوئی علاج تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اس کی کوئی خاص پروا کی تھی۔ میں اگر اسے اہم ذمے داریاں نہیں سونپتا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ میں اس کی صلاحیتوں اور کارکردگی سے بخوبی آگاہ تھا۔ میں اچھے خاصے بنتے ہوئے کام کو بگاڑنے کا ہرگز کوئی شوق نہیں رکھتا تھا لہٰذا اسے اس کی اوقات میں رکھتے ہوئے ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا، وہ چودھری برکت باجوہ کے نمک خواروں میں سے تھا اسی لیے مجھے ایک شرارت سوجھی تھی۔ اسی شرارت کے ذیل میں، میں نے سلیمان شاہ کو اپنے پاس بلایا تھا۔

میں نے ہمیشہ اس بات کو سخت ناپسند کیا تھا کہ میرے عملے کا کوئی آدمی تھانے سے زیادہ کسی اور کا نمک خوار اور وفادار ہو۔

سلیمان شاہ نے میرے کمرے میں آکر مجھے سلام کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی اس عادت سے بھی مجھے چڑ تھی کہ اسے آرام کی پڑی رہتی تھی۔ جہاں بھی کوئی خالی کرسی دیکھتا، کھٹک سے بیٹھ جاتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وجہ بات چاہے کچھ بھی کیوں نہ رہی ہو، ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت بیزار اور تنگ تھے۔

''شاہ جی! میں نے آپ کے لیے ایک مشن نکالا ہے۔'' میں نے سلیمان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اس میں کامیاب ہوگئے تو سمجھیں آپ کی ترقی پکی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے، آپ کو سب انسپکٹر بنا کر کسی تھانے میں انچارج مقرر کردیا جائے۔''

اس زمانے میں عملے کی کمی کے باعث سب انسپکٹر کے عہدے کے لوگوں کو بھی تھانیدار بنا دیا جاتا تھا۔ چھوٹے گاؤں دیہات میں یہ چلن عام دیکھنے کو ملتا تھا۔

میری مبہم سی پیش کش پر اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور متذبذب لہجے میں پوچھا۔ ''کون سا مشن ہے جناب؟''

''قلعہ معصوم شاہ سے ایک بندے کو گرفتار کرکے تھانے لانا ہے......''

''کس بندے کو؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

قبل مسیح

سن عیسوی سے کہیں زیادہ مشکل ان تاریخوں کا یاد رکھنا ہے جن کے بعد میں قبل مسیح آتا ہے۔

اس لیے کہ یہاں مؤرخین گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ذہنی ''شیرش آسن'' کرنا پڑتا ہے جو اتنا ہی دشوار ہے جتنا الٹے پہاڑے سنانا، اس کو طالب علموں کی خوش قسمتی کہیے کہ تاریخ قبل میلادِ مسیح نسبتاً مختصر اور ادھوری ہے۔

اگرچہ مؤرخین کوشاں ہیں کہ جدید تحقیق سے بے زبان بچوں کی مشکلات میں اضافہ کردیں۔ بھولے بھالے بچوں کو جب بتایا جاتا ہے کہ روم کی داغ بیل 753 قبل مسیح میں پڑی تو وہ ننھے منے ہاتھ اٹھا کر سوال کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کیسے پتا چل گیا کہ حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے میں 753 سال باقی ہیں؟ ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ 753 ق۔م کو ساتویں صدی شمار کریں یا آٹھویں۔ عقل مند استاد ان جاہلانہ سوالات کا جواب عموماً خاموشی سے دیتے ہیں، آگے چل کر جب یہی بچے پڑھتے ہیں کہ سکندر 350 ق۔م میں پیدا ہوا اور 323 ق۔م میں فوت ہوا۔ تو وہ اسے کتابت کی غلطی سمجھتے ہوئے استاد سے پوچھتے ہیں کہ یہ بادشاہ پیدا ہونے سے پہلے کس طرح مرا؟ استاد جواب دیتا ہے کہ پیارے بچو! اگلے وقتوں میں ظالم بادشاہ اسی طرح مرا کرتے تھے۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب چراغ تلے سے اقتباس

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''ضیا کو......'' میں نے دھماکا کیا۔ ''ضیا باجوہ کو......!''

''چودھری برکت باجوہ کے بیٹے کو......؟'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں تصدیق چاہی۔

''ہاں ہاں...... میں اسی باجوہ کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ ضیا باجوہ کا نام سن کر پریشان کیوں ہو گئے ہیں۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''مسئلہ تو کوئی نہیں جناب!'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ باجوہ صاحب کو کس جرم میں گرفتار کر کے لانا ہے؟''

''اس کے جرائم کی ایک لمبی فہرست ہے میرے پاس۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''آپ یہ بتاؤ شاہ جی...... کہ ضیا باجوہ کو گرفتار کرنے جا رہے ہو یا نہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر معنی خیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کے لیے ترقی کرنے کا آخری موقع ہے...... اب فیصلہ کرنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

چند لمحات کے تذبذب کے بعد وہ مریل سی آواز میں بولا۔ ''جاتا ہوں جناب......''

جب اے ایس آئی سلیمان شاہ میرے کمرے سے رخصت ہو گیا تو حوالدار محفوظ علی میرے پاس چلا آیا۔ میں نے سلیمان کو جس مشکل میں ڈالا تھا وہ راز محفوظ علی کو بھی معلوم تھا۔ اس نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا شاہ جی ضیا باجوہ کو گرفتار کر کے لے آئیں گے؟''

محفوظ علی بہت ہی جی دار اور کام کا بندہ تھا۔ میرے عملے کا سب سے زیادہ قابلِ بھروسا شخص وہی تھا۔ میں ہر نازک معاملہ اس سے شیئر کیا کرتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''شاہ جی کی محکمہ جاتی قابلیت پر ہم دونوں میں اتفاق رائے پایا جاتا ہے لہٰذا میرا حتمی جواب یہ ہے کہ...... ہرگز ہرگز نہیں۔ سلیمان شاہ ایک ایسا کھوتا ہے جسے صرف گھاس کھانے سے مطلب ہوتا ہے۔ یہ ضیا باجوہ کو گرفت میں لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ دو کام کرے گا۔''

میں نے لمحاتی توقف کیا تو حوالدار سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''نمبر ایک۔ یہ بندہ (اے ایس آئی) تھوڑی دیر باہر گھوم پھر کر خالی ہاتھ واپس آ جائے گا اور آ کر بتائے گا کہ تلاش کے باوجود بھی ضیا باجوہ کہیں نظر نہیں آیا۔ شاید وہ قلعہ معصوم شاہ سے کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ نمبر دو...... یہ سیدھا اسے والدِ محترم ولی نعمت چودھری برکت باجوہ کے پاس پہنچے گا او اسے جا کر بتائے گا کہ تھانیدار صاحب اس کے بیٹے ضیا باجو کو گرفتار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لہٰذا وہ اپنے بیٹے کو بچانے کوئی بندوبست کر لیں۔''

''ان دونوں صورتوں میں ہمیں کیا کرنا ہے؟'' حوالدار نے پوچھا۔

''وہی جو ہمارا اصل منصوبہ ہے۔'' میں نے کہا ''سلیمان شاہ کے تھانے سے نکلتے ہی بلکہ کوشش کرو کہ اس سے پہلے ہی قلعہ معصوم شاہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور پہلی فرصت میں ضیا باجوہ کے ڈیرے پر موجود دونوں ملازمین کو گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔ ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا سلیمان شاہ کو تمہاری جاملہ اور آمد کی خبر نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں ملک صاحب'' حوالدار نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''جب امتیاز اور ریحان تھانے جائیں گے تو ان کے ساتھ ہم وہی نفسیاتی ٹریٹ منٹ کریں گے جو ہم نے طے کر رکھا ہے۔''

حوالدار محفوظ علی مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

محفوظ علی سے اس سلسلے میں میری تفصیلی گفتگو ہو چکی تھی۔ ہم ضیا باجوہ کو چھیڑنے کے بجائے اس کے بندوں کی ''ٹرائی'' کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود ہی ان کے پیچھے بھاگا آتا۔ تھوڑی دیر بعد میرے تھانے میں ایک ڈراما اسٹیج ہونے والا تھا جس کا ایک کردار آفتاب بھی تھا۔ اس کی انٹری بڑی ڈرامائی تھی۔ میں نے اسے اس کا رول اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔

مجھے ننانوے فیصد یقین تھا اور جیسا کہ نظر بھی آ رہا تھا کہ طاہر چندرا کی موت میں ضیا باجوہ کا ہاتھ شامل تھا۔ اس نوعیت کے کام چودھری، وڈیرے اور دوسرے طاقتور لوگ عموماً اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے بلکہ اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعے کراتے ہیں۔ میں نے چند روز پہلے ڈیرے پر امتیاز اور ریحان سے ملاقات کی تھی تو ان کے رویے میں خاصا کھنچاؤ اور احتراز پایا تھا، پھر اس پر ضیا باجوہ کا جھوٹ اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ طاہر چندرا کی موت میں یہ تینوں افراد کسی نہ کسی طور ضرور ملوث تھے۔ یہ کیسا اتفاق تھا کہ وقوعہ کی رات وہ لوگ غلطی سے ڈیرے کا بیرونی دروازہ بند کرنا بھول گئے اور طاہر وہاں سے تیل کا خالی ڈرم چرا کر منظور حسین کمہار کے کمرے تک لڑھکاتا ہوا لے گیا اور انہیں کوئی خبر ہی نہ ہوئی...... کیا کوئی ایسے اہتمام سے بھی خودکشی کیا کرتا ہے......

☆☆☆

منظر میرے کمرے کا تھا اور ڈرامے کا آغاز ہو چکا تھا۔

امتیاز میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی کیونکہ ٹرائل روم سے اس کے ساتھی ریحان کے بلبلانے اور چلانے کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں۔ چند منٹ پہلے ہی حوالدار محفوظ ان دونوں شکروں کو گرفتار کر کے لایا تھا اور میں نے ریحان کو حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''پہلے اسے ٹرائی کرو۔ امتیاز کی باری بعد میں آئے گی......!''

اور حوالدار اس وقت تفتیشی کمرے میں ریحان کی ''ٹرائی'' کر رہا تھا۔ دراصل، حوالدار کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ یہ چیخنے چلانے، ڈکرانے اور بلبلانے کی آوازیں ایک کانسٹیبل کی تھیں جو مختلف آوازوں کی نقالی کا ماہر تھا۔ یہ سارا صوتی ڈراما امتیاز کو متاثر کرنے کے لیے رچایا گیا تھا۔

چند لمحات کے بعد اذیت اور کرب میں ڈوبی ہوئی وہ آوازیں ابھرنا بند ہو گئیں۔ پھر خطرناک تیوروں کے ساتھ حوالدار کمرے میں داخل ہوا اور چٹانی لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! ملزم نے زبان کھول دی ہے۔ وہ اپنے جرم کا اقرار کرنے کے لیے تیار ہے۔ آپ اس کا اقبالی بیان لے لیں۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا پھر امتیاز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اب تم اسے بھی لے جاؤ اپنے ساتھ......!''

امتیاز نے دہشت زدہ نظروں سے باری باری مجھے اور حوالدار کو دیکھا پھر خوشامد بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''تھانیدار صاحب میں حوالدار کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں تنہائی میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ ریحان کی مصنوعی آہ و بکا اور دلخراش چیخوں نے اس کا پتا پانی کر دیا تھا۔ وہ کسی ٹرائل سے گزرے بغیر ہی اقبالِ جرم کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری نفسیاتی چال ابتدا ہی میں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی۔

میں نے حوالدار کو آنکھوں ہی آنکھوں میں چند اشارے کیے پھر امتیاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم ادھر میرے کمرے ہی میں بیٹھو۔ جو لوگ پولیس سے تعاون کرتے ہوئے سچ بولتے ہیں ہم انہیں ایک تھپڑ بھی نہیں مارتے۔'' پھر میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''تم یہاں رک کر امتیاز کی نگرانی کرو، میں ابھی ریحان کا بیان لے کر آتا ہوں، پھر اس سے بھی بات ہوگی...... اور ہاں، اس کے ساتھ کوئی مار پیٹ نہیں کرنا۔'' آخری جملہ میں نے بڑے ذو معنی انداز میں ادا کیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ پروگرام کے اگلے حصے پر فوراً عمل ہونا چاہیے۔

میں دوسرے کمرے میں ریحان کے پاس پہنچا ہی تھا کہ تیسرے کمرے سے ''امتیاز'' کے ڈکرانے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ امتیاز کی نہیں بلکہ اداکار کانسٹیبل کی آوازیں تھیں۔ حوالدار نے میری ہدایت کے مطابق اسے دوبارہ ''متحرک'' کر دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی جو ''آوازیں'' ابھری تھیں، وہ بھی یقیناً ریحان نے سنی ہوں گی۔

ریحان نے بے حد سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے جناب......؟''

''تفتیش ہو رہی ہے۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہارے ساتھی امتیاز کی درد میں ڈوبی ہوئی آوازیں ہیں۔ اس کے بعد تمہاری باری آئے گی۔ ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔''

''للل...... لیکن...... ہمارا قصور کیا ہے......؟'' وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ تو تم لوگ اپنی زبان سے خود ہی بتاؤ گے......!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں تھوڑی دیر تک مختلف انداز میں ریحان کو خوف و ہراس میں مبتلا کرتا رہا۔ اس دوران میں ''امتیاز'' کے رونے، بلکنے اور بلبلانے کی آوازیں مسلسل ابھرتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔ اگلے ہی لمحے حوالدار محفوظ علی میرے پاس پہنچ گیا، اس اطلاع کے ساتھ۔

''ملک صاحب! ملزم امتیاز نے زبان کھول دی ہے۔ وہ اپنے جرم کا اعتراف کرنے کو تیار ہے، آپ اس کا اقبالی بیان ریکارڈ کر لیں......''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں امتیاز کا بیان لیتا ہوں۔ تم ذرا اس کو بھی چیک کر لو۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے انگلی سے ریحان کی جانب اشارہ کیا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قدموں میں گر گیا پھر فریادی لہجے میں بولا۔ ''جناب! آپ مجھ سے تفتیش نہ کریں۔ میں کسی مار پیٹ کے بغیر ہی اپنے جرم کا اقرار کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے!'' میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ریحان کا خیال رکھو۔ میں امتیاز کا بیان قلم بند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے بعد اس کا بیان لوں گا۔"

اس کے بعد میں نے ضیا باجوہ کے دونوں ڈشکروں کے ساتھ ایک جیسی چال چلی۔ امتیاز کے پاس آ کر میں نے اسے بتایا کہ ریحان نے اقرار کر لیا ہے کہ تم دونوں نے ضیا باجوہ کے ایما پر طاہر جندرا کو پہلے زہر دے کر ہلاک کیا پھر اس کی لاش کو پھانسی پر لٹکا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ امتیاز نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو نہ صرف اقبالِ جرم کر لیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ وہی طاہر جندرا کو گھر سے بلا کر ڈیرے پر لایا تھا کہ باجوہ صاحب کو اس سے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔ میں امتیاز کے پاس سے اٹھا اور ریحان کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ امتیاز نے طاہر جندرا کو گھر سے بلا کر ڈیرے پر لانے اور پھر زہر دے کر ہلاک کرنے کا اقرار کر لیا ہے۔ اس قتل میں تم بھی اس کے ساتھی تھے۔ اب بتاؤ کہ تم کیا کہتے ہو؟"

ریحان کی ہمت تو پہلے ہی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اقبالِ جرم کے علاوہ اس نے اس بات کا بھی اقرار کر لیا کہ انہوں نے یہ کام ضیا باجوہ کے حکم پر کیا تھا اور..... یہ حقیقت وہ عدالت میں کھڑے ہو کر بیان کرنے کو بھی تیار ہے۔

میں نے باری باری دونوں کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ان کے انگوٹھے لگوائے اور انہیں حوالات کے دو مختلف کمروں میں بند کر دیا۔ ان کا ایک جگہ رہنا ٹھیک نہیں تھا ورنہ میری چالاکی کا راز کھل جاتا۔ ویسے مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ میری چال کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ وہ مجرم تھے، انہوں نے جرم کا ارتکاب کیا تھا اور اپنے اس سنگین جرم کا حلفیہ اقبال بھی کر لیا تھا، کسی ٹرائل سے گزرنے کے بعد یا اس سے پہلے..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

امتیاز اور ریحان کے اقبالِ جرم کے تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی سلیمان شاہ حسبِ توقع خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ میں نے اس کی لٹکی ہوئی صورت دیکھ کر پوچھا۔

"شاہ جی! کیا رہا؟"

"وہ جناب....." وہ لنگڑی وضاحت پیش کرتے ہوئے بولا۔ "ضیا باجوہ صاحب تو گاؤں سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ ویسے میں نے بڑے باجوہ صاحب، چودھری برکت کو بتا دیا ہے کہ ضیا باجوہ کو ملک صاحب تھانے میں بلا رہے ہیں۔"

"اور آپ کو یقین ہے، ضیا جیسے ہی واپس آئے گا....." میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تو برکت باجوہ اسے کان سے پکڑ کر تھانے پہنچا دے گا؟"

"انہوں نے وعدہ تو کیا ہے جی۔" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔

میں سمجھ گیا..... یا تو وہ موضع قلعہ معصوم شاہ گیا ہی نہیں تھا اور یا پھر وہ وہاں پہنچ کر باجوہ اینڈ کمپنی کو "اطلاعات" فراہم کر آیا تھا۔ اس کی کارکردگی زیادہ دیر چھپنے والی نہیں تھی لہٰذا میں نے بڑے میٹھے انداز میں طنز کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! آپ کے پھیرے نے بڑا کام دکھایا ہے۔ چودھری برکت باجوہ نے اپنے ڈیرے کے ملازمین امتیاز اور ریحان کو تھانے بھیج دیا تھا۔ میں نے ان سے کڑی پوچھ گچھ کر کے حوالات میں بند کر دیا ہے۔ میں خوامخواہ ضیا باجوہ کو قصوروار سمجھ رہا تھا۔ اصل مجرم تو یہی دونوں بندے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک طاہر جندرا کے قتل کا اعتراف تو نہیں کیا لیکن جب میں انہیں خطرناک تفتیش سے گزاروں گا تو وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے اسی تیکھے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کرو شاہ جی۔ میں آپ کی ترقی کے لیے ضرور سفارش کروں گا۔ آپ نے کوشش تو پوری کی ہے نا۔ اب اگر ضیا باجوہ گاؤں میں موجود ہی نہیں تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے.....!"

وہ ندامت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا تاہم منہ سے کچھ نہ بولا۔ شام سے ذرا پہلے سلیمان شاہ کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔ چودھری ضیا باجوہ اپنے دو حواریوں کے ہمراہ سجے سجائے تانگے میں بیٹھ کر تھانے پہنچ گیا۔ وہ خاصا غصے میں دکھائی دیتا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس وقت آفتاب بھی تھانے میں موجود تھا۔ اس ڈرامے میں اس کا بھی ایک اہم کردار تھا۔ میں نے آفتاب کو فی الحال ضیا کے سامنے نہیں آنے دیا اور ضیا باجوہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حوالدار محفوظ علی چونکہ اس گیم میں میرا ہم راز تھا اور اس کا کردار ایک پیش کار کا سا تھا لہٰذا وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ کب کس مہرے کو آگے بڑھانا ہے۔ وہ بدستور میرے کمرے میں موجود تھا۔

میں نے ضیا باجوہ پر بالکل یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہاں اب تک کیا ہو چکا ہے اور مزید کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اسے اور اس کے باڈی گارڈز کو عزت سے بٹھایا اور ان کے تاثرات کے پیشِ نظر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"خیریت تو ہے باجوہ صاحب! آپ پہلی مرتبہ تھانے آئے ہیں اور وہ بھی اتنے غصے میں؟"

"ملک صاحب! آپ نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ مجھے مجبوراً آپ کے پاس آنا پڑا....." وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کے اعتماد اور جارحانہ انداز سے مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت پیش نہ آئی کہ سلیمان کے توسط سے یہ اطلاع اس تک پہنچ گئی ہے کہ میں طاہر جندرا والے کیس میں اسے بے قصور سمجھتا ہوں جب ہی وہ بے خوف و خطر مجھ سے ملنے تھانے چلا آیا تھا۔ میں نے سلیمان شاہ کو دانستہ یہ بھی بتایا تھا کہ امتیاز اور ریحان نے اپنے جرم کا اقرار نہیں کیا تاکہ ضیا باجوہ غائب ہونے کے بجائے انہیں چھڑانے فوراً تھانے پہنچ جائے اور بالکل ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ ضیا بے چارے کو پتا نہیں تھا کہ اس نے تھانے میں قدم رکھ کر خود کو کتنی بڑی مصیبت میں پھنسا لیا تھا۔

"میں نے ایسا کون سا کام کر دیا ہے باجوہ صاحب؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"آپ نے طاہر جندرا کے قتل کے الزام میں میرے دو بندوں کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

"الزام میں نہیں باجوہ صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میرے پاس ان کے جرم کا ثبوت بھی ہے۔"

"ثبوت!" اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ یہ انکشاف اس کے لیے خلافِ توقع تھا، اضطراری لہجے میں اس نے پوچھا۔ "کس قسم کا ثبوت.....؟"

"اس قسم کا ثبوت.....!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے میز کی دراز کھول کر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ باہر نکالی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"باجوہ صاحب! میں جانتا ہوں، انگریزی میں تحریر کردہ یہ رپورٹ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی لہٰذا میں ہی آپ کو اس کا مفہوم بتاتا ہوں۔ یہ طاہر جندرا کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے اور اس رپورٹ کے مطابق اس جوان رعنا کو وقوعہ سے رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا اور بعد میں اس کی لاش کو پھانسی پر لٹکا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ طاہر جندرا نے خودکشی کی ہے۔"

"جندرا نے خودکشی کی تھی یا اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔" وہ رعب جمانے والے انداز میں بولا۔ "اس کی موت سے میرے بندوں کا کیا تعلق؟"

"تعلق..... تعلق..... تعلق.....!" میں نے اس کے جارحانہ استفسار کا برا منائے بغیر معتدل انداز میں دہرایا پھر دراز میں ہاتھ ڈال کر طلائی انگوٹھی برآمد کر لی اور اسے ضیا باجوہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہے تعلق جناب باجوہ صاحب.....!"

طلائی انگوٹھی کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے شناسائی کی جھلک دیکھی، اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "یہ انگوٹھی آپ کو کہاں سے ملی.....؟"

"کیا آپ اس انگوٹھی کو پہچانتے ہو؟" میرے لہجے میں سختی شامل ہونے لگی۔

"نن..... نہیں.....!" وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔ "مم..... میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ اس انگوٹھی..... سے یہ کیسے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہر جندرا کی موت کے ذمے دار میرے بندے ہیں.....؟"

اس نے جی کڑا کر کے مجھ سے سوال تو کر لیا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے اندر بڑی خوفناک ٹوٹ پھوٹ جاری تھی اور اس شکست و ریخت کے آثار اس کے چہرے اور آنکھوں میں بڑے واضح نظر آ رہے تھے۔

میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "یہ انگوٹھی مجھے طاہر جندرا کی جامہ تلاشی کے دوران میں ملی تھی۔ بعد میں، میں نے اس انگوٹھی کے حوالے سے تفتیش کی تو پتا چلا کہ اسے لاہور کے انارکلی بازار کے ایک جیولرز کی دکان سے خریدا گیا تھا۔" میں بڑے منطقی انداز میں غلط بیانی کر کے حقائق کو اجاگر کر رہا تھا۔ یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا۔ اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔

"میں انارکلی بازار کے جیولر کے پاس پہنچ گیا۔ جب میں نے اسے یہ انگوٹھی دکھا کر پوچھا کہ اس کے خریدار کا نام بتاؤ تو اس نے غزالہ نامی ایک لڑکی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ غزالہ کے باپ کی اسی بازار میں گھڑیوں وغیرہ کی دکان ہے۔ میں اس دکان پر پہنچ گیا اور وہاں جا کر میں نے غزالہ کے باپ رحمت باجوہ سے ملاقات کی اور تبھی یہ بات میرے علم میں آئی کہ رحمت باجوہ تو تمہارا چاچا ہے اور غزالہ تمہاری منگیتر۔ اگلے سال تم لوگوں کی شادی ہونے والی ہے۔"

اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری اس وضاحت کے جواب میں کیا بولے، بالآخر بے حد سٹپٹاتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

"لل..... لیکن یہ انگوٹھی..... جندرا کے پاس کیسے پہنچی.....؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''غزالہ نے اسے دی..... اس لیے پہنچی......!''

ضیا نے خفت بھرے انداز میں باری باری اپنے حواریوں کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''غزالہ نے یہ انگوٹھی...... اسے کیوں دی تھی؟''

''اس لیے دی تھی کہ......'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہ وہ جندرا کو دل و جان سے پسند کرنے لگی تھی۔ یہ انگوٹھی جندرا کے لیے غزالہ کی محبت کا تحفہ تھی۔ وہ انگوٹھی لائی تو تمہیں دینے کے لیے تھی لیکن کبڈی ٹورنامنٹ میں طاہر جندرا کی کارکردگی نے اس کا دل موہ لیا اور اس کی محبت کا دھارا تمہاری طرف سے مڑ کر جندرا کی جانب بہنے لگا۔ اس نے واپس لاہور جانے سے پہلے تنہائی میں جندرا سے ایک دو ملاقاتیں بھی کیں......''

''یہ جھوٹ ہے!'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ چیخ سے مشابہ لہجے میں بولا۔ ''سراسر بکواس......!''

''کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ......'' میں نے اس کے طیش اور برہمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دوٹوک انداز میں پوچھا۔ ''تمہیں غزالہ اور جندرا کے معاملے کا علم ہوگیا تھا اور اسی لیے تم نے ایک سازش کے تحت جندرا کو اپنی راہ سے ہٹایا ہے؟''

''میں نے...... جندرا کو......!'' وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''میں جندرا سے دشمنی کیوں کروں گا...... پتا نہیں، آپ کیا الٹی سیدھی باتیں کررہے ہیں......؟''

''جب انسان چشم پوشی اور ڈھٹائی کے توسط سے خود کو بچانے کی کوشش کررہا ہو تو اسے ہر معقول اور سیدھی بات الٹی ہی نظر آتی ہے۔ اس میں تمہارا کچھ زیادہ قصور نہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس خارج کی۔ پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ تم غزالہ کے جھکاؤ کے باعث جندرا کے دشمن ہوگئے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمہارے بندوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہے۔ میں ان کے اقبالی بیانات قلم بند کرچکا ہوں کہ کس طرح انہوں نے تمہارے حکم پر پہلے طاہر جندرا کو گھر سے بلا کر ڈیرے پر پہنچایا اور کھانے کی کسی شے میں ایک خطرناک زہر کھلا کر اسے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کے لیے اس کی لاش کو پھانسی دے دی گئی۔ یہ ظلم اور زیادتی تمہارے کہنے پر کی گئی تھی ضیا باجوہ، طاہر جندرا کی موت کے ذمے دار صرف اور صرف تم ہو۔ امتیاز اور ریحان نے تو تمہارے حکم کی تعمیل کی تھی اور بنتے ہو، مجھے تم پر کیسے شک ہوا؟''

میں نے رک کر سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ مریل سی آواز میں بولا۔ ''کک...... کیسے؟''

''تمہارے جھوٹ کی نقاب کشائی کے بعد!'' میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا پھر حوالدار محفوظ علی کو ایک مخصوص اشارہ کرنے کے بعد دوبارہ ضیا باجوہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے طاہر جندرا کی کبڈی کی صلاحیتوں کے زوال کے حوالے سے مجھے بتا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے شکست اور ناکامی کے خدشے کے پیش نظر، دل برداشتہ ہوکر خودکشی کی تھی مگر آفتاب کی زبانی مجھے پتا چل گیا کہ جندرا تو ہمیشہ کبڈی کی پریکٹس اس کے ساتھ کیا کرتا تھا اور یہ کہ...... اس کی کارکردگی، پکڑ، جکڑ، پھرتی اور صلاحیت میں ذرا بھی کمی یا کمزوری واقع نہیں ہوئی تھی۔ تم نے یہ جھوٹ اپنے جرم کی پردہ پوشی کے لیے بولا تھا نا......؟''

میں نے اس کے فرار کے تمام راستے مسدود کردیے تو وہ جھرجھراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آ...... فتا...... ب......!''

اسی لمحے حوالدار، آفتاب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر ضیا باجوہ کا رنگ مزید اڑ گیا۔ میں نے حوالدار سے کہا۔ ''محفوظ علی! ذرا حوالاتیوں کو بھی یہاں لے آؤ تاکہ باجوہ صاحب کو اقبال جرم کرنے میں کسی دقت یا تکلیف کا سامنا نہ ہو۔''

اس کے بعد میرے کمرے میں جس قسم کی قانونی کارروائی ہوئی ہوگی، اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس، اتنا سمجھ لیں کہ ایک گھنٹے کی گرماگرمی اور نرمانرمی کے بعد میں نے ضیا باجوہ کی جان اس وقت چھوڑی جب اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا۔

مجھ سے جان چھوٹنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے اسے اور اس کے معاونین کو حوالۂ عدالت کردیا تھا جہاں سے لمبی سزائیں پاکر چھوٹنے کے بعد وہ تینوں سیدھے جیل چلے گئے۔

اس کیس میں تفتیش کے نام پر ایک تھپڑ تک مارنے کی نوبت پیش نہیں آئی تھی۔ ماربیٹ اور مختلف ٹرائل کے بغیر کرائے جانے والے ''اقبالِ جرم'' کو عدالت بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور عوام بھی اس عمل کو لائق تحسین جانتے ہیں۔

یہ کیس بھی کچھ اسی نوعیت کا ثابت ہوا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

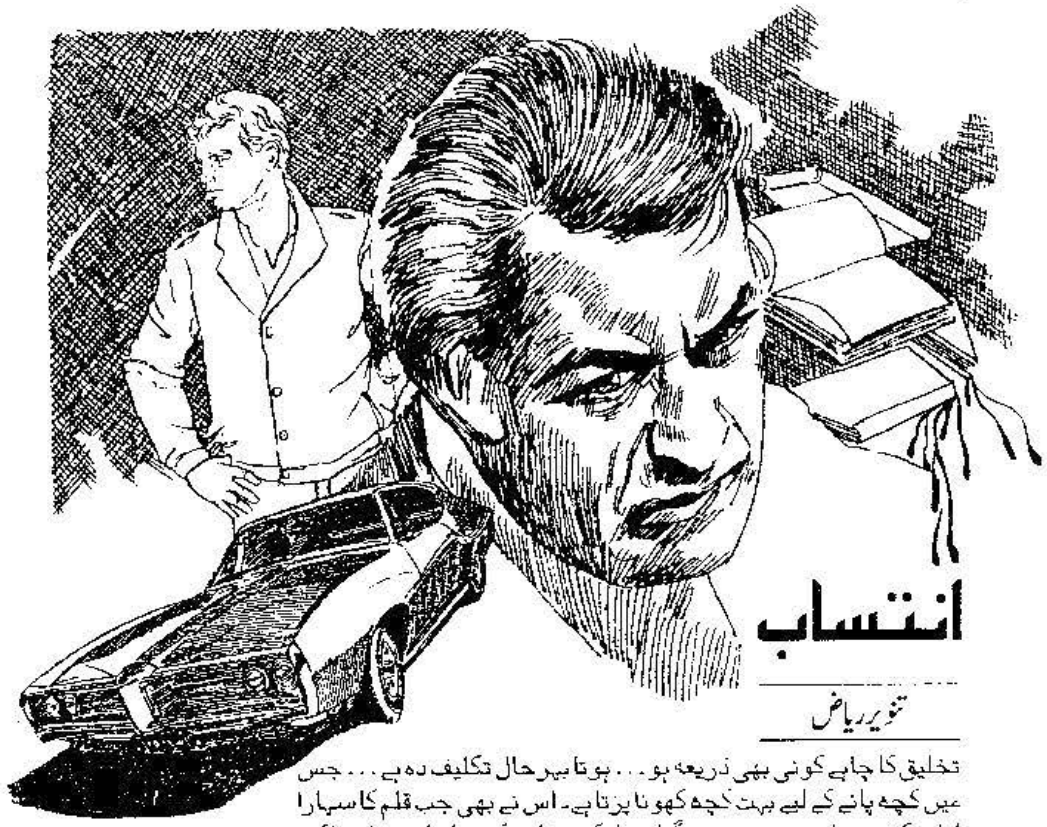

انتساب

تنویر ریاض

تخلیق کا چاہے کوئی بھی ذریعہ ہو... ہوتا بہرحال تکلیف دہ ہے... جس میں کچھ پانے کے لیے بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ اس نے بھی جب قلم کا سہارا لیا تو کئی سہاروں سے دور ہوگیا... لیکن تخلیق کے مراحل میں ایسا کب ہوتا ہے جیسا اس کے ساتھ ہوا... اس پر نہ صرف وہ خود حیران تھا بلکہ شاید پڑھنے والے بھی ششدر رہ جائیں گے۔

ایک قلمکار کا چونکا دینے والا انداز تحریر

پیٹرک پندرہ سال کا تھا جب اس نے چارلی ویلٹرون کا سنسنی خیز ناول آئی واکلر پڑھا۔ یہ چارلی کا پہلا ناول تھا اور اس کا شمار کلاسیکی ناولوں میں ہوتا تھا۔ اس نے اس سے پہلے ایسی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی اور نہ ہی وہ سوچ سکتا تھا کہ کسی ناول میں تشدد اور گروہی جرائم کی اتنی حقیقی عکاسی کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد وہ نہ صرف چارلی کا بہت بڑا مداح بن گیا بلکہ اس نے چارلی کی تحریروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنا شروع کردیا تھا۔ وہ اس کی ہر آنے والی کتاب کی اشاعت کا بےچینی سے انتظار کرتا اور مارکیٹ میں آتے ہی اسے خریدنے پہنچ جاتا۔ وہ چارلی ویلٹرون کی شخصیت اور اس کی تحریروں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے خود بھی مصنف بننے کا فیصلہ کرلیا۔ کالج میں اپنے لیے انگریزی ادب کا مضمون منتخب کیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایک ناول کے مسودے پر کام شروع کردیا۔ اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے قالینوں کی دکان پر ملازمت اختیار کرلی جو فروخت کے ساتھ ساتھ گھروں اور دفتروں میں قالین بچھانے کی خدمت بھی سرانجام دیتی تھی۔ جب پیٹرک کو پہلی بار یہ خدمت انجام دینے کے لیے ایک محل نما مکان میں بھیجا گیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے پڑھ رکھا تھا کہ اچھی تحریر کے لیے گہرا مشاہدہ بہت ضروری ہے۔ اس کا خیال تھا کہ گھروں اور دفتروں میں جانے سے اس کا مشاہدہ بڑھے گا اور اسے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے اور انہیں پرکھنے کا موقع ملے گا۔ وہ دکان میں آنے والے گاہکوں کا بھی عمیق نظروں سے جائزہ لیتا۔ ان کے لباس، چال ڈھال، انداز گفتگو اور رویوں کا بغور مشاہدہ کرتا۔ اسے ہر گاہک کے چہرے پر ایک تحریر لکھی ہوئی نظر آتی جسے وہ اپنے تخیل کی قوت سے کہانی کا روپ دینے کی کوشش کرتا۔

ایک طویل عرصے تک چارلی ویلٹر دن اس کا ہیرو رہا اور اب وہی عظیم مصنف نہ صرف اس کا استاد بن چکا تھا بلکہ ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں چارلی کے نیو جرسی والے گھر کے عقبی صحن میں بیٹھے شراب اور کیوبا کے سگاروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جبکہ کچن سے آنے والی گوشت کے پارچوں کے بھننے کی خوشبو ان کی اشتہا کو مزید بڑھا رہی تھی۔

ان دونوں کے تعلق کا آغاز بھی بڑے دلچسپ اور منفرد انداز میں ہوا۔ ایک سال پہلے پیٹرک نے چارلی کو اپنا تحریر کردہ مسودہ بھیجا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ شاید وہ اس ناول پر اپنی رائے ضرور دے گا لیکن اسے اس بارے میں بہت زیادہ توقع نہیں تھی کیونکہ چارلی ایک مشہور اور مصروف مصنف تھا اور اس کے پاس شاید اس کا مسودہ پڑھنے کی بھی فرصت نہیں ہوگی جبکہ اس کے مقابلے میں چھبیس سالہ پیٹرک ایک غیر معروف مصنف تھا جس کی ابھی تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے چارلی کا فون موصول ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا ''لڑکے! تمہارے مسودے میں کچھ اچھا مواد موجود ہے لیکن اسے مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے، کیوں نہ ہم ساتھ بیٹھ کر کام کریں؟''

اس لمحے پیٹرک نے اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا مصنف اس جیسے نوآموز کے لیے اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال سکے گا۔ ویسے بھی اس نے چارلی کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ بہت ہی الگ تھلگ زندگی گزارنے کا عادی ہے، نہ کہیں جاتا ہے اور نہ کسی کو اپنے گھر بلاتا ہے۔ اپنے پبلشر کے علاوہ کسی سے اس کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسی لیے چارلی کا فون سننے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔

وہ مزید کوئی وقت ضائع کیے بغیر اپنے محبوب مصنف سے ملنے کے لیے پہنچ گیا۔ پہلی ملاقات میں وہ وہسکی پیتے اور مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے لیکن اس پوری نشست کے دوران میں چارلی نے اس کے مسودے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا جبکہ پیٹرک اس کی رائے جاننے کے لیے بے چین تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ خود ہی یہ موضوع چھیڑ دے لیکن چارلی کی شخصیت کا رعب اس سوچ پر حاوی ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چارلی اسے بے وقت کی راگنی سمجھ کر ناراض نہ ہو جائے چنانچہ وہ بڑے صبر اور سکون کے ساتھ اس امید پر بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا کہ جلد یا بدیر وہ خود ہی اس موضوع پر بات کرے گا۔

یہ طویل نشست رات گئے ختم ہوئی۔ چارلی اسے دروازے تک چھوڑنے آیا اور پرجوش انداز میں رخصت کرتے ہوئے بولا۔ ''تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ تمہارے اندر ایک ہونہار مصنف بننے کی صلاحیت ہے۔ تم جب چاہو مشورے اور رہنمائی کے لیے میرے پاس آ سکتے ہو۔ میں تمہیں کامیاب مصنف بننے کے گر سکھاؤں گا بشرطیکہ تم شاگرد بننا قبول کرو۔''

پیٹرک کو ایک بار پھر اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ چارلی جیسا معروف شخص اسے اپنا شاگرد بنانے پر آمادہ ہے۔ اس سے زیادہ اسے اور کیا چاہیے۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ وہ چارلی ویلٹر دن کے حلقے میں شامل ہو رہا ہے۔ اس نے جھک کر چارلی کے ہاتھ کو عقیدت سے بوسہ دیا اور جلد آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا آیا۔

دوسری ملاقات خاصی نتیجہ خیز رہی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ چارلی سے دوبارہ ملنے کے لیے کب جانا مناسب ہوگا لیکن یہ مشکل بھی چارلی نے آسان کر دی۔ اس نے تیسرے دن ہی فون کر کے پیٹرک کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔ ''لڑکے! آج کی شام میرے پاس تمہارے لیے تھوڑا سا وقت ہے اگر فارغ ہو تو آ جاؤ۔ ہم تمہارے مسودے پر گفتگو کر لیں گے اور ہاں تم، ڈنر بھی میرے ساتھ ہی کرو گے۔''

پیٹرک کا سینہ فخر سے تن گیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ چارلی کو اس کا مسودہ پسند آ گیا ہے۔ تبھی وہ اسے اتنی اہمیت دے رہا ہے۔ اس روز پیٹرک نے چارلی کے گھر جانے کے لیے خاص اہتمام کیا۔ وہ عام طور پر جینز اور ٹی شرٹ پہنا کرتا

تھا لیکن اب اسے اپنی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے الماری کھول کر اپنا اکلوتا سیاہ رنگ کا سوٹ نکالا جس کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ پیٹرک نے اپنی سستی اور بے پروائی پر لعنت بھیجی اور سوچنے لگا کہ اگر اس نے اس سوٹ کو ڈرائی کلین کروا لیا ہوتا تو یہ خاصا بہتر ہو سکتا تھا۔ اس نے فوری طور پر فیصلہ کر لیا کہ جیسے ہی چار پیسے ہاتھ میں آئیں گے۔ وہ اپنے لیے ایک نیا سوٹ ضرور خریدے گا۔

چارلی نے پہلے کی طرح اس کا خوش دلی سے استقبال کیا پھر اس نے پیٹرک کے سامنے اس کا مسودہ رکھ دیا جس کے کئی درجنوں صفحوں پر اس نے نشان لگا رکھے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''لڑکے! میں تمہاری تعریف کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا کیونکہ تمہیں تعریف کی نہیں بلکہ تنقید کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی بے جا تعریف انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اب تم میری شاگردی میں آ گئے ہو تو یہ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہاری کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی کر کے انہیں دور کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے جن حصوں پر نشان لگائے ہیں۔ انہیں غور سے پڑھو۔ میں دیکھتا ہوں کہ کھانے میں کتنی دیر ہے؟''

اس شام چارلی نے اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ وہ سر جھکائے عقیدت سے انہیں سنتا رہا۔ اس کے ذہن میں کچھ سوال بھی ابھرے لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ایک نشست میں پورے مسودے کا احاطہ کرنا ممکن نہ تھا اس لیے چارلی نے اسے اجازت دے دی کہ وہ جب چاہے اس سے ملنے کے لیے آ سکتا ہے۔ اس کے بعد چارلی اور پیٹرک کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ اب ان کے درمیان صرف پیٹرک کے مسودے پر ہی گفتگو نہیں ہوتی تھی بلکہ دیگر موضوعات بھی زیر بحث آتے تھے۔ چارلی کا مشاہدہ بہت وسیع اور گہرا تھا۔ وہ ہر واقعے کو اس طرح بیان کرتا جیسے وہ خود بھی اس میں شامل رہا ہو، اب پیٹرک کو اندازہ ہوا کہ چارلی کی تحریریں پڑھ کر حقیقت کا گمان کیوں ہوتا ہے۔

پیٹرک روزانہ نہیں تو ایک دن چھوڑ کر چارلی کے پاس ضرور جاتا۔ یوں لگتا تھا کہ چارلی صرف اس کا استاد ہی نہیں بلکہ ان میاں بیوی نے اسے گود لے لیا ہے۔ چارلی کی بیوی ایلس بالکل اپنی اولاد کی طرح پیٹرک کا خیال رکھتی تھی۔ وہ آئے دن اسے نت نئے مزے دار کھانے بنا کر کھلاتی اور جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں چلی جاتی تو استاد اور شاگرد شراب سے دل بہلانے بیٹھ جاتے۔ چارلی اسے اپنی جوانی کے قصے سنایا کرتا جب اس کا جرائم پیشہ افراد کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا۔

''ایک بات واضح کر دوں۔'' وہ اکثر کہا کرتا۔ ''ان لوگوں سے میرا ملنا جلنا ضرور تھا لیکن میں نے کبھی کوئی واردات نہیں کی۔ ساتھ رہ کر ان کے طریقہ کار کا مشاہدہ کیا کرتا تھا یا ان کا کوئی چھوٹا موٹا کام کر دیتا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں نے کسی کی ٹانگیں توڑی ہوں یا کسی سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہو، یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ کہیں تم میرے بارے میں کوئی غلط خیال دل میں نہ لاؤ۔''

پیٹرک جانتا تھا کہ چارلی کی ان باتوں میں کوئی جھوٹ نہیں ہے، جب وہ جرائم پیشہ لوگوں کے درمیان رہنے کا اعتراف کر سکتا ہے تو اس کے لیے کسی اور جرم کا اقرار کرنا مشکل نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ چوہتر سال کا ہو چکا تھا اور اس عمر میں آدمی پہلے سے زیادہ راست باز، صاف گو اور نڈر ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں بھی اس کی صحت قابل رشک تھی۔ چوڑا سینہ، مضبوط موٹے موٹے بازو اور چوڑی ہتھیلیاں۔ اب بھی وہ کسی کو تھپڑ رسید کر دے تو اس کی ضرب سے مقابل کے چہرے پر سرخ نشان ضرور پڑ جائے گا گو کہ اس کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن ان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور وہ انہیں بڑی نفاست اور سلیقے سے سنوارتا تھا۔ اس کے جبڑے بھاری اور چہرہ چوڑا تھا جس پر جا بہ جا زخموں کے نشانات اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ اس کی جوانی بڑی ہنگامہ خیز رہی ہوگی۔

چارلی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے کر دھوئیں کے مرغولے بنا رہا تھا اور پیٹرک سوچ رہا تھا کہ اس عمر میں بھی اس کا انداز مجرموں اور بدمعاشوں جیسا تھا اور اسے دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا مصنف ہے۔ پیٹرک عقیدت کے عالم میں اپنے استاد کو دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ چارلی کی بیوی ایلس کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے اپنے شوہر کے کندھے دبانا شروع کر دیے۔ وہ غالباً اس سے پندرہ سال چھوٹی ہوگی۔ پیٹرک نے اس کی جوانی کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت حسین اور شاندار رہی ہوگی لیکن اب بھی دیکھنے میں وہ خوب صورت لگتی تھی۔ اس نے اپنے چہرے اور جسم پر خاص توجہ دی تھی اسی لیے اس کے چہرے پر بہت کم جھریاں تھیں اور وہ آج بھی اپنے بالوں کو اسی رنگ میں رنگتی تھی جو بیس سال پہلے تھا۔ چارلی نے گردن موڑے بغیر بیوی سے پوچھا کہ کھانے میں کتنی دیر ہے، پھر وہ ازراہ مذاق بولا۔ ''ذرا اس لڑکے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حالت تو دیکھو، بھوک سے اس کا دم نکلنے والا ہے۔ ہمیں جلد از جلد اسے کھانے کو کچھ دے دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ یہ اس دنیا سے کوچ کر جائے۔"

ایلس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ "میرا خیال ہے کہ یہ مزید پانچ منٹ تک زندہ رہ سکے گا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اس لڑکے کی کھال ویسے ہی ہڈیوں سے چپکی ہوئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہماری نظروں کے سامنے ہی ضائع ہو جائے۔"

وہ کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لے رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ گزشتہ چند ہفتوں میں چارلی کے گھر کا کھانا کھا کر پیٹرک کا وزن بیس پونڈ بڑھ گیا تھا۔ ایلس نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا کہ وہ پانچ منٹ میں کھانا لگا دے گی۔ چارلی نے یہ سن کر اس کے عقب میں سیٹی بجائی۔ ایلس نے مڑ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے کچن میں داخل ہو گئی۔

"آہ!" چارلی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اچھی بیوی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔" پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "لڑکے تمہیں بھی ایسی ہی عورت کی ضرورت ہے۔"

"میں اس بارے میں غور کر رہا ہوں۔" پیٹرک نے ٹالنے والے انداز میں کہا پھر جھجکتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نے میرا تازہ مسودہ دیکھ لیا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے خوشی ہے کہ اب تم میری بتائی ہوئی باتوں سے قریب ہوتے جا رہے ہو۔ پلاٹ، ٹیمپو، ڈھانچا اور کردار سب کچھ بہت اچھا ہے۔ یہ کتاب اور بھی اچھی ہو سکتی ہے لیکن اب بھی اس کے کچھ حصے حقیقت سے دور ہیں۔ خصوصاً بینک میں ڈاکے والا منظر۔ اس میں بالکل بھی حقیقت نظر نہیں آتی۔"

چارلی نے ایک اور دعویں کا مرغولہ بنانے کے لیے توقف کیا، پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تمہیں زندگی میں مزید تجربات کی ضرورت ہے۔ تم اس دنیا کو کسی مضبوط انسان کی نظر سے دیکھو۔ شراب خانوں میں ہونے والے جھگڑوں میں ٹانگ اڑاؤ۔ کسی شوٹنگ رینج میں جا کر دیکھو اور یہ محسوس کرو کہ سیب کا نشانہ کیسے لیا جاتا ہے؟"

پیٹرک نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ اسے امید تھی کہ یہ آخری مسودہ اس کے استاد کو ضرور پسند آئے گا۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیا تم مجھے اپنے کسی پرانے دوست سے نہیں ملوا سکتے تاکہ میں بھی تجربہ حاصل کرنے کی خاطر کچھ لوگوں کی ٹانگیں توڑ دوں جیسا کہ تم نے ایک دفعہ کیا تھا؟"

چارلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ تم کس واقعے کا ذکر کر رہے ہو۔"

"ہاں۔ واقعی تم کچھ نہیں جانتے۔" پیٹرک نے طنز کیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ واقعی نہیں جانتا لیکن تم کافی بولڈ ہو رہے ہو۔ تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

"میں نے تمہارا ناول پڑھا ہے۔ تم وہ ناول لکھ ہی نہیں سکتے تھے اگر تم نے خود کسی جرائم پیشہ گروہ کے ساتھ کام نہ کیا ہو۔"

"وہ سب میرا تخیل تھا۔" چارلی نے اپنی شہادت کی انگلی کو دماغ پر مارتے ہوئے کہا۔ "یہ سب باتیں میرے ذہن کی پیداوار ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اپنے علاقے میں لڑکوں کی زبانی ایسی کہانیاں سنا کرتا تھا۔ ان میں کچھ شیخی خور بھی تھے جو اپنی بڑائی اور اہمیت جتانے کے لیے معمولی سا واقعہ بھی نمک مرچ لگا کر بیان کرتے۔ میں جرم کی یہ داستانیں غور سے سنتا اور اپنے ذہن میں محفوظ کرتا رہتا پھر جب کچھ لکھنے بیٹھتا تو تخیل کے ذریعے اپنی تحریر میں کچھ اس طرح رنگ آمیزی کرتا کہ پڑھنے والے یہی سمجھتے ہوں گے کہ میں بھی جائے واردات پر موجود تھا، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں نے کبھی اس طرح کی کسی واردات میں حصہ نہیں لیا۔"

"ٹھیک ہے، میں بھی ان لڑکوں سے مل کر کچھ کہانیاں سننا چاہوں گا۔"

چارلی کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھوں میں حسرت کی لہر ابھری اور وہ بجھے ہوئے انداز میں بولا۔ "یقیناً تمہیں ان سے ملنے کا اشتیاق ہو رہا ہوگا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جن لڑکوں کو میں جانتا تھا وہ مر چکے ہیں یا ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ عرصۂ دراز سے میرا ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اس لیے میں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

اسی لمحے چارلی کا سیل فون بجنے لگا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا۔ وہ ایک سستا سا ڈسپوزیبل سیٹ تھا جسے دیکھ کر پیٹرک کو یقین ہو گیا کہ چارلی انتہائی کنجوس شخص ہے۔ اس نے فون کان سے لگایا اور کئی منٹ تک دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگو سنتا رہا پھر اس کے چہرے پر سختی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

"تم کیا بات کر رہے ہو؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ "تمہیں تاریخ میں ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟"

پیٹرک نے حیرت سے چارلی کی جانب دیکھا۔ اس روز تیس تاریخ ہی تھی۔ اس نے چارلی کو اپنی جانب متوجہ کیا اور چارلی کو اشارے سے یہ بات بتائی۔ چارلی نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے پیٹرک کی جانب سے اپنا منہ پھیر لیا۔ وہ نیچی مگر سخت آواز میں باتیں کر رہا تھا تاہم پیٹرک کے کانوں تک اس کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔

"میں تم سے مذاق کر رہا تھا۔ جانتا ہوں کہ آج کیا تاریخ ہے۔ اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور مجھے تاریخ بھی یاد نہیں رہتی۔" پھر اس نے ایک لمبا وقفہ لیا اور پھر اپنے مخاطب کو تسلی دیتے ہوئے بولا کہ وہ بالکل پریشان نہ ہو۔ اس سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کیا جائے گا۔ بات ختم کرنے کے بعد وہ کافی دیر خاموش بیٹھا خلا میں گھورتا رہا پھر پیٹرک نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری باتوں سے تو یوں لگا جیسے کسی کتاب کا مسودہ دینے کی آخری تاریخ گزر گئی ہو؟"

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ وہ خالی خالی نظروں سے پیٹرک کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پریشانی جھلک رہی تھی اور اس کے ہونٹ نیچے کی جانب لٹک گئے تھے۔

عین اس وقت ایلس ان دونوں کے لیے تازہ بیئر لے آئی اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی کہ کھانا تیار ہے لہٰذا وہ اندر آ جائیں۔

کھانے کے دوران میں بھی چارلی خاموش اور گم صم رہا۔ ایلس معمول کے مطابق اس سے باتیں کر رہی تھی لیکن وہ اس کی ہر بات کا جواب ہوں، ہاں میں دے رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ایلس برتن دھو رہی تھی تبھی چارلی نے پیٹرک کو ایک طرف لے جا کر کہا کہ اسے اس کی مدد چاہیے۔

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے، وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ آنے جانے میں آدھ گھنٹا لگ جائے گا۔ اس طرح ہم اپنا کام ختم کر کے ایک گھنٹے میں واپس آ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" پیٹرک نے فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

چارلی نے سر ہلایا اور بے ترتیب قدموں سے چلتے

تقسیم نہیں ضرب

اشفاق احمد کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ماحول اور انسانوں کا بغور مشاہدہ کرتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کر لیتے تھے۔ ایک بار وہ باغ میں اپنے نوعمر بیٹے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ بچہ کھیل رہا تھا، باغ کے مالی نے دیکھا تو نزدیک آیا اور پوچھا۔ "بابو جی یہ آپ کا بچہ ہے؟"

"جی ہاں۔" انہوں نے کہا۔

"اللہ رکھے بہت پیارا بچہ ہے، ایسے بچوں سے تو ہر بندہ پیار کرتا ہے۔"

اشفاق صاحب نے پوچھا۔ "آپ کے ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں؟"

"جی میرے دس بچے ہیں۔"

اشفاق صاحب حیرت سے بولے۔ "کمال ہے، آپ اتنے بہت سارے بچوں میں اپنا پیار کیسے تقسیم کر سکتے ہو؟"

مالی نے جواب دیا۔ "بابو جی پیار کو تقسیم نہیں کرتے۔ اس کو ضرب دیا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر اشفاق صاحب بیٹھے سوچتے رہے کہ ایک اَن پڑھ مالی کتنی بڑی بات کہہ گیا ہے۔

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

ایک سے بڑھ کر ایک

نوجوان نے اپنا سفری بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے جذباتی لہجے میں باپ سے کہا۔ "ڈیڈی! میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتا ہوں، عیش و عشرت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ خوبصورت لڑکیوں کے سنگ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ خدارا مجھے مت روکیے۔"

"کون کم بخت تمہیں روک رہا ہے؟" باپ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تو خود تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

مرسلہ: ماہا ایمان، حافظ آباد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک جم بیگ تھا۔ اس نے پیٹرک کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا پھر وہ کچن کے دروازے پر رک کر ایلس سے بولا۔ ”میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔“

”تم دونوں کو باہر نکلتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“ وہ اپنے شوہر کو ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ یہ لڑکا تمہارے ساتھ کلب یا بار میں جا کر الجھ جائے۔“

چارلی نے اس کی بات سن کر برا سا منہ بنایا اور وہ کچھ کہے بغیر گھر سے باہر آگئے۔ پیٹرک اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ گھر سے چند میل کے فاصلے پر واقع ایک شاپنگ مال کی پارکنگ لاٹ میں اس نے اپنی کیڈی لیک کھڑی کی اور وہاں پر پہلے سے موجود ایک پرانے ماڈل کی بیوک میں سوار ہوگیا۔ پیٹرک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ چارلی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

”کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ سامان ایک جگہ پہنچانا ہے۔ لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سناؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ فون کتاب کے مسودہ کے بارے میں تھا جس کی تاریخ آج ختم ہو رہی ہے۔“

”ہاں۔ وہ فون کتاب کے بارے میں ہی تھا لیکن یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔“

ان کی منزل پارامارس تھی۔ راستے میں چارلی نے سیاست اور ٹی وی شوز کے بارے میں مختصر سی گفتگو کی لیکن وہ زیادہ تر مضطرب اور پریشان ہی نظر آتا رہا۔ اس کی باتوں کے جواب میں پیٹرک نے جو کچھ کہا، چارلی نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ تھوڑی دیر بعد ہی پیٹرک نے محسوس کیا کہ اس پر نیند کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو چارلی کی بے ربط گفتگو اور دوسری بڑی وجہ ایلس کا بنا ہوا مزے دار کھانا اور بیئر تھی اور اسی کا خمار ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ پھر ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ان کی گاڑی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ پیٹرک کے تجسس میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب اس نے دیکھا کہ چارلی نے ڈرائیوے میں پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں۔

جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر آئے۔ چارلی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گھر کے بغلی دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے جم بیگ سے دو شے نکالی اور پیٹرک کو پکڑا دی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ نہ دیکھ سکا لیکن وہ لوہے سے بنی ہوئی کوئی چیز تھی اور زیادہ بھاری بھی نہیں تھی۔ چارلی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اس دوران پیٹرک کو اندازہ ہو چکا تھا کہ چارلی نے اسے ایک پستول تھمایا ہے جبکہ ایسا ہی ایک ہتھیار اس کے پاس بھی تھا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا۔ چارلی نے بلا توقف فائر کر دیا۔ گولی اس شخص کے سینے میں لگی جس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ شخص پیچھے کی جانب گرا۔ کیونکہ پستول میں سائیلنسر لگا ہوا تھا اس لیے گولی چلنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ پیٹرک کے لیے یہ ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔ ابھی وہ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ چارلی نے ہلکا سا دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ وہ شخص جس انداز میں فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا اور اس کی عمر بہ مشکل تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے خاکی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو دل کے قریب گولی لگنے سے خون میں تر بتر ہوگیا تھا۔ چارلی نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر گولی چلائی جو اس کی داہنی آنکھ پر لگی پھر وہ مڑا اور تقریباً غرانے کے انداز میں اس نے پیٹرک کو اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ پیٹرک نے اس کی تعمیل کی۔ اس وقت وہ ایک معمول کی طرح عمل کر رہا تھا چنانچہ اس نے چارلی کے اگلے حکم کا انتظار نہیں کیا اور اس کے کہے بغیر ہی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اندر سے کسی دوسرے آدمی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ٹونی نامی شخص سے بہ آواز بلند پوچھ رہا تھا کہ دروازے پر کون ہے؟ چارلی تیزی سے اس جانب بڑھا جہاں سے آواز آرہی تھی۔ پیٹرک نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس کا ذہن ابھی تک اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی جاسوسی ناول کا سنسنی خیز باب پڑھ رہا ہے بلکہ خود بھی اس کا ایک کردار بن گیا ہے۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھے۔ ایک شخص باتھ روم سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً یہی شخص ٹونی کو آواز دے رہا تھا۔ وہ مرنے والے کے مقابلے میں عمر میں بڑا، لمبا اور جسمانی طور پر مضبوط نظر آرہا تھا۔ اس نے جب چارلی کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی کمر میں لگی پیٹی سے پستول نکالتا، چارلی نے پے در پے تین فائر کر کے اس کے سینے کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گرا۔ چارلی آگے بڑھا تاکہ مرنے والے کی جیبوں کی تلاشی لے سکے۔ ابھی وہ جھکا ہی تھا کہ اسے پیٹرک

کے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک گیا کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق گھر میں کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا امکان نہیں تھا۔ وہ اپنے پستول کی پانچ گولیاں پہلے ہی استعمال کر چکا تھا اور درمیان میں پیٹرک کے ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ آنے والے فرد کو نشانہ بنا سکے۔ وہ برہم ہوتے ہوئے بولا۔ ”لڑکے! تمہارے پیچھے کوئی ہے، اسے روکو۔“

پیٹرک نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے گولی چلا دی۔ چارلی کی طرح اس کے پستول میں بھی سائیلنسر لگا ہوا تھا چنانچہ گولی چلنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ ایک لڑکی تھی جو نیم عریاں حالت میں یہ دیکھنے کے لیے بیڈ روم سے نکل آئی کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟ اس کی عمر بہ مشکل بیس برس رہی ہوگی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کے لمبے سنہری بال عریاں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ پیٹرک نے ایک ساتھ دو گولیاں اس کے پیٹ میں اتار دی تھیں اور وہ جاں کنی کے عالم میں فرش پر لیٹی کراہ رہی تھی۔

پیٹرک خوف اور دہشت کے عالم میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور حیران تھا کہ اس سے یہ فعل کیسے سرزد ہوگیا؟ پستول چلانا تو درکنار اس نے کبھی اس ہتھیار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ البتہ فلموں اور کہانیوں میں اس کے بارے میں ضرور دیکھا اور پڑھا تھا۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی اور لگتا تھا کہ وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔ دوسری جانب چارلی بڑے اطمینان سے مرنے والے کی تلاشی لینے میں مصروف تھا۔ اس نے اس کی جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے پیٹرک کو غور سے دیکھا جو ابھی تک سکتے کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ غصے سے بولا۔

”تمہیں کیا ہوگیا ہے لڑکے! کیا گولی چلا کر پچھتا رہے ہو؟ اس لڑکی کی مشکل آسان کیوں نہیں کر دیتے؟“

اس نے چند لمحے پیٹرک کے ردعمل کا انتظار کیا لیکن جب اس نے کوئی حرکت نہیں کی تو وہ خود آگے بڑھا اور لڑکی کی کنپٹی میں گولی مار دی۔ واقعی اس گولی نے لڑکی کی مشکل آسان کر دی اور وہ پتھر کی بے جان مورتی کی طرح ساکت ہوگئی۔ پیٹرک کو یہ سب کچھ ایک خواب کے مانند لگ رہا تھا۔ لڑکی کی موت کا منظر اس کے لیے شدید صدمے کا باعث بنا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ کسی بت کے مانند پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

اس کے برعکس چارلی کے اعصاب بالکل پرسکون تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی معمول کی کارروائی میں حصہ لیا ہو۔ وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ بڑھا کر پیٹرک سے اس کا پستول لے لیا پھر اس نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں اس مکان سے باہر آگئے۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس علاقے کے لوگ جلد سو جانے کے عادی ہیں۔ سڑک پر بھی پرائے نام ٹریفک تھا اور اکا دکا گاڑی گزرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ پیٹرک نے گاڑی کا دروازہ کھول کر دونوں پستول بیگ میں رکھے اور چابی پیٹرک کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

”گاڑی تم چلاؤ گے۔ مجھے اسٹرپ مال کے پارکنگ لاٹ کے قریب اتار دینا جہاں میری لیک کیڈی کھڑی ہوئی ہے۔ پھر تم یہ گاڑی نیو آرک کے علاقے میں اس پتے پر چھوڑ دینا۔“ اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

پیٹرک نے ایک معمول کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی لیکن وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور اس سے اسٹیئرنگ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ چارلی نے اپنی جیب سے ایک بوتل نکالی اور اس کے ڈھکنے میں مشروب انڈیلتے ہوئے بولا۔ ”یہ پی لو۔ اس سے تمہارے اعصاب پرسکون ہو جائیں گے اور تم اپنی دنیا میں واپس آجاؤ گے۔“

پیٹرک نے ایک گھونٹ لینے کے بعد تجسس نگاہوں سے چارلی کی طرف دیکھا تو اس نے بوتل ہی اسے تھما دی جسے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے خالی کر گیا۔

”اب تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں نے جوانی میں ورزش کرنے کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا ہے۔“ چارلی نے سپاٹ آواز میں کہا، البتہ اب اس کے لہجے میں نرمی آگئی تھی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کتنا بڑا مصنف ہوں اور یہ چیز مجھے جرم کی راہ پر چلنے سے نہیں روک سکتی کیونکہ آدمی ایک بار اس دلدل میں پھنس جائے تو مرتے دم تک اس سے نہیں نکل سکتا۔ اس کے لیے معافی اور توبہ کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔“

پیٹرک نے بڑی مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کیا۔ وہ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ اس کا بس چلتا تو پستول کی باقی گولیاں چارلی کے سینے میں اتار دیتا پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ”کمینہ، ذلیل۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ چارلی اس کی بڑبڑاہٹ پوری طرح نہیں سن سکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم واقعی بہت بڑے کمینے ہو۔" اس نے غصے سے چیختے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے بھی جرم کی راہ پر لگا دیا۔"

"بہتر ہوگا کہ تم اپنی زبان قابو میں رکھو۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور آئندہ تمہارے منہ سے ایسے گندے الفاظ نہیں سننا چاہتا۔ تمہیں اپنے مرتبے کا خیال ہونا چاہیے۔ تم ایک بڑے مصنف کے شاگرد ہو اور تمہارا مستقبل بے حد تابناک ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ "جہاں تک تمہیں اس جرم میں ملوث کرنے کا تعلق ہے تو مجھے واقعی اس پر افسوس ہے لیکن میرے پاس اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں، ویسے بھی میں تمہیں صرف اپنی مدد کے لیے ساتھ لے گیا تھا۔ اس لڑکی کی وہاں موجودگی کا کوئی امکان نہ تھا، اگر وہ درمیان میں نہ آتی تو تم اس جرم سے بچ سکتے تھے۔ تمہیں میری مجبوری کا اندازہ نہیں۔ مجھے واقعی تاریخ یاد نہیں رہی تھی اور سمجھ رہا تھا کہ ابھی تیس تاریخ میں ایک ہفتہ باقی ہے۔ جب تم میری عمر کو پہنچو گے تو ایسے واقعات تمہارے ساتھ بھی پیش آئیں گے۔ اس نے مجھے فون پر دھمکی دی تھی اس لیے اسے آج رات ہی ختم کرنا ضروری تھا۔ اس کام کے لیے مجھے ایک آدمی کی مدد درکار تھی اور اتنی جلدی کسی دوسرے شخص کا بندوبست نہیں ہوسکتا تھا۔ تم نے اس لڑکی کے پیٹ میں گولیاں مار کر عقل مندی کا ثبوت دیا ورنہ وہ لڑکی ہمارے لیے مشکل کھڑی کرسکتی تھی۔"

چارلی نے اسے وہ رقم دینے کی کوشش کی جو اس نے مکان کے اندر موجود دوسرے شخص کی جیب سے نکالی تھی۔ جب اس نے انکار کیا تو چارلی نے وہ گڈی زبردستی اس کی جیب میں ڈال دی اور بولا۔

"یہ دو ہزار ڈالرز سے زیادہ ہیں۔" وہ سمجھاتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے آپ کو قصوروار مت سمجھو۔ جانتا ہوں کہ تم اس لڑکی کی وجہ سے پریشان ہو۔ یقین جانو کہ اس کے وہاں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور میری معلومات کے مطابق اس گھر میں صرف دو ہی افراد کو ہونا چاہیے تھا۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے اس لڑکی کا وہاں ہونا باعث شرم بھی تھا۔ اگر وہ وہاں نہ ہوتی تو تمہیں کچھ بھی نہ کرنا پڑتا اور تم محض ایک خاموش تماشائی ہی رہتے۔"

اس کے بعد ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد ہی وہ اسٹرپ مال کی پارکنگ ایریا میں داخل ہو چکے تھے۔ پیٹرک نے گاڑی چارلی کی کار کے برابر میں کھڑی کی۔

چارلی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کل شام سات بجے گھر ضرور آنا۔ میں ایلس سے کہہ کر تمہاری پسندیدہ ڈش لسانگنا بنواؤں گا۔ اس کے بعد تمہیں چند لوگوں سے بھی متعارف کرواؤں گا۔ چاہے تم اسے پسند کرو یا نہیں لیکن اب تم بھی اس گروہ کا حصہ بن چکے ہو۔ البتہ میں تمہارا پورا خیال رکھوں گا اور اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ تمہارے ساتھ مناسب سلوک کیا جائے۔ تمہیں اپنی تحریر کو جاندار اور پراثر بنانے کے لیے اس کی شدید ضرورت ہے اور تم جان جاؤ گے کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کار سے اتر گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی پیٹرک نے گاڑی کا رخ نیوآرک کی طرف کردیا۔ اس کے پیٹ میں بری طرح مروڑ اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے اس مکان میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی دہشت ابھی تک اس کے سر پر سوار تھی۔ جب بھی ذہن میں مرنے والوں کی تصویر ابھرتی، اسے ابکائی آنے لگتی۔ خاص طور پر اس لڑکی کا چہرہ تو جیسے ذہن میں نقش ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتا تو اس کے سامنے وہ لڑکی فرش پر پڑی نظر آجاتی۔ بہرحال نیوآرک تک پہنچتے پہنچتے اس کی سوچ کا مرکز تبدیل ہوچکا تھا جیسے کسی نے کوئی بٹن دبا کر منظر تبدیل کردیا ہو۔ اب وہ ان ہلاکتوں کے بجائے اپنے ناول کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ بینک ڈکیتی والے واقعے کو کس طرح دوبارہ تحریر کرے کہ اس میں بھی چارلی کی تحریروں جیسی حقیقت نظر آئے۔ وہ بڑے پرجوش انداز میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ مطلوبہ پتے پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ طے کرچکا تھا کہ گھر جاکر فوراً ہی اپنے ناول پر کام شروع کردے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایلس کی بنائی ہوئی ڈش کے تصور سے اس کی رال ٹپکنے لگی۔

☆☆☆

انتساب

"میں اس کہانی کو ڈیوڈ تھامپسن کے نام منسوب کرتا ہوں۔ انہوں نے جاسوسی ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اس انڈسٹری میں ایسے ناشر بہت کم ہیں جنہوں نے غیر معروف اور نوآموز مصنفین کی اتنے پرجوش انداز میں حوصلہ افزائی کی ہو۔ ان کی ناگہانی موت ہم سب کے لیے بہت بڑا نقصان ہے اور ان کی کمی ہمیشہ شدت سے محسوس کی جائے گی۔"

سزا

محمد زبیر سلیمانی

جینے والوں کو جینے کی سزا تو ہر دور میں ملتی رہی ہے۔ یہ اور بات کہ کسی کے حصے میں جانوروں کے مانند زندگی آئی ہے اور کہیں کسی جانور کو اتنا عیش و عشرت نصیب ہوتا ہے کہ انسانی آنکھ حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ جاتی ہے۔ بہرکیف، جینا تو ہر حال میں پڑتا ہے۔

سطر سطر پر لرزہ خیز ایک حساس تحریر

بوری کا منہ جیسے ہی کھلا اس میں سے ایک ننھا سا کتا باہر نکل آیا اور کچھ دور جاکر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا اور پھر اچانک وہاں سے بھاگا اور ساتھ والے ایک خالی پلاٹ میں جا گھسا جس میں لمبی لمبی گھاس لہرا رہی تھی۔ نئی آبادی ہونے کے باعث آس پاس کے گھروں کا گندا پانی اسی پلاٹ میں جمع ہوکر جوہڑ کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ اسی ننھے پپے کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے کون لوگ چھوڑ گئے تھے؟

سوزوکی ڈین میں جو لوگ بوری لے کر آئے تھے وہ کب کے جاچکے تھے اور آس پاس کی روزمرہ زندگی بغیر کچھ دیکھے سنے معمول کے مطابق جاری تھی۔ چند لوگوں نے اگر کتے کو بوری سے برآمد ہوتے دیکھا بھی تو یہ ان کے نزدیک ایک معمولی سی کارروائی تھی۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ اگلے 15 منٹ بعد تک یہ بات یا یہ واقعہ لوگوں کو یاد رہتا۔ پلاٹ کے سامنے نتھو قصاب کی دکان تھی جو شام ڈھلے تک پانی ملے گوشت کو فروخت کرتا رہتا تھا، گویا اس ننھے کتے کے لیے یہاں خوراک کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اگلی دکان ایک موبائل شاپ تھی جس کے آس پاس چند نوجوان لڑکے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ جبکہ اس کے قریب ہی دو تین دکانیں اور بھی تھیں۔ وہ کتا جہاں سے بھی آیا یا زبردستی لایا گیا تھا، اب اس کا موجودہ مسکن کئی گنا بہتر تھا۔ خالی پلاٹ میں اس کے لیے مکمل جنگل کا ماحول تھا اور قریب ہی قصاب کی دکان تھی۔ گویا قیام کے علاوہ طعام کا بھی مستقل بندوبست تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کتے نے گھاس میں سے سر اُبھارا، اس کی جسامت ایک بڑی بلی کے برابر تھی۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرتے ہوئے وہ پلاٹ سے باہر آگیا۔ اس نے مخصوص انداز میں خود کو دو تین جھٹکے دیے جس سے جوہڑ کا پانی چھینٹوں کی صورت میں اس کے جسم سے الگ ہوگیا۔ پھر اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور منہ کھول کر لمبی سی جمائی لے کر باریک سی آواز نکالی، پھر خراماں خراماں چلتے ہوئے قصاب کی دکان کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کچھ دیر تک اردگرد کا جائزہ لیا جیسے وہاں پر دوست اور دشمن کی تعداد کا اندازہ لگا رہا ہو۔

چند لمحوں بعد وہ بیچ گلی میں آکر بیٹھ گیا۔ دور سے ایک سائیکل سوار آرہا تھا جو بالکل اس کی سیدھ میں تھا۔ کتے نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شاید سائیکل سوار اپنا راستہ بدل لے لیکن جب وہ بالکل سر پر آگیا تو وہ ایک ہلکی سی بھونک کے ساتھ گلی پار کر گیا۔ کچھ فاصلے پر دو تین کتے اور بھی موجود تھے جو خاصے ہٹے کٹے تھے، انہوں نے غور سے اس ننھے کتے کو دیکھا پھر تینوں اس پر بھونکنے لگے۔ وہ بھی اپنی باریک سی آواز میں تینوں کو اسی انداز میں جواب دے رہا تھا جس پر ایک موٹا سا کتا غصے میں آگیا اور اس کی طرف لپکا۔ یہ دیکھتے ہی ننھے کتے نے الٹے قدموں دوڑ لگائی اور پلاٹ کی جھاڑیوں میں ایک بار پھر گم ہوگیا۔ بڑا کتا کچھ دیر تو جھاڑیوں کو دیکھ کر بھونکتا رہا پھر واپس اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا جو قصاب کی حرکات وسکنات کو بغور دیکھ رہے تھے۔ قصاب نے ایک بڑا سا چھیچھڑا ان کی طرف اچھال دیا۔ وہ تینوں کتے بیک وقت اس کی طرف لپکے مگر اس سے پہلے ہی ساتھ والی دیوار پر بیٹھے ہوئے کوّے نے گویا غوطہ لگایا اور اس چھیچھڑے کو چونچ میں دبا کر اڑ گیا۔ اپنی خوراک کو لٹتا دیکھ کر کتے ایک بار پھر قصاب کی طرف دوستانہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

دن گزرتے گئے، اس خالی پلاٹ میں اب خاصی گھنی جھاڑیاں بن گئی تھیں، ویسے بھی وہ پلاٹ دو کنال کا تھا۔ اس کتے نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ نتھو قصائی کے تازہ چھیچھڑے اور ہڈیوں کا اثر اس کتے کی صحت سے ظاہر تھا۔ اب اس کے ساتھ دو تین اور کتے بھی گھومتے تھے لیکن وہ اپنے مسکن میں تنہا رہتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے پلاٹ سے نکلا اگلی ٹانگوں کو پھیلا کر انگڑائی لی اور کسی انجان راستے کی طرف چل دیا۔ شام سے کچھ دیر پہلے لوٹا تو اس کے ہمراہ اس کی نئی ہم سفر بھی تھی، وہ کتیا اس کے ہاتھ نہ جانے کہاں سے لگ گئی تھی؟ اب دونوں ساتھ ساتھ دکھائی دیتے تھے۔ آس پاس کے چند اور کتے بھی کبھی کبھی اس کتیا سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے مگر وہ کتا کچھ اس طرح سے غراتا کہ وہ سہم کر دور ہٹ جاتے تھے۔ پھر ان دونوں کی محبت رنگ لائی اور اس پلاٹ میں دو پلوں نے جنم لیا۔ ایک گورا چٹا تھا جبکہ دوسرا کالا۔ اب کتیا کا زیادہ وقت پلاٹ میں ہی بسر ہوتا تھا، کتا بھی کم کم نظر آتا تھا۔ دونوں پلے رفتہ رفتہ بڑے ہونے لگے۔ گورا پلا کالے سے قد میں بڑا ہوتا گیا جبکہ کالا تقریباً بلی جیسا ہی رہا۔ جب دونوں ماں باپ کہیں باہر جاتے تو گورا کتا بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ کالا کتا ساتھ چلنے لگا تو کتیا نے اس کو بری طرح جھنجھوڑ ڈالا جس پر وہ کاؤں کاؤں کرتے ہوئے واپس جھاڑیوں میں چلا گیا۔ کتیا کا سلوک دونوں پلوں سے خاصا غیر مساویانہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گورے پلے کو پسند کرتی ہو جبکہ کالے سے اس کو خاص لگاؤ نہیں تھا۔ کالا پلا خاصا چڑچڑا سا [illegible] اس کے ماں باپ اور بھائی کہیں چلے جاتے تو وہ [illegible] باریک آواز میں بھونکتا رہتا تھا۔ جب وہ واپس آجاتے تو اس کی آواز بھی بند ہوجاتی تھی۔

کچھ عرصے بعد ایک دن کتا اور کتیا پلاٹ سے باہر نکلے۔ گورا پلا بھی ان کے ساتھ تھا اور [illegible] پھر وہ کبھی دوبارہ لوٹ کر نہ آئے۔ شاید انہوں نے یہ علاقہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے چار پانچ دنوں تک ان تینوں کا انتظار کیا مگر وہ تو شاید کوئی نئی جگہ ڈھونڈ چکے تھے۔ وہ کالا کتا جو کہ تنہا رہ گیا تھا، سارا دن اپنے پلاٹ میں بیٹھا بھونکتا رہتا تھا۔ قد اس کا بلی سے کچھ ہی بڑا تھا۔ کمزور اس قدر تھا کہ اس کی پسلیاں نظر آتی تھیں۔

ایک دوپہر کو وہ اپنے مسکن سے باہر نکلا۔ زمین کو سونگھتے ہوئے آگے بڑھا اور قصاب کی دکان کے سامنے بیٹھ گیا۔ قصاب نے ایک ہڈی باہر پھینکی، وہ ہڈی کی جانب جانا چاہتا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے ایک بدمعاش قسم کا کتا اس ہڈی کو منہ میں دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ پلا اس کتے پر یوں بھونکنے لگا جیسے گالیاں دے رہا ہو۔ اس دن وہ کافی دیر تک بھونکتا رہا یہاں تک کہ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ میں گھر گیا اور فریج سے گوشت کا ٹکڑا نکال لایا اور اس کی طرف پھینکا مگر وہ ہی لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے سمجھا کہ میں شاید پتھر مار رہا ہوں۔ گوشت کا وہ ٹکڑا گلی میں ہی پڑا رہ گیا اور وہ ننھا کتا جھاڑیوں میں گم ہوگیا۔ میں نے وہ بوٹی اٹھائی اور جھاڑیوں کی طرف اچھال دی۔

اگلے کئی روز تک وہ مجھے قصاب کے آس پاس گھومتا ہوا نظر آیا۔ وہ مسلسل زمین سونگھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں جوہڑ کے کیچڑ سے لتھڑے ہوئے تھے۔ شاید وہ بھوکا تھا۔ پھر اسے ایک بوسیدہ سی ہڈی نظر آگئی، وہ اس کی طرف لپکا اور اگلے دونوں پاؤں میں پھنسا کر اس سے زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ ہڈی شاید کسی کتے نے کھانے کے بعد پھینک دی تھی۔ ننھا کتا کافی دیر تک اس کے ساتھ گویا لڑتا رہا، پھر اس نے ہڈی کو وہیں چھوڑ دیا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ چند فٹ دور کھڑے ایک بچے نے اس کی طرف پتھر پھینکا تو وہ فوراً بھاگ کر اس پلاٹ میں گھس کر غائب ہوگیا۔

میرا دل شدت کے ساتھ چاہا کہ میں پلاٹ میں گھس کر اس کے آگے ہڈیوں اور گوشت کا ڈھیر لگا دوں، اس سے خوب باتیں کروں، اس کو اپنے ساتھ سلاؤں، اس کو وہ پیار دوں جو اسے کبھی ملا ہی نہ تھا۔ نہ جانے اس کو پیار کی ضرورت تھی یا نہیں۔ ہوسکتا ہے کتا پیار کا مطلب ہی نہ جانتا ہو۔ پھر مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ اور بھائی کو یاد کرتا ہے۔ شاید اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی محرومی تھی۔ تب ہی چھوٹا رہ گیا ہے۔ اس نے کوئی دوست بھی تو نہیں بنایا تھا۔ ایسی ہی نہ جانے کتنی سوچیں میرے ذہن میں گردش کرتی رہتی تھیں۔

اب میں نے یہ دیکھنا شروع کردیا کہ وہ روزانہ مسلسل کئی کئی گھنٹے آنے جانے والے لوگوں پر بھونکنے لگا ہے۔ اس کی پتلی آواز پر کسی نے بھی کبھی کان نہیں دھرا تھا۔ میں گھر سے نکلا تو وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مسلسل عف عف کر رہا تھا۔ دور سے ایک نوجوان اپنے بڑے سے بل ڈاگ کے ہمراہ آرہا تھا، وہ بل ڈاگ واقعی کسی بل سے کم نہ تھا۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے میں رہنے اور اچھی خوراک کھانے کی وجہ سے وہ خاصا صحت مند تھا۔ جب وہ بل ڈاگ میرے سامنے سے گزرا تو وہ ننھا کتا اس پر بھی بھونکنے لگا جس پر اس بل ڈاگ کے قدم رک گئے اور وہ سرزنش کرنے والی نظروں سے اس بلی جیسے پلے کو دیکھنے لگا جو اس بل ڈاگ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسلسل بھونک رہا تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی سی بجنے لگی پھر دفعتاً اس بل ڈاگ نے اس ننھے پلے کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ پلا جلدی سے پلاٹ کی جانب بڑھا لیکن وہ بل ڈاگ اپنے مالک سے زنجیر چھڑا چکا تھا، اس نے کسی چیتے کے مانند چھلانگ لگائی اور پلے کو دبوچ لیا۔ کتے کی خوفناک غراہٹ کے ساتھ پلے کی دردناک آوازیں میرے کانوں میں ہتھوڑے کے مانند برس رہی تھیں، اس کے مالک نے اپنے بل ڈاگ کو کئی بار آوازیں دے کر بلایا مگر وہ تو جیسے اپنے ہوش میں نہ تھا۔ اس ساری دھینگا مشتی میں جو کہ تعفن زدہ کیچڑ میں ہو رہی تھی صرف وہ بل ڈاگ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ننھا کتا دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کی دم توڑتی ہوئی پتلی پتلی سی دردناک آواز اب بھی آرہی تھی۔ یہ منظر میری برداشت سے باہر تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ تک یہ یک طرفہ جنگ ہوتی رہی پھر جب ننھے کتے کی آوازیں یکسر معدوم ہوگئیں تو وہ بل ڈاگ باہر نکلا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا، پھر زمین پر لیٹ گیا۔ جب اس کی سانس درست ہوئی تو مالک کی طرف بڑھا۔ یکبارگی اس نے مقتل کی جانب دیکھا جیسے اس ننھے کتے کی موت کا یقین کر رہا ہو، مالک نے اس کو ڈانٹ پلائی اور زنجیر تھام کر روانہ ہوگیا۔

میرے علاوہ دو تین لوگوں نے کچھ دیر کے لیے رک کر اس تماشے کو دیکھا، پھر آگے بڑھ گئے۔ گلی میں معمول کی زندگی رواں دواں تھی جیسے روز ہوتی تھی۔ میں نے ایک موہوم سی امید پر جوہڑ میں دیکھا کہ شاید اس پلے میں زندگی کی رمق موجود ہو مگر وہاں خاموشی کا راج تھا۔

اس ننھے پلے نے اپنے سے طاقتور کو للکارا تھا۔ سزا تو پھر ملنی تھی۔ اندھی طاقت کے نزدیک کمزور کے لیے کم سے کم سزا موت ہے۔ آج بھی ایک اندھی طاقت نے ایک کمزور کو جرم ضعیفی پر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محفلِ شعر و سخن

❊ محمد امجد ریاض   چیچہ وطنی، ضلع ساہیوال
جو آنا چاہو ہزار رستے، نہ آنا چاہو تو عذر ہزاروں
مزاج برہم، طویل رستہ، برستی بارش، خراب موسم

❊ محمد زریان سلطان.....اردو بازار، کراچی
ہر اک ملک نے اپنے افکار بدلے
مگر ہم نے ہرگز نہ اطوار بدلے
وہی ریت صدیوں سے قائم ہے اپنی
نہ نادار بدلے نہ زردار بدلے

❊ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
میرے ہونے ہی سے مشروط ہے ہونا تیرا
دیکھنے والا نہ ہو تو آئینہ کچھ بھی نہیں

❊ شوکت علی.....گلبرگ، لاہور
آندھی کی زد میں آئے ہوئے پھول کی طرح
میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فضا میں بکھر گئی

❊ عمران حیدر بلوچ...ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہوا نے موسم باراں سے سازشیں کر لیں
مگر شجر کو خبر ہی نہیں شرارت کی

❊ قاسم نصیب.....صفدر آباد، شیخوپورہ
شبِ تاریک رستے میں جو آ جائے تو یہ آنکھیں
کبھی جگنو، کبھی تارے، کبھی قندیل کر لینا
ہمیشہ سے یہی اپنا شعارِ زندگی رکھنا
جو رستہ عام ہو جائے اسے تبدیل کر لینا

❊ محسن علی.....بالاکوٹ
بارش ہوئی تو پھول کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفاک ہو گئے

❊ حسنین عباس بلوچ...ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
تاروں میں چمک نہ گلابوں میں باس ہے
تم کیا گئے ہو شہر کی ہر شے اداس ہے.....!
کیسے چھپاؤں گا میں تیرے پیار کی دھنک
ہر شخص تیرے شہر کا چہرہ شناس ہے!

❊ طاہرہ یاسمین.....سرگودھا
بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی، آنکھوں میں مسکراؤں گی

❊ ڈاکٹر وسیم خالق گہیاں...گجرات
اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
کیوں دیں تیرے دل کو تہمت ویران دل
زلزلوں میں تو بھرے شہر بھی اجڑ جاتے ہیں

❊ ہنی ایمان.....کراچی
تمہی سے اے مجاہدو جہان کا ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

❊ تفسیر عباس بابر.....اوکاڑہ
سر پہ حالات کی شمشیر سے جاگتے رہنا
ہر گھڑی گھات میں تقدیر ہے جاگتے رہنا
بچنا ہے امیرِ شہر کے قزاقوں سے اگر!
تو بس ایک ہی تدبیر ہے، جاگتے رہنا

❊ رانا مختار احمد...ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

❊ پیارے یوسف میاں.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی یاد نہ جب ان کو ہم آئے

❊ عاصم اقبال جسپال...ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
گزر چلی تھی دبے پاؤں شام تنہائی
تیرا خیال جو آیا تو آنکھ بھر آئی

❊ ذیشان افتخار ڈھلوں.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

❊ صوبیدار (ر) انوار بنگش.....ملیر کینٹ کراچی
سندر، کومل سپنوں کی بارات گزر گئی جاناں
دھوپ آنکھوں تک آ پہنچی ہے رات گزر گئی جاناں

❊ عون عباس بابر.....اوکاڑہ
قافلہ تو رات بھر چلتا رہا
میں چراغِ شب تھا سو جلتا رہا

❊ ریاض بٹ.....حسن ابدال
عید کا چاند ہے خوشیوں کا سوال اے دوست
خوشیاں بھیک میں مانگنے سے کہاں ملتی ہیں

❊ ماہا ایمان.....پنجاب
کس جان گلستان سے یہ ملنے کی گھڑی تھی
خوشبو میں نہائی ہوئی اک شام کھڑی تھی
یوں دیکھنا اس کو کہ کوئی اور نہ دیکھے
انعام تو اچھا تھا مگر شرط کڑی تھی

❊ محمد قاسم.....ضلع خوشاب
تمنا دید کی موسیٰ کرے اور طور جل جائے
عجب دستورِ الفت ہے کرے کوئی، بھرے کوئی

❊ راجا ضیاء الحسن کیانی.....رتی ٹبی، ساہیوال
ہم اپنی کہانی کس سے کہیں خود ہم کو جھوٹی لگتی ہے
وہ کون تھا، کس کو چاہا تھا، اے عمرِ گریزاں بھول گئے

❊ محمد آصف ساجد.....ارزانی پور، قصور
ہم کو جدا نہ کر دے یہ ایک فرق ذرا سا
تم فاصلوں کے قائل، میں قربتوں کا پیاسا

❊ زاہد آزاد   نمیال
تو مرے حق میں کوئی نیک فال دے مولا
کبھی تو بدبخت کو مرے [illegible] دے مولا

❊ محمد انور ندیم.....حویلی لکھا، اوکاڑہ
کریں ترک زمیں یا جائیں جاں سے
وہی انداز ان کے آسماں سے

❊ عدنان صدیقی.....ملتان
سنائیں جب حال دل وہ اپنا میرے مسافر خوش رہنا
وہ جھوٹ بولیں تو کچھ نہ کہنا صداقتوں کا حساب رکھنا

❊ اختر شاہ عارف.....جہلم
کوئی منزل کوئی سایہ تو نظر آنے دو
پھر بڑے شوق سے تم جدا ہو جانا
مجھ سے فرطِ محبت میں ہوئے تھے سجدے
تمہیں کس نے کہا تھا کہ خدا ہو جانا

❊ ارسلا اختل.....روہڑی
اک زمانہ ہوا ہم کو جیتے ہوئے
بے بس جیے جانا ضروری نہیں

❊ افشاں.....وہاڑی
یہی چار تنکے تو تھے آشیاں میں
جلا کر ملا تجھ کو کیا آشیانہ

❊ رضوان.....لاہور
نہ جانا کہ جاتا ہے دنیا سے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

❊ ارحم علی.....گوجرانوالہ
آتے نہیں انداز مجھے حسنِ طلب کے
اے رحمتِ یزداں یہ مرا دستِ دعا ہے

❊ نوروز خان.....ایبٹ آباد
میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہن رکھے ہیں دستانے

❊ نوشین ناز.....راولپنڈی
آج تمہاری خونخواری پر حیرت ہے حیوانوں کو
تم تو کل تہذیب سکھانے نکلے تھے انسانوں کو

❊ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
شہر آبادی سے خالی ہو گئے، خوشبو سے پھول
اور کتنی خواہشیں ہیں جو دلوں میں قید ہیں

❊ آصف محمد   حیدر آباد
ایک ایک کر کے خود سے بچھڑنے لگے ہیں ہم
دیکھو تو جا کے قافلہ سالار کون ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

❊ محمد کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
قربتیں ہوتے ہوئے بھی فاصلوں میں قید ہیں
کتنی آزادی سے ہم اپنی حدوں میں قید ہیں

❊ مولا بخش......میر پور ساکرو
ہم اہلِ عشق پر ایسا بھی دور آیا محبت میں
کوئی بھی ابتدا کرتا مگر آخر کرتے ہم

❊ عمیر منہاس......گلشن اقبال، کراچی
ہم ایک قتل کے عینی گواہ ہیں لیکن
بتانا چاہتے ہیں پر زباں نہیں رکھتے

❊ جبران احمد......کراچی
تمام عمر اسی آرزو میں بیت گئی
ہمیں بھی ٹوٹ کے چاہے کوئی ہماری طرح

❊ عبدالعزیز......کراچی
ہیں چند احباب ایسے اپنے جنہیں نہ آیا حساب کرنا
کہ بھول سارے سمیٹ لیں گے ہمیں کہ عادت ہے بھول کرنا

❊ حاجی محمد زاہد اقبال زرگر......نئی منڈی سکھیکی
یاد آیا ہے وہ اور بھی شدت سے ہمیں
بھول جانے کا اسے جب بھی ارادہ چاہا

❊ ریما سلیم......کراچی
جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
ان کو زباں ملی تو ہمی پہ برس پڑے

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
کوئی تو برسات ایسی ہو جو تیرے سنگ برسے "جاناں"
تنہا تو میری آنکھیں روز برستی ہیں

❊ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
پینے کا مجھے کچھ شوق نہیں فقط گزارہ کرتا ہوں
کچھ دیر نشے کی لہروں میں دنیا سے کنارہ کرتا ہوں

❊ احمر علی......نواب شاہ
مہک اٹھا صحنِ چمن یار کے آجانے کے بعد
لجا گئی شاخِ گل زلف کے لہرانے کے بعد

❊ اشفاق خانزادہ......اسلام آباد
شمع کی لو پہ کیوں پروانہ آن گرتا ہے
کسی نصاب میں ایسا کوئی سوال نہیں

❊ محمد آصف پیرزادہ......گوجرانوالہ
اٹھائیں ناز حور شمائل کب تک
ہوگا دل آخر تیرا قائل کب تک

❊ اطہر حسین......کراچی
ہم اپنے دل کے پردوں سے رہے ناآشنا برسوں
کہاں موجود تھا وہ اور ہم اس کو کہاں سمجھے

❊ ملک آصف نواز تلوکر......کینال کالونی، لیہ
سب کو سیراب وفا کرکے بھی خود کو پیاسا رکھنا
ہم کو لے ڈوبے گا اے دل تیرا دریا ہونا

❊ محمد اقبال......کورنگی، کراچی
لوگ ہم ایسے نادانوں کو آئیں ہے سمجھانے بھی
تیرا غم پھر تیرا غم ہے غم ہے تو غم خوار بہت

❊ امتیاز احمد......عظیم پورہ، کراچی
چراغِ صبح سے شامِ وطن کی بات کرو
جو راہ میں ہے ابھی، اس کرن کی بات کرو

❊ مجاہد رضا......جامعہ ملیہ، کراچی
جو آتا ہے نظر ویسا ہی کیوں ہو
کہ ہر محمل نشیں لیلیٰ ہی کیوں ہو

❊ راشد خان......گلشن حدید، کراچی
عجب نہیں جو کبھی پھر کسی بہانے آئے
ابھی گیا ہے جو آنکھیں دکھا کے رستے میں

❊ سید محی الدین......سیالکوٹ
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لہجہ
بدل دیتا ہے لفظوں کے معانی

❊ محمد خرم......لاہور
سہمے ہوئے لوگوں پہ مکانوں کی چھتوں پہ
اک تیغ نئے خوف کی سو بار گری ہے

کوپن برائے شمارہ نومبر 2011

محفلِ شعر و سخن

نام: ....

پتا: ....

سمجھداری اچھی چیز ہے مگر... جب مکاری کی حدود میں داخل ہوجائے تو "سمجھ" اور "داری" کے راستے جدا ہوجاتے ہیں۔ گویا یوں سمجھ لیں کہ ساری سمجھ... دار پر چڑھ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ بھی ہوا... جب عقل دور کھڑی اس پر کبھی ہنستی اور کبھی ماتم کرتی رہی... جبکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔

ایک کامیاب بزنس مین کی ناکام چالوں کا احوال

سیانا

مسرت کے حسان

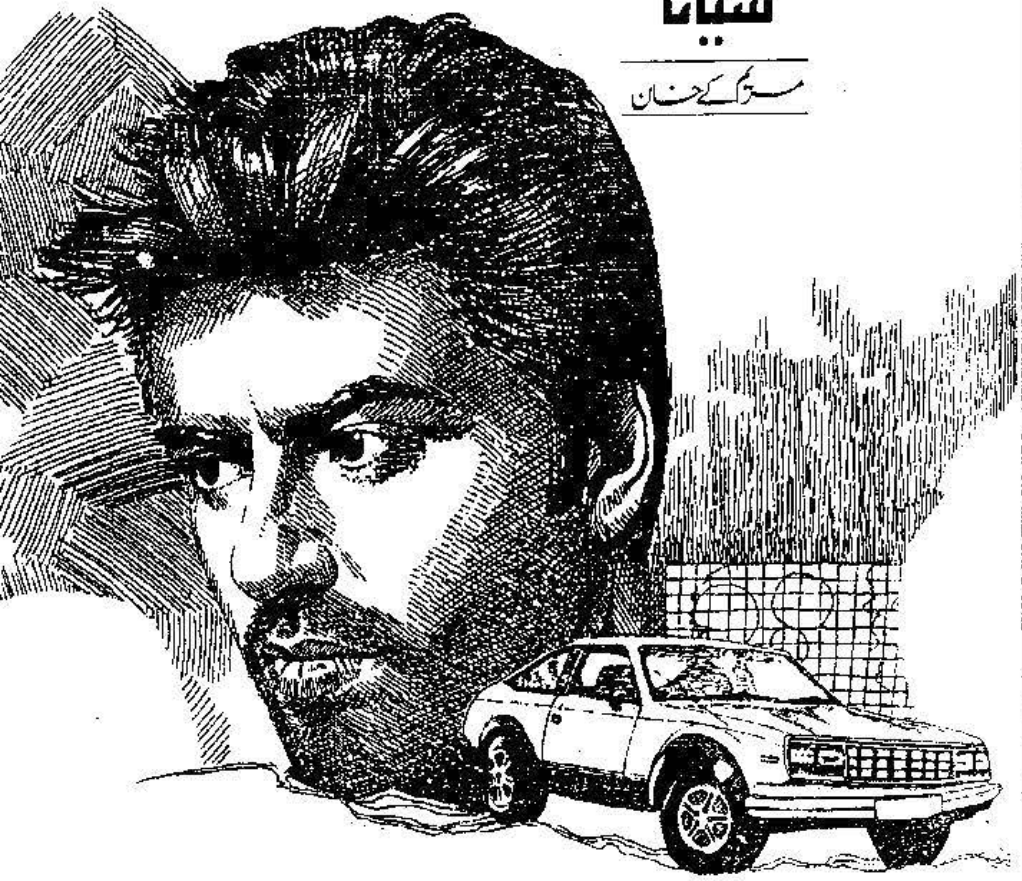

میرا نام جونی کیمپ ہے۔ میں اینٹیک گاڑیوں کا ڈیلر ہوں اور ان کی تلاش میں پورے امریکا میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ ویسے میری رہائش اور کاروبار فلوریڈا میں ہے کیونکہ یہاں دولت مندوں کو اینٹیک گاڑیاں جمع کرنے کا شوق ہے اور ان میں سے بہت سے میرے گاہک بھی ہیں۔ اینٹیک کاروں یا گاڑیوں سے مراد یہ نہ لی جائے کہ کسی زمانے میں کوئی بہت خاص گاڑی یا کار تیار کی گئی تھی جو اب اینٹیک میں شمار ہوتی ہے۔ بلکہ جنگ عظیم اور خاص طور سے انیس سو تیس کی دہائی کے درمیان بننے والی لگژری گاڑیاں اینٹیک میں شمار ہوتی ہیں۔ بعض ایسی عام گاڑیاں جو بہت پہلے بنی ہوں اور اصل حالت میں ہوں وہ بھی اینٹیک کے شوقین لے لیتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا زیادہ تر کاروبار کباڑیوں کے توسط سے چلتا ہے۔ ان کے پاس کوئی پرانی کار اچھی حالت میں آتی ہے تو وہ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں اور اگر میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ٹھاک ہو کر اچھی قیمت میں نکل جائے گی تو میں اسے خرید لیتا ہوں۔ پرانی گاڑیاں ٹھیک کرنے کے لیے میرے پاس ایک ورکشاپ ہے جس کا سپر وائزر شہاب پرانی گاڑیوں کا ماہر ترین مکینک ہے۔ شہاب ایرانی ہے لیکن گزشتہ تیس سال سے امریکا میں ہے۔ وہ شاہِ ایران کے شاہی گیراج کے سیکڑوں مکینکوں میں سے ایک تھا۔ اس لیے جب انقلاب آیا تو اسے بھی فرار ہونا پڑا۔ شاہ ایران کو تو نہیں البتہ اس کے بہت سارے حامیوں کو امریکا میں پناہ مل گئی تھی اور شہاب ان میں سے ایک تھا۔ اسے تقریباً تمام پرانی گاڑیوں کے تمام حصوں کا کام آتا تھا بس وہ انجن کا زیادہ ماہر نہیں تھا لیکن باڈی اور آرائش میں اس کے ہاتھ خوب کام کرتے تھے اور گاڑی کی ظاہری حالت کیسی ہی خراب کیوں نہ ہو وہ اسے بالکل اصل حالت میں لے آتا تھا۔ اس لیے شہاب میرے لیے ناگزیر تھا۔ میں اسے منہ مانگا معاوضہ دیتا تھا تاکہ وہ کہیں اور نہ چلا جائے۔ انجن کے کام کے لیے ایک لڑکا میکگان تھا۔ وہ بھی اپنے کام کا ماہر تھا۔ اگر کسی گاڑی کا کوئی پرزہ نہیں ملتا تھا تو میں اسے ایک خاص کارخانے سے بنوا لیتا تھا۔ یہ کارخانہ اسی قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔

کباڑیوں کی مدد سے کام تو چلتا رہتا تھا لیکن اس میں دو قباحتیں تھیں۔ اول وہ مجھے زیادہ اچھی گاڑیاں نہیں دیتے تھے۔ یہ گاڑیاں وہ اس کام میں موجود ایسے افراد کو دیتے تھے جو ان کو منہ مانگی قیمت دے سکتے تھے۔ دوسرے وہ درمیانے درجے کی گاڑیوں کی بھی اچھی خاصی قیمت وصول لیا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے اچھی لگژری گاڑیوں کی تلاش میں جنک یارڈ کھنگالنے کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔ یہاں سے اکثر مجھے اچھی گاڑیاں بہت کم قیمت میں مل جاتیں۔

میں سال میں دو مرتبہ پرانی گاڑیوں کی تلاش میں نکلتا تھا اور میری توجہ کا مرکز وہ جنک یارڈ ہوتے تھے جہاں لوگ اپنی ناکارہ یا پرانی ہو جانے والی گاڑیاں چھوڑ آتے تھے اور جنک یارڈ والے انہیں توڑ پھوڑ کر اسکریپ میں تبدیل کر دیتے تھے۔ یہ اسکریپ بیچ دیا جاتا۔ پورے امریکا میں ایسے دو ہزار سے زیادہ جنک یارڈ ہیں جنہیں پرانی گاڑیوں کا قبرستان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر شہروں اور آبادی سے باہر ویرانوں میں پھیلے ہوتے ہیں اور ان میں بعض اوقات بڑی نایاب گاڑیاں مل جاتی ہیں۔

دو سال پہلے مجھے بتیس کے ماڈل کی ڈیملر کار ملی تھی۔ یہ بالکل اصل حالت میں تھی لیکن برسوں سے کھڑے کھڑے اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔ یہ ہٹلر کی پسندیدہ کار تھی اور وہ اسے اپنی سواری کے لیے استعمال کرتا تھا۔ جنک یارڈ سے یہ مجھے صرف ایک سو تیس ڈالرز کی مل گئی اور اسے ورکشاپ تک لانے میں میرے پانچ سو ڈالرز خرچ ہوئے پھر اسے اصل شکل میں بحال کرنے پر پانچ ہزار ڈالرز سے زیادہ کا خرچ آیا تھا لیکن ایک شوقین نے اسے ایک لاکھ پینتالیس ہزار ڈالرز میں ہنسی خوشی خرید لیا تھا۔ اس طرح چانس کے سودے سال میں ایک آدھ بار ملتے تھے اور سال بھر کی کسر پوری ہو جاتی تھی۔ میری خوشحالی کا راز ایسی ہی گاڑیاں تھیں جو مجھے جنک یارڈ سے سستے داموں مل جاتی تھیں۔ ان کی وجہ سے میں نے ساحل کے ساتھ شاندار قسم کا بیچ ولا خریدا تھا اور اس سے کچھ ہی دور میری ورکشاپ تھی۔ میرے پاس دو بہترین گاڑیاں تھیں اور میری بیوی، بچوں کو ہر آسائش میسر تھی۔

ایک سفر کے دوران میں، میں عام طور سے کسی ایک ریاست میں گھومتا پھرتا ہوں۔ اس بار میں کیلیفورنیا کے لیے نکلا۔ مجھے یہاں آئے کئی سال بیت چکے تھے۔ آخری سفر میں، میں نے یہاں درجنوں جنک یارڈ دیکھے تھے لیکن کوئی کام کی چیز نہیں ملی تھی۔ کیلیفورنیا کے باشندے چیز کے حسن سے زیادہ اس کی مضبوطی دیکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں گاڑیوں کے لگژری ماڈل کم ہی ملتے ہیں۔ مگر لاس اینجلس اور سان فرانسسکو کے آس پاس جنک یارڈز میں بعض اوقات کوئی اچھی چیز بھی آ جاتی ہے۔ میں اپنے فورڈ پک اپ ٹرک میں کیلیفورنیا کے لیے روانہ ہوا۔ میری بیوی نے بے نیازی سے گلے لگا کر رخصت کیا۔ ظاہر ہے شادی کے بیس سال بعد پہلے والی گرم جوشی کہاں رہ جاتی ہے۔ البتہ میرا پندرہ سال کا بیٹا راجر کیمپ اور بارہ سال کی بیٹی مشل کیمپ میرے لیے اداس تھے۔ مشل نے مجھ سے کہا۔

''پاپا جلدی آنا۔''

''میں کوشش کروں گا میری گڑیا۔'' میں نے اس کے گال چومے۔ ''لیکن پاپا کو کام کے لیے دور تو جانا پڑتا ہے۔''

''مشل، راجر اندر آؤ۔'' کورینا نے اندر سے پکارا۔ ''بارش ہونے والی ہے۔''

میں بچوں سے مل کر رخصت ہوا۔ فلوریڈا سے کیلیفورنیا تک فاصلہ کوئی ساڑھے تین ہزار کلومیٹرز ہے۔ میں تیسرے دن کیلیفورنیا میں داخل ہوا۔ دن میں بارہ گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب جہاں

رکوں گا وہاں کم سے کم چوبیس گھنٹے آرام کروں گا اور اس کے بعد ہی آگے روانہ ہوں گا۔ خوش قسمتی سے مجھے لاس اینجلس سے دو سو کلومیٹرز پہلے ایک ڈرائیوان مل گیا۔ یہ خاص طور سے ٹرک ڈرائیوروں کے لیے تھا لیکن کوئی بھی ہائی وے پر سفر کرنے والا اس میں ٹھہر سکتا تھا۔ یہاں زیادہ تر لاس اینجلس سے آنے والے ٹرک ڈرائیور رکتے تھے کیونکہ اس کے بعد انہیں اپنی منزل پر پہنچ جانا ہوتا تھا۔ سفر ختم ہونے سے پہلے وہ اس ڈرائیوان میں دل کھول کر تفریح کر لیتے تھے۔ یہاں اس کے تمام تر مواقع بھی موجود تھے۔ بے شمار کاروں کے موٹلز کے ساتھ بہت بڑا بار تھا جس میں ہر قسم کی شراب میسر تھی، ریستوران تھا جس میں فرمائش پر ہر کھانا مل جاتا تھا اور ایک نائٹ کلب بھی تھا جس میں درجنوں کے حساب سے حسین لڑکیاں ڈرائیوروں کا دل بہلانے کے لیے ہر وقت موجود رہتی تھیں اس لیے یہاں سے گزرنے والے ہر ٹرک ڈرائیور کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ایک بار ضرور رکے۔ بہت سے تو صرف رات میں چند گھنٹوں کے لیے رک کر دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاتے تھے اور میرا خیال تھا کہ ڈرائیوان کی اصل رونق ایسے ہی ڈرائیور تھے۔

میں نے ڈرائیوان میں ایک کمرا حاصل کیا اور کچھ دیر آرام کر کے تفریح کرنے نکل کھڑا ہوا۔ شام ہوتے ہی ڈرائیوان میں رونق نظر آنے لگی اور سورج غروب ہوتے ہی وہاں روشنیوں اور ہنگاموں کا سیلاب سا امڈ آیا۔ سارا دن کے تھکے ہارے ڈرائیور اپنے ٹرک اور گاڑیاں دور تک پھیلی پارکنگ میں کھڑی کرنے لگے۔ میں نے بار کا رخ کیا۔ بار اور نائٹ کلب آپس میں ملے ہوئے تھے لیکن ہر شخص کو نائٹ کلب میں جانے کی اجازت نہیں تھی جب تک وہ ایک ڈالر کا ٹکٹ نہ لے۔ مجھے نائٹ کلب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں نے ٹکٹ نہیں لیا اور بار تک محدود رہا۔ جلد یہاں مجھے ایک اچھی کمپنی مل گئی۔ یہ چند ٹرک ڈرائیور تھے جنہیں صرف پینے پلانے سے دلچسپی تھی۔

گفتگو میں میرے کاروبار کا ذکر آیا تو ایک ڈرائیور بارنی جیکر نے کہا۔ ''تب تمہیں یہاں سے کچھ دور ایک جنک یارڈ کا دورہ کرنا چاہیے۔ یہ لاس اینجلس سے ستر میل کے فاصلے پر ہے اور یہاں زیادہ تر گاڑیاں وہیں سے آتی ہیں۔ اسے جارج شیلٹر نامی شخص چلا رہا ہے اور میں نے اسے بے وقوفی کی حد تک سادہ پایا ہے۔ ایک بار میرے ٹرک کا ٹائر پھٹ گیا تھا اور اس نے مجھے ایسا ہی ٹائر صرف دس ڈالرز میں دے دیا تھا جسے میں نہیں لے لیتا تو اس قسم کا ٹائر سو ڈالرز کم کا نہیں ملتا۔''

''وہاں لگژری گاڑیاں ہوتی ہیں؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''شاید ہوں، میں نے غور تو نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے وہاں لگژری گاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔'' بارنی نے کہا۔ ''تمہیں ایک بار جا کر دیکھنا چاہیے، تمہارے راستے میں ہی پڑے گا۔''

میں نے بارنی سے پتا سمجھ لیا تھا۔ اس رات دیر تک میں بار میں بیٹھا رہا پھر نشہ گہرا ہونے لگا تو میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور اگلے دن سہ پہر تک سوتا ہی رہا۔ میری آنکھ بھوک سے کھلی تھی۔ نہا دھو کر میں نے ریستوران کا رخ کیا۔ بل میں پہلے ہی ادا کر چکا تھا اس لیے چابی موٹل کے کاؤنٹر پر دے کر میں وہاں سے نکل آیا۔ میرا رخ جارج شیلٹر کے جنک یارڈ کی طرف تھا۔ بقول بارنی کے سڑک کے کنارے شیلٹر جنک یارڈ کا بڑا سا بورڈ لگا ہوگا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے بورڈ نظر آ گیا۔ لیکن جنک یارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہائی وے سے کوئی نصف کلومیٹر دور ایک بہت بڑے احاطے میں پھیلا ہوا تھا۔ احاطہ لوہے اور ٹین کی چادروں کی مدد سے تیار کیا گیا تھا اور جہاں کہیں خلا رہ گیا تھا اسے خاردار تاروں سے بند کیا گیا تھا۔ اندر کھڑے ٹرکوں اور بسوں کی جھلک یہاں سے بھی نظر آ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے یہاں زیادہ تر بڑی گاڑیاں آتی ہیں۔ میں نے اپنا پک اپ ٹرک احاطے کے باہر ہی روک دیا اور پانی کا بڑا والا لائین اٹھا کر اندر داخل ہوا۔

کہیں دور ہائیڈرولک کرشر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اس طرف کا رخ کیا۔ یہ بھی میرا ایک حربہ تھا، میں جب کسی جنک یارڈ میں داخل ہوتا تو پانی لینے کا بہانہ کرتا اس طرح جنک یارڈ کے مالک پر واضح نہیں ہوتا کہ میں اصل میں بزنس کے لیے آیا ہوں اور پھر اپنے مطلب کی چیز جیسے اتفاقاً دیکھ لیتا تھا لیکن جیسے جیسے میں اس جنک یارڈ میں آگے بڑھ رہا تھا مجھے مایوسی ہو رہی تھی۔ یہ بیچ زیادہ تر بڑی گاڑیوں کا جنک یارڈ تھا۔ یہاں ٹرک، منی ٹرک، بسیں اور وین کھڑی تھیں۔ بالآخر میں کرشر کے پاس پہنچ گیا۔ یہ بہت بڑا کرشر تھا جو بس اور ٹرک کی باڈی کو بھی دبا کر اسے ڈبے میں تبدیل کر سکتا تھا اور اس وقت وہ ایک بس کو دبا کر اسے چھوٹے سے چوکور ڈبے میں تبدیل کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوئی تیس فٹ لمبی اور بارہ فٹ چوڑی اور اونچی بس صرف دو ضرب دو فٹ کے چوکور ڈبے میں تبدیل ہو گئی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر ایک کرین نے یہ ڈبا اٹھا کر ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں رکھ دیا جہاں پہلے ہی ایسے بے شمار ڈبے موجود تھے۔

میں آس پاس دیکھ رہا تھا۔ کرشر اور کرین چلانے والے تو اپنی جگہ موجود تھے لیکن اس کے علاوہ وہاں کوئی اور شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ میں کرشر سے ذرا دور آیا اور ایک کیبن کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ باسٹھ ماڈل کی پورشے تھی۔ سیاہ رنگ جو یقیناً اصلی تھا اور اس کے ٹائر اور وہیل کیپ تک اصلی تھے۔ پورشے میری پسندیدہ ترین کاروں میں سے ایک تھی کیونکہ یہ بہت مہنگی ہے۔ پورشے ایک زمانے میں تیز رفتار اسپورٹس کاروں کے شوقین حضرات کی پہلی ترجیح ہوتی تھی۔ درحقیقت یہ پہلی کار تھی جسے تیز رفتار ڈرائیو کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس کا چھ سلینڈر کا طاقت ور انجن اسے صرف ایک منٹ میں سو میل فی گھنٹا کی رفتار تک پہنچا دیتا تھا۔ اس کا خصوصی ایروڈائنامک ڈیزائن اسے تیزی سے سفر کرنے میں مدد دیتا تھا۔

میری سمجھ نہیں آیا کہ یہ کار یہاں کیسے موجود تھی کیونکہ جس شخص کے پاس پورشے ہو وہ اسے بیچنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے ان جنک یارڈز میں دنیا کی ہر گاڑی دیکھی لیکن مجھے آج تک کہیں پورشے نظر نہیں آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ایک پورشے اور وہ بھی اتنی اچھی حالت میں ایک جنک یارڈ میں کھڑی نظر آرہی تھی۔ اس کی باڈی درست حالت میں تھی۔ ٹیوں کا کور خراب ہو رہا تھا لیکن ان کی ساخت برقرار تھی اور سب سے بڑھ کر کار کا ڈیش بورڈ اصل حالت میں تھا۔ کسی بھی پرانی کار کا ڈیش بورڈ بالکل اصل کی طرح بنوانا نہایت دشوار کام ہے۔ اس لیے کوئی پرانی کار اصل ڈیش بورڈ کے ساتھ مل جاتی تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا تھا۔ مجھے احساس نہیں ہوا کہ میں پاگلوں کی طرح کار کو گھورے جا رہا تھا۔ خاصی دیر بعد کوئی کھنکارا تو میں چونکا تھا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جس نے ڈانگری پہن رکھی تھی۔

''معاف کرنا۔'' میں نے خفت سے کہا۔ ''وہ میں اسے دیکھ کر متاثر ہوا ہوں۔ کیا خوب صورت وہیل ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں اچھی کار ہے۔''

''کار نہیں میں صرف پہیوں کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ''ویسے یہ کون سی کار ہے؟''

''پتا نہیں شاید یورپ کا کوئی ماڈل ہے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پورشے سے ناواقف تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلایا۔ ''تم دیکھ رہے ہو یہاں زیادہ تر بڑی گاڑیاں ہیں اس لیے مجھے چھوٹی گاڑیوں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔''

''مجھے جونی کیمپ کہتے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''جارج شیلنر۔'' اس نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

میں نے کیبن ہلایا۔ ''میں ہائی وے پر سفر کر رہا تھا میری پک اپ کا انجن گرم ہو گیا اور میں پانی کی تلاش میں یہاں چلا آیا۔''

''تمہیں پانی ضرور ملے گا۔'' اس نے خلوص سے کہا۔ ''ایک کپ کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں خوش ہو گیا۔ ''میں شکر گزار ہوں مسٹر شیلنر۔''

اس نے ایک کونے میں لگے نل کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم وہاں سے پانی لے سکتے ہو۔ جب تک تم پانی بھرو میں کافی لاتا ہوں۔''

وہ کہہ کر کیبن میں چلا گیا۔ یہ چھوٹا سا خود ساختہ کیبن اور یقیناً جارج شیلنر کا دفتر تھا کیونکہ اتنے چھوٹے سے کیبن میں رہائش کی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی لیکن کیا کہا جا سکتا ہے انسان بعض اوقات سونے کے لیے درکار جتنی جگہ میں بھی رہ سکتا ہے۔ میں کیبن کے نل کی طرف بڑھ گیا اور اس سے پانی بھرنے لگا۔ جب تک میں نے کین میں پانی بھرا وہ کیبن کے اندر سے دو کپ کافی لے آیا۔ اس نے ایک کپ مجھے دیا۔ ''تم لاس اینجلس جا رہے ہو؟''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''اگر تم لاس اینجلس سے آرہے ہوتے تو سڑک کے دوسری طرف سے گزرتے اور اس طرف سے میرے جنک یارڈ کا بورڈ نظر نہیں آتا ہے۔''

''تم نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے مسٹر شیلنر۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا اور کافی کی چسکی لے کر بولا۔ ''کافی بھی اچھی ہے۔''

وہ واقعی سادہ آدمی تھا، میری اتنی سی تعریف سے خوش نظر آنے لگا۔ مگر میں اتنی جلدی اس کی سادگی پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جنک یارڈ چلانا اور اس سے نفع کمانا سادہ مزاج آدمی کا کام نہیں ہے۔ سادہ نظر آنا اور بات جبکہ سادہ ہونا اور بات۔

''تمہارا جنک یارڈ بہت بڑا ہے اور یہاں گاڑیاں بھی خاصی نظر آرہی ہیں۔'' میں نے آس پاس دیکھا۔ ''اس کا مطلب ہے تمہارا کاروبار اچھا چل رہا ہے؟''

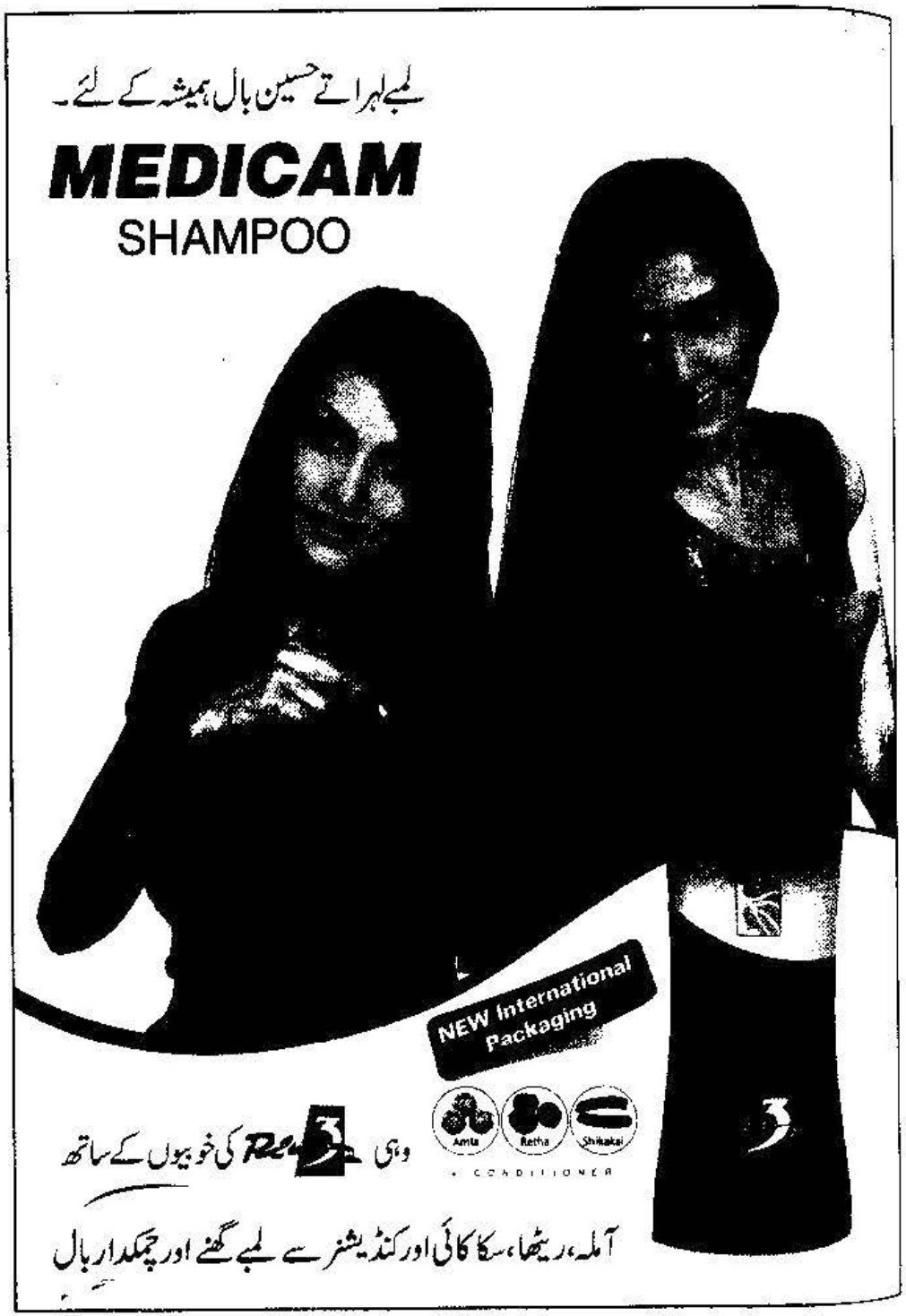

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''بہت حد تک'' اس نے تائید کی۔ ''لیکن سال کے کئی مہینے بالکل بیکار بھی گزرتے ہیں اور چھوٹی موٹی چیزیں بیچ کر گزارا ہوتا ہے۔ جیسے یہ اس بار کی آخری کھیپ ہے اور ابھی کوئی آرڈر نہیں ہے۔'' اس نے کرشر پر جاری کام کی طرف اشارہ کیا۔ ''ایک اسٹیل مل سے اسکریپ کا آرڈر ملا ہے۔''

''معاشی حالات خراب چل رہے ہیں۔ ملیں اور کارخانے بند ہو رہے ہیں۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''چین نے ہماری معیشت کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔''

''چین نے نہیں ہمارے لالچی سرمایہ داروں نے، وہ چین سے سستی چیزیں خریدنے کے لیے یہاں کارخانے بند کر رہے ہیں۔ انہیں صرف اپنے نفع سے غرض ہے امریکا بے شک ڈوب جائے۔'' اس نے کہا تو میں نے اپنے اندازے پر نظر ثانی کی، وہ اتنا سادہ نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ معیشت پر اس کی گہری نظر تھی لیکن اس کی اس بات سے مجھے بات آگے بڑھانے کا موقع مل گیا۔

''لیکن چین کی بنی ہوئی چیز پائیدار نہیں ہوتی۔ پچھلے دنوں میں نے اپنی گاڑی کے لیے چین کے بنے ہوئے پہیے لیے اور وہ چند مہینوں میں جواب دے گئے۔ مجھے ان کے لیے اچھے پہیوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اس کار کے پہیے اپنے کام کے لگ رہے ہیں۔ سسٹر شیلٹر، کیا تم یہ گاڑی بیچنا چاہو گے؟''

اس نے میری بات پر غور کیا۔ ''تمہیں صرف پہیے درکار ہیں؟''

''نہیں، یہ گاڑی بھی ٹھیک لگ رہی ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ممکن ہے اس کے کچھ انجن پارٹس میری گاڑی میں فٹ ہو جائیں۔''

''یہ خاصی پرانی گاڑی ہے، ممکن ہے اس کے انجن پارٹس تمہاری گاڑی میں فٹ نہ ہوں۔''

''میں گاڑیوں کا مکینک بھی ہوں، میں جوڑ توڑ کر کے اپنا کام چلا لیتا ہوں۔'' میں نے امید سے کہا۔ ''تو کیا خیال ہے؟''

''ظاہر ہے، یہاں موجود ہر شے برائے فروخت ہے۔'' اس نے اپنی خشخشی ڈاڑھی کھجائی اور بولا۔ ''میرا خیال ہے دو سو ڈالرز مناسب ہوں گے۔''

میرا خوشی سے برا حال ہو گیا، وہ گاڑی مجھے فری میں دے رہا تھا لیکن میں اپنی خوشی کا اظہار کر کے اسے چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے برا سا منہ بنایا۔ ''دو سو ڈالرز ..... بہت زیادہ ہیں۔''

''نہیں، مناسب ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''دیکھو اس کوالٹی کے پہیے تم، رکیٹ سے لو تو کم سے کم چالیس ڈالرز کا ایک پہیہ ملے گا یعنی چار پہیوں کا سیٹ ہی ایک سو ساٹھ ڈالرز کا ہو گا۔ باقی انجن پارٹس کے لیے تمہیں صرف چالیس ڈالرز میں پڑ رہا ہے۔''

''لیکن یہ پرانی گاڑی ہے اس کے پہیے اچھے خاصے استعمال ہو چکے ہیں۔'' میں نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ''پارٹس کا معاملہ رسک پر ہے ممکن ہے میرے کام آ جائیں اور ممکن ہے نہ آئیں۔ میرا خیال ہے اس کے سو ڈالرز ٹھیک ہیں۔''

''نہیں دوست! سو ڈالرز بہت کم ہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور مجھ سے کپ لے کر واپس کیبن میں چلا گیا۔ ایک لمحے کو میرا دل ڈوب گیا کہ اس نے انکار کر دیا ہے۔ میں اسے دو سو ڈالرز بھی خوشی سے دے سکتا تھا لیکن میں اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ سودا ابھی ہوا نہیں تھا اور عین ممکن تھا وہ سمجھ جاتا کہ کار بہت قیمتی ہے اس لیے میں اس کی واپسی تک کار کا معائنہ کرتا رہا اور ایسی شکل بنا تا رہا جیسے خود کو اس کی منہ مانگی قیمت دینے پر آمادہ کر رہا ہوں۔ میں نے کار کا بونٹ اٹھایا۔ پورشے کا انجن شاہکار تھا اور انجن بھی بہترین حالت میں تھا اگرچہ یہ کار کے سسپنشن سے الگ تھا یعنی انجن صرف رکھا ہوا تھا کار سے جڑا نہیں تھا لیکن یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا اسے بعد میں آسانی سے جوڑا جا سکتا تھا۔

وہ یقیناً کیبن سے میرا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کین اٹھایا اور جیسے واپسی کا ارادہ کیا لیکن پھر رک گیا۔ قریب دس منٹ بعد وہ کیبن سے برآمد ہوا اور اس نے وہیں سے کھڑے کھڑے کہا۔ ''ٹھیک ہے صرف تمہارے لیے میں ڈیڑھ سو ڈالرز لے لوں گا لیکن اس سے ایک ڈالر بھی کم نہیں ہو گا۔''

میں نے ظاہری طور پر بادلِ ناخواستہ کہا۔ ''مجھے منظور ہے کیونکہ تم ایک اچھے آدمی ہو اور مجھ سے اچھی طرح پیش آئے ہو۔''

''ٹھیک ہے، لاؤ ڈیڑھ سو ڈالرز۔'' اس نے ہاتھ آگے کیا۔

میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے پچاس ڈالرز والے تین نوٹ اس کے حوالے کر دیے۔ ''سودا طے ہے۔''

اس نے نوٹ دیکھ کر اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور بولا۔ ''تمہارے پاس کون سی گاڑی ہے! تم نے شاید کسی پک اپ کا بتایا تھا؟''

''میرے پاس ڈوج پک اپ ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''تب تو کوئی مسئلہ نہیں، آرام سے آ جائے گی۔''

پورشے چھوٹی کار ہوتی ہے لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوتی کہ میرے پک اپ ٹرک میں آسانی سے آ جاتی، مگر رسیوں سے باندھ کر میں اسے محفوظ طریقے سے لے جا سکتا تھا۔ میں اپنی خوشی چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے لگا کہ میں کچھ دیر اس کے سامنے رہا تو پھٹ پڑوں گا اس لیے میں نے اس سے کہا۔ ''میں اپنی پک اپ لے کر آتا ہوں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے تم آرام سے آؤ۔'' اس نے کہا اور اپنے آدمیوں کو آواز دینے لگا۔ میں تیزی سے باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آواز جارج شیلٹر یا اس کے ساتھیوں تک نہیں جائے گی تو میں نے منہ اوپر کر کے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اپنی زندگی کا سب سے نفع بخش سودا کر لیا ہے۔ کار پر زیادہ خرچ نہیں آتا اور چند ہزار ڈالرز کے خرچ سے یہ ایسی ہو جاتی جیسے ابھی شو روم سے نکلی ہو۔ اس پورشے کی قیمت کم سے کم بھی دو لاکھ ڈالرز بنتی تھی اور اگر میں اسے نیلام کر کے فروخت کرتا تو اس کی کہیں زیادہ قیمت مل سکتی تھی۔ میرا دل رقص کرنے کو چاہ رہا تھا لیکن یہ موقع نہیں تھا، مجھے جلد از جلد یہ کار حاصل کر کے یہاں سے رخصت ہو جانا تھا۔ میں پک اپ کے پاس آیا۔ اس کا انجن بالکل بھی گرم نہیں تھا لیکن میں نے ریڈی ایٹر کا پانی بدل دیا اور تھوڑا پانی سامنے بھی گرایا تا کہ میری کہانی بالکل حقیقی لگے۔ میں ان تمام باریکیوں کا خیال رکھتا تھا اور اسی وجہ سے میں ایک کامیاب کاروباری تھا۔ میں نے کوئی پندرہ منٹ بعد پک اپ اسٹارٹ کی اور جنک یارڈ کے اندر آیا۔

میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا لیکن جب کیبن کے پاس پہنچا تو جیسے دھڑام سے زمین پر آ گرا۔ وہاں کار نہیں تھی بلکہ اس کے چاروں پہیے اور انجن پڑا تھا۔ اس کی باڈی غائب تھی۔ میں بدحواسی میں پک اپ سے اترا اور گرتے پڑتے جارج شیلٹر کے کیبن تک آیا۔ میں نے چلا کر اسے آواز دی۔

''جارج تم کہاں ہو؟''

وہ کیبن سے نکلا اور خفگی سے بولا۔ ''یہیں ہوں اس میں اتنا چلانے کی کیا بات ہے؟''

کار کو غائب دیکھ کر میں پاگل ہو گیا تھا اور میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ''کار کہاں ہے؟''

''یہ ہے۔'' اس نے اپنا گریبان چھڑایا اور پہیوں اور انجن کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہیں ان چیزوں کی ضرورت تھی۔''

''مجھے پوری کار کی ضرورت ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

''لیکن تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ تمہیں پوری کار کی ضرورت ہے۔'' اس نے مجھے یاد دلایا۔ ''تمہیں اصل میں پہیے درکار تھے اور انجن کے کچھ پرزے بھی۔ وہ میں نے نکال دیے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا میں نے صرف پہیوں اور انجن کی بات کی تھی لیکن مجھے پوری کار چاہیے تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے، میں اب بتا رہا ہوں مجھے پوری کار چاہیے۔''

اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''اب تو وہ شاید تمہیں نہیں مل سکتی۔ تم نے دیر کر دی ہے۔''

میں بدحواس ہو گیا۔ ''نہیں مل سکتی ..... لیکن کیوں؟''

''وہ کئی سال سے یہاں بے کار کھڑی تھی اور اب تو مزید بے کار ہو گئی تھی، میں نے اپنے آدمیوں سے کہا انجن اور پہیے نکال کر باقی باڈی کرشر میں ڈال دیں۔ میرے آدمی اسے کرشر میں ڈالنے کے لیے لے گئے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں چلایا۔

''لعنت ہو تم پر۔''

میں زندگی میں کبھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا جتنا اس وقت دوڑا۔ سرپٹ بھاگتے ہوئے کرشر کے سامنے پہنچا تو پورشے کار اس کے پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس کی باڈی صحیح سلامت تھی۔ میں کرشر کے کنٹرول کیبن کے نیچے آیا اور اس میں موجود جارج شیلٹر کے آدمی کو چلا چلا کر کرشر چلانے سے روکنے کی کوشش کرنے لگا مگر افسوس کرشر ..... کی مشین کے شور میں اس تک آواز ہی نہیں گئی اور اس نے ہائڈرولک جیک کا ہینڈل کھینچ لیا۔ اوپر سے کرشر کی گول فولادی پلیٹ کار کی باڈی پر گری اور اسے پچکا کر رکھ دیا۔ مجھے لگا جیسے کرشر نے کار کی باڈی کا نہیں اصل میں میرا کلیجہ بنا دیا ہو، میں چکرا کر گر پڑا تھا۔

مسئلہ

شوہر، ہوٹل منیجر سے۔ ''جلدی سے میرے ساتھ آئیں، میری بیوی کمرے کی کھڑکی سے کود کر جان دینا چاہتی ہے۔''

منیجر۔ ''سر، آپ اسے روکیں میں کیا کر سکتا ہوں؟''

شوہر۔ ''یہی تو مسئلہ ہے کہ کھڑکی نہیں کھل رہی۔''

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

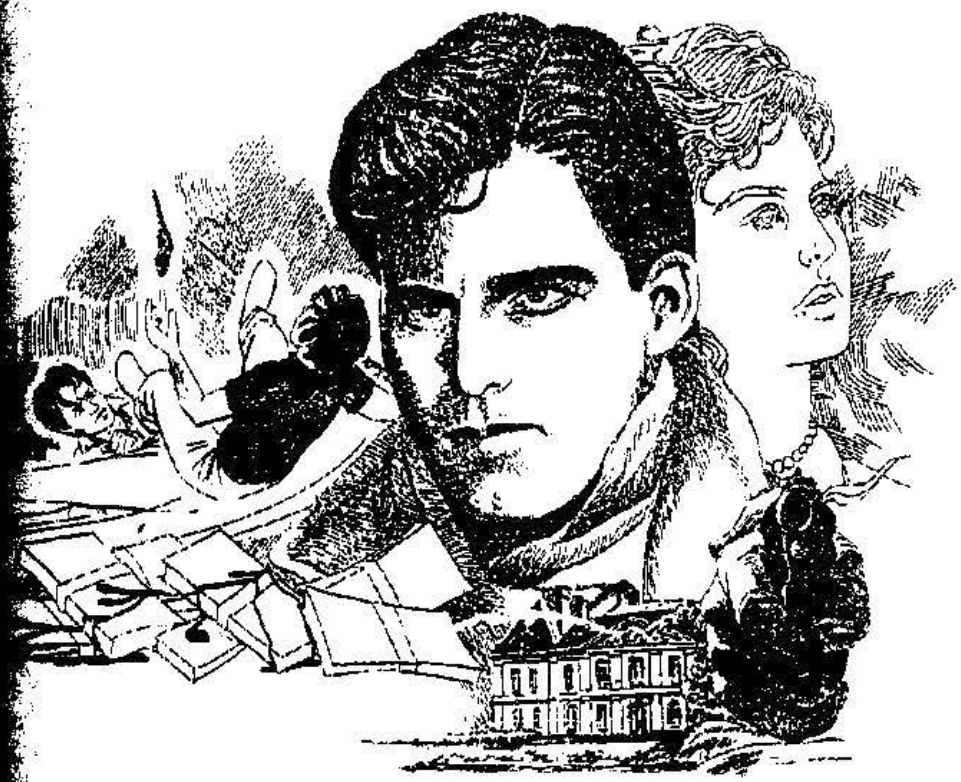

اناڑی

قسط:66

خوب صورت دلکش رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

قسمت کے پھیر میں الجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیار غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اسے پردیس راس آگیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد ... وہ لوٹا ... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

دور حاضر کے فتنوں اور حالات کی عکاس ایک داستان رنگ بہ رنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

گردو پیش کا احوال۔ منظر کشی کا کمال۔ ایک داستان لازوال، آج کے زندہ کرداروں کی حقیقی کہانی جسے احمد اقبال کی زمانہ شناس نگاہ اور سحر آفریں انداز تحریر نے تخلیق کیا۔

نئے پڑھنے والے یہاں سے شروع کریں۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں انگریز فوج کو شاہ افغانستان کے لشکر نے ایک عبرت ناک شکست دی۔ بچ جانے والا واحد شخص ایک ڈاکٹر تھا جسے زخمی حالت میں میرے پردادا کے پردادا نے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر بہ حفاظت رہتاس کے قلعے میں انگریزی چھاؤنی تک پہنچا دیا۔ انعام کے طور پر انگریز نے اجازت دی کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک جتنی زمین کا چکر اپنی بیل گاڑی دوڑا کے لگا لیں گے وہ ان کے نام کر دی جائے گی۔ یوں بدھائی کی ریاست وجود میں آئی۔ میرے آباؤ اجداد نواب کہلائے۔ ریاست کے چوتھے حکمران کو ایک فقیر کی بددعا لگی اور اس کے چھ جوان بیٹے باری باری مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ آخری بیٹے کو باپ نے جان بچانے کے لیے سات سمندر پار لندن بھیج دیا لیکن کسی خرابی کے باعث جہاز بحر اوقیانوس میں ڈوب گیا۔ باپ نے عالم دیوانگی میں اپنی تین بیویوں کو مار اور پھر خودکشی کر لی ..... حویلی نصف صدی سے زیادہ عرصہ غیر آباد پڑی رہی۔ میرے والد لاہور کے کالج سے ریٹائر ہوئے ..... میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں میرا تعلق ایک سیاسی تنظیم کے دہشت گردوں سے ہو گیا۔ میری زندگی بچانے کے لیے والد صاحب نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے بہانے امریکا بھیج دیا۔ ہاورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد مجھے لندن میں لارڈ ارنسٹ کی بزنس فرم میں اعلیٰ عہدے پر کام کرنے کا موقع ملا لیکن فرم کے مالک کی اکلوتی بیٹی ایلیشا مجھ پر فریفتہ ہو گئی اور اپنا نام تک بدل کر عائشہ بن گئی ..... مگر میں نے اسے ٹھکرا دیا کیونکہ میں فریال سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ فریال پہلے ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اپنی بے وقوفی کے باعث ایک عیاش اور شخص اور فلمساز چودھری سلطان سے منگنی بھی کر بیٹھی تھی ..... میں نے اور فریال نے چھ سال تک اس کی عداوت کا مقابلہ کیا۔

اچانک لندن میں مجھے ایک وکیل کے ذریعے اپنے کسی رشتے کے پردادا نے طلب کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھے اور دماغ کے سوا ان کا جسم مفلوج تھا..... ان کی معلومات کے مطابق میں ان کا رشتے دار تھا۔ چنانچہ اپنی وصیت کی رو سے انہوں نے مجھے ست بدھائی کا وارث بنا دیا۔ وہ ساتویں بیٹے تھے جن کا جہاز لندن جاتے ہوئے سمندر میں گر گیا تھا..... وہ بچ جانے والے واحد مسافر تھے جو بیہوشی میں کسی تختے پر تیرتے ہوئے برطانیہ کے ساحل تک پہنچ گئے تھے۔ کسی سراغرساں ادارے کی مدد سے انہیں لندن میں میری موجودگی کا علم ہوا۔ لہٰذا وہ مجھے اپنا وارث مقرر کر کے مر گئے۔

اب مجھے لوٹ کے پاکستان جانا پڑا۔ ست بدھائی کی عالی شان مگر منحوس سمجھی جانے والی حویلی اور جاگیر ساٹھ ستر سال سے غیر آباد پڑی تھی۔ وہ جی ٹی روڈ پر لاہور اور جہلم کے درمیان دینہ جانے والی سڑک پر رہتاس کے تاریخی قلعے کے کھنڈر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ حویلی کے تہ خانے میں بند تجوریوں اور مقفل الماریوں سے مجھے قیمتی ہیرے جواہرات، سونے چاندی کے زیور، برتن اور بیش بہا نوادرات کا، جن میں گاڑیاں بھی شامل تھیں ایسا خزانہ ملا جس کی مالیت کروڑوں سے بڑھ کر اربوں تک پہنچ چکی تھی۔

اپنے چند دوستوں کی مکمل حمایت سے میں نے اپنے علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام بنایا جس میں اسکول اور اسپتال قائم کرنے کے علاوہ جنگلات فروغ، فرنیچر بنانے اور ایکسپورٹ کرنا اور دریائے کہان سے پن بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ شامل تھا۔ مجھے دوستوں سے مدد اور لوگوں سے پذیرائی ملی لیکن علاقے کا جدی پشتی جاگیردار میرا دشمن ہو گیا۔ میری انسان دوستی اور غربا پروری کی شہرت پھیلی تو رانا کو اپنی صوبائی اسمبلی کی سیٹ خطرے میں نظر آنے لگی جسے وہ موروثی حق سمجھتا تھا۔

ابتدا میں شہر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے والوں میں میرا نامور صحافی دوست راجا اور اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کے علاوہ میری چچا زاد بہن رابعہ اور میرے والدین شامل تھے۔ پھر علاقے کا نامی گرامی ڈاکو میرا حمایتی اور دوست بن گیا۔ شاہی بادشاہ نے میرے کہنے سے فیصلہ کیا کہ معافی ملنے کے بعد بدھائی میں باعزت زندگی گزارے گا لیکن اس خفیہ پروگرام کی خبر دشمنوں کو مل گئی اور انہوں نے پولیس مقابلے کا ڈراما رچا کے سب کو راستے میں مار ڈالا۔ زخمی شاہی بادشاہ کو اس کی بیوی گولی نکال کر لے گئی۔

شرعی قانون وراثت کے مطابق مجھ سے پہلے ریاست کے وارث میرے والد اور چچا ہوتے لیکن مجھے وصیت کی رو سے مالک و مختار بنانے والے برطانوی شہری تھا اور خود میں نے برطانیہ میں قیام اور ملازمت کے دوران برطانوی شہریت حاصل کر لی تھی چنانچہ اس فیصلے کو پاکستان کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چچا اور چچی کی خواہش کے مطابق اگر میں ان کی اکلوتی بیٹی رابعہ سے شادی کر لیتا تو حق تلفی کا ازالہ ہو سکتا تھا لیکن میں فریال کے سوا کسی کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے رابعہ کو بہن کا درجہ دیا اور وہ ست بدھائی میں میرے ساتھ رہی۔ اس نے محبت کی شادی میں دو بار دھوکا کھایا۔ بدقسمتی سے دھوکا دینے والے میرے دوست تھے رفتہ رفتہ رابعہ بھی مجھے حق تلفی اور اپنے والدین کی موت کا ذمے دار سمجھنے لگی۔

حویلی میں آنے کے بعد میں نے ایک پرانے محافظ کی بیوی نور جہاں کو دیکھا جو درحقیقت اس کی داشتہ تھی۔ بردہ فروشی سے منشیات فروشی تک کے کاروبار میں نور جہاں کو استعمال کرتا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی لیکن نور جہاں جیسی حسین عورت نہیں دیکھی۔ اس نے مجھ سے مراسم استوار کرنے میں جائز و ناجائز کو نہیں دیکھا۔ فریال سے محبت اور شادی کے عہد و پیمان کے باوجود میں نور جہاں کے جال میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے میرے لیے اپنے نہاد شوہر کو بھی قتل کر دیا اور میں نے اسے قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ فریال میرے ساتھ لندن، پیرس اور نیویارک جیسے شہروں کی چکا چوند والی زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ نور جہاں کے معاملے نے اسے جواز فراہم کر دیا اور وہ لوٹ کر شوبزنس میں چلی گئی جہاں چودھری سلطان کے ذریعے اسے زبردست کامیابی ملی۔ موقع ملتے ہی اس نے چودھری سلطان کو قتل کرا دیا اور اپنے اعلیٰ سطحی مراسم کے باعث قانون کی گرفت میں آنے سے بھی محفوظ رہی۔

نور جہاں نام نہاد شوہر کے قتل کے الزام سے بچنے کے لیے طویل عرصہ روپوش رہی۔ پھر ماہ نور بن گئی۔ ایک نئے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کا حصول

تھا۔ میں اسے لندن لے گیا تاکہ وہ اپنی نئی شخصیت کے ساتھ ست بدھائی واپس آ جائے۔ میں اسے لارڈ ارنسٹ کی مدد سے برطانوی شہریت دلوانا چاہتا تھا۔ کئی دن بعد لندن پہنچ کر مجھ پر انکشاف ہوا کہ عائشہ دوبارہ ایلیشا بن چکی ہے اور ڈپریشن کے باعث نشہ کرتی ہے۔ اس کی ماں مر چکی تھی اور باپ سیاسی اور کاروباری ..... میں الجھا ہوا تھا۔ عائشہ کا عشق مجھے دیکھتے ہی پھر ایک جنون کی شکل میں لوٹ آیا۔ اس نے نور کو اغوا کرا کے مجھے مجبور کیا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔ نور کو بچانے کے لیے مجھے یہ ڈراما بھی کرنا پڑا۔ چند دن بعد اس کے عیاش باپ کو دل کا دورہ پڑا۔ اس کی وارث صرف عائشہ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ عائشہ اس کی ..... سنبھالنا نہیں جانتی تھی۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنی ایف سو میں تین پاؤنڈ کی جائیداد اور تجارت کا مالک مجھے بنا دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مجھ سے شادی کے بعد ..... ٹھیک ہو جائے گی۔ میرے انکار اور اس باپ کی موت نے عائشہ کے احساس جرم کو شدید تر کر دیا اور وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ترک دنیا ..... مہربان ہوئی۔ قدرت کی طرف سے خوش نصیبی کی یہ دوسری اتری ہمارے لیے ایک آزمائش بن گئی۔ نور یہاں اکیلی رہنے پر راضی نہ تھی اور نہ میں ..... بنا کے واپس جاتا پھر کچھ اور غیر معمولی واقعات پیش آئے۔ اچانک مجھے وہ شخص مل گیا جو چیف کہلاتا تھا۔ اس نے دس سال پہلے لاہور میں مجھے اپنی سیاسی تنظیم میں دہشت گردی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ لندن میں جلاوطنی اور روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے اپنا سیاسی مشیر بنا لوں تو ..... میں اپنے حریف رانا کو شکست دے کر صوبائی اسمبلی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں نے بظاہر اس کی پیشکش قبول کر لی۔

ست بدھائی کے اسپتال کو وسعت دینے میں میرے ساتھ ایک ڈاکٹر باپ بیٹا شامل تھے۔ اس فیملی کی تیسری رکن بیٹا بھی ڈاکٹر تھی لیکن محبت میں ناکامی اور شوہر کے قتل نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مجھے اپنا سابق محبوب وحید مان لیا اور کسی حد تک نارمل بھی ہو گئی۔ وحید ایک لاابالی مصور تھا جو لندن میں عریاں تصاویر بنا کے اپنا فن اونے پونے بیچ رہا تھا اور استحصال کا شکار تھا..... ثمینا نے اپنی جان چھڑانے کے لیے وحید کو پاکستان لے جانا ضروری تھا۔ وہ وحید میری کاربن کاپی تھا۔ میں نے اس کے تمام قرضے بے باق کیے اور اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ چیف نے مجھے پہلی ٹپ دی کہ میں وحید کو اپنے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی استعمال کر سکتا ہوں۔ چیف کا اصل نام غلام علی تھا۔

اگرچہ میں یہ کر سکتا تھا کہ ست بدھائی کو رابعہ کے سپرد کر دوں تاکہ اس کا حق تلفی کا احساس ختم ہو اور خود نور کے ساتھ لندن میں رہ کر کاروبار کو مزید پھیلاؤں۔ مگر نور کے سمجھانے سے میں نے لندن اور ست بدھائی دونوں جگہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ لارڈ ارنسٹ کے تمام ملازم مجھے ساری خرابی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ وہ سب احتجاجاً ملازمت چھوڑ گئے..... لارڈ کے سابق شوفر اور باڈی گارڈ نے میری ناواقفیت کے باعث مجھے ایک ویران احاطے میں لے جا کر قتل کرنے کی کوشش کی انہیں ناک آؤٹ کر کے میں نے غلام علی کو طلب کیا اور خود ایلیشا سے ملنے چرچ چلا گیا۔ غلام علی نے احاطے میں کھڑا ٹرک آگ لگا کے ان دونوں کو دبا دیا جو وہاں پہلے سے موجود تھا۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ گرفتار ہو گیا۔ میں نے اپنے بیان میں وہ سب بتا دیا جو ..... نے مجھے بتایا تھا۔ چرچ کے مددگار اپنی جان بچانے کے بے وعدہ معاف گواہ بن گئے۔ حالات نے پلٹا کھایا اور مجھے اغوا کر لیا گیا۔ مگر سراغ رساں ..... میں چونک گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ میں سارے الزامات اپنے سر لے لوں۔ چیف کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسی دوران چیف کی ایک نفسیاتی ..... کی بدولت میں نے یہ جان لیا کہ سرغنہ اصل چیف نہیں بلکہ اس کا ڈپلی کیٹ ہے۔ ادھر لندن پولیس کی مہارت اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے چیف اور ..... کے گرفتار کر لیے گئے۔ میں قید خانے سے نکل کر ایک عمر انگریز جوڑے کی مدد سے اپنے گھر پہنچا۔ پھر میں نور کے ساتھ مل کر اپنی ذمے داریوں کو ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میں اور نور تمام امور سے فارغ ہو کر مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ اچانک ایلیشا برقعے میں ملبوس پہنچ گئی۔ اب وہ اپنی بازیابی واپسی کا مطالبہ کر رہی تھی مگر مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ تھا لہٰذا میں نے اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دیا جس پر مشتعل ہو کر اس نے پستول نکال کر دیوانگی کی حالت میں مجھ پر فائر کر دیا۔ پولیس اسے لے گئی۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ایلیشا نے جواباً مجھ پر الزامات کی بوچھار کر دی لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ لارڈ ارنسٹ کے وکیل نے مجھے جذباتی بلیک میل کرتے ہوئے ایلیشا کی حالت کے پیش نظر اس سے شادی کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے یہ تجویز بھی سے مسترد کر دی۔ دوسری جانب نور مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ میں ست بدھائی رابعہ کے نام کر دوں اور لندن میں اس کے ساتھ رہوں۔ میں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہرحال حالات کے پیش نظر میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ نور بڑی مشکل سے تنہا لندن میں رہنے پر راضی ہوئی۔ ..... پر میرا بریف کیس چوری ہو گیا جس کے باعث فلائٹ سے میری روانگی خطرے میں پڑ گئی۔ اسی کشمکش میں غیر معمولی مہارت سے مجھے بے ہوش کر دیا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اغوا کار کون ہیں پھر جب رابعہ میرے سامنے آئی تو میں چونک کر رہ گیا اور مزید ..... نے میرے حریف زوہیب کے ساتھ مل کر یہ ڈراما رچایا تھا۔ اس کا دو ٹوک مطالبہ تھا کہ جاگیر اس کے نام کی جائے۔ مجھے اس پر مجبور کرنے کے دوران ایک دن ..... مشتعل ہو کر اس نے ریوالور سے مجھ پر فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ اسی اثنا میں اس کے کارندے داخل ہوئے اور اسے لے کر چلے گئے۔ ایک دن میرے کمرے میں ٹی وی رکھ دیا گیا جس کے ذریعے رابعہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنا مطالبہ دہرایا۔ مسلسل قید اور ذہنی اذیت کے باعث میں اتنا بےزار تھا کہ میں نے اس کا مطالبہ منظور کر لیا۔ معاملہ یہ طے پایا کہ میں جاگیر رابعہ کو گفٹ کر دوں گا۔ بعد ازاں رابعہ نے مجھ سے رابطہ کر کے اپنی محبت کا اظہار کیا اور شادی کی درخواست کی میں نے انکار کیا تو وہ اپنی ناکامی پر دوبارہ مخالفت پر کمربستہ ہو گئی۔ یہاں مجھے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ اب میری زندگی محفوظ ہے کیونکہ وکیل ..... کے درمیان میں آ جانے سے جان کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

قید کے دوران ایک دن میری نگرانی پر مامور افراد میں سے ایک کے دل میں آخر وہ نیکی کا جذبہ بیدار ہوا اور اس نے قید خانے کی دیوار میں رخنہ ڈال کر مجھے ..... میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی متروک گیسٹ ہاؤس تھا۔ ویرانے میں مجھے ایک دیہاتی جوڑا نظر آیا جو مجھے ایک سابق فوجی خلیل صاحب کے گھر تک ..... یہاں خلیل صاحب اور ان کی اہلیہ نے میری بہت مدد کی اور میں راجا سے رابطہ کرنے اور وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ رابعہ کی پراسرار گمشدگی پریشان کن ..... مجھے ایک اسپتال لے گیا جو کہ میری صحت پر ..... اثرات زائل ہوں۔ پھر مجھے ..... نے ماں والا ..... کے ساتھ ..... کی خوشخبری ملی۔ ..... رابعہ نے بھی فون پر مجھ سے بات کرنا چاہی مگر ..... ہوں ..... میں نے اسپتال جا کر دیکھا تو ..... اور ..... سے وہ رابعہ ..... جس کا چہرہ ..... تھا۔ میں ..... آ رہا تھا کہ میرے ..... ملی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئی گارڈز کی گاڑی دھماکے سے تباہ ہوگئی اور ایک خونی معرکہ کے بعد میں حویلی واپس پہنچا تو نور نے فون پر بتایا کہ وہ پاکستان آرہی ہے لہٰذا میں اسے لینے کے لیے روانہ ہوا لیکن راستے میں مولاداد نامی ڈاکو نے مجھے اغوا کرلیا۔ مولاداد کے ڈیرے پر نیلم نامی لڑکی نے مجھے اس کے عزائم سے آگاہ کیا اور میری مدد کی۔ یہاں ڈاکوؤں سے نمٹ کر جب ائرپورٹ پہنچا تو دیکھا نور نہیں آئی بلکہ فون پر مجھے الزام دیا کہ میں نے رابعہ کے بارے میں اس سے غلط بیانی کی ہے۔ میں نے وضاحت کی تو اس نے فون پر رابعہ کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کی آواز سن کر میں چکرا کر رہ گیا۔

رابعہ میرے نیے دردسر بن چکی تھی جبکہ اس نے نور کو بھی میرے خلاف بھڑکا دیا تھا۔ لیکن نور نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے رابعہ کی نگرانی کی جس کے ذریعے انکشاف ہوا کہ رابعہ کا حویلی میں کسی سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا نتیجے میں ایک گارڈ سردار خان مجرم ثابت ہوا اور ایک مختصر لڑائی کے بعد میں نے اس پر قابو پالیا۔ دوسری جانب وحید کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایک مقابلے کے بعد اغوا کار بھی قیدی بنا لیے گئے۔ میں نے نور کو کنگ میں منتقل ہونے اور رابعہ کی نگرانی کرنے کی ہدایت کی اور لندن جانا چاہا لیکن راجا نے مجھے مصلحتاً روکا اور خود لندن جانے کا فیصلہ کیا جبکہ قیدیوں سے حاصل کی گئی معلومات کے مطابق ان ساری کارروائیوں کے پیچھے دلاور کا ہاتھ تھا۔ یہ نام میرے لیے نیا تھا جو اسلحے اور منشیات کا ایک بین الاقوامی اسمگلر تھا۔ وہ الیکشن میں اپنے حق میں میری دستبرداری کا خواہش مند تھا مگر میں نے اسے چیلنج کردیا۔ رات کی تاریکی میں مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ کی تھی جسے کسی نقاب پوش نے دبوچ رکھا تھا۔ میری مداخلت پر وہ فرار ہوگیا۔ حملہ آور کی حویلی میں موجودگی باعث تشویش تھی۔ اسی دوران ڈاکٹر شہناز کی کزن جو ڈاکٹر تھی، بھی ہماری ٹیم کا ایک رکن بن گئی۔ سخت تفتیش کے بعد سجاد نامی حملہ آور کو ڈھونڈ نکالا گیا جو دلاور خان کا آدمی تھا۔ بعدازاں سجاد نے اپنی ایک جھوٹی کہانی سنائی کہ کس طرح وہ دلاور کے شکنجے میں پھنسا۔ مگر اب وہ حقیقت جان کر دلاور کا دشمن بن گیا ہے۔ میں اس کے جھانسے میں آگیا میں نے یقین کرکے اسے دوست کی حیثیت سے حویلی میں رکھ لیا جبکہ ڈاکٹر شہناز نے حقیقت محسوس کرلی۔ راجا کا فون آیا اور اس نے اطلاع دی کہ رابعہ فرار ہوگئی ہے۔ ہم نے سجاد کے بارے میں معلومات کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا۔ جس کی روانگی کے بعد ایک نامعلوم کال کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ وہ اسپتال میں زخمی حالت میں ہے۔ ہم حیران تھے کہ اتفاقیہ صوبے دار میجر صاحب نے میرے پستول کی صفائی کے دوران ٹرانسمیٹر نائپ ایک ڈیوائس دریافت کی اور سجاد جس پر جو شک تھا وہ یقین میں بدل گیا لہٰذا اس سے تہ خانے میں تشدد کے ذریعے معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ شدید زخمی ہوگیا اور اسی حالت میں فوت ہوگیا۔ اس امر کی تصدیق ہوئی کہ اسے بھیجنے والا زوہیب تھا۔ راجا نے اطلاع دی تھی کہ وہ اور نور پاکستان آرہے ہیں لہٰذا اسے لینے میں اپنے گارڈ کے ساتھ ائرپورٹ پہنچا جہاں ایک گارڈ نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ اسی دوران ایک فائر ہوا اور میں نے ایک گارڈ کو گرتے دیکھا۔ ایئرپورٹ پر اس صورت حال پر پولیس بروقت پہنچ کر پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع کرتی ہے۔ راجا اور نور ایئرپورٹ سے برآمد ہوتے ہیں۔ نور بڑی فکرمند ہے معاملہ کچہری کا ہے لہٰذا انہیں وہیں رکنا پڑتا ہے۔ اسی دوران راجا کا ایک کرم ریورفرد دوست اثر ورسوخ کا حامل ہے ان کی مدد کرتا ہے۔ فراغت کے بعد یہ لوگ ست بدھائی پہنچ جاتے ہیں جہاں ڈاکٹر شہلا کو اپنے گھر سے بلاوے پر لانے سرور کے ذریعے روانہ کیا جاتا ہے لیکن سرور زخمی حالت میں آکر اطلاع دیتا ہے کہ شہلا کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہاں بھی راجا کا دوست ناصر کام آتا ہے اور شہلا بازیاب کرالیا جاتا ہے۔ اس کے بعد رفیق سکون کا سانس لیتا ہی ہے کہ ایک فون کال اس کا سکون غارت کردیتی ہے۔

کال رابعہ کی تھی اور اس نے اپنی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا کہ کئی بار جھڑکنے کے بعد بالآخر میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا جہاں مجھے قید کرکے ذہنی ٹارچر کیا جاتا ہے لیکن ایک بار پھر غنی کی بروقت مداخلت سے رہائی ملتی ہے اور ساتھ ہی رابعہ کو بھی آزاد کرا لیا جاتا ہے اس کے ساتھ ہی ایک شخص نجو کو بھی یرغمال بنا کر قید کردیا جاتا ہے۔ رابعہ اپنی رام کہانی سناتی ہے۔ لاہور میں ہم غنی کے ایک دوست کی کوٹھی میں قیام کرتے ہیں۔ جہاں مجھ پر ایک حملہ کیا جاتا ہے۔ گولی لگنے سے زخمی ہوجاتا ہوں۔ یرغمالی کے منہ سے ایک نیا نام شاکر سامنے آتا ہے جو لاہور کا غنڈا ہے۔ اس حملے کے سلسلے میں بیان لینے پولیس افسر آتا ہے اور شاکر کے متعلق بتاتا ہے لیکن رفیق لاعلمی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی دوران دروازے کے باہر غنی کی کسی سے بحث کی آواز آتی ہے۔

حویلی میں ایک پگلی عورت گھس آئی تھی جس سے گارڈز الجھے ہوئے تھے۔ میں نے گارڈز کو ان کی بے پروائی پر سرزنش کی اور پگلی کو روانہ کردیا۔ راولپنڈی سے ناصر کا فون آیا، اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ہم نے اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا جبکہ نیلم نے بھی اپنے والد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا لہٰذا وہ بھی ساتھ تھی۔ راستے میں نامعلوم افراد نے ہم پر حملہ کیا۔ نیلم نے بھرپور انداز میں مدد کی اور تجرات کی ذہنی کمشنر کی مدد کی بدولت میں اسپتال تک پہنچ سکا جہاں سے راجا کو فون پر اطلاع دی اور وہ آکر ست بدھائی لے گیا۔ اس معرکے کے دوران میرا موبائل وہیں گر گیا تھا۔ اسی دوران خبر ملی کہ غزالہ کو قتل کردیا گیا ہے اور اس کی لاش کے پاس ہی میرا موبائل ملا ہے۔ یہ انتہائی تشویشناک صورت حال تھی لیکن راجا کے تعلقات اور ذہنی کمشنر کی مدد سے اس صورت حال پر قابو پا لیا گیا۔ ایک دن مجھے شاکر کا فون موصول ہوا جو مجھ سے فوراً ملنا چاہتا تھا۔ غنی نے پریشانی کے عالم میں مجھے رابعہ کے متعلق خبر دی۔

رابعہ نے ڈراما کرکے بیمار بننے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ پگلی نے ایک بار پھر حویلی میں داخل ہونے کی جرأت کی جس پر اسے حویلی بلا لیا گیا جس نے انکشاف کیا کہ وہ پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہی تھی رانا کے ظلم کی وجہ سے۔ لیکن بعدازاں وہ جھوٹی ثابت ہوئی اور حویلی سے فرار ہوگئی۔ اسی دوران لندن سے سوشی کا فون آیا اور ایک بڑے معاہدے کے سلسلے میں نور کو لندن واپس بلایا۔ رابعہ کو اسپتال لے جایا گیا جہاں سے وہ بیماری کی حالت میں فرار ہوگئی۔ لندن روانگی سے پہلے نور کی شاپنگ کے سلسلے میں لاہور جاتے ہوئے راستے میں ایک ہوٹل پر شاکر سے حادثاتی ملاقات ہوئی اور اس نے اپنے اور دلاور کے درمیان جاری تنازعات کے بارے میں بتایا۔ واپسی میں کچھ لوگوں نے نواب رفیق اور نور کو اغوا کرکے قید کر [illegible] جہاں رفیق نے مشتعل ہوکر ایک ڈاکو کو قابو کرلیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

''ہاں، ریشم!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا جتنا خیال کرتا ہوں، تم مجھے اتنی ہی تکلیف پہنچاتی ہو۔ تم نے اس حویلی کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کسی اور ملازم میں اتنی جرأت ہے کہ وہ رات کے اس پہر بلند آواز میں بات بھی کرسکے۔ تم نے تو پوری حویلی سر پر اٹھا رکھی تھی۔''

''مجھے معاف کردیں صاحب جی!'' ریشم روتے

ہوئے میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ ''وہ اصل میں اس غنی نے بات ہی ایسی کی تھی۔''

''اچھا، میرے پیروں میں مت بیٹھو!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''آیندہ اگر تمہاری طرف سے ایسی کوئی حرکت ہوئی تو تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ غنی آخر تمہارا شوہر ہے۔ تم تو اسے بالکل اپنا زرخرید ملازم سمجھتی ہو۔ وہ تو تم سے محبت کرتا ہے اس لیے کچھ کہتا بھی نہیں ہے، ورنہ تم جانتی ہو، گاؤں کے دوسرے مرد اپنی عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟''

''اب آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میری بلا سے وہ گھر میں کتے پالے یا بندر یا پورے گھر کو چڑیا گھر بنا دے۔''

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے وہ کتا نیلم کے حوالے کردیا ہے، اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''آپ پہلے سارا کام مجھ سے کراتے تھے، اب وہی کام نیلم کرتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔''

''اچھا آیندہ سے میرے سارے کام تم ہی کروگی۔ ابھی تو میں ست بدھائی سے باہر جا رہا ہوں۔ ہاں، ذرا نیلم کو بھیج دینا۔''

''جی صاحب جی!'' وہ خوش ہوکر بولی۔

تھوڑی دیر بعد نیلم اپنی تمام تر خوش سامانیوں سمیت وہاں موجود تھی یا پھر مجھے ہی ایسا لگتا تھا کہ اس کے آنے سے ماحول ایک دم بدل جاتا ہے۔ ویسے جب سے وہ گجرات اور لاہور میں میرے ساتھ رہ کر آئی تھی، مجھ سے کچھ بے تکلف بھی ہوگئی تھی۔

''نیلم! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''صاحب جی! لاہور؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں لاہور!'' میں نے کہا۔ ''تم نے کبھی لاہور کا نام نہیں سنا؟''

''آپ نے اچانک جانے کا فیصلہ کیا ہے اس لیے مجھے حیرت ہوئی تھی۔'' نیلم نے کہا۔ ''مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ آپ جائیں گے؟''

''میں ابھی آدھے گھنٹے میں نکلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم اپنے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھ لو۔''

''میرے پاس سامان ہی کیا ہے صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔ ''میں تو ابھی دس منٹ میں تیار ہوجاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس مرتبہ میرے پیچھے گارڈز کی ایک گاڑی بھی تھی لیکن وہ لوگ پرانی سی ایک ٹویوٹا پک اپ میں موجود تھے اور اپنے حلیوں سے گوالے لگ رہے تھے۔ پک اپ میں دودھ کے دو چار ڈرم بھی تھے۔

میری گاڑی حسب معمول غنی ڈرائیو کر رہا تھا۔ پسنجر سیٹ پر راجا تھا اور عقبی سیٹ پر میرے ساتھ نیلم بیٹھی تھی۔ سرور، احمد شاہ اور شوکا (مالی) ٹویوٹا پک اپ میں سوار تھے۔ اس پک اپ کو شوکا ڈرائیو کر رہا تھا۔ ان کی گاڑی کا فاصلہ ہماری گاڑی سے کچھ زیادہ تھا لیکن غنی کا سرور اور احمد شاہ سے سیل فون پر رابطہ تھا۔

ہاں، میں بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہماری گاڑی میں ایک مسافر اور موجود تھا، یہ مسافر وہ جرمن شیفرڈ تھا جو غنی اور ریشم کے درمیان وجہ تنازع بن گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت آرام سے اس ٹوکری میں سو رہا تھا جو غنی نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کی تھی۔

نیلم البتہ اب تک حیران تھی کہ ہم اسے لاہور میں کیوں لے جا رہے ہیں؟

آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ ''صاحب جی! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''تم سے شکایت؟'' میں نے کہا۔ ''تم سے کیا شکایت ہوگی؟''

''پھر آپ مجھے لاہور کیوں لے جا رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی حویلی میں جو آرام ملا ہے، میں نے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آپ مجھے کس کے حوالے کرنے جا رہے ہیں؟''

''تم کیا سمجھ رہی ہو، ہم تمہیں کسی کے حوالے کرنے جا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو یہی سمجھ رہی ہوں۔'' نیلم نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے لاہور میں آپ کے کسی دوست کو ملازمہ کی ضرورت ہو ورنہ آپ مجھ سے سامان باندھنے کو نہ کہتے۔'' اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اصل میں ہم لوگ خود لاہور میں کچھ دن رہنا چاہتے ہیں۔ وہاں تمہیں کپڑے بدلنے اور چائے وغیرہ کی ضرورت تو پڑے گی نا! یہ کام کون

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرے گا؟"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ "سچ صاحب جی؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔ "آپ کو واقعی لاہور میں کوئی کام ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "ہم نے لاہور میں بھی ایک کوٹھی کا بندوبست کرلیا ہے لیکن نیلم! ایک بات یاد رکھنا۔ وہاں کی کوئی بات باہر نہیں جائے گی۔ ہمارا کام بہت خطرناک ہے، میں نے اسی لیے تمہیں ساتھ لیا ہے کہ تم خطروں سے گھبراتی نہیں ہو۔"

"میری جان تو جاسکتی ہے صاحب جی!" نیلم نے اٹل لہجے میں کہا۔ "لیکن میری زبان سے کوئی ایک لفظ بھی نہیں نکلوا سکتا۔ پھر آپ کے لیے تو میں سو بار مرسکتی ہوں۔"

"ملاحظہ فرمایا آپ نے نواب صاحب؟" راجا نے انگریزی میں کہا۔ "یہ تو ابھی سے سو بار مرنے کی بات کر رہی ہے۔"

"اپنی زبان کو قابو میں رکھ راجا!" میں نے کہا۔ "تو نے پھر بکواس شروع کردی؟"

ہم خیر و عافیت سے لاہور پہنچ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے دشمن یا تو ہم سے غافل ہوگئے ہیں یا پھر انہیں یقین ہے کہ وہ جب چاہیں گے ہماری گردن ناپ لیں گے۔

☆☆☆

اس وقت رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک رواں دواں تھا۔ میں نے ایک پی سی او سے آفتاب خان کے گھر فون کیا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ فاصلے کے لحاظ سے وہ ٹرانسپورٹر تھا۔ وہ رات گئے ہی گھر لوٹتا ہوگا۔ میں نے اور راجا نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آفتاب خان کو اس کے گھر کے نزدیک سے اٹھائیں گے۔ ایک تو اس کا گھر ماڈل ٹاؤن میں تھا جو ہماری کوٹھی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، پھر دفتر کے مقابلے میں گھر سے اٹھانا زیادہ آسان تھا۔ بس اس میں ایک ہی خطرہ تھا، آفتاب خان کے ساتھ مسلح محافظ ہوئے تو گڑبڑ ہوسکتی تھی۔ میں نے ان سے نمٹنے کا بھی انتظام کرلیا تھا۔

غنی نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی تھی کہ کسی کو شبہ نہ ہوسکے۔ ہماری نظریں اس سڑک پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے آفتاب خان کو آنا تھا۔ اس میں یہ مشکل تھی کہ میں آفتاب خان کو پہچانتا نہیں تھا لیکن راجا نے اس کی گاڑی کا میک اور ماڈل معلوم کرلیا تھا۔

"یار فیکے!" راجا کی آواز اندھیرے سے ابھری۔ "ادھر ہم کب تک کھڑے رہیں گے؟ آفتاب آیا بھی تو وہ سیدھا اپنے گھر میں داخل ہوجائے گا۔"

"یہ منصوبہ تو تیرا ہی تھا۔" میں نے کہا۔

"اب اس منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم کرلے۔" راجا نے کہا۔ "ہم براہ راست آفتاب خان کے گھر چلتے ہیں۔"

"نہیں یار، اس میں بھی خطرہ ہے۔ گھر جائیں گے اس کے ملازم ہمیں اندر بٹھا دیں گے یا پھر صاف کہہ دیں گے کہ ابھی صاحب آیا نہیں ہے۔ آپ لوگ صبح آئیں۔"

"تیرے پاس آفتاب خان کا سیل نمبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے یہ نمبر اس کی بیٹی سے حاصل کیا تھا۔"

"تو اسے فون کرکہ اس کی بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ فوری طور پر گھر پہنچے۔"

"وہ فوراً اپنے گھر فون کرے گا اور اسے معلوم ہوجائے گا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے اسے دھوکا دیا ہے۔" راجا نے کہا۔

"سر جی!" اچانک غنی نے کہا۔ "سامنے سے ایک گاڑی آرہی ہے۔ شاید آفتاب خان اسی میں ہو۔"

"تم گاڑی اسٹارٹ کرکے سڑک کے بالکل درمیان لے آؤ۔" راجا نے کہا۔ "اگر آفتاب خان ہوا تو اسے گھیر لیں گے ورنہ معذرت کرلیں گے۔"

غنی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے جھٹکے سے آگے بڑھا کر سڑک کے عین درمیان میں لے آیا۔ اس نے گاڑی کے ہیڈ لیمپس بھی آن کردیے تھے۔

سامنے سے آنے والی گاڑی نے ایک دم بریک لگائے، پھر بھی غنی نے اس کے اگلے حصے پر گاڑی آہستہ سے مار ہی دی۔

گاڑی میں سے ڈرائیور بپھر کر نیچے اترا۔ "اوئے، تجھے سڑک پر چلنے کی تمیز نہیں ہے یا نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی ہے؟"

"میرا ہاتھ بہک گیا تھا صاحب جی!" غنی نے کہا۔ "ویسے آپ فکر مت کریں، آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے وہ میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔"

"میری گاڑی کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے علاوہ گاڑی میں ڈینٹ بھی پڑ گیا ہے۔"

"وہ میں نے کہا نا کہ آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے، میں پورا کردوں گا۔ میں کسی کی زیادہ بات سننے کا عادی بھی نہیں ہوں۔" غنی کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"تو مجھے بتاتا ہے؟" ڈرائیور نے کہا۔

میں نے غور سے اس کا حلیہ دیکھا۔ وہ سفید براق

کلف دار شلوار قمیص اور سفید سلک کی واسکٹ میں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہی آفتاب خان ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے دو آدمی بھی باہر آگئے تھے۔ وہ دونوں مسلح تھے لیکن ان کی رائفلیں ان کے کندھوں سے لٹک رہی تھیں۔

"آپ پاکستان کے وزیراعظم ہوں تو بھی مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے کہا تو ہے کہ آپ کا نقصان پورا کردوں گا۔ ویسے میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام سنے گا تو تیرا پیشاب خطا ہوجائے گا۔" وہ غرور سے بولا۔ "میرا نام آفتاب خان ہے۔"

"آف..... تاب..... خان!" غنی جان بوجھ کر ہکلایا۔ "سر جی! غلطی ہوگئی، معاف کردیں۔ میں ذرا اپنے دوستوں کو سیر کرانے نکلا تھا۔ میرا مالک بہت ظالم آدمی ہے۔ وہ تو میری کھال کھینچ لے گا۔"

اس دوران میں سرور اور احمد شاہ بہت خاموشی سے گاڑی سے اتر گئے تھے۔

غنی اور آفتاب خان کی تکرار میں انہیں موقع مل گیا اور وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر ان دونوں مسلح آدمیوں کی پشت پر جا پہنچے۔

"تو ڈرائیور ہے۔" آفتاب خان نے کہا۔ "میں تجھ سے پیسے کیا لوں گا۔ ویسے شراب پی کر گاڑی مت چلایا کر۔ وہ بھی اتنی قیمتی گاڑی۔"

اچانک سرور اور احمد شاہ نے پشت سے اس کے گارڈز پر حملہ کردیا۔ وہ دونوں کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھے منہ گرے تو آواز سن کر آفتاب خان نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

غنی نے اچانک ریوالور نکال لیا اور بولا۔ "آفتاب خان! خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ ورنہ میرے ریوالور پر سائلنسر فٹ ہے۔"

"کون ہو تم؟"

"کوئی سوال نہیں۔" غنی نے لہجے کو خوفناک بنا کر کہا۔ "گاڑی میں بیٹھ ورنہ میں فائر کردوں گا۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لے۔"

آفتاب خان بکتا جھکتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی غنی نے اس کی کھوپڑی پر بھی ریوالور کا دستہ دے مارا۔ وہ سیٹ پر لڑھک گیا۔

آفتاب خان کی گاڑی اور دونوں گارڈز کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم بہت تیز رفتاری سے اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئے۔

مشکل سے دس منٹ کا فاصلہ تھا جسے غنی نے سات منٹ میں طے کرلیا۔

آفتاب خان کو ہم نے کوٹھی کے آخر میں واقع ایک بیڈ روم میں ڈالا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

میں نے احمد شاہ سے کہا۔ "تم ابھی اور اسی وقت ست بدھائی جاؤ، یہ گاڑی وہاں چھوڑ کر صبح دوسری گاڑی میں واپس آجاؤ۔ اپنے مکینک سے کہنا کہ وہ گاڑی کی اچھی طرح ڈینٹنگ اور پینٹنگ کردے اور رنگ بھی تبدیل کردے۔ اس کے گارڈز نے اگر گاڑی دیکھی بھی ہوگی تو اسے پہچان نہیں سکیں گے۔"

احمد شاہ اسی وقت روانہ ہوگیا۔

مجھے آفتاب خان کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔

غنی نے ہاتھ ہلکا مارا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی کسمسایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ غنی نے اس کے ہاتھ بیڈ کی پشت سے بھی باندھ دیے تھے۔ میں دوسرے کمرے سے اسے دیکھ رہا تھا اور ابھی اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ راجا اور غنی البتہ اس کے سامنے تھے۔

"کون ہو تم لوگ؟" آفتاب خان نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"ہم موت کے فرشتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "تو نے اس دنیا میں بہت عیش کرلیے آفتاب خان! ہم تجھے لے جانے آئے ہیں۔"

"دیکھو، اگر تم سردار جہانگیر کے آدمی ہو تو اسے بتا دو کہ میرا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"ہم شاہ جی کے آدمی ہیں۔" راجا نے اچانک کہا۔

آفتاب خان بری طرح چونکا۔ "شاہ جی کے آدمی! لیکن شاہ جی نے مجھے اس طرح یہاں کیوں بلوایا ہے؟"

"وہ ڈاکٹر کئی دن سے غائب ہے۔ شاہ جی کو اس کی طرف سے بہت فکر ہے۔ تم نے اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں کیا کیا؟"

"اس ڈاکٹر کے بارے میں تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے نواب رفیق اپنے ساتھ لے گیا۔"

"شاہ جی کا خیال ہے کہ اسے تم نے غائب کرایا ہے۔ آخر تمہارے بھی تو کچھ راز تھے اس کے پاس۔" راجا نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"شاہ جی اب مجھ پر شک کررہے ہیں؟" آفتاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خان حیرت سے بولا۔

''ہم تو حکم کے غلام ہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''شاہ جی نے کہا کہ آفتاب خان کو اٹھانا ہے۔ میں نے تمہیں اٹھا لیا، وہ کہیں گے کہ آفتاب خان کو گولی مار دو تو ہم تمہیں گولی بھی مار دیں گے۔''

''لیکن میرا قصور؟''

''ڈاکٹر کہاں ہے؟'' راجا نے لہجے کو کرخت بنا کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر کہاں ہے؟'' آفتاب خان نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ اس کے پاس کتنی ویڈیوز اور سی ڈیز ہیں۔ اگر وہ شاہ جی کے کسی مخالف کے ہاتھ لگ گئیں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟'' راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی سب سے پہلے تو تمہیں اس دنیا سے رخصت کر دے گا کیونکہ صرف تم ہی اس راز سے واقف ہو کہ شاہ جی وہ تمام ویڈیوز اور ڈی وی ڈیز کہاں رکھتے ہیں۔''

''میں ہی نہیں اس راز سے قدوائی اور جابر خان بھی واقف ہیں۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''ان کا نمبر بھی آئے گا۔'' راجا نے کہا۔ ''پہلے تو شاہ جی تمہیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

''شاہ جی مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں۔'' آفتاب خان ہذیانی انداز میں بولا۔ ''انہیں شاید معلوم نہیں کہ میں نے بھی اپنا بندوبست کر رکھا ہے۔ میں نے اپنے وکیل سے کہہ دیا ہے کہ میری موت کی صورت میں وہ تمام سی ڈیز، خطوط اور ڈی وی ڈیز پریس کانفرنس کر کے سردار جہانگیر کے حوالے کر دینا۔ پھر شاہ جی کہاں ہوگا؟''

''تم صبح اپنے وکیل کو فون کرو گے اور اس سے کہو گے کہ وہ تمام اشیا تمہیں واپس کر دے۔'' راجا نے کہا۔

''تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میں خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود دوں گا؟''

''اس کا مطلب تو یہی ہے کہ شاہ جی کا تمام ریکارڈ تمہارے پاس محفوظ ہے۔''

''ہاں، اور یہ بات شاہ جی بھی جانتا ہے۔''

''پھر تو مجبوری ہے۔'' راجا نے کہا۔

آفتاب خان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آگئی۔ ''میں شاہ جی کے کمینے پن سے واقف ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے بچاؤ کا پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔''

''یار، پھر اپنے ان آدمیوں کو واپس بلا دو جو قدوائی کو اٹھانے گئے ہیں۔ اسے اٹھانا بے کار ہے۔'' راجا نے [illegible] سے کہا۔

''وہ بھی ایک نمبر کا حرام زادہ ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''شاہ جی جتنی بھی نئی ویڈیوز بناتا ہے، انہیں ڈی وی ڈیز پر وہی منتقل کرتا ہے اور ڈاکٹر انہیں ارسال کرتا ہے۔''

''لیکن اب ڈاکٹر بھی تو کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''اب شاہ جی کیا کرے گا؟''

''اس کے پاس بندوں کی کمی نہیں ہے۔ اسے ڈاکٹر [illegible] نہیں، ان سی ڈیز کی فکر ہے جو اس کے پاس ہیں۔ ویسے وہ صاف مکر جائے گا کہ میرا ان سی ڈیز سے کیا تعلق [illegible] استغفر اللہ! میں بھلا ایسا کام کر سکتا ہوں۔''

''شاہ جی کو زندگی میں پہلی دفعہ میں نے اپنی غلطی [illegible] پچھتاتے دیکھا ہے۔''

''شاہ جی پچھتا رہا ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ [illegible] تو اپنی سگی بہن کا سودا کرتے ہوئے بھی نہ پچھتائے۔''

''وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے جمال خان شیروانی کو چھ[illegible] کر اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت ضدی افسر ہے۔ اس کی جان چ[illegible] جائے لیکن وہ شاہ جی کی بات نہیں مانے گا۔''

آفتاب خان قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''ذرا قدوائی کو ا[illegible] ویڈیو کی ڈی وی ڈی تیار کر لینے دو۔ پھر دیکھنا اس ضدی ا[illegible] اصول پسند افسر کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اولاد کی محبت بہت بر[illegible] ہوتی ہے۔''

''میں تم سے کہوں گا۔'' راجا نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''اپنے وکیل کو صبح فون کر کے تمام ریکارڈ منگوا لی[illegible] ورنہ...''

''ورنہ کیا...؟'' آفتاب خان حقارت سے بولا۔

''ورنہ تمہاری بھی تو ایک جوان بیٹی ہے۔ شاہ جی اس کی ویڈیو بھی بنوا سکتا ہے۔ اولاد کی محبت واقعی بہت بری ہوتی ہے۔''

''اگر اس کتے نے میری بیٹی کی طرف میلی آنکھوں سے بھی دیکھا تو میں اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ میں... میں...'' وہ بری طرح ہانپنے لگا۔

''وہ تمہاری بیٹی کو میلی آنکھ سے نہیں بلکہ کیمرے کی آنکھ سے دیکھے گا۔ نہ صرف خود دیکھے گا بلکہ دنیا کو بھی دکھائے گا۔ سنا ہے تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے؟''

''بکواس بند کرو...'' وہ اپنے ہاتھ آزاد کرانے کے لیے بری طرح مچلنے لگا۔

''[illegible] سے بچ نہیں ہوگا۔ تم تمام ریکارڈ شاہ جی کے حوالے کرو گے یا پھر تمہاری بیٹی کی ویڈیو تمہاری آنکھوں کے سامنے بنے گی۔''

آفتاب خان غضب ناک ہو کر شاہ جی کی شان میں ایسی گالیاں بکنے لگا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ راجا نے اپنی ذہانت سے کام لے کر آفتاب خان کو شاہ جی کے خلاف کر دیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ قدوائی کو اٹھانے کا تھا۔

☆☆☆

''یہ تو بتاؤ، تم لوگ کون ہو؟'' آفتاب خان نے پوچھا۔

''او بھائی!'' راجا نے کہا۔ ''تم یہ سوال کتنی دفعہ کرو گے؟''

''تم نے پہلے کب بتایا ہے کہ تم لوگ کون ہو؟'' آفتاب خان نے راجا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''پہلے نہیں بتایا ہے تو اب کیسے بتا سکتے ہیں؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتے تھے۔ شاہ جیسا کمینہ آدمی کسی احمق کو تو اپنا دست راست بنا نہیں سکتا۔ تمہیں ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ہم لوگ کون ہیں؟''

''اندازہ کیا، مجھے یقین ہے کہ تم اسی حرامی کے لیے [illegible] ہے ہو، اسی بگا بھگت شاہ جی کے زرخرید ہو لیکن میں صرف تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔''

''ہم کسی کے لیے کام نہیں کرتے احمق!'' راجا نے کہا۔ ''ہم صرف پیسے کے لیے کام کرتے ہیں، صرف پیسے کے لیے۔'' راجا کا لہجہ خالص بدمعاشوں والا تھا۔ ''اگر تم شاہ جی سے زیادہ پیسے دے دو تو ہم تمہارے لیے بھی کام کر سکتے ہیں۔''

آفتاب خان کے چہرے پر اس دوران میں پہلی دفعہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس حرامی نے کتنی رقم دی ہے تمہیں؟'' آفتاب خان نے پوچھا۔

''اس نے ہمیں اس کام کی اتنی رقم دی ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اسے کروڑوں روپے کی ان ڈی وی ڈیز کی [illegible] ہے، وہ تمہیں بھی پارٹی سے نکالنا چاہتا ہے۔'' [illegible] نے کہا۔

''یار، تم اسے سچ سچ کیوں نہیں بتا دیتے؟'' میں نے [illegible] ''وہ تمہیں پارٹی ہی سے نہیں، اس دنیا سے بھی [illegible] چاہتا ہے۔''

''میں اس سے دگنی رقم دوں گا۔'' آفتاب خان پھر [illegible]

''ہم ہمیشہ رقم ایڈوانس لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اور نقد یعنی کیش کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔'' راجا نے ٹکڑا لگایا۔

''اور تم شاید فوری طور پر اتنی رقم کا بندوبست نہ کر سکو۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے اس بات کو بھول جاؤ۔''

''تم رقم بتاؤ۔'' آفتاب خان نے گردن اکڑا کر کہا۔

''دس کروڑ روپے!'' میں نے یوں کہا جیسے دس ہزار کی بات کی ہو۔

''دس کروڑ؟'' آفتاب خان حیرت سے بولا۔ ''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''یہ تو ہمیں شاہ جی سے ملی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''تم نے تو اس کا دگنا دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

آفتاب خان پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ''وہ حرام زادہ کنجوس اتنی بڑی رقم خرچ کر ہی نہیں سکتا۔''

''اس کا ایک کام نہیں ہے بلکہ پورا پیکیج ہے۔ تمہارا اغوا، تم سے ڈی وی ڈیز کی وصولی، تمہاری بیٹی کا اغوا اور اس کی وڈیو کی...''

''بکواس بند کرو۔'' آفتاب خان نے بپھر کر میری بات کاٹ دی۔ ''اگر میری بیٹی کا نام بھی لیا تو...''

میں نے اچانک اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''میں بہت دیر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آیندہ اس لہجے میں بات کرو گے تو میں تمہاری زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

''بیس کروڑ میرے لیے بہت بڑی رقم ہے، میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہم نے تو ایک آفر کی تھی۔'' راجا نے کہا۔ ''تمہیں قبول نہیں تو نہ سہی۔''

''اس بات کو چھوڑو۔ اب جلدی سے یہ فیصلہ کر لو تم وہ ڈی وی ڈیز دے کر اپنی بیٹی کی عزت بچاؤ گے یا...'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''ہم سوچنے کے لیے تمہیں صرف آدھا گھنٹا دے سکتے ہیں۔''

''آدھا گھنٹا تو بہت ہے لی...'' راجا [illegible] کے مطابق مجھے نیلے پتر کہتے کہتے رک گیا۔ وہ بات بنانے کو بولا۔ ''لی زمانہ ایک منٹ کی بھی بہت قیمت ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم سوچو۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم [illegible] ابھی [illegible]''

ہم کمرے سے باہر نکلے تو حسب معمول وہاں [illegible] موجود تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تم یہیں ٹھہرو۔'' میں نے غنی سے کہا۔ ''یا پھر احمد شاہ کی ڈیوٹی لگا دو۔''

میں راجا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد نیلم نے کمرے میں جھانکا۔ ''کافی دوں صاحب جی؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم اس وقت تک جاگ کیوں رہی ہو؟''

''آپ بھی تو جاگ رہے ہیں صاحب جی!'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ٹھیکے پتر!'' راجا نے مسکرا کر کہا، پھر انگریزی میں بولا۔ ''اس کی تمام حرکات وسکنات بیگمات والی ہیں، میرا مطلب ہے بیویوں والی! تو آخر مان کیوں نہیں لیتا کہ......''

''میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا۔'' میں نے گنگنا کر کہا۔ ''ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اب آپ نے بکواس فرمائی تو آپ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔''

''پھر میں کہتا پھروں گا عورت یعنی زن کے معاملے میں جگری دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ جیسے تو میرا ہو گیا ہے کہ اپنی بیگم نمبر پانچ کی خاطر میرا خون کرنے پر آمادہ ہے۔'' راجا مسلسل انگریزی میں بکواس کر رہا تھا۔

نیلم کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی۔

''تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔'' میں نے نیلم سے کہا۔ ''مجھے کافی کی ضرورت ہوگی تو میں غنی سے کہہ دوں گا۔ وہ بھی اچھی کافی بنا لیتا ہے۔''

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ راجا کی مسلسل بکواس میں آدھا گھنٹا گزر چکا تھا، صرف ایک منٹ باقی تھا۔

میں اور راجا دوبارہ اس کمرے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں آفتاب خان کو بند کیا گیا تھا۔

ہمیں دیکھ کر وہ بولا۔ ''میں نے بہت سوچا ہے، بہت غور کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم شاہ جی کے آدمی نہیں ہو۔''

میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''الو کے پٹھے! ہم نے کب کہا کہ ہم شاہ جی کے آدمی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''تو اب تک یہی سوچتا رہا ہے کہ ہم شاہ جی کے آدمی ہیں یا نہیں ہیں۔'' پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''تو عزت سے رہنا نہیں چاہتا ہے، یہ ہے تو پھر یہی سہی۔ احمد شاہ!'' میں نے آواز دی۔

احمد شاہ فوراً ہی کمرے میں آ گیا۔ ''یس باس!''

''بھئی، تم لوگوں نے آفتاب صاحب کا حشر تو دیکھ ہی لیا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کی بیٹی کو یہاں ہونا چاہیے۔''

''او کے باس!'' احمد شاہ نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''ہم ... میری بیٹی تو دہشت ہی سے مر جائے گی۔ وہ بہت کمزور دل ہے۔''

''کیا جمال خان شیروانی کی بیٹی مر گئی؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی اتنی ہی معصوم ہے جتنی تمہاری بیٹی ہے۔ اس کی وڈیو اور تصویریں بناتے ہوئے تمہیں یہ خیال نہیں آیا؟''

''ٹھیک ہے، میں وہ ڈی وی ڈیز تمہیں دینے کو تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں صبح اپنے وکیل کو فون کر دوں گا لیکن وہ ڈی وی ڈیز کہاں پہنچائے گا؟''

''اسے پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس سے خود وصول کر لیں گے۔''

''وہ میرے بغیر ڈی وی ڈیز، تصویریں اور ان کے نگیٹو دے گا نہیں۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''یہ تمہارا دردِ سر ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''ہمیں تو ہر صورت میں وہ چیزیں صبح چاہئیں۔''

''تم نے کیا وکیل کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ڈی وی ڈیز اور بند لفافوں میں کیا ہے؟''

''نہیں وکیل کو میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''وہ سب چیزیں ایک بریف کیس میں ہیں۔''

''پھر تو وکیل کو کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' آفتاب نے کہا۔

''کوشش نہیں، ہمیں وہ بریف کیس چاہیے۔'' راجا نے کہا۔ ''ورنہ پھر ہم صرف کوشش نہیں کریں گے بلکہ......''

''یار، مجھے بار بار دھمکیاں مت دو۔'' آفتاب خان منہ بنا کر بولا۔

''ایک بات اور!'' میں نے کہا۔ ''ہمارے پاس ان تصویروں اور وڈیوز کا ریکارڈ بھی ہے۔ ان میں سے ایک بھی تصویر، ڈی وی ڈی یا وڈیو کم نہیں ہونا چاہیے۔ ہم وہ چیزیں پہلے چیک کریں گے، پھر تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔''

ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''تم اس کا کمرا اچھی طرح لاک کر دو، خود جا کر سو جاؤ۔''

''جی سر آپ سو جائیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔''

اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں نے سوچا، میں بھی کمر سیدھی کر لوں۔

راجا بھی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ میں بھی کپڑے بدلے بغیر بستر پر گر پڑا اور فوراً ہی مجھے بہت گہری نیند آ گئی۔ بہت عرصے کے بعد مجھے اتنی گہری نیند آئی تھی ورنہ میری نیندیں ہی اڑ گئی تھیں۔

مجھے کسی نے آہستہ آہستہ سے شانہ تھپک کر اٹھایا۔

''سونے دو نور!'' میں نے غنودگی کے عالم میں کہا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے، اب اٹھ جاؤ۔'' میرے کانوں میں نور کی آواز آئی۔ اس نے پھر میرا شانہ تھپتھپایا۔

میں نے آنکھیں بند کیے کیے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

آہستہ آہستہ میرے ذہن سے دھند صاف ہونے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ نور تو یہاں ہے ہی نہیں، پھر ... پھر یہ کون ہے؟ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے بازوؤں میں تکیہ تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا کیونکہ باہر ہر طرف دن پھیل گیا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس میں ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس دن بھی شدید سردی تھی لیکن بستر سے تو نکلنا ہی تھا۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور راجا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''قبلہ نواب صاحب، سپیدۂ سحر نمودار ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ اب جلدی سے تیار ہو جا اور سوچ کہ اس ٹرانسپورٹر کے وکیل سے وہ بریف کیس کیسے وصول کیا جائے؟''

''راجا! آج نور کو اغوا ہوئے کتنے روز ہو گئے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''تیرے خیال میں کیا مجھے احساس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا صرف تجھے ہی نور کی فکر ہے؟''

''ایک لڑکی میرے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار تھی۔ وہ اغوا ہونے کے بعد نہ جانے کس حال میں ہے اور ہم یہاں عیش کر رہے ہیں۔'' میں نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''جب تک وہ موجود تھی تو میرے بہت اہم کام وہ ... سے تیری بزم میں تجھے ہنگامے، گئے تو کیا تیری بزم خیال سے بھی گئے؟''

''یہ سب کچھ ہم نور ہی کے لیے تو کر رہے ہیں نیلے!'' ... نے خلافِ معمول نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے ... ... نور کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ... ... سے بازی کریں گے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں راجا!'' میں نے کہا۔ ''مجھے صرف یہ اندیشہ ہے کہ وہ......''

''تو تمام خدشات کو دل سے نکال دے نیلے پتر! تیری ... صبح تو بھی کیا بات لے بیٹھا۔ فی الحال تو ہمیں اس آفتاب خان سے نمٹنا ہے۔''

''تو ہمیں شکار پر جا رہا ہے؟'' میں نے راجا کی تیز اور ڈیزائن جیکٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، شکار بھی آدم خور شیر کا!'' راجا ہنس کر بولا۔ ''وہ کمینہ شاہ جی آدم خور ہی تو ہے۔ وہ اپنے زہد وتقویٰ اور شرفی گیٹ اپ کی آڑ میں کیسے کیسے گھناؤنے کام کر رہا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''چل اب اٹھ جا، ناشتا تیار ہے اور چوہے میرے پیٹ میں کبڈی کھیل کھیل کے نڈھال ہو چکے ہیں۔''

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو راجا ڈرائنگ روم میں میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نیلم نے ناشتا لگا دیا۔

''غنی! اپنے مہمان کو بھی ناشتا کرا دو۔'' میں نے کہا۔ ''اور دھیان رکھنا وہ کوئی معمولی چور اچکا نہیں ہے۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

غنی اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد آفتاب کے کمرے میں پہنچے تو اس نے بیزاری سے ہمیں دیکھا اور بولا۔ ''آپ لوگ اب آئے ہیں۔ میرا وکیل تو اب تک کورٹ کے لیے نکل چکا ہوگا۔''

''کورٹ کیا عالم بالا میں ہے؟'' راجا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''جہاں سے واپس نہیں آ سکتا؟ اس کے پاس سیل فون تو ہوگا؟''

میں نے غنی سے اس کا سیل فون منگوایا اور اس سے کہا۔ ''اپنے وکیل کو فون کرو کہ وہ جہاں بھی ہے، فوراً اپنے آفس پہنچے۔''

''وہ آفس تو پہنچ جائے گا، پھر؟'' آفتاب نے مجھے گھورا۔

''اس سے کہنا کہ میں نے جو بریف کیس رکھوایا ہے، وہ تیار رکھے۔ میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں۔ وہ بریف کیس اسے دے دینا۔''

''وہ نہیں دے گا۔'' آفتاب نے کہا۔

راجا نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ ''ہم نے رات ہی تجھے بتا دیا تھا کہ ... درد ہے۔ ہمیں آج ہر صورت میں وہ بریف کیس چاہیے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''وہ..... دراصل..... میں نے ہی اسے ہدایت دی تھی کہ جب تک میں خود نہ آؤں، وہ بریف کیس کسی کو نہ دے۔''

''اور تمہاری موت کی صورت میں وہ کیا کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میری موت کی صورت میں؟'' آفتاب نے کہا۔

''ہاں، فرض کرو، تم ابھی مرجاؤ تو وہ بریف کیس کسے ملے گا؟''

''میری موت کی صورت میں وہ بریف کیس میری بیوی کو ملے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''پھر تمہارا مرجانا ہی بہتر ہے۔''

''ہم وہ بریف کیس تمہاری بیوی سے وصول کرلیں گے۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا اور جیب سے پستول نکال لیا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس کا رخ آفتاب کی طرف کردیا۔

آفتاب کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

''ایک منٹ!'' راجا نے کہا۔ ''اس پستول پر سائیلنسر فٹ کرلو تاکہ فائر کی آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔''

''لو آ گیڈیا!'' میں نے کہا اور غنی سے سائیلنسر فٹ کرنے کو کہا۔

''باس! اسے مارنے میں اتنا اہتمام کیوں کر رہے ہیں؟ میں ایک سیکنڈ میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔''

غنی اس کی طرف بڑھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''میں نے غلط کہا تھا کہ بریف کیس میری بیوی کو ملے گا۔ میرے مرنے کے بعد وہ بریف کیس میری ٹرانسپورٹ کمپنی کے ایک ڈائریکٹر اشرف کو ملے گا۔ میں نے تھوڑا بہت اسے بتا بھی دیا ہے اور.....''

''یہ وقت ضائع کر رہا ہے باس!'' غنی، آفتاب کے سامنے مجھے مسلسل باس کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''تمہارا خیال درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا احمد شاہ کو بلاؤ۔''

غنی، احمد شاہ کو بلا لایا۔

احمد شاہ خاصا دراز قد تھا، اس کا جسم کسرتی تھا اور رنگت سرخ و سفید تھی۔ وہ چہرے سے ہی ملٹی نیشنل کمپنی کا کوئی ملازم لگ رہا تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''تم ابھی آفتاب کے گھر جاؤ اور اس کی بیٹی کو اٹھا لاؤ۔ آج کل سردیوں کی چھٹیاں ہیں اس لیے وہ اس وقت گھر میں ہی ہوگی۔''

''میری بات سنو، دیکھو میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ وہ تو یہاں تک آتے آتے ہی مرجائے گی۔'' آفتاب تلملا کر بولا۔

میں نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔ ''ہاں! آفتاب کی کوئی اور بیٹی ہو تو اسے بھی اٹھا لانا۔''

''میری بات سنو!'' آفتاب چیخ کر بولا۔

''ہاں جانے سے پہلے عامر کو فون کر دینا کہ وہ مووی کیمرے اور لائٹس وغیرہ لے کر یہاں پہنچ جائے۔''

''میری بات سنو حرام زادے!'' آفتاب بھڑک کر بولا۔

میں نے مڑ کر اس کے منہ پر اتنا زوردار ہاتھ مارا کہ نہ صرف اس کے ہونٹ بلکہ بایاں رخسار بھی زخمی ہو گیا۔ ''اب اگر تو نے بکواس کی تو تیری زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' پھر میں احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔ ''اپنے ساتھ تین چار آدمی لے جانا۔ اس کے گھر میں کوئی ذرا بھی مزاحمت کرے تو اسے گولی مار دینا۔ ہاں، آتے ہوئے اس کی بیوی کو بھی گولی مار دینا۔''

''خدا کے واسطے میری بات سن لو۔'' آفتاب نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات ان سنی کر دی اور احمد شاہ سے کہا۔ ''اگر اس کی بیوی طرح دار اور خوب صورت ہو تو گولی مارنے کے بجائے اسے بھی اٹھا لانا۔''

''تمہیں اللہ کا واسطہ! اپنے بچوں کا واسطہ! میری بات سن لو۔''

''جاؤ احمد شاہ!'' میں نے آفتاب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

احمد شاہ کمرے سے باہر جانے لگا تو میں نے غیر محسوس انداز میں اشارہ کر دیا کہ ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ باہر نکل گیا تو آفتاب خان نے کہا۔ ''اگر..... میری بیٹی..... اور بیوی..... کو..... کوئی گزند پہنچی تو..... تو میں..... پورے شہر کو..... الٹ پلٹ کر دوں گا۔''

وہ اس وقت مجھے بالکل جنونی لگ رہا تھا۔

''شہر کو کیا، تم پورے ملک کو تہ و بالا کر دینا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تمہاری بیٹی کی وڈیو ضرور دے گی۔''

''کمینے ہو تم لوگ، کتے ہو حرام زادو! یہ کوئی مردانگی ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ اپنے حواس کھو رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر پھر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو، میں ابھی تمہاری زبان ہی کٹوا دیتا ہوں۔'' میں نے

بلند آواز میں غنی کو پکارا۔

غنی فوراً ہی کمرے میں آ گیا۔ ''یس باس!''

''تمہارے کتے نے آخری مرتبہ انسانی زبان کب کھائی تھی؟''

''تین دن ہو گئے باس!'' غنی نے کہا۔ ''انسانوں کی زبان، کان اور ناک تو اس کی پسندیدہ غذا ہے۔''

''چلو، پھر اس کی زبان بھی کاٹ لو۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''اوکے باس!'' غنی نے مستعدی سے کہا۔

''دیکھو میری بات سنو!'' آفتاب خان نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''تمہیں وہ بریف کیس چاہیے نا! وہ تمہیں مل جائے گا۔ اللہ کے واسطے اپنے آدمی کو واپس بلا لو۔ میری بیٹی تو دہشت سے مر ہی جائے گی۔''

''یہ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔'' پھر میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور یونہی ایک نمبر پنچ کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہاں احمد شاہ! مشن آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی کر دو۔ اپنی گھڑی دیکھ لو۔ اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر میری کال نہ آئے تو تم اپنا کام کر سکتے ہو۔'' میں نے سیل فون آف کیا اور جیب میں ڈال لیا۔

''آدھا گھنٹا تو بہت کم ہے۔ میں.....''

''دیکھو، اب تم خود وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تیس منٹ میں سے دو منٹ گزر چکے ہیں۔''

''میرا سیل فون دو۔ وکیل کوئی اجنبی نمبر دیکھ کر شاید نہ پڑھ سکے گا۔''

راجا اس دوران میں لاتعلقی سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ غنی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا سیل فون نکال لیا، اسے آن کیا اور میری طرف بڑھا دیا۔

وہ خاصا قیمتی سیل فون تھا۔ میں نے آفتاب سے پوچھا۔ ''وکیل کا فون نمبر بتاؤ۔''

''مجھے زبانی یاد نہیں ہے۔''

''وکیل کا نام بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ..... وہ کسی اور کو فون نہ کر دے۔

''منصور ڈھلون!'' اس نے مرے مرے انداز میں کہا۔

''میں نے اس کے موبائل کی فون بک سے منصور ڈھلون کا نمبر نکالا اور اس نمبر پر اپنے سیل فون سے کال کر دی۔

دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجیں، پھر کسی نے فون ریسیو کر لیا اور مجھے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''وکیل صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ایک کیس کے سلسلے میں مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔''

''ابھی تو میں کورٹ میں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ شام پانچ بجے میرے آفس آ جائیں۔ ویسے میرا نمبر کس نے دیا آپ کو؟''

''اب آپ اتنے غیر معروف بھی نہیں ہیں وکیل صاحب!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''شہر میں آپ کا نام ہے۔''

''کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''میں مسعود احمد خاکوانی بول رہا ہوں وکیل صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں ملتان سے اسی کیس کے سلسلے میں لاہور آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ میرے آفس کا ایڈریس لکھ لیں۔''

''جی بتائیے!'' میں نے کہا۔ پھر غنی کو نوٹ کرنے کا اشارہ کیا۔

غنی نے اس کا ایڈریس اپنے سیل فون میں لکھ کر محفوظ کر لیا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اب تو تمہاری تسلی ہو گئی؟'' آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہ بہت ضروری تھا۔'' راجا نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔ ''اب تم وکیل کو اپنے سیل سے فون کرو گے اور فون کا اسپیکر آن رکھو گے۔''

''میں نمبر ملا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ آفتاب خان کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات تھے۔ میں نے آفتاب خان کے سیل فون سے وہی نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر فون کا اسپیکر آن کر کے آفتاب کو دے دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔

تیسری گھنٹی پر وکیل نے کال ریسیو کر لی۔ ''جی خان صاحب!'' اسپیکر پر وکیل کی آواز سنائی دی۔ ''آج صبح صبح کیسے یاد کر لیا؟''

''وکیل صاحب!'' آفتاب نے کہا۔ ''میں نے آپ کے پاس جو بریف کیس رکھوایا تھا، مجھے فوری طور پر اس کی ضرورت ہے۔''

''..... وہ بریف کیس تو میں نے بینک کے لاکر میں رکھوا دیا ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''آپ کہاں ہیں، شام تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے آفس آجائیں، میں......"

"اس میں میرے کچھ انتہائی اہم کاغذات ہیں اور مجھے فوری طور پر ان کی ضرورت ہے۔"

"اس وقت تو میں ہائی کورٹ میں ہوں۔" وکیل نے کہا۔ "دو مقدمات کی پیشیاں ہیں، میں اس وقت کیسے آسکتا ہوں؟" وکیل نے سرد لہجے میں کہا۔

"آپ کورٹ میں اپنے کسی اسسٹنٹ کی ڈیوٹی لگا دیں، مجھے آدھے گھنٹے میں وہ بریف کیس چاہیے۔"

"لیکن سر! میرے دوسرے مقدمات ......"

"لعنت بھیجو ان مقدمات پر!" آفتاب جھنجلا کر بولا۔ "میں تمہیں اتنا بھاری معاوضہ یوں ہی نہیں دیتا۔"

"لیکن سر...... !"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" آفتاب خان نے چیخ کر کہا۔ "مجھے آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ بریف کیس چاہیے، انڈر اسٹینڈ!"

"اوکے سر!" وکیل نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس وقت ساڑھے دس بجے ہیں۔ آپ گیارہ بجے تک دفتر آجائیں یا میں خود وہ بریف کیس آپ کے گھر پہنچا دوں؟"

"نہیں، میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں، میں آدھے گھنٹے بعد خود ہی تمہارے آفس آجاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب تو اپنے آدمی کو فون کر دو کہ وہ میرے گھر کی طرف نہ جائے۔"

"چلو، تمہیں آدھے گھنٹے کی مہلت مزید دے دیتے ہیں۔" راجا نے کہا۔

میں نے پھر اسے دکھانے کے لیے یوں ہی ایک نمبر ملایا اور بولا۔ "احمد شاہ! میں آدھے گھنٹے بعد تمہیں کال کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے سیل فون جیب میں ڈال لیا۔

آفتاب خان نے میری ہی ہدایت پر وکیل کے آفس آنے کو کہا تھا۔ غنی نے اس کے دفتر کا پتا تو لکھ ہی لیا تھا، میں نے تصدیق کرنے کو آفتاب خان سے پوچھا۔ "وکیل کے آفس کا ایڈریس بتاؤ۔"

"جب تم مجھے لے جا رہے ہو تو ایڈریس کی کیا ضرورت ہے؟"

"تمہیں کون لے جا رہا ہے؟" راجا نے کہا۔ "وکیل بریف کیس لے آئے گا تو باقی کام ہم لوگ خود ہی کرلیں گے۔"

راجا کے جواب سے آفتاب خان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"تم کیا سمجھ رہے تھے کہ ہم تمہیں بھی وہاں لے جائیں گے اور تم وہاں جا کر کوئی چالاکی دکھاؤ گے؟ تم صرف وکیل کا ایڈریس بتاؤ۔"

آفتاب خان نے اس کا وہی پتا دہرا دیا جو وکیل نے مجھے بتایا تھا۔

"وکیل کا حلیہ بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"آپ کی طرح قدآور اور صحت مند آدمی ہے۔ ریبن کا چشمہ استعمال کرتا ہے۔"

میں نے غنی کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر آکر میں نے اس سے کہا۔ "تم اور احمد شاہ ابھی وہاں چلے جاؤ۔ تم اس وکیل سے پہلے پہنچ جاؤ گے۔ بڑے وکیل اپنی کوئی سیکریٹری یا کوآرڈینیٹر ضرور رکھتے ہیں۔ اگر اس کا آفس کھلا ہو تو تم لوگ اندر جا کر بیٹھ جانا اور اگر......" میں بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ میں نے سوچا، اس بریف کیس میں انتہائی قیمتی اسٹف ہے۔ اس موقعے پر مجھے یا راجا کو بھی ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

"میں بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔" راجا نے کہا۔

میں چونک اٹھا کہ راجا بھی میرے ہی انداز سے سوچ رہا ہے۔

غنی نے آفتاب خان کے کمرے کو تالا لگایا اور وہ لوگ عجلت میں روانہ ہوگئے۔ غنی نے جانے سے پہلے آفتاب خان کے کمرے پر مالی کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ وہ وہیں برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

"صاحب جی! کافی لاؤں آپ کے لیے؟" نیلم نے کمرے میں جھانکا۔

"نہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

میری نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔

جب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا تو میں نے راجا کو فون کیا۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ راجا کا سیل فون بند تھا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی لیکن دوبارہ بھی وہی ریکارڈنگ سنائی دی۔

میں مزید پریشان ہوگیا کہ راجا نے سیل فون آف کیوں کر رکھا ہے؟

میں نے غنی کو فون کیا۔ اس کا سیل فون بھی بند تھا۔ میں

بہت زیادہ فکرمند ہوگیا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ میں شدید اضطراب اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ احمد شاہ کو کال کروں لیکن پھر یہ سوچ کر نہیں کیا کہ اگر اس کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں آیا تو؟

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں گھنٹی کی آواز سے یوں اچھلا جیسے میرے قریب ہی بم پھٹا ہو۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا تو اسکرین پر احمد شاہ کا نام تھا۔ میں نے بے تابی سے سیل فون کان سے لگا لیا۔

"ہاں احمد شاہ؟" میں نے پوچھا۔

"سر، یہاں تو اچھی خاصی گڑبڑ ہوگئی ہے۔" احمد شاہ نے کہا۔ "راجا صاحب اور غنی کو کچھ لوگوں نے گن پوائنٹ پر اس وکیل کے آفس ہی میں روک لیا ہے۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس بلڈنگ کے نزدیک ہی ہوں، بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف کھڑا ہوں۔"

"تم وہیں ٹھہرو، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا، جاتے جاتے میں نے مالی سے کہا۔ "محتاط رہنا اور قیدی کا خیال رکھنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اپنی گاڑی نکالی اور آندھی طوفان کی طرح روانہ ہوگیا۔

احمد شاہ وہیں موجود تھا۔ میں نے گاڑی مناسب جگہ پارک کی اور احمد شاہ کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا ہوا تھا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"سر! راجا صاحب اور غنی مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ میں احتیاطاً ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم لوگ البتہ ایک ہی لفٹ میں اوپر پہنچے تھے۔ لفٹ میں ہمارے علاوہ کچھ لوگ اور بھی تھے۔ میں ان دونوں سے بالکل انجان بنا اوپر پہنچا۔ کوریڈور میں بھی وہ لوگ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ وہ دونوں وکیل کے دفتر کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ اندر سے دو آدمی نکلے۔ مجھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دکھائی دی، پھر وہ ان لوگوں کو یوں اندر لے گئے جیسے وہ کوئی معزز مہمان ہوں کیونکہ اس وقت کوریڈور میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔"

"کیا وہ لوگ اب بھی وہیں ہیں؟"

"جی سر!" احمد شاہ نے جواب دیا۔ "اس عمارت سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ ان دونوں کو اگر کہیں اور لے جایا جاتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا۔ میں نے بلڈنگ کے مین گیٹ سے ایک لمحے کو بھی نظر نہیں ہٹائی ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

"میں اس وکیل کے دفتر میں جا رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم پہلے کی طرح دور رہ کر میری نگرانی کرنا اور اگر میں آدھے گھنٹے تک نہ آؤں تو تم اپنے طور پر کارروائی کرنا۔"

"سر، آپ یہیں ٹھہریں۔" احمد شاہ نے کہا۔ "میں ابھی اپنے طور پر کارروائی کر لیتا ہوں۔"

احمد شاہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔

ابھی احمد شاہ لفٹ سے کچھ فاصلے پر تھا کہ لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے کئی آدمی باہر نکلے۔ ان میں ایک وکیل بھی تھا۔ وہ اپنے کالے کوٹ کی وجہ سے پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاصا بھاری بھرکم ایک بریف کیس بھی تھا۔

لفٹ سے نکلتے ہی اس نے دوڑنا شروع کر دیا اور احمد شاہ کے نزدیک سے گزر کر مین گیٹ کی طرف بھاگا۔

میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ بلڈنگ کی عمارت سے نکل کر مین روڈ پر دوڑنے لگا۔

اسی وقت مجھے راجا اور غنی دکھائی دیے۔ وہ دونوں شاید سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آئے تھے۔ غنی کی نظر اس وکیل پر پڑ گئی۔ وہ بھی اندھادھند اس کے پیچھے بھاگ لیا۔

احمد شاہ نے بھی راجا اور غنی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی تیزی سے واپس آگیا۔

وکیل دوڑ کر ایک بس میں سوار ہوگیا۔

"احمد شاہ!" میں نے کہا۔ "جلدی سے گاڑی لے کر آؤ۔"

وہ میرے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر گاڑی کی طرف جھپٹا۔ وہ بس میری نظروں میں تھی۔ احمد شاہ گاڑی لایا تو میں اور راجا اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے احمد شاہ سے بس کا پیچھا کرنے کو کہا۔

غنی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا نہ جانے کس طرف نکل گیا تھا۔ اسے ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے ہم بس کے پیچھے چلتے رہے۔ بس ایک اسٹاپ پر رکی تو احمد شاہ نے بھی گاڑی کی رفتار بہت کم کر دی۔

بس میں سے دو آدمی اترے۔ ان دونوں میں سے کوئی وہ وکیل نہیں تھا۔

میں نے احمد شاہ سے کہا۔ "تم بس کو اوورٹیک کرکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے آگے آجاؤ، میں بس سے اترنے والے مسافروں پر دھیان رکھوں گا۔"

اسی وقت بس کی رفتار بہت سست ہوگئی۔ احمد شاہ نے بہت مہارت سے اسے اوورٹیک کیا اور بس کے آگے آگیا۔ اب میں بہت آسانی سے اترنے والے تمام مسافروں پر نظر رکھ سکتا تھا۔

میں نے ابھی تک راجا سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا، نہ اس نے مجھے کچھ بتایا تھا۔ فوری طور پر تو ہمیں اس بریف کیس کی فکر تھی جو ہمارے ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا۔

اچانک میری نظر پیچھے کی طرف سڑک پر پڑی۔ وکیل آنے والی گاڑیوں کی پروا کیے بغیر سڑک پار کررہا تھا۔

"گاڑی روکو!" میں نے چیخ کر احمد شاہ سے کہا۔

اس نے ایک دم بریک لگا دیے۔ بریکوں کی چرچراہٹ سے آس پاس کی گاڑیوں والے اور راہ گیر ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہمارے پیچھے جو گاڑی تھی، وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ اس نے بھی بروقت بریک لگا دیے۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "وہ جارہا وکیل!" اور گاڑی سے باہر کود گیا۔

میں خاصی تیزی رفتاری سے وکیل کے پیچھے بھاگا لیکن اس وقت تک وہ آنے جانے والی دونوں سڑکیں پار کرکے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ میں نے بھی سڑک پار کرنے کی کوشش کی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وکیل ایک رکشا میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

"تم گاڑی گھما کر لاؤ۔" میں نے احمد شاہ سے کہا۔

"میں دوسری طرف جاکر کوئی رکشا یا ٹیکسی دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بھی اندھا دھند سڑک پار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ گاڑی کو یوٹرن لینے کے لیے بہت آگے جاکر سڑک کے درمیان راستہ ملے گا۔

میں آنا فاناً سڑکیں پار کرکے دوسری طرف پہنچا لیکن دور دور تک کسی رکشا یا ٹیکسی کا پتا نہیں تھا۔

وکیل کا رکشا بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

میں نے ایک دو گاڑی والوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ لوگ رکے بغیر گزر گئے۔ جس قسم کے حالات تھے، ان میں تو وہ گاڑی والے گاڑی نہ روکنے میں حق بجانب تھے۔

اسی وقت احمد شاہ نے میرے پاس گاڑی روکی۔ میں تنک تنکے انداز میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"نکل گیا مردود!" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "لیکن جائے گا کہاں؟ میں آفتاب خان کے جسم کی کھال کھینچوا دوں گا۔" میں راجا سے مخاطب ہوا۔ "ہاں راجا! اب تو بتا، وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"میں اور غنی وہاں پہنچے تو احمد شاہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔" راجا نے کہنا شروع کیا۔ "غنی نے آفس کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور اندر سے کرخت چہرے والے آدمی نے باہر جھانکا۔

"مجھے وکیل صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"آیئے اندر آجایئے۔ وکیل صاحب ابھی تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔" اس نے کہا اور عجیب سی نظروں سے ایک جانب دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا۔

مجھے فوراً ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا۔ غنی نے اندر جانا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور کرخت چہرے والے سے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم باہر ہی وکیل صاحب کا انتظار کرلیتے ہیں۔"

میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ کرخت چہرے والے نے اچانک گن نکال لی۔ پھر ایک دوسرا شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ وہ دونوں جلدی سے باہر آگئے۔ ایک نے میری کمر سے ریوالور لگایا اور دوسرے نے غنی کو گن پوائنٹ پر لیا لیکن اتنی مہارت سے کہ آس پاس سے گزرنے والوں کو شبہ تک نہ ہوسکا کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول ہیں۔

کرخت چہرے والا ہنس کر بولا۔ "کوئی چالاکی مت دکھانا ورنہ میرا پستول بے آواز چلتا ہے۔"

دوسرا دوستانہ انداز میں مسکرا کر غنی سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے بھی میرے ساتھی کی بات سن لی ہوگی۔ اب خاموشی سے اندر چلو۔"

قریب سے گزرنے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ ہم لوگ وہاں کھڑے ہوئے گپ شپ کررہے ہیں۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو انہوں نے ہمیں ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم دیا اور رخ دیوار کی طرف پھیر دیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب کے کلائنٹس کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے یہاں؟"

"وکیل صاحب وقت دیے بغیر کسی سے نہیں ملتے۔" کرخت چہرے والے کی آواز سنائی دی۔ ہمارا رخ دیوار کی طرف تھا اس لیے مجھے ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ان دونوں نے بہت مہارت سے ہماری تلاشی لی اور ان میں سے ایک طنزیہ لہجے میں بولا۔ "وکیل صاحب کے کلائنٹس مسلح ہوکر نہیں آتے۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں کوئی ایرا غیرا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی حفاظت کے لیے نہ صرف مسلح رہنا پڑتا ہے بلکہ باڈی گارڈ بھی رکھتا ہوں۔"

ان لوگوں نے ہماری جیبوں سے سیل فون بھی نکال کر آف کردیے۔

"سر! آپ کے وکیل تو بیرسٹر سجاد صاحب ہیں۔ پھر کسی چھوٹے موٹے وکیل سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" غنی نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ غنی ان لوگوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ سرور ڈھلوں بھی شہر کے چند بہترین اور مہنگے وکیلوں میں سے ایک تھا۔

"کیا کہا؟" کرخت چہرے والا بھنا کر بولا۔ "چھوٹے موٹے وکیل!"

"یار! یہ تو دیکھ کر ہی معلوم ہوگا کہ وہ چھوٹے ہیں یا موٹے؟" غنی نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

ہم لوگ غیر محسوس طور پر ان کی طرف گھوم چکے تھے۔ غنی نے بہت پرانا اور گھسا پٹا حربہ آزمایا۔ وہ حربہ کبھی کبھی کامیاب بھی ہوجاتا ہے۔ میں نے اچانک کہا۔ "لو وہ وکیل صاحب بھی آگئے۔"

ان دونوں نے بیک وقت گھوم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ غنی کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے بدمعاش کے پستول پر ہاتھ مارا اور دوسرے بدمعاش کی ناف پر زوردار لات رسید کردی۔

اس کے حلق سے ایک کراہ برآمد ہوئی اور ریوالور دور جا گرا۔ میں نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا۔ غنی بھی دوسرے بدمعاش سے ریوالور چھین چکا تھا۔

"ہاں، اب تم یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور یہ سب کیا ہے؟"

"ہم تو وکیل صاحب کے ملازم ہیں۔" ان میں سے ایک بولا۔

"تم لوگ کیا وکیل صاحب کے ہر کلائنٹ کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔" وہ دوسرا بولا۔

"غنی!" میں نے کہا۔ "ان دونوں کے گلے میں پھندا ڈال کر انہیں پنکھے سے لٹکا دو۔"

"ہم تو... میں انہیں ذبح کرکے ان کی لاشیں کسی کمرے میں یا باتھ روم میں چھپا دیتا ہوں، پھر اس وکیل سے بھی نمٹ لیں گے۔" یہ کہتے ہوئے غنی نے اپنی جیب سے تیز دھار والا خنجر نکال لیا۔

"ہم سے وکیل صاحب نے کہا تھا کہ یہاں آفتاب صاحب کے علاوہ کوئی بھی آئے اسے میرے پاس آنے سے روک کر رکھنا۔"

"کیوں؟"

"یہ تو وکیل صاحب خود ہی بتائیں گے۔ وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ اس نے باری باری پشت پر جاکر دونوں کی کھوپڑیاں ریوالور کے دستے سے سہلا دیں۔

وہ دونوں فوراً ہی ناک آؤٹ ہوگئے۔ غنی نے انہیں کھینچ کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا۔

ہم لوگ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنے سیل فون تک آف نہیں کیے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو غنی نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

وکیل نے بھی آہستہ سے دروازہ کھولا۔ پھر مجھ پر اور غنی پر نظر پڑتے ہی وہ اچانک بھاگ نکلا۔ لیکن وہ بھاگ کر جائے گا بھی کہاں؟" راجا نے کہا۔ "ابھی آفتاب خان تو ہمارے قبضے میں ہے۔"

"یار، مہاراجا! یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وکیل کو سب کچھ معلوم ہو اور وہ آفتاب خان کو بھی ڈبل کراس کررہا ہو؟"

"ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" راجا نے کہا۔ "تو مرغ کی طرح بانگ دے سکتا ہے، سر کے بل کھڑا ہوسکتا ہے۔"

"سوسائٹی میں اور بھی بے شمار لیے ہیں مہاراجا! تو کن کن مسائل کو روئے گا۔" میں نے کہا۔

"تو تو یوں چہک رہا ہے جیسے تو نے نور کو بازیاب کرالیا ہے؟" راجا نے کہا۔

میرا اچھا بھلا موڈ راجا کے اس جملے سے غارت ہوگیا۔

شاید راجا کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "سوری یار! میں پتا ہوں...."

"بس کر یار!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "چل ذرا اس ٹرانسپورٹر کی خبر لیں۔ مجھے شبہ ہے کہ اس نے ضرور زارا سے فون پر وکیل نے کوئی ایسی بات نہیں کی..."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سیدھا آفتاب خان کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے تیور دیکھ کر بوکھلا کے اٹھ بیٹھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرنا۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ الٹ کر بیڈ پر گر گیا۔ ''الو کے پٹھے! تو نے فون پر اس وکیل سے کیا کہا تھا؟''

''میں نے آپ کے سامنے ہی تو بات کی تھی۔'' وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر میری انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ اس کے ہونٹ بھی پھٹ گئے تھے اور ان سے بھی خون جاری تھا۔

''تم نے وکیل سے کیا کہا تھا؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''تو کیا سرور تمہیں نہیں ملا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو آفتاب خان!'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو، ورنہ تم جانتے ہو کہ میں...''

''میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اس سے کچھ بھی...''

''بند کرو یہ بکواس!'' میں نے گرج دار آواز میں اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ''کیا تم مجھے اتنا ہی الو کا پٹھا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری اس بکواس پر یقین کر لوں گا۔ وہ حرام زادہ پہلے تو ہمیں گھیرنے کے چکر میں تھا، پھر جب بات نہیں بنی تو وہ بریف کیس سمیت کہیں غائب ہو گیا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' آفتاب خان الجھ کر بولا۔

''ایسا ہوا ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں پانچ منٹ دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' پھر میں نے بلند آواز میں پکارا۔ ''احمد شاہ!''

تھوڑی دیر بعد احمد شاہ کمرے میں موجود تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید وہ کوٹھی کے کسی دوسرے حصے میں تھا اور یقیناً غنی نے سیل فون پر کال کر کے اسے بلایا تھا۔

''یس سر!''

''تم ابھی آفتاب خان کے گھر جاؤ اور اس کی دونوں بیٹیوں کو اٹھا لاؤ۔''

''... تم کیا کہہ رہے ہو، میری چھوٹی بیٹی تو مشکل سے ابھی تیرہ چودہ سال کی ہوئی۔''

''ہاں، اس کی بیوی کو بھی اٹھا لانا۔''

''دیکھو! میں نہیں جانتا کہ وہ وکیل کیوں بھاگ گیا، میں...''

''ابھی تمہارے دو منٹ باقی ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں گھڑی پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

پانچ منٹ پورے ہوتے ہی میں نے احمد شاہ کو جانے کا اشارہ کیا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

''دیکھو، میری بیٹیوں پر یہ ظلم مت کرو۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے بتا دیا۔''

''ممکن ہے تمہاری بیٹیوں یا بیوی کو کچھ معلوم ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟'' آفتاب خان اچانک چیخ کر بولا۔

''اگر تمہیں کچھ یاد آ جائے تو بتا دینا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری بیٹیوں کو یہاں لانے کے بعد بھی چھوڑ دوں گا۔''

میں کمرے سے باہر آ گیا۔ راجا مجھے کوریڈور میں ملا۔ ''کچھ بتایا اس ٹرک ڈرائیور نے؟'' راجا نے پوچھا۔

''کون ٹرک ڈرائیور؟'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر! یہ آفتاب خان جو آج اتنا معزز بنا بیٹھا ہے۔ یہ پہلے ٹرک ڈرائیور تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''اور ٹرک بھی اس کا اپنا نہیں تھا بلکہ یہ ٹھیکے پر ٹرک چلاتا تھا۔ جیسے تو اچانک ست بدھائی کا نواب بن بیٹھا ہے۔'' راجا نے مجھے چھیڑنے کو کہا۔

''میں نے نواب بننے کے لیے کسی کا گلا نہیں کاٹا، غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیا، منشیات کی اسمگلنگ نہیں کی، بردہ فروشی اور اغوا برائے تاوان کی وارداتیں نہیں کیں۔''

''ہاں، تیری تو لاٹری نکلی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن ہر شخص اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا۔ اس بات کو چھوڑ، اس نے تجھے کچھ بتایا اس وکیل کے بارے میں؟''

''وہ مسلسل یہی کہہ رہا ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ وکیل فرار کیوں ہوا ہے؟''

''یار! میں تو سمجھتا تھا کہ تو ہی ڈھیٹ ہے پر یہ ٹرک ڈرائیور تو تجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔''

''بلوائی کرے گا تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔''

''یار، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آفتاب خان کو کچھ معلوم نہ ہو۔'' راجا نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو کیا واقعی اس کی بیٹیوں کو اٹھوا لوں؟''

''تو پہلے اس سے وکیل کا پتا اور اس کے دوسرے ٹھکانے معلوم کر۔'' راجا نے کہا۔ ''بلکہ تو رہنے دے۔ یہ کام مجھ کو کرنے دے۔''

''کھانا کھا کر میں خود ہی معلوم کرا لوں گا۔''

☆☆☆

کھانے کے بعد میں راجا اور غنی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر آفتاب خان کے کمرے میں پہنچا۔

''مجھے یقین ہے کہ اب تک تمہیں یاد آ گیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

آفتاب خان خاموشی سے ہمارے چہرے دیکھتا رہا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی بیٹی اور بیوی کو دہشت زدہ کروں لیکن وہ آفتاب خان اتنا ڈھیٹ تھا کہ کسی طرح زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، ایک آخری کوشش کر لوں، پھر اس کی بیٹی اور بیوی کو اٹھوائے بغیر کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

میں نے اچانک گن نکالی اور آفتاب خان کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ''اگر تم نے میرے تین کہنے سے پہلے زبان نہ کھولی تو میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری زندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وکیل کو شاہ جی بھی خود تلاش کر لے گا۔''

''اس کی بیٹیوں اور بیوی کا کیا کرنا ہے سر؟'' راجا نے سنجیدگی سے کہا۔

''ان کی وڈیو بنا کر مارکیٹ میں پھیلا دو۔'' میں نے کہا۔ پھر آفتاب خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ایک، دو...''

''ٹھہرو۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''ایک دفعہ میری بیوی سے بات کرا دو۔'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''اب یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری فیملی یہاں نہیں ہے۔ ان کی تو وڈیو بن رہی ہوگی۔''

''ایسا مت کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''اب یہ کوئی نئی چال ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''دراصل میں میری بیوی... وہ... وکیل... میری بیوی کی ... گیا ہوگا... میں نے ... اسے فون پر ... ہدایات دی تھی۔''

''پھر تم اس ... ہو تم؟'' میں نے کہا۔ ''فون تو تم ... نے ... تھا۔''

''میں نے اپنے وکیل کو پہلے ہدایات دے رکھی تھی کہ اگر میں بھی فون پر تم سے بریف کیس کا مطالبہ کروں تو اس پر یقین مت کرنا۔ مجھے جب بھی بریف کیس کی ضرورت ہوگی، میں خود آفس آ جاؤں گا۔''

''لیکن اس مردود نے تو ہمیں گھیرنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ اس نے میری بیوی کی ہدایت پر کیا ہوگا۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میں نے وکیل کو ہدایت دی تھی کہ اگر کبھی تمہیں میری طرف سے ایسا کوئی فون موصول ہو تو تم میرے گھر فون کر کے مجھ سے یا میری بیوی سے تصدیق ضرور کرنا۔''

''تو کیا ان کالے دھندوں میں تمہارے ساتھ تمہاری بیوی بھی ملوث ہے؟'' راجا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' آفتاب خان نے سر جھکا کر کہا۔ ''وہ میرے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ اس کا رابطہ براہ راست شاہ جی سے بھی ہے۔ اب تک شاہ جی کو بھی میرے اغوا کا علم ہو گیا ہوگا۔''

''اس کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے اسی کے حکم پر تو تمہیں اٹھایا ہے۔ شاہ جی نے اس سے یہی کہا ہوگا کہ آفتاب خان کو میں نے اپنے کسی کام سے بھیجا ہے۔''

''میری بیوی اچھی عورت نہیں ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''اسے آپ جیسے چاہیں سزا دیں لیکن میری دونوں بیٹیاں بہت معصوم ہیں...''

''اگر یہ بات تم پہلے ہی بتا دیتے تو ہم تمہاری بیٹیوں کو کیوں اٹھواتے؟'' راجا نے اسے نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کو کہا۔ ''اب تو یہ باس کی مرضی پر منحصر ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

''مجھے اگر وہ بریف کیس مل جائے تو میں اب بھی تمہاری بیٹیوں کو باعزت طور پر واپس چھوڑ آؤں گا۔'' میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

راجا میرے پیچھے پیچھے آیا اور بولا۔ ''فیکے پتر! کہیں یہ بھی اس ٹرک ڈرائیور کی چال نہ ہو۔''

''یہ اگر کوئی چال ہوئی تو میں اسے گولی مار کے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوا دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''یار! ہمیں اس کی بیوی کی بھی فکر کرنا چاہیے۔ آفتاب خان کے اغوا کے بعد وہ بھی ہوشیار ہو گئی ہوگی۔ ممکن ہے شاہ جی نے اسے فی الحال منظر عام سے ہٹا دیا ہو؟''

''پہلے میں آفتاب خان سے ... اس کے بارے میں ... ہوں...''

میں کمرے میں پہنچا تو ... کمرے میں ... تھا...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئی۔

''تم اپنا کام کرتی رہو۔ ہم باہر لاؤنج میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور لاؤنج میں آ گیا۔ ''احمد شاہ کو بلاؤ۔'' میں نے راجا سے کہا۔

راجا سے پہلے غنی اسے بلانے چلا گیا کیونکہ اس وقت لاؤنج میں وہ بھی موجود تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد احمد شاہ میرے سامنے کھڑا تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''تم نے آفتاب خان کا گھر دیکھا ہے؟''

''یس سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔

''تم اور غنی جا کر ایک بار پھر اس کا جائزہ لے لو۔ وہاں کتنے گارڈ ہیں، کتنے ملازم ہیں اور......''

''یہ سب جائزہ میں لے چکا ہوں سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''آفتاب خان کا بنگلا آبادی سے کچھ ہٹ کر ہے۔ اس کے اردگرد کئی پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ گیٹ پر دو گارڈز ہوتے ہیں۔ بنگلے کے اندر تین مرد ملازم ہیں اور دو عورتیں، وہ لوگ سرونٹ کوارٹرز میں رہتے ہیں۔''

''آج تم لوگوں کو آفتاب خان کی بیوی اور اس کی بیٹیوں کو اٹھانا ہے۔'' میں نے یوں کہا جیسے برسوں سے یہی کام کرتا آیا ہوں۔

''ابھی؟'' غنی نے پوچھا۔

''رات میں کسی وقت۔'' راجا نے کہا۔

''یار راجا!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ بریف کیس آفتاب کی بیوی کے پاس ہے تو ہم وہاں خود بھی تو جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تیرا دماغ چل گیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ چل رہا ہے، یہی بات اگر میں تجھ سے کہتا تو کبھی نہ مانتا۔''

''یار! میں لڑکیوں کے اغوا وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ بریف کیس ہمیں آفتاب خان کے بنگلے سے مل جائے تو ہمیں ان لوگوں کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' پھر میں غنی سے بولا۔ ''ہم آج رات آفتاب خان کے بنگلے میں داخل ہوں گے۔ تم اور احمد شاہ تیار رہنا۔''

''میں ست بد حالی سے بچھا اور گارڈز کو بولوں!'' غنی نے کہا۔

''یا ہم ان طلب پر مدد نہ بیار ہے ہیں'' میں نے اسے گھورا۔ ''کسی کی لادو گٹری کی ضرورت نہیں ہے۔''

☆☆☆

ہم لوگ آفتاب خان کے بنگلے کے دو چکر لگا چکے تھے۔ اس کے مین گیٹ پر تیز روشنی والے دو بلب روشن تھے اور گیٹ بند تھا۔ گارڈز گیٹ کے اندر تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں بنگلے کی عقبی سمت سے اندر داخل ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''بنگلے میں کتے تو نہیں ہیں؟'' راجا نے پوچھا۔

''نہیں سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔

''دو ٹانگوں پر چلنے والے کتے تو بنگلے کے اندر بھی ہیں اور باہر بھی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تجھے اس وقت بھی فلسفہ سوجھ رہا ہے؟''

''اس وقت تو اندھیرے میں کچھ بھی نہیں سوجھ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تیری مکروہ صورت تک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''

''پھر تو تجھے آئینہ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوگا ورنہ اپنی مکروہ صورت تو دیکھ ہی لیتا۔''

غنی نے گاڑی ایک ایسی جگہ پارک کر دی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ وہ دو بنگلوں کی درمیانی دیوار تھی۔ ہر بنگلے کا مکین یہی سمجھتا کہ گاڑی میں پڑوس کے بنگلے میں کوئی آیا ہوگا۔ وہاں سے آفتاب کے بنگلے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے پھر ایک مرتبہ اپنے ہتھیار چیک کیے اور بنگلے کی پشت پر پہنچ گئے۔

رائفل چھپانے کے لیے غنی نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ احمد شاہ کی پشت پر کینوس کا ایک بیگ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بیگ میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہوگی۔

بنگلے کی چار دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے ذریعے اوپر چڑھ کر بنگلے کا جائزہ تو لیا جا سکتا تھا لیکن اس کے ذریعے بنگلے میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ بنگلے سے اتنے فاصلے پر تھا کہ کوئی بندر یا لنگور ہی لمبی چھلانگ لگا کر اندر جا سکتا تھا۔ چار دیواری خاصی اونچی تھی اور اس پر خاردار تار بھی تھے۔

احمد شاہ پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی پھرتی دیکھ کر میں اش اش کر اٹھا۔ ہم سب اس سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کھڑے تھے۔

اب ہمیں احمد شاہ کسی بندر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بنگلے کی پشت پر تار لگی تھی۔ احمد شاہ اوپر نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ غنی نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس سے رابطہ کرنے ہی والا تھا کہ وہ ہمیں ایک مضبوط شاخ پر جھولتا نظر آیا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ احمد شاہ نے شاخ کے گرد رسی لپیٹ رکھی ہے اور اس رسی میں جھول رہا ہے۔

پھر اس نے ایک لمبی سوئنگ لی لیکن اندر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ زیادہ قوت سے سوئنگ لی اور ہوا میں اڑتے ہوئے بنگلے کی چار دیواری عبور کر گیا۔ اس کے کودنے سے اندر ہلکا سا دھماکا ہوا۔ ہم لوگ اضطراب کے عالم میں باہر کھڑے رہے۔ احمد شاہ نے یوں اندر کود کر گویا اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔ ممکن ہے اس حصے میں بھی آفتاب خان کا کوئی گارڈ ہو۔ وہ تو احمد شاہ کو دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔ مجھے اپنے اتنے اچھے گارڈ اور کمانڈو کے ضائع ہونے کا افسوس زندگی بھر رہتا۔

چند منٹ تک وہاں بالکل سناٹا رہا۔ ایسا سناٹا کہ ہمیں اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

پھر بہت آہستگی سے عقبی سمت کا چھوٹا سا دروازہ کھلا اور مجھے احمد شاہ کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ہمیں اندر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں بے اختیار احمد شاہ سے لپٹ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے تم پر فخر ہے احمد شاہ!''

''شکریہ سر!'' احمد شاہ نے انکساری سے جواب دیا۔

ہم نے اندر داخل ہو کر وہ دروازہ بھیڑ دیا۔ اس میں تالا تھا لیکن احمد شاہ نے اسے نہ جانے کیسے کھول لیا تھا۔

''میں اور غنی مین گیٹ کی طرف جا کر ان دونوں گارڈز کو قابو میں کرتے ہیں۔ آپ لوگ سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلے جائیں۔''

''پہلے ہم سب مین گیٹ کی طرف چلتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''سر! وہاں صرف دو آدمی ہیں۔ ان سے میں اور غنی آسانی سے نمٹ سکتے ہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ چلو، ہم لوگ کچھ فاصلے سے تمہیں کور دیں گے۔''

ہم لوگ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر بنگلے کے سامنے والے حصے کی طرف آئے تو غنی نے ہمیں وہیں دیوار کی آڑ میں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دبے پاؤں مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ مین گیٹ کے ساتھ ہی چھوٹا سا ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ وہ گویا گارڈ روم تھا۔ اس میں تیز روشنی تھی اور مجھے ابھی تک وہاں کوئی گارڈ دکھائی نہیں دیا تھا۔ میری نظریں غنی اور احمد شاہ پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں مخالف سمتوں سے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک عمارت کی طرف سے ایک شخص نکلا اور دبے پاؤں احمد شاہ کی طرف بڑھا۔ میں بھی تیزی سے اس طرف بڑھ گیا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں رائفل تھی جسے اس نے نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور احمد شاہ پر اس کے دستے سے وار کرنے والا تھا۔

اس نے جوں ہی رائفل ڈنڈے کی طرح بلند کی، میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ وہ اوندھے منہ گرا تو احمد شاہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

اس شخص کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ میری لات زیادہ بھرپور نہیں پڑی تھی ورنہ وہ گالیاں تو درکنار اپنا نام تک بھول جاتا۔ احمد شاہ نے جھپٹ کر اس کی کھوپڑی پر زوردار ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی ناک آؤٹ ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مزید رسید کر دیا۔

اچانک وہاں کتے کے بھونکنے کی آواز گونجی تو میرے ساتھ ساتھ احمد شاہ بھی بری طرح چونک اٹھا۔

فوراً ہی گارڈ روم سے ایک آدمی نکلا اور الجھن آمیز انداز میں اردگرد دیکھنے لگا۔ میں اور احمد شاہ ڈم ڈم کی باڑھ کے پیچھے چھپ گئے۔

اب دو طرف سے خطرہ تھا۔ ایک طرف تو وہ گارڈ تھا، دوسری جانب وہ کتا تھا جو نہ جانے کس نسل کا تھا۔ آواز اور غراہٹ سے تو مجھے وہ خوفناک قسم کا ڈوبرمین لگ رہا تھا۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور فائر کرنے کو تیار ہو گیا۔ احمد شاہ کے ہاتھ میں لمبے اور چمک دار پھل کا خنجر تھا۔

گارڈ مزید آگے بڑھا تو اچانک لڑکھڑا کر گر گیا۔ میں نے سر تھوڑا سا اوپر اٹھا کر اس طرف دیکھا، وہ گرا نہیں تھا بلکہ غنی نے اس کا پیر پکڑ کر کھینچ لیا تھا اور وہ اس کے سینے پر سوار تھا۔ غنی نے ایک ہاتھ سے گارڈ کے بال پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ خاصا تیم تحیم آدمی تھا لیکن غنی کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دب کر گویا بے بس ہو گیا تھا۔ لمحوں میں اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

غنی نے اسے کھینچ کر ڈم ڈم کی باڑھ کے ساتھ ڈالا اور دبے قدموں گارڈ روم کی طرف بڑھا۔ گارڈ روم کے ساتھ بھی ڈم ڈم کی گھنی باڑھ تھی۔ غنی اس باڑھ کے پیچھے غائب ہو گیا اور مجھے پھر کتے کی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر احمد شاہ سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ بنگلے میں کتے نہیں ہیں!''

اس سے پہلے کہ احمد شاہ کوئی جواب دیتا، اچانک کتے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی برآمدے میں آ گیا۔ ہم دونوں ...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمین سے چپک گئے۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ اگر ہم معمولی سی حرکت بھی کرتے تو اس شخص کی نظروں میں آجاتے یا اگر وہ برآمدے سے اتر کر پورچ میں آجاتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔

اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ ”کون ہے؟ ... غلام علی! دیکھو، یہ کتا کہاں سے آگیا؟“

”ابھی دیکھتا ہوں۔“ دور سے غلام علی کی آواز سنائی دی، پھر وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آواز غلام علی کی نہیں بلکہ غنی کی تھی۔

وہ آدمی تجسس میں مزید آگے بڑھا۔ اسی وقت پیچھے سے کسی نے اسے دبوچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے زمین پر گر پڑے۔ اس پر عقب سے حملہ کرنے والا راجا تھا اور اس نے بہت صحیح وقت پر مداخلت کی تھی۔ احمد شاہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لمحوں میں ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا، پھر اس نے راجا سے لپٹے ہوئے آدمی کی گردن یوں پیچھے سے پکڑ لی جیسے سپیرے سانپ کی گردن پکڑتے ہیں۔ وہ شخص بوکھلا کر پلٹنا چاہتا تھا لیکن احمد شاہ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ کسی بچے کی طرح بے بس ہو گیا۔

احمد شاہ نے اسے چھوڑا تو وہ مردہ چھپکلی کی طرح پیٹ سے زمین پر گر گیا۔

”کیا یہ مر گیا؟“ راجا نے پوچھا۔

”یہ صرف بے ہوش ہوا ہے سر!“ احمد شاہ نے کہا اور بے ہوش ہونے والے کی کنپٹی پر ایک ہاتھ اور مار دیا۔ اس نے اسے بھی گھسیٹ کر ڈوم ڈم کی باڑھ کے ساتھ ڈال دیا۔

”جلدی کریں سر!“ غنی کی آواز آئی۔ ”وقت بہت کم ہے، یہ لوگ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہیں گے۔“

”راجا!“ میں نے کہا۔ ”تم گاڑی بنگلے کے گیٹ پر لے آؤ۔“

غنی نے گاڑی کی چابیاں راجا کو دے دیں اور بولا۔ ”گیٹ کی طرف اب کوئی نہیں ہے۔“

”وہ کتے بھی شاید تم ہی تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی سر!“ غنی نے کہا۔ ”گارڈز کو ان کے کمرے سے تو نکالنا تھا!“

اس سے ہمیں دوسرا فائدہ یہ ہوا تھا کہ بنگلے کے اقامتی حصے کا صدر دروازہ کھل گیا تھا ورنہ اس کے لیے بھی ہمیں کوئی شیشہ توڑنا پڑتا یا کوئی گرل کاٹنا پڑتی۔

ہم تینوں تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔ راجا مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

”غنی! تم دروازے کے پاس ٹھہرو۔ ممکن ہے کوئی ملازم سرونٹ کوارٹر سے اس طرف آجائے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اندر کوئی ملازم ہوا تو اس سے ہم لوگ نمٹ لیں گے۔“

ہم لاؤنج عبور کر کے کوریڈور کی طرف آگئے۔ وہاں دونوں اطراف میں دو دو کمرے تھے۔ میں نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ احمد شاہ کے پاس محدود روشنی والی پنسل ٹارچ تھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ”یہ کمرا تو خالی ہے سر!“

ہم آہستگی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں نے دروازے پر لگی ہوئی ناب گھمائی لیکن کمرا اندر سے لاک تھا۔

احمد شاہ نے جیب سے عجیب سا ایک آہنی تار کا ٹکڑا نکالا اور اسے کی ہول میں ڈال کر مخصوص انداز میں حرکت دی۔ بیس سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں لاک کھل گیا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دبے قدموں اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں زیرو پاور کا نیلگوں بلب روشن تھا اس لیے احمد شاہ کو ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ بہت شاندار اور آراستہ خواب گاہ تھی۔ کمرے میں جہازی سائز ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر کوئی سو رہا تھا۔ سردی کے باعث سونے والے نے لحاف اوڑھ رکھا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ سونے والا ایک ہی ہے کیونکہ بیڈ کا آدھا حصہ خالی تھا۔

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس کے سرہانے پہنچ گیا۔ پھر میں نے احمد شاہ کو اشارہ کیا۔

احمد شاہ نے جیب سے وہی لمبے پھل والا خنجر نکالا اور بائیں ہاتھ سے لحاف گھسیٹ لیا۔

اچانک برق سی کوند گئی۔ سونے والی نے بجلی کی سی تیزی سے احمد شاہ کے سینے پر لات ماری اور پلک جھپکتے میں ریوالور نکال لیا۔ وہ اس پر فائر کرنے ہی والی تھی کہ میں نے جھپٹ کر پشت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا، ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسرا ہاتھ میں نے اس کے منہ پر جما دیا تھا کہ وہ شور شرابا نہ کر سکے۔

اس نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے ہاتھ پر خراشیں ڈال دیں۔ اس نے میرا چہرہ بھی نوچنے کی کوشش کی لیکن میں نے سر پیچھے جھکا کر اپنا چہرہ بچا لیا۔

احمد شاہ نے اچانک خنجر اس کے گلے پر رکھ دیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ”اگر آواز نکالی تو تمہاری یہ خوب صورت گردن صابن کی ٹکیا... کی طرح کاٹ دوں گا۔“

اس نے زور زور سے سر ہلایا اور اشاروں سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”اگر تم شور شرابا نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔“

عورت نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

”اگر آواز نکالے تو اس کی گردن جسم سے علیحدہ کر دینا۔“ میں نے احمد شاہ سے کہا اور اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر میں گھوم کر اس کے سامنے آگیا۔ میں نے بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے احتیاطاً اپنے چہرے پر مفلر لپیٹ لیا تھا۔ احمد شاہ کے چہرے پر بھی مفلر تھا، صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

وہ انتہائی حسین عورت تھی۔ اس کی عمر تقریباً چالیس، بیالیس سال ہوگی لیکن وہ اپنے متناسب جسم اور پرکشش چہرے سے تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

”اگر تم لوگوں کو کیش یا زیورات چاہئیں تو تمہیں مایوسی ہوگی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ”میں گھر میں کیش نہیں رکھتی اور زیورات بھی بینک لاکر میں ہیں۔“ اس نے کہا۔

”وہ بریف کیس کہاں ہے جو وکیل نے تمہیں دیا ہے؟“ میں نے غرا کر پوچھا لیکن آواز دھیمی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ”کون ہو تم؟“

”دیکھو! میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں اس لیے تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

”تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”دیکھو، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم نے فوراً جواب نہ دیا تو میرا ساتھی تمہارے ٹکڑے کر دے گا۔“

”تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ پھر بولی۔

میں نے اچانک اس کے لمبے اور گھنے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ ”مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔“

”میں نہیں جانتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے پھر ڈھٹائی دکھائی۔

احمد شاہ نے میرے اشارے پر اس کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار دیا۔ وہ الٹ کر بستر پر گر گئی۔

”اس کے ہاتھ پیر باندھو۔“ میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ”میں اس کی بیٹیوں کو دیکھتا ہوں۔“

میں تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ اس تمام عمل میں مشکل سے تین منٹ لگے تھے۔ میں اس کے سامنے والے بیڈروم میں پہنچا تو وہ خالی تھا۔ سامنے والے دوسرے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”دروازہ کھولو بیٹا!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے شب خوابی کے لباس میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر بمشکل سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔

وہ لڑکی اتنی معصوم تھی کہ مجھے ایک لمحے کو تو خود سے شرم محسوس ہوئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے فوراً ہی اس کے منہ پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی دونوں کنپٹیاں دبائیں۔ وہ چند لمحوں بعد میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔

میں نے اسے آہستگی سے فرش پر لٹایا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔

بیڈ پر اس سے بھی چھوٹی ایک معصوم صورت بچی سو رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی تو میں فوراً نیچے کی طرف جھک گیا۔

اچانک میری نظر بیڈ کے نیچے رکھے ہوئے ایک بنڈل پر پڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چیز ہے اور بچیوں کے کمرے میں کیوں ہے؟

میں نے اپنا سیل فون نکالا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے دیکھا تو مجھے ایک چادر میں کچھ لپٹا ہوا نظر آیا۔

اچانک میرے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ چادر کا ایک سرا کھلا ہوا تھا اور اس میں سے سیاہ رنگ کے بریف کیس کا ایک کونا جھانک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بیڈ سے باہر گھسیٹ لیا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔

اس بریف کیس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکی ہی بتا سکتی تھی جسے میں نے بے ہوش کر دیا تھا۔

میں نے اسے اٹھا کر بستر پر ڈالا اور اس کی چھوٹی بہن کی کنپٹیاں دبا کر بے ہوش کر دیا۔ یہ داؤ میرے کورین کوچ نے مجھے سکھایا تھا۔

میں نے پانی کا جگ اٹھا کر بڑی بہن کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تھوڑی دیر میں وہ ہوش میں آ گئی۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھا، پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے چیخنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بری طرح مچلنے لگی۔

''ڈرو مت بیٹا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے تم سے ایک دو باتیں پوچھنا ہیں، پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم شور نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں اپنا ہاتھ ہٹاؤں؟'' میں نے کہا۔

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں نے پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا، جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

''آ... آپ... کون ہیں اور...''

''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں بیٹا!'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟''

''پاپا!... وہ تو دو دن پہلے شہر سے باہر گئے تھے۔''

اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''گڈ گرل!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ، یہ بریف کیس کس کا ہے؟'' میں نے اسے وہ بریف کیس دکھایا۔

''یہ... بریف کیس تو مما نے مجھے دیا تھا کہ اسے اپنی الماری میں رکھ دو۔ میری الماری میں کپڑے اور دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب وقت ملے گا، الماری خالی کر کے اسے کپڑوں کے پیچھے رکھ دوں گی۔ مما نے کہا تھا کہ اسے چھپا کر رکھنا۔ میں نے اس وقت تو اسے چادر میں لپیٹ کر بیڈ کے نیچے رکھ دیا تھا۔''

''یہ بریف کیس تمہارے پاپا کا تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پاپا کا بریف کیس ان کے پاس ہے، دوسرا بریف کیس براؤن کلر کا ہے۔ وہ ان کے بیڈ روم میں ہے۔ یہ... بریف کیس...'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو سرور انکل لائے تھے۔ میں اس وقت لاؤنج میں اپنی دوست سے فون پر بات کر رہی تھی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔ ''تم آرام سے سو جاؤ۔ کمرے سے باہر مت نکلنا بیٹا! باہر خطرہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اچانک اس کی کنپٹیاں پکڑ لیں۔

لڑکی نے سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا، پھر وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گئی۔ میں نے اسے لحاف اوڑھایا اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

احمد شاہ بے تابی سے کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''اس بریف کیس کو کھولو... بلکہ اس کا لاک توڑ دو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

وہ خاصا دبیز اور بھاری بھرکم بریف کیس تھا۔ احمد شاہ نے وہی خنجر نکالا اور لمحوں میں اسے کھول دیا۔ بریف کیس میں بہت سی، سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بھری ہوئی تھیں۔ دو چار فائلیں بھی تھیں۔

مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ گویا یہ وہی بریف کیس تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔

''آفتاب کے بیڈ روم میں مزید بریف کیس بھی ہوں گے۔ میں انہیں بھی چیک کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہاں تین بریف کیس تھے سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''ان تینوں کے کاغذات اور تمام چیزوں کو میں ایک شاپر میں ڈال کر لے آیا ہوں۔'' اس نے مجھے ایک بڑا سا شاپر دکھایا۔ ''یہ شاپر بھی مجھے آفتاب خان کی الماری ہی سے ملا ہے۔''

''گڈ!'' میں نے کہا۔

''سر! وہ عورت جھوٹ بول رہی تھی کہ میرے پاس کیش نہیں ہے۔ اس کی الماری میں کم سے کم چار لاکھ روپے اور لاکھوں کی مالیت کے زیورات ہوں گے۔''

''بس اب یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارا کام پورا ہو گیا ہے۔'' میں نے بریف کیس احمد شاہ کے حوالے کر دیا۔

ہم لاؤنج میں پہنچے تو غنی بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔

ہم لوگ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھے۔ غنی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ہم لوگ تیز رفتاری سے روانہ ہو گئے۔

''کیا رہا فیکے پتر؟'' راجا نے پوچھا۔

''بریف کیس مل گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آفتاب خان کی بیٹی سے تصدیق بھی کر لی ہے۔ یہ وہی بریف کیس ہے جو وکیل دے کر گیا ہے۔''

ہم گھر پہنچے تو رات کے بلکہ صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ہم لوگوں نے آفتاب کے بنگلے میں اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا، سوائے اس رسی کے جو احمد شاہ نے بنگلے میں داخل ہونے کے لیے استعمال کی تھی۔

''فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''ان ڈی وی ڈیز کو چیک تو لے۔''

''پہلے میں شاور لے لوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو اس وقت تک غنی سے ذرا بہترین قسم کی کافی بنوا لے۔''

''غنی سے کیوں؟'' راجا نے کہا۔ ''وہ آپ کی بیگم... میرا مطلب ہے کہ نیلم جاگ رہی ہے۔''

''تو پھر اسی سے بنوا لے۔'' میں یہ کہہ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

بھاپ اگلتی کافی کے دو مگ کے بعد مجھ میں ایک نئی توانائی دوڑ گئی۔ راجا نے ڈی وی ڈی پلیئر ٹی وی میں لگا دیا تھا۔ یہ ٹی وی، ڈی وی ڈی پلیئر، ڈیپ فریزر، فریج، کیمرہ، ویڈیو اوون اور اسی قسم کے دوسرے الیکٹرانک آئٹم اس بنگلے کے ساتھ ہی ملے تھے۔

راجا نے ڈی وی ڈی پلیئر آن کیا تو نیلم وہیں موجود تھی۔ وہ غالباً کافی کے خالی مگ اٹھانے آئی تھی اور تجسس میں [illegible] رک گئی تھی۔

اچانک مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے [illegible] کہا۔ ''اب تم جا کر سو جاؤ۔''

''جی صاحب جی!'' وہ جلدی سے بولی اور [illegible] اٹھ کر نکل گئی۔

ڈی وی ڈی چلنا شروع ہوئی لیکن وہ کسی علاقے کی [illegible] میٹری تھی۔

راجا نے دوسری ڈی وی ڈی لگائی، وہ بھی نیشنل [illegible] چینل سے ریکارڈ کی گئی تھی۔

پھر اس کے یکے بعد دیگرے تمام ڈی وی ڈیز چیک کیں [illegible] ان میں سے کام کی ایک بھی نہیں تھی۔ کسی میں ہندی [illegible] کے گانے تھے۔ کسی میں صدر مملکت کی تقریر تھی، ٹی وی [illegible] تھے، ہندی فلمیں تھیں اور ڈاکومینٹریز تھیں۔

میں چکرا کر رہ گیا۔ ''اس لڑکی نے مجھے سب [illegible] بتایا ہے۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

[illegible]

کوّا

کوّا گرامر میں ہمیشہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ کوّا صبح صبح موڈ خراب کرنے میں مدد کرتا ہے۔ ایسا موڈ جو ویسے بھی کوئی خاص اچھا نہیں ہوتا۔ کوّا گا نہیں سکتا اور کوشش بھی نہیں کرتا۔ وہ کائیں کائیں کرتا ہے۔ کائیں کے کیا معنی ہیں؟ میرے خیال میں تو اس کا کوئی مطلب نہیں۔ کوّے کا بچپن گھونسلے میں گزرتا ہے۔ جہاں اہم واقعات کی خبریں فوراً دیر سے پہنچتی ہیں۔

اگر وہ سیانا ہو تو بقیہ عمر وہیں گزار دے لیکن سوشل بننے کی تمنا اسے آبادی میں کھینچ لاتی ہے۔ جو کوّا ایک مرتبہ شہر میں آ جائے۔ وہ ہرگز پہلے سا کوّا نہیں رہتا۔ کہیں بندوق چلے تو کوّے اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں اور دفعتاً لاکھوں کی تعداد میں کہیں سے آ جاتے ہیں اور اس قدر شور مچاتا ہے کہ بندوق چلانے والا مہینوں پچھتاتا ہے۔ کوّا اتنا غیر رومانی نہیں جتنا میں اور آپ سمجھتے ہیں۔ شاعروں نے اکثر کوّے کو مخاطب کیا ہے۔ کاگا جا [illegible] کاگا جا رے جا رے... لیکن ہمیشہ کوّے کو کہیں دور جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کسی نے بھول کر بھی خوش آمدید نہیں کہا۔

اگر آپ کوّوں سے نالاں ہیں تو یہ مت بھولیے کہ کوّے بھی آپ سے نالاں ہیں۔

شفیق الرحمٰن کی کتاب ''مزید حماقتیں'' سے اقتباس

''اس نے [illegible] کہا تھا کہ اس بریف کیس میں [illegible]

[illegible] تجھے تلاش ہے؟'' راجا نے [illegible] لہجے میں کہا۔ ''تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی [illegible] اور پھر ٹھنڈے [illegible] سوچ۔ اس میں [illegible] کا قصور ہے؟''

میں نے اس کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو مجھے [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اس کی بجٹ نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وکیل ہی نے اصل بریف کیس وہاں نہیں پہنچایا تھا۔

نور کو اغوا ہوئے آج پانچ دن ہو گئے تھے اور میں ابھی تک آفتاب خان اور وکیل کے چکر میں الجھا ہوا تھا۔ اب آفتاب خان کو قید رکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بریف کیس تو فی الحال میرے ہاتھ لگا نہیں تھا لیکن وہ مجھے مل بھی جاتا تو کیا ہوتا؟ اس میں شاہ جی کے خلاف ثبوت تھے۔ وہ بریف کیس یقیناً وکیل کے پاس تھا اور وہ زیادہ دیر تو چھپا رہ نہیں سکتا تھا۔ وہ شہر کا خاصا نامور وکیل تھا۔ اس بریف کیس اور آفتاب خان کے چکر میں اپنا کیریئر تو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر نور کو تلاش کرنا تھا۔ اسے اغوا کرنے والوں نے اب تک مجھ سے کوئی مطالبہ کیا تھا اور نہ ہی رابطہ کیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی، صبح ہونے والی تھی، میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے کہا۔ ”آفتاب خان کو بے ہوش کر کے کسی دور دراز کے علاقے میں ڈال آؤ۔“

”یس سر!“ احمد شاہ نے کہا۔

”اب تو کیا اس قدوائی کو اٹھوائے گا؟“ راجا نے پوچھا۔

”جہنم میں گیا قدوائی۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”مجھے فوری طور پر نور کا سراغ لگانا ہے۔ اسے کن لوگوں نے اغوا کیا ہے؟“

اچانک مجھے شاکر کا خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا۔ اس نے اس وقت بھی ان لوگوں کو پہچان لیا تھا جب ہم اس ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔

”یار فکیے!“ راجا نے کہا۔ ”اس وقت تو اپنے دماغ پر بالکل زور مت ڈال اور کچھ دیر کے لیے سو جا۔ صبح دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟“

رات بھر کی بھاگ دوڑ اور ڈی وی ڈیز دیکھنے کی ذہنی اذیت نے مجھے واقعی نڈھال کر دیا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک ساتھ ویلیئم کی دو گولیاں پانی سے نگلیں اور خالی الذہنی کے عالم میں بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی ساڑھے سات بجا رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ویلیئم کی دو گولیاں کھانے کے باوجود میں دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سو پایا تھا لیکن مجھے تھکن بالکل بھی نہیں تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی بہت جو کسلمندی تھی وہ گرم پانی سے نہانے کے بعد دور ہو گئی اور میں بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا۔

میں باتھ روم سے باہر نکلا تو راجا میری راکنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

”نواب صاحب خواب خرگوش بلکہ خواب خر سے بیدار ہو گئے؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگے ہیں خواب سے!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یار مہاراجا! میں دو گھنٹے کی نیند سے اتنا ہشاش بشاش ہو گیا؟“

”دو گھنٹے؟“ راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”قبلہ نواب صاحب! آپ تو اب زمان و مکان سے بھی بے بہرہ ہو گئے۔ حضور! آپ پورے پندرہ گھنٹے بعد اس خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ساڑھے سات!“ راجا نے کہا۔

”اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اتنی بھوک کیوں لگ رہی ہے؟“ میں نے کہا۔

”سوچیے مت بلکہ اب ڈنر تناول فرما لیجیے۔ آ جائیے تشریف لے آئیے، کھانا لگا دیا گیا ہے۔“

کھانے کی میز پر واقعی کھانا موجود تھا۔ میں راجا کی طنزیہ باتوں کو نظر انداز کر کے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

کھانے کے بعد نیلم کافی لے آئی، میں نے کافی پیتے ہوئے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے آفتاب خان کے بارے میں پوچھا۔

”آفتاب خان کو شیخوپورہ کے ایک علاقے میں ڈال کر آیا ہوں سر!“ احمد شاہ نے کہا۔

”گڈ!“ میں نے کہا۔ پھر میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ میرا ارادہ تھا کہ شاکر کو فون کر کے کہیں ملنے کا وقت طے کر لوں۔ فی الحال لاہور کا یہ ٹھکانا میں اسے بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد میں نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو!“

”نواب رفیق شیرازی صاحب بول رہے ہیں؟“ دوسری طرف سے کسی نے انتہائی مہذب انداز میں پوچھا۔ مجھے اس سے پہلے کبھی یہ آواز سنائی نہیں دی تھی۔

”جی فرمائیے، کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”نواب صاحب! آپ کی ایک امانت ہے ہمارے پاس!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کون صاحب بول رہے ہیں؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”اپنا تعارف تو کرائیے۔“

”ارے چھوڑیے، ان رسمی باتوں میں کیا رکھا ہے۔“ دوسری طرف سے گویا چڑانے والے انداز میں کہا گیا۔ ”آپ کو تو اپنی امانت سے غرض ہونا چاہیے۔“

”کیسی امانت؟“ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نور کے بارے میں بات کرنے والا ہے۔

”آپ اتنی جلدی بھول گئے؟“ دوسری طرف سے طنز کیا گیا۔ ”ویسے ہم نے سنا تو تھا کہ آپ اپنی محبوبائیں بدل دیتے ہیں لیکن......“

”آپ صاف صاف بات نہیں کر سکتے؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”چلیے، پھر صاف لفظوں ہی میں سن لیجیے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کی محبوبۂ دوراں یعنی مس ماہ نور، اس وقت ہماری مہمان ہیں۔“

”تم ہو کون؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”اور نور کو تم نے کیوں اغوا کیا ہے؟“

”نواب صاحب!“ دوسری طرف سے سرد آواز ابھری۔ ”میں آپ سے انتہائی شائستگی سے گفتگو کر رہا ہوں اور آپ جواب میں انتہائی غیر شائستہ زبان استعمال فرما رہے ہیں۔“

”جناب شائستہ صاحب! آپ نے نور کو کیوں قید کر رکھا ہے۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے؟“ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”میں نے عرض کیا نا، کہ محترمہ ماہ نور ہماری مہمان ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔

”اور آپ چاہتے کیا ہیں، اب یہ بھی فرما دیں۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

”ابھی تو آپ کو صرف یہ اطلاع دینا مقصود تھا۔“ اس نے کہا۔ ”باقی باتیں بعد میں ہوں گی اور ہاں، اب اس نمبر پر کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا کیونکہ اب اس نمبر سے آپ کو کبھی جواب نہیں ملے گا۔“

”تم آخر ہو کون؟“ میں نے چلا کر کہا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ میری آواز اس تک نہیں پہنچ رہی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں خود ہی بکواس کر رہا ہوں۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔

”کون تھا فکیے پتر؟“ راجا نے پوچھا۔ ”وہ نور کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا اور تو اتنا غصے میں کیوں ہے؟“

میں نے اسے ٹیلی فون کال کے بارے میں بتایا۔

”یہ رانا زوہیب اور ولاور اینڈ کمپنی ہی کی حرکت معلوم ہوتی ہے فکیے!“ راجا نے کہا۔

”مجھے بھی یقین ہے کہ نور کے اغوا میں رانا اور دلاور کا ہاتھ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس مبہم سی... فون کال کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟“

”تجھے نفسیاتی طور پر توڑنا۔“ راجا نے کہا۔

”تو شاکر سے بات کیوں نہیں کرتا؟“ راجا نے کہا۔ ”وہ بھی ان ہی کے قبیلے کا آدمی ہے۔ وہ واقعی اگر تیرے ساتھ مخلص ہے تو اس سلسلے میں تیرے بہت کام آ سکتا ہے۔“

”میں اسی کو فون کر رہا تھا کہ یہ کال آ گئی۔“ میں نے کہا اور شاکر کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

”میں اسے یہاں تو نہیں بلاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”تو اسے ست بدھائی بلا لے۔“ راجا نے کہا۔ ”ہم لوگ بھی ست بدھائی روانہ ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی اب لاہور میں کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔“

میں نے شاکر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن شاکر نے کال وصول نہیں کی۔

میں جھنجلا کر سلسلہ منقطع کرنے ہی والا تھا کہ مجھے شاکر کی آواز سنائی دی۔ ”السلام علیکم نواب صاحب!“

”وعلیکم السلام!“ میں نے کہا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو شاکر؟“

”خیریت تو ہے نواب صاحب!“ شاکر سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں، خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم مجھ سے آج مل سکتے ہو؟“

”کیا آپ لاہور ہی میں ہیں؟“ شاکر نے پوچھا۔

”میں لاہور میں تھا لیکن اب ست بدھائی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میرے لیے آج ست بدھائی پہنچنا تو مشکل ہے۔ ہاں، میں کل دوپہر تک حاضر ہو سکتا ہوں۔ ویسے کوئی ایمرجنسی ہے تو میں آج بھی آ سکتا ہوں۔“

”ایمرجنسی تو ہے لیکن تم کل تک ست بدھائی آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے نواب صاحب! میں کل بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ست بدھائی پہنچ جاؤں گا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''میں تمہارا انتظار کروں گا، اوکے، اللہ حافظ!'' میں نے کہا۔ پھر میں نے غنی کو بلا کر کہا۔ ''ہم ابھی ست بدھائی کے لیے نکل رہے ہیں۔''

غنی نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کال اسی ''شائستہ خان'' کی ہوگی لیکن اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو ناصر! کیسے ہو؟''

''میں بخیریت ہوں نواب صاحب! مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ لاہور میں ہیں؟''

''ہاں، بس ابھی تھوڑی دیر بعد ست بدھائی کے لیے نکلنے ہی والے ہیں۔''

''ابھی کچھ دیر ٹھہر جائیں، میں آپ کے پاس آرہا ہوں۔ مجھے اپنا پتا بتایئے۔''

میں نے اسے پتا بتایا اور ناصر کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شاید کہیں قریب ہی تھا، اس لیے دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گیا۔

''میڈم انور کی کوئی اطلاع؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تک مجھے صرف ایک فون کال موصول ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس شخص نے صرف مجھے یہ اطلاع دی کہ نور اس کے قبضے میں ہے۔'' پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ''تم لاہور کب آئے؟''

''میں دوپہر کے وقت اپنے ایک ذاتی کام سے لاہور آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اطلاع ملی کہ شاہ جی کا سب سے قریبی ساتھی پریس کلب میں پریس کانفرنس کرنے والا ہے۔''

''کون قریبی ساتھی، آفتاب خان؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہی شاہ جی کا دایاں ہاتھ تھا۔ اس نے پریس کانفرنس میں سب سے پہلے تو یہ اعلان کیا کہ میں مستین شاہ کی پارٹی سے مستعفی ہو رہا ہوں۔ آج کے بعد میرا اس پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا پھر اس نے شاہ جی پر ایسے گھناؤنے الزامات لگائے کہ میں حیران رہ گیا۔ میں ہی کیا پوری صحافی برادری حیران تھی۔ جواب میں صحافیوں نے آفتاب خان سے یہ پوچھتے ہوئے سوالات کیے کہ وہ کس طرح ... اعلان کیا کہ وہ جلد ہی اس بلا جھجک شاہ جی کے خلاف ... کو ایسے ثبوت فراہم کرے گا کہ اس کے ... کا نقاب اتر جائے گا۔''

''مسٹر آفتاب!'' میں نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ آپ پارلیمنٹ کے ایک معزز اور نیک نام رکن پر اتنے ریکیک الزامات لگا رہے ہیں۔ اگر آپ ثبوت فراہم نہ کرسکے تو خود آپ کی پوزیشن کیا ہوگی؟''

''شاہ جی مجھ پر ہتک عزت کا دعویٰ کردے۔ عدالت کے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہیں لیکن وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا نہیں۔'' آفتاب خان نے جواب دیا۔

''نواب صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ آفتاب خان جو کل تک محض ایک ٹرک ڈرائیور تھا، جو شاہ جی کی وجہ سے آج اس مقام پر پہنچا ہے، وہ یک لخت اس کے خلاف کیسے ہوگیا؟''

میں نے جواب میں اسے آفتاب خان کے اغوا سے لے کر اس کی رہائی تک سب کچھ تفصیل سے بتادیا۔

''اچھا...... اچھا...... اسی لیے وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ جی کے بدمعاشوں نے اسے اغوا کرنے کے بعد حبس بے جا میں رکھا، اس کے گھر میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے اور اس کی بیوی سے بدسلوکی کی۔ ان لوگوں کو ان شواہد کی تلاش تھی جو میں نے شاہ جی کے خلاف اکٹھے کر رکھے ہیں۔ ان بدمعاشوں نے مایوس ہو کر مجھے خود ہی چھوڑ دیا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔'' راجا نے کہا۔

میں نے ناصر کو شاکر کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''محض اس کے لیے آپ ست بدھائی جا رہے ہیں؟ اس سے تو آپ یہیں ملاقات کرسکتے ہیں۔ آپ اگر اسے یہاں نہیں بلانا چاہتے تو گلبرگ بلالیں۔ وہاں میرا ایک صحافی دوست رہتا ہے۔''

میں نے شاکر کو فون کرکے بتایا کہ مجھے ایک ضروری کام سے دوبارہ لاہور آنا پڑے گا۔ تم کل شام کو چار بجے مجھ سے گلبرگ میں مل لو، میں وہاں اپنے ایک دوست کے گھر میں تیار رہوں گا۔'' میں نے اسے ناصر کو بتایا ہوا پتا بھی بتادیا۔

میں نے ناصر سے پوچھا۔ ''جہاں خان شیروانی کی کوئی خبر ہے؟''

... نے پرسوں میری سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔'' ناصر نے کہا۔ ''ابھی تک شاہ جی کی طرف سے انہیں کوئی ... نہیں ملی ہے۔''

... دوست درانی کے بنگلے میں ...

شاکر کا انتظار کر رہے تھے۔ درانی خود کسی ضروری کام سے چلا گیا تھا۔

ٹھیک چار بجے شاکر وہاں پہنچ گیا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا۔ ''یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ سے لاہور میں ملاقات ہوگئی۔ میں آج کل ایک ضروری کام میں پھنسا ہوا ہوں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''آپ فرمایئے، کیسے زحمت کی؟''

''شاکر، تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو جو اس دن ریسٹورنٹ میں بھی موجود تھے؟ تم نے مجھے خطرے سے آگاہ بھی کیا تھا۔''

شاکر چند لمحے تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''میں یہ بات آپ کو اسی دن بتادیتا لیکن مجھے خود بھی پوری طرح علم نہیں تھا۔ میں نے بعد میں اپنے طور پر معلومات کی تو علم ہوا کہ وہ اکبر سندھو کے آدمی تھے۔''

''اکبر سندھو!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے اور اسے مجھ سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟''

''انڈر ورلڈ کا ایک مضبوط آدمی ہے۔ اسے آپ کرائے کا غنڈا سمجھ سکتے ہیں۔ آپ سے دشمنی کی ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے، کسی نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

''مطلب یہ کہ وہ دولت ور بھی ہوسکتا ہے اور رانا بھی؟'' میں نے کہا۔

''فی الحال تو آپ کے دشمن وہی ہیں۔'' شاکر نے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے میڈم نور کو تاوان کے لیے اغوا کیا ہو اور وہ آپ سے بھاری رقم کا مطالبہ کرے۔ وہ جانتا ہوگا کہ آپ اس کا مطالبہ پورا کرسکتے ہیں۔''

''یہ اکبر سندھو کہاں ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے کئی ٹھکانے ہیں۔'' شاکر نے کہا۔ ''لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کے تمام ٹھکانے معلوم کرلیتا ہوں۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا۔

میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ جہاں کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے چند لمحے توقف کے بعد کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''نواب صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''کون صاحب بول رہے ہیں؟'' میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ یہ اسی کا فون تھا جس نے مجھے نور کے بارے میں بتایا تھا۔

''حیرت کی بات ہے۔ آپ میری آواز نہیں پہچان رہے ہیں؟''

''جناب! نفسانفسی کے اس دور میں بعض اوقات بھائی، بھائی کو اور باپ بیٹے کو پہچاننے سے انکار کردیتا ہے۔ آپ آواز کی بات کر رہے ہیں، یہاں تو لوگ خون کے رشتے بھی بھلا دیتے ہیں۔''

''نواب صاحب! آپ مذاق اچھا کرلیتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''آپ کو میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''بہرحال، آپ اپنا نام تو بتایئے؟''

''میں آپ کا خدمت گزار بول رہا ہوں، آپ کی جانِ جاناں ہماری مہمان ہیں۔''

''تو بھائی کریں مہمان نوازی!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ بات مجھے بار بار کیوں بتا رہے ہیں؟''

''جی میں...... وہ...... آپ......'' وہ جواب دیتے ہوئے کچھ بوکھلا سا گیا۔ ''یعنی آپ کو ان خاتون کی کوئی فکر ہی نہیں ہے؟''

''بھئی، جب آپ جیسا مہذب اور شائستہ میزبان ہو تو مجھے فکر کیوں ہوگی؟''

''آپ...... تو......''

''ایک تو بات کرتے ہوئے آپ ہکلاتے بہت ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میری طرف سے جب تک دل چاہے، آپ ان موصوفہ کو مہمان بنا کر رکھیں۔''

''نواب صاحب! آپ شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ وہ خاتون میری مہمان ضرور ہیں لیکن میرے باس میری طرح رحم دل نہیں ہیں۔''

''مطلب کی بات کریں۔'' میں نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''باس کے کچھ مطالبات ہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے اسے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہو۔

''پھر اپنے باس سے کہیں کہ وہ خود مجھ سے بات کریں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور آپ کے باس ہیں کون؟''

''آپ کچھ توقف فرمائیں۔'' اس متعلق شخص نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے ایک بھاری اور کرخت آواز سنائی دی۔ ''نواب رفیق! تمہاری ہونے والی بیگم میرے قبضے میں ہیں۔''

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مطلب کی بات کرو۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اگر تم مجھے باتوں میں لگا کر یہ چاہتے ہو کہ میرا نمبر ٹریس کر سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔ اپنا وقت اور توانائی ضائع مت کرو۔'' اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''یار! مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اپنا وقت ضائع کرنے کی، تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''

''میں کیا چاہتا ہوں یہ بھی تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کال کا کیا مقصد تھا؟ کیا وہ لوگ مجھے ذہنی طور پر مزید ڈسٹرب کرنا چاہتے تھے؟

راجا بہت غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا فیکے! کس کا فون تھا؟''

''یار، وہ نور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اتنا تو میں بھی سمجھ گیا ہوں لیکن وہ ہے کون؟''

''اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''فضول بک بک کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ نور سے ان لوگوں نے ... ہے ہی نہیں۔''

''ممکن ہے وہ لوگ تمہیں ... پر منتشر کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''اب اگر ان کی کال آئے تو ان سے کہنا کہ نور سے میری بات کراؤ۔''

شاکر مختلف جگہ فون کرنے کے بعد مجھ سے بولا۔ ''نواب صاحب! ابھی ایک شخص سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ کچھ دن پہلے تک اکبر سندھو کے ساتھ کام کرتا تھا..... اب ان میں کچھ اختلافات ہو گئے ہیں۔''

''تم اس سے معلومات حاصل کرو۔ اکبر سندھو کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔

''میں نے آج اسے اپنے ایک ٹھکانے پر بلایا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''آپ ابھی لاہور میں رکیں گے ... چلے جائیں گے؟''

''تم معلومات کرو ... میں ہی ہوا تم سے سیل فون ... گا۔ ... میں تو لاہور ہی میں ...'' میں نے کہا۔

''... پھر میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔''

... ناصر نے کہا۔ ''یار شاکر! تم یہ چھوٹے موٹے ... کوئی بڑا کام بھی کرتے ہو؟''

شاکر نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''ناصر صاحب! ... اس کا علم آپ کو بھی ضرور ہوگا۔ یہ کام تو میں محض نواب صاحب کی خاطر کر رہا ہوں۔''

''یہ کام تو کوئی بھی کر لے گا۔'' ناصر نے کہا۔ ''تم سے اگر کوئی بڑا کام کہا جائے تو تم کر لو گے؟''

''آپ حکم کریں، کام کیسا ہی ہو، میں کبھی انکار نہیں کرتا۔ سوائے دو کاموں کے۔'' شاکر نے کہا۔ ''میں لڑکیوں کا اغوا اور بردہ فروشی نہیں کرتا، چاہے کوئی مجھے کتنا ہی معاوضہ کیوں نہ دے۔''

''ہمیں بھی ایسے گھٹیا کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''تو پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟'' شاکر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''رانا زوہیب کو اٹھا لاؤ۔'' ناصر نے اچانک دھماکا سا کر دیا۔

''رانا زوہیب کو!..... آپ کا مطلب ہے کہ.....''

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' ناصر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کر سکو گے یہ کام؟''

''رانا زوہیب کوئی بھیڑ کا بچہ نہیں ہے کہ کوئی جائے اور اسے کان سے پکڑ کر لے آئے۔'' شاکر نے کہا۔

''بقول تمہارے، تم ہر قسم کا کام کرتے ہو؟'' ناصر نے کہا۔ ''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''میں تو یہاں نواب صاحب کی مدد کرنے آیا تھا۔'' شاکر نے کہا۔ ''کوئی ڈیل کرنے نہیں آیا تھا۔''

''یہ بھی تو نواب صاحب کی مدد ہی ہوگی۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس وقت نواب صاحب کا سب سے بڑا دشمن وہی ہے۔ وہی یہ بھی بتا سکے گا کہ میڈم نور کہاں ہیں۔''

''لیکن اسے اغوا کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں ورنہ تو کسی چھوٹے موٹے بدمعاش سے یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ یوں بھی ... نے کھلے عام دلاور کی مخالفت شروع کر دی ہے۔''

شاکر نے میری طرف دیکھا۔ ''نواب صاحب! آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟ اگر آپ کہیں تو میں دلاور کو ختم کر دوں؟''

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن رانا مجھے زندہ چاہیے۔ ویسے اگر یہ کام تمہیں مشکل لگ رہا ہے تو رہنے دو۔ ہم کوئی اور بندوبست کر لیں گے۔''

''نواب صاحب! آپ کو شاید میری قوت کا اندازہ نہیں ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ اخراجات کی فکر مت کرنا۔''

''اخراجات کا نام لے کر مجھے گالی مت دیں نواب صاحب!'' شاکر نے کہا۔ ''اس سلسلے میں جتنے بھی اخراجات ہوں گے، میں خود کروں گا۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر رانا زوہیب پاکستان میں ہے تو آپ کا کام بہت جلد ہو جائے گا۔'' اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ناصر سے پوچھا۔ ''یہ تمہیں اچانک کیا سوجھی؟''

''نواب صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''مجھے شروع ہی سے اس شخص پر نہ جانے کیوں اعتبار نہیں ہے۔ وہ صرف دلاور کی مخالفت میں آپ کی حمایت کر رہا ہے۔ جس دن اس نے دلاور کا پتا صاف کر دیا، اسی دن یہ آپ سے لاتعلق ہو جائے گا۔''

''بغض و عناد ہی میں سہی، وہ ہماری مدد تو کر رہا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''یہ ہماری مدد نہیں کر رہا ہے بلکہ نواب صاحب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہتا ہے۔'' ناصر نے منہ بنا کر کہا۔

''ہائیں!'' راجا نے کہا۔ ''تم بھی بامحاورہ اردو بولنے لگے۔ شکر ہے کہ فیکے کی صحبت میں رہ کر تم نے شعر و شاعری شروع نہیں کی۔''

''بھلا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ، افسوس تم کو ... سے صحبت نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔

''اور جہاں تک اس اکبر سندھو کا معاملہ ہے تو جب چاہوں، میں الو کی گردن ناپ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت وہ کہاں ملتا ہے۔''

''تم جانتے ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نواب صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں نے ... سال تک کرائم رپورٹنگ کی ہے۔ آج بھی ایک طرح سے کرائم رپورٹنگ ہی کر رہا ہوں۔ پولیٹیکل انویسٹی گیٹر بھی تو ... رپورٹر ہی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے ... کے کرائم منظر عام پر لاتا ہے۔''

''تم مجھ سے پوچھ رہے ہو یا مجھے بتا رہے ہو؟'' راجا نے ... پوچھا۔

''میں نواب صاحب کو بتا رہا ہوں، تم تو اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہو۔'' ناصر نے کہا۔

''یہ اکبر سندھو کہاں ملے گا اس وقت؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

ناصر نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی، پھر جیب سے سیل فون نکال کر کسی کو کال کرنے لگا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔ ''ہیلو، لالو! میں ..... اچھا تم پہچان گئے ... ہاں، خاص کام تو نہیں ہے۔ بس یہ معلوم کرنا ہے کہ اس وقت سندھو کہاں ہوگا؟ ... ہاں..... ہاں ہاں، تم بولو..... گلبرگ ..... اچھا ..... ٹھیک ہے.....'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے میری طرف دیکھا۔ ''اکبر سندھو اس وقت گلبرگ کے ایک فلیٹ میں موجود ہے۔ وہ کچھ خوش وقتی کے لیے وہاں اپنی محبوبہ کے پاس جاتا ہے۔''

''چلو، پھر وہیں چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''اتنی پھرتی مت دکھا۔ پہلے شاکر کو معلومات کر لینے دے۔''

''شاکر اب صرف دلاور اور رانا کی فکر میں ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔ ''اور صحیح لفظ پھرتی ہے، پھرتی نہیں۔'' ناصر ہنس کر بولا۔

''او یار! اب تو بھی مجھے اردو سکھائے گا؟'' راجا منہ بنا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ صحیح لفظ پھرتی ہے لیکن اپنے نواب صاحب کچھ زیادہ ہی تیزی سے کام کرتے ہیں اس لیے میں اسے پھرتی کہہ رہا ہوں۔''

''سندھو کے لیے میرے ساتھ صرف غنی اور ناصر جائیں گے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''یار، مجھے گھر تو چھوڑ دے۔'' راجا نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آ گئی۔ ''میں بھی تیرے ساتھ چلتا لیکن ناصر کی سندھو سے کچھ یاد اللہ بھی رہی ہے۔''

میں نے ناصر کی طرف دیکھا۔

''ہاں، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ راجا کو بھی جانتا ہے۔ کرائم رپورٹر اور کرمنل کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔''

☆☆☆

ہم وہاں سے نکلے تو ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ہمارا مطلوبہ فلیٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راجا نے مجھ سے کہا۔ ''اب تو میری وجہ سے ماڈل ٹاؤن جانے گا فیکے؟ چل میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر غنی تھا۔ ناصر نے غنی کو ایڈریس بتایا۔ اس نے ... منٹ ... میں ہمیں اس کمپلیکس کے سامنے پہنچا دیا جہاں سندھو سے ملنے کا امکان تھا۔

''غنی! تم اوپر جاؤ۔ میں اور ناصر تمہارے پیچھے پیچھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئیں گے۔ راجا گاڑی میں بیٹھ کر اردگرد نظر رکھے گا۔" میں نے کسی فوجی کمانڈر کی طرح ہدایات دیں۔

غنی گاڑی سے اتر کر ٹہلنے والے انداز میں بلڈنگ کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بہت صاف ستھرے اور لگژری فلیٹ تھے۔ مین گیٹ پر بیریئر بھی موجود تھا، اس کا مقصد غالباً اجنبیوں اور مہمانوں کی گاڑیوں کو اندر آنے سے روکنا تھا۔ بیریئر کے دائیں جانب اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی آرام سے گزر سکتا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار بھی موجود تھا لیکن اس نے غنی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

میں اور ناصر بھی گاڑی سے باہر آگئے اور غنی کے پیچھے روانہ ہوگئے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ سندھو کو تو صرف ناصر پہچانتا ہے۔ اگر وہ فلیٹ میں ہوا بھی تو کہہ سکتا ہے کہ اکبر سندھو یہاں نہیں ہے۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور غنی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ "غنی! تم ٹھہرو! فلیٹ میں ناصر جائے گا۔ تم میرے ساتھ رہنا۔" میں نے سیل فون اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔" ناصر نے کہا۔ "فلیٹ میں پہلے مجھے جانا چاہیے تھا۔"

غنی لفٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اسی وقت لفٹ آگئی۔ ناصر لپک کر اس میں سوار ہوگیا۔ میں اور غنی زینے کی طرف بڑھ گئے کیونکہ ہمیں صرف سیکنڈ فلور تک ہی جانا تھا۔

میں فلیٹوں کے نمبر دیکھتے ہوئے آگے بڑھا تو ایک کوریڈور میں مجھے ناصر دکھائی دیا۔ وہ ایک فلیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے غنی کو کوریڈور کے دوسرے سرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں ٹھہر کر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ میں عادی سگریٹ نوش نہیں ہوں لیکن دن میں دو چار سگریٹ پی لیتا ہوں۔ اس وقت تو مجھے وہاں ٹھہرنے کا جواز بھی چاہیے تھا۔

اچانک فلیٹ کا دروازہ کھلا لیکن اسے کھولنے والا میری نظروں سے اوجھل تھا۔

ناصر نے اس سے کچھ کہا، پھر فوراً ہی اپنا پاؤں دروازے کے بیچ میں اڑا دیا۔ اندر سے شاید کسی نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے ناصر کے ہاتھ میں گن نظر آئی۔ اس نے درشت لہجے میں کچھ کہا تھا۔ مجھے صرف اس کے چہرے کے تاثرات نظر آرہے تھے۔ الفاظ سنائی نہیں دے رہے تھے۔

میں نے بھی سگریٹ پھینکی اور اس فلیٹ کی طرف لپکا۔ فلیٹ کا دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ میں نے بھی بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور اندر داخل ہوگیا۔

اندر اٹھائیس، تیس سال کی ایک دلکش عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مزید سہم گئی۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

"میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اکبر یہاں نہیں ہے۔" وہ عورت آہستہ سے بولی۔

"لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ یہیں آیا ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"آپ کی اطلاع درست ہے جناب!" وہ عورت اب کچھ زیادہ اعتماد سے بول رہی تھی۔ "اکبر کو یہاں آنا تھا لیکن وہ اب تک یہاں آیا نہیں ہے۔"

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ خاصی حسین عورت تھی۔ اس وقت کچھ سہمی ہوئی تھی لیکن اس سے اس کی دلکشی مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ شاید میک اپ کرنے میں مصروف تھی اور ادھورا چھوڑ کر دروازہ کھولنے آگئی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ پر آئی شیڈ اور کاجل لگا ہوا تھا۔ جسم انتہائی متناسب تھا۔ وہ نیلے رنگ کی ساڑی اور مختصر سے بلاؤز میں تھی۔ اس میں اس کی پیٹھ اور پیٹ برہنہ تھا اور دودھیا جلد نظر آرہی تھی۔

"آپ چاہیں تو میرے فلیٹ کی تلاشی لے لیں۔" اس نے کہا۔ "یوں بھی پولیس والے کئی دفعہ میرے فلیٹ کی تلاشی لے چکے ہیں۔"

گویا وہ ہمیں پولیس والا سمجھ رہی تھی۔ اتنے دھڑلے سے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا خودساختہ اختیار صرف ہماری پولیس ہی کو تھا۔

اس کا ادھورا میک اپ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کی یہ تیاری اور سولہ سنگھار صرف اکبر سندھو ہی کے لیے ہوسکتا ہے۔

"ٹھیک ہے، ہم فلیٹ کی تلاشی ضرور لیں گے۔" میں نے کہا۔

میں نے فلیٹ کا داخلی دروازہ بولٹ کیا اور عورت کے پیچھے پیچھے لاؤنج سے گزر کر اندر کی طرف بڑھا۔

میں اس وقت بھی بہت محتاط تھا۔ مبادا سندھو اندر کسی کمرے میں ہو اور اچانک میرا کام تمام کردے۔

اس عورت کی چال مشتعل کردینے والی تھی۔ اس فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ دو بیڈروم اور ڈرائنگ، ڈائننگ روم۔ اس میں نہایت شاندار ایک لاؤنج بھی تھا۔

ناصر میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے پہلے لاؤنج اور ڈرائنگ روم کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر وہ بیڈروم کی طرف بڑھا۔

میں عورت کے پیچھے اس کے بیڈروم میں چلا گیا۔ اس کا آراستہ بیڈروم دیکھ کر مجھے اس کے ذوق کا اندازہ ہوا۔ وہ صرف حسین ہی نہیں بلکہ نفاست پسند بھی تھی۔

"اچھی طرح تلاشی لے لیں آفیسر!" اس نے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس ہوا۔

میں نے بیڈ کے نیچے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اس کا بیڈ ماڈرن طرز کا تھا۔ ایسے بیڈز میں عموماً نیچے چھپنے کی جگہ نہیں ہوتی ہے۔ وہ چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں اور عام بیڈ کے مقابلے میں ان کی اونچائی بھی کم ہوتی ہے۔

اس نے اپنی جہازی سائز دیوارگیر الماریاں پہلے ہی کھول دی تھیں۔ ان میں اس کے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے باتھ روم میں جھانک کر دیکھا، پھر بیڈروم میں موجود ایک دروازہ مزید دکھائی دیا۔ وہ دروازہ باہر ٹیرس میں کھلتا تھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا اور وہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں سے کوئی فرار ہوسکے۔

"آپ کی تسلی ہوگئی؟" عورت نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میری تسلی ابھی نہیں ہوئی۔" میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا گدا اتنا نرم تھا کہ میں اس میں دھنس کر رہ گیا۔ "اگر اکبر کو یہاں آنا ہے تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔"

مجھے اس کے چہرے پر پہلی دفعہ شدید پریشانی کے تاثرات دکھائی دیے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے موضوع بدلنے کو پوچھا۔

"میرا نام نورین ہے۔" اس نے کہا۔

ناصر بھی مایوسی کے عالم میں اندر داخل ہوا۔ "یہاں تو ان خاتون کے علاوہ چڑیا کا بچہ تک نہیں ہے، میرے خیال میں ہمیں غلط اطلاع ملی تھی۔"

"نورین نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اکبر کو یہیں آنا تھا۔" میں نے کہا۔

"نورین!" ناصر چونک کر بولا۔ "اچھا ان خاتون کا نام نورین ہے!" پھر وہ سرسری انداز میں بولا۔ "مس نورین! کیا یہی آپ کا اصلی نام ہے؟"

"جی ہاں، یہی میرا نام ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتی ہوں۔"

"اکبر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"اکبر میرا دوست ہے۔" اس نے کہا۔

"ایسا دوست جو رات کو یہاں قیام بھی کرتا ہے؟" ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، کبھی رات زیادہ ہوتی ہے تو وہ یہاں ٹھہر بھی جاتا ہے۔"

اچانک سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے چونک کر ناصر کی طرف دیکھا، پھر نورین کو دیکھا، وہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا سیل فون اٹھا رہی تھی۔ "نو!" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "سیل فون مجھے دے دو۔"

"یہ...... میری...... پرسنل کال ہے آفیسر!" اس نے رک کر کہا۔

"سیل فون مجھے دو۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس نے سیل فون میرے حوالے کردیا۔

گھنٹی بج بج کر خاموش ہوچکی تھی۔ میں نے مس کال دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اکو کی کال تھی۔ میں سمجھ گیا کہ نورین نے اکبر سندھو کا نمبر اکو کے نام سے محفوظ کر رکھا ہے۔

"یہ اکبر تمہیں فون کیوں کر رہا ہے؟"

"وہ آنے سے پہلے ہمیشہ فون کرتا ہے۔" نورین نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کی کال ابھی پھر آئے گی۔ تم اس مرتبہ کال ریسیو کروگی اور اس سے کہوگی کہ تم باتھ روم میں تھیں۔ اس سے کہو کہ تم بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہو۔"

"اسپیکر فون آن کردینا۔" ناصر نے کہا۔ "اور اگر ایسی ویسی کوئی بات کی تو میں تمہاری یہ خوبصورت گردن اپنے ہاتھوں سے ماچس کی تیلی کی طرح توڑ دوں گا۔ یہ سمجھ لو کہ......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ نورین کے سیل فون کی بیل پھر بجنے لگی تھی۔ اسکرین پر اکو کا نام تھا۔ میں نے اسپیکر آن کرکے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

ناصر نے اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا۔

"ہیلو!" نورین نے سنبھل کر کہا۔

"تم کہاں تھیں ڈیئر؟" دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "میں کب سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔"

"میں باتھ روم میں تھی۔" نورین نے کہا۔ "اور یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے کہ تم کہاں تھے؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا جان!" اکبر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔ ''میں بس ابھی پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ وہاں، کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟''

ناصر نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

''گڑبڑ کیسی جانو؟'' نورین نے پوچھا۔

''آج کل ایک کیس کے سلسلے میں دشمن میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پولیس بھی میری تاک میں ہے۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔'' نورین نے کہا۔

ناصر نے اشارے سے کہا کہ اب بات ختم کرو۔

''اوکے جانو! ٹیک کیئر۔'' نورین نے یہ کہہ کر سیل فون آف کر دیا۔

اس کا چہرہ پریشانی میں مزید حسین لگ رہا تھا۔

ناصر نے اس کا سیل فون آف کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا اور اس سے کہا۔ ''چلو، تم لاؤنج میں بیٹھو۔''

وہ خاموشی سے اٹھی اور لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

نورین کے چہرے پر فکرمندی اور پریشانی کے تاثرات تو تھے لیکن وہ اضطرابی کیفیت نہیں تھی جو اس موقعے پر ہونا چاہیے تھی۔

ظاہر ہے، اکبر وہاں اپنی زندگی کے کچھ لمحات کو رنگین کرنے آتا تھا۔ اس ضمن میں وہ نورین کو ہر ماہ خاصی خطیر رقم دیتا ہوگا۔ نورین کو اکبر سے ملنے والی رقم آئندہ نہ ملنے کا افسوس ہو تو ہو، اسے اکبر کی گرفتاری پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں اپنے خیالات میں اتنا گم تھا کہ اس دوران میں اطلاعی گھنٹی بجی تو میں بری طرح چونک اٹھا۔

میں اور ناصر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اپنا ریوالور نیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کے دوسرے سرے پر ناصر ریوالور بہ دست کھڑا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال سے نورین کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ نورین ابھی تک ادھورے میک اپ میں تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے نورین کو چونکتے دیکھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''آؤ! اندر آ جاؤ۔''

آنے والا اندر آیا تو اس کا رخ نورین کی طرف تھا۔

میں نے اچانک پیچھے سے اس کی کمر پر ایک بھرپور لات رسید کی۔ ضرب غیر متوقع تھی اس لیے وہ اوندھے منہ گرا لیکن فوراً ہی سیدھا ہو گیا۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر ریوالور کی نال رکھ دی۔

ناصر نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور نووارد پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ''یہ اکبر نہیں ہے۔''

وہ فرش پر پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خاصے کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کا قد درمیانہ اور ہاتھ پیر خاصے مضبوط لگ رہے تھے۔

ناصر نے آگے بڑھ کر انتہائی مہارت سے اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی جیب سے ایک بھدا سا درہ ساخت پستول اور تقریباً ساڑھے چار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔

''کون ہو تم لوگ اور......''

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ''سوال کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''آپ میرے گھر میں بلااجازت گھس آئے اور......''

میں نے اس مرتبہ اس کے چہرے پر زیادہ زور سے تھپڑ مارا اور بولا۔ ''تمہارا گھر! یہ تمہارا گھر ہے؟''

''یہ پولیس آفیسر ہیں بابو!'' نورین نے کہا۔

''یہ پولیس کے آدمی ہیں؟'' بابو چونک کر بولا۔

''یہ تمہارا گھر ہے؟'' میں نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

''یہ گھر تو اصل میں مس نورین کا ہے لیکن میں یہاں آتا جاتا رہتا ہوں۔'' بابو گھگیا کر بولا۔

''اکبر کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''مجھے ان کے بارے میں تو کچھ نہیں معلوم۔'' بابو نے کہا۔

''جھوٹ بولو گے تو میں اسی گھر کو تمہاری قبر بنا دوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ پھر جیب سے سیل فون نکال کر غنی کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے کہا۔ ''غنی! اندر آ جاؤ۔''

''اوکے سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھا اور بابو کو گھورنے لگا۔

دروازے پر غنی نے مخصوص انداز میں دستک دی۔ ناصر نے پوچھا۔ ''کون؟''

> **یہ پر پیچ و سنسنی خیز داستان جاری ہے**
> **مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں**

دولت کے حصول کی ایک رائگاں کوشش...... ایک بلاجواز مسافت کا احوال

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت کچھ پاکر بھی انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے... اور جب ساری تگ ودو بے سود اور تمام جستجو لاحاصل ٹھہرے تو انسان بے زاری کا شکار ہو جاتا ہے... اور بیزار انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔

لاحاصل

سلیم انور

جیری گرے ہاؤنڈ بس سے ففتھ اور مین کے سنگم پر اترا اور حیرت سے اطراف پر نگاہ دوڑانے لگا۔

اتنے میں ایک نوعمر لڑکا اپنے اسکیٹ بورڈ پر تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ ''کیا واقعی یہ لوکس ول ہے؟'' جیری نے لڑکے سے بلند آواز میں پوچھا جو تیزی سے جوش میں آگے نکل گیا تھا۔

لڑکے کی عمر چودہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اسکیٹ کرتے ہوئے رک گیا اور اپنے اسکیٹ بورڈ پر ایک پیر اس طرح مارا کہ بورڈ ہوا میں اچھل گیا۔ لڑکے نے مشاق انداز میں بورڈ کو ایک ہاتھ سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اپنی ٹی شرٹ کو اوپر اٹھاتے ہوئے، ماتھے پر گرے ہوئے بالوں کو درست کیا اور بولا۔ ''دادا جان یہ سن **2011**ء ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ایلوس پریسلے کے دور کے اس کوٹ سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور زمانے کے ساتھ چلیں۔''

جیری نے جواب دینے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس دوران میں وہ نوعمر لڑکا ہوا میں اچھلا اور اپنے اسکیٹ بورڈ پر قدم جماتے ہی دور نکل گیا۔

جیری نے سر کو جنبش دیتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک پرانا کاغذ نکالا جس کی زرد رنگت اس کی خستہ حالی کی مظہر تھی۔ وہ ضرورت کے تحت نہیں بلکہ عادت سے مجبور ہو کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

نقشہ بالکل وہی تھا جو اس نے بیس برس قبل بنایا تھا۔ یہ نقشہ اسے اچھی طرح ذہن نشین بھی تھا۔ اس نے ایک نگاہ اسٹریٹ سائن بورڈ پر ڈالی اور مسکرا دیا۔ وہ بالکل صحیح مقام پر تھا۔

وہ ففتھ اسٹریٹ پر چلتے ہوئے کارنر تک پہنچا اور پھر مشرق کی سمت سینٹ چارلس اسٹریٹ کی جانب روانہ ہو گیا پھر جب اسے ''ڈیڈ اینڈ'' کا سائن بورڈ دکھائی دیا تو اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

پرانا گیس اسٹیشن اب خستہ حال ہو چکا تھا لیکن اب بھی اسی پرانے نام سے اپنی جگہ قائم تھا...... جیکی سروس اسٹیشن!

اب اسے پانچ لاکھ ڈالرز کی خوشبو بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسی احساس نے کہ لوٹ کی یہ رقم حفاظت سے لوکس ول چرچ آف کرائسٹ کے نیچے مدفن ہے، اسے اب تک زندہ رکھے ہوئے تھا۔ کوئی بھی خدا کے گھر کو الٹ پلٹ نہیں کر سکتا تھا۔

اس خیال سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا کہ اس کی ناجائز طریقے سے حاصل کردہ رقم کی حفاظت خدا کر رہا ہے۔

جیری سروس اسٹیشن کے عقب سے ہوتے ہوئے اس حصے میں داخل ہو گیا جہاں درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کا یہ جھنڈ اب اتنا گھنا دکھائی نہیں دے رہا تھا جیسا کہ جیری کو یاد تھا۔

''لیکن اس وقت میرے پاس اتنا ٹائم کہاں تھا کہ

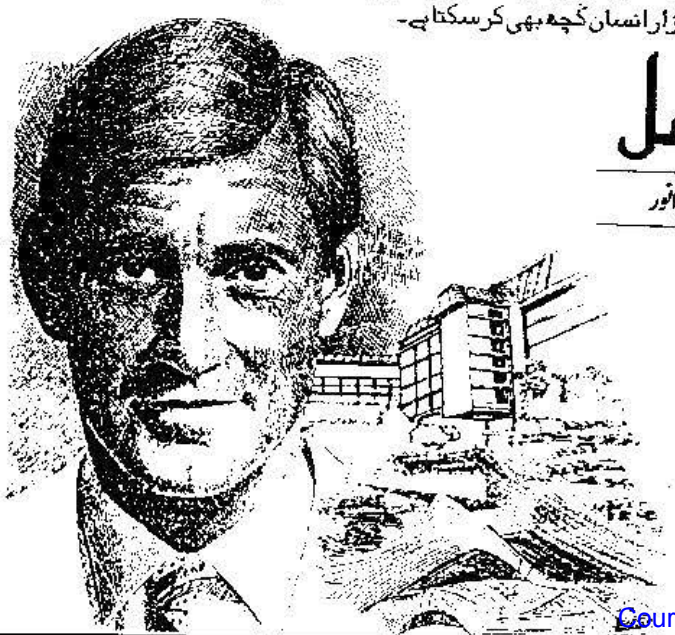

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس منظر کو ذہن نشین کرتا کیونکہ وہ پولیس والے میرا پیچھا کر رہے تھے۔'' جیری نے بلند آواز سے کہا۔
وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا اور جب درختوں کا جھنڈ ختم ہوگیا تو اس کے زرد چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اب پھر صاف ستھرا علاقہ نگاہوں کے سامنے تھا۔
اپنی ریٹائرمنٹ کے لیے محفوظ کردہ پوشیدہ خزانے سے وہ صرف چند سو گز کے فاصلے پر تھا۔ بیشتر لوگ زندگی بھر کام کرتے ہیں اور ریٹائر ہونے پر ایک حقیر سی رقم سوشل سیکیورٹی کی مد میں ان کے ہاتھ آتی ہے لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے ایک ہی ہاتھ مارا تھا اور اب اسے اس کی محنت کا صلہ ملنے والا تھا۔
بے شک یہ نہ بتانے پر کہ اس نے رقم کہاں چھپائی تھی اسے بیس سال کی سزا میں سے پندرہ سال کی قید کاٹنی پڑ گئی تھی۔ لیکن اس کے لیے یہ قید کاٹنا رائگاں نہیں رہا تھا۔ دولت ہاتھ آنے کی آس نے اسے قید کی صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ دے دیا تھا اور اب چند لمحوں کے بعد یہ دولت اس کے ہاتھ میں آجانی تھی۔
اس تصور سے اس کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی اور اس نے گرتے پڑتے دوڑ لگا دی۔ وہ جھاڑیوں کا آخری جھنڈ عبور کر گیا تو سامنے نگاہ پڑتے ہی اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور وہ دھیرے دھیرے گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ ''یہ کیا......؟'' اس کے حلق سے ایک کراہ سی نکل گئی اور وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا۔
وہ کاغذ جس پر اس نے نقشہ بنایا تھا اور جو اس کے لیے بائبل کی سی حیثیت رکھتا تھا، اس کی انگلیوں سے پھسل کر ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے دور چلا گیا۔ اس کے اب تک زندہ رہنے کی واحد وجہ یہی نقشہ تھا۔
بیس برس قبل کے سراغ رساں کی آواز اس کے کانوں میں شدت سے گونجنے لگی۔ ''ہمیں بتا دو کہ رقم کہاں ہے؟ استغاثہ تمہاری سزا میں نرمی کی سفارش کرے گا اور زیادہ سے زیادہ دو سال قید بھگتنا پڑے گی۔ تمہیں ڈکیتی کے عوض اس سے بہتر اور کوئی ڈیل نہیں مل سکتی۔''
جیری نے سراغ رساں کی بات سن کر فرش پر تھوک دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اپنی راہ لے۔
''نفرت انگیز ہے نا؟'' جیری کو اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔
جیری اس آواز پر اچھل کر کھڑا ہوگیا اور گھوم گیا۔ گو اس کے بالوں میں اب سپیدی آ گئی تھی اور چہرے کی جھریوں میں بھی اضافہ ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود جیری نے اسے پہچان لیا۔
وہ سراغ رساں پیٹرسن تھا!
''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' جیری نے حیرت زدہ لہجے میں سوال کیا۔
''تمہارا تعاقب!''
''کیا؟''
سراغ رساں پیٹرسن کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص شیطانی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ''مجھے امید ہے کہ تم نے یہی سمجھا کہ وہ تمہیں پانچ سال پہلے تمہارے اچھے رویے کی بنا پر جلدی رہا کر رہے ہیں، ہے نا؟''
جیری نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میری ریٹائرمنٹ میں کچھ ہی عرصہ باقی رہ گیا ہے اور میں چاہتا تھا کہ تم اس رقم تک میری رہنمائی کرو جو تم نے ڈکیتی کے بعد کہیں چھپا دی تھی اور ہمیں اس کے بارے میں بتانے کے بجائے تم نے طویل قید کاٹنے کو ترجیح دی تھی لیکن میں بھی اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اطمینان اور آسائش کی زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ اسی لیے رہائی کے بعد میں نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا۔ پانچ لاکھ ڈالرز کی رقم ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی آرام سے گزارنے کے لیے خاصی معقول ہوتی ہے، مجھے اندازہ تھا کہ رہائی ملتے ہی تم فوراً اس ٹھکانے کا رخ کرو گے جہاں تم نے ڈکیتی میں لوٹی ہوئی رقم چھپائی ہے..... میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اب وہ رقم تمہاری نہیں، میری ہوگی...... صرف میری!''
''مجھے وقت سے پہلے رہائی تم نے دلائی ہے؟''
سراغ رساں پیٹرسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''وہ رقم وہاں اس کے نیچے دبی ہوئی تھی؟'' سراغ رساں پیٹرسن نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''وہاں نہیں، اس مقام سے تین سو فٹ مشرق کی سمت میں۔'' جیری نے شکست خوردہ لہجے میں بتایا۔ ''اب کیا ہوگا؟''
پیٹرسن نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے اسے دلاسا دینے کے انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم نے پندرہ سال کی قید فضول میں کاٹی۔ تمہیں اب کچھ حاصل نہیں ہوگا اور مجھے بھی نہیں۔''
جیری حسرت آمیز نظروں سے اس مقام کو دیکھتا رہا، جہاں کبھی لوکس ول چرچ آف کرائسٹ کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی اور آج وہاں سپر والی مارٹ کی جدید اور شاندار عمارت کھڑی تھی۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

[illegible]

دنیا کی سب سے سرکش قوم بنی اسرائیل نے بر موڑ پر بغاوت کی اور قدم قدم پر ٹھوکر بھی کھائی مگر صد افسوس کہ راہِ حق پر چلنا اسے پھر بھی نہ آیا۔ یکے بعد دیگرے انبیا آتے رہے اور بت پرستی کا اندھیرا چھانٹتے رہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کڑی حضرت حزقیل ؑ کی ہدایات بھی ہیں... حسب روایت آپ ؑ کو بھی رد کیے جانے کا دکھ... سفر کی صعوبت... کبھی محبت اور کبھی نفرت سہنے جیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر انبیا کا یہ شعار ہے کہ وہ کبھی کسی آزمائش سے منہ نہیں موڑتے۔ انہی آزمائشوں سے گزرنا ہی دراصل انبیا کی تربیت ہے اور ان میں کامیابی پانا ہی نبوت کی معراج ہے اور اللہ اپنے برگزیدہ بندوں کا امتحان ایسے ہی لیتا ہے۔

حضرت یرمیاہؑ کے پیغام کو بڑھانے والے ایک اور نبی کا احوال

حضرت ہارون علیہ السلام کے نسب سے تعلق رکھنے والے ایک نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کا زمانۂ نبوت چھٹی صدی قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔
حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے بعد تورات و تاریخ متفق ہیں کہ حضرت یوشعؑ منصبِ نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حق حضرت موسیٰؑ کے دوسرے رفیق الب بن یوحنا نے ادا کیا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ مریم بنت عمران کے شوہر تھے مگر نبی نہیں تھے۔ طبری کہتے ہیں کہ ان کے بعد سب سے پہلے جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت کی وہ حزقیل علیہ السلام ہی ہیں۔
قرآن عزیز میں حزقیل علیہ السلام کا نام مذکور نہیں لیکن سورۂ بقرہ میں بیان کردہ ایک واقعے کے متعلق سلف صالحین سے جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روایات منقول ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق حضرت حزقیل علیہ السلام کے ساتھ ہی ہے۔

''(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے پھر اللہ نے فرمایا کہ مرجاؤ پھر ان کو زندہ کردیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔'' (سورۂ بقرہ)

کتب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ یا ان کے پیغمبر حزقیل علیہ السلام نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہوگئے ہیں، دور ایک وادی میں مقیم ہوگئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضا قدر کے فیصلے سے روگردانی سمجھ کر اظہار ناراضی کرتے ہوئے ان کے لیے بددعا کی اور یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری بہرحال اس کے غضب نے ان پر موت طاری کردی اور وہ سب کے سب موت کی آغوش میں چلے گئے۔ ان پر حضرت حزقیل علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے ان کی اس حالت پر افسوس کیا اور دعا مانگی کہ اے اللہ! ان کو موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے عبرت وبصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعا قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونۂ عبرت بنے۔ (تفسیر ابن کثیر)

توریت میں اس واقعے کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

''خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے (حزقیلؑ) اپنی روح میں اٹھالیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتارا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا اور دیکھو وہ وادی کے میدان میں بہ کثرت اور نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد! کیا یہ ہڈیاں زندہ ہوسکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا، اے خداوند خدا تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے فرمایا، تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ، اے سوکھی ہڈیو! خداوند کا کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہوجاؤ گی اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہوگی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس! میں (حضرت حزقیلؑ) نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور بلند ہوا اور زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ رہا ہے۔ ان پر چمڑے کی پوشش ہوگئی مگر ان میں دم نہ تھا۔ تب اس نے مجھے فرمایا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ اے ''دم'' تو چاروں طرف سے آ اور ان مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہوجائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں ایک نہایت بڑا لشکر۔''

جب وہ زندہ ہوئے تو انہوں نے یہ الفاظ کہے تھے۔

''اے اللہ! تیری ذات پاک ہے اور ہم تیری ہی تعریف کرتے ہیں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔''

☆☆☆

حضرت داؤد علیہ السلام نے اسرائیل کو متحد کردیا تھا لیکن ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان دو حصوں کو عام طور سے ''شمالی سلطنت'' اور ''جنوبی سلطنت'' کہا جاتا ہے۔ جنوبی سلطنت چھوٹی تھی۔ اس پر حضرت داؤد کے جانشین 586ق م تک حکومت کرتے رہے۔ اس کا دارالسلطنت ''یروشلم'' تھا۔ یہ یہودہ اور بنیمین کے قبیلوں پر مشتمل تھی۔ بائبل نے ان سلطنتوں کو عام طور سے ''یہودہ'' اور ''اسرائیل'' کے نام سے پکارا ہے۔ اسرائیل شمالی سلطنت اور یہودہ جنوبی سلطنت۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اس جنوبی سلطنت کے دارالسلطنت یروشلم میں پیدا ہوئے۔

حضرت داؤدؑ کی نسل سے یکے بعد دیگرے بادشاہ برسراقتدار آتے رہے اور یہودہ کی اس چھوٹی سی مملکت پر حکمرانی کرتے رہے۔ بادشاہوں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے تخت نشیں ہوتے رہے۔

یہ چھوٹی سی ریاست ابتدا ہی میں بت پرستی کا شکار ہوگئی اور مذہبی جوش وخروش ماند پڑتا گیا۔ اسے ایسے بادشاہ میسر آئے جنہوں نے بت پرستی کی سرپرستی کی اور گمراہی کی اتھاہ گہرائی میں اتر گئے لیکن بعض ایسے حکمران بھی آئے جنہوں نے اس سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کی۔ انہی میں ایک یوسیاہ بھی تھا۔ اس کے باپ امون کی وفات کے بعد اسے تخت نشیں کیا گیا تو اس کی عمر

صرف آٹھ سال تھی۔

مملکت میں ہر طرف بت پرستی کا دور دورہ تھا۔ نوعمر بادشاہ کے لیے مذہبی لحاظ سے ترقی واصلاح کرنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ عمر ایسی تھی کہ امورِ مملکت دوسرے لوگ چلا رہے تھے جو بت پرستی اور دوسری اخلاقی برائیوں میں گلے گلے ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا باپ امون مارا ہوا شریر بادشاہ تھا۔ اس کے دورِ حکومت نے کافی موقع فراہم کردیا کہ ملک کے لوگ بت پرستی کی راہوں پر گامزن رہیں۔ ایسی بدترین برگشتگی کے بدلے میں یہوداہ سوائے غضبِ الٰہی اور کس بات کی امید کر سکتے تھے جیسا کہ اس وقت کے نبی خبردار کرتے رہے تھے۔

یہ تباہی اور پہلے آجاتی لیکن یوسیاہ سولہ سال کی عمر کو پہنچا تو اس نے اپنے وقت کی گناہ آلودہ حالت کے خلاف ردِعمل کا اظہار کیا۔ وقت کی رو میں بہنے اور بت پرستی کی طرف مائل ہونے کے بجائے وہ خلوصِ نیت سے خدا کا طالب ہوا اور اس نے مذہبی اصلاحات کا آغاز کردیا۔ اس نے شاہی اختیار کو بڑی دلیری کے ساتھ استعمال کیا اور نہ صرف یہوداہ بلکہ شمالی قبائل سے بھی بے دینی اور بت پرستی کی رسومات کو ختم کردیا۔ بعل کے مذبح خانے توڑ ڈالے اور بت پرستی کے لیے مخصوص ظروف کو دور کردیا۔ مذہبی کسبیوں کے حجرے ڈھا دیے، گھوڑے جو سورج دیوتا کے لیے مخصوص تھے ان کو پھاٹک سے ہٹا دیا اور رتھوں کو آگ سے جلا دیا۔ بچوں کی قربانی کی ہولناک رسم کو یک دم ختم کردیا۔ اس نے ان کاہنوں کو بھی نکال دیا جو بت پرستی کے لیے مخصوص تھے۔ ان کی برطرفی سے سورج، چاند اور ستاروں کے لیے بخور جلانا بند ہوگیا۔

پچھلے بادشاہوں نے یروشلم میں ہیکل کو بالکل ہی نظرانداز کردیا تھا۔ یوسیاہ نے اس کی مرمت کی طرف توجہ دی۔ ہیکل کی تعمیر کے دوران میں اسے توریت کی کتاب ملی جو کسی وقت دفن کردی گئی تھی اور اب تو لوگ یہ بھی بھول گئے تھے کہ اس کتاب میں کن باتوں پر عمل کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

بادشاہ کی قیادت میں یہوداہ کے بزرگ، کاہن، لاوی اور یروشلم کے عام لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تو دریافت شدہ توریت کی کتاب سب کو پڑھ کر سنائی گئی۔

''میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس شریعت کی پوری پوری پابندی کروں گا۔'' بادشاہ نے بلند آواز میں اپنی قوم کو مخاطب کیا۔

وہاں موجود لوگوں نے اس کی آواز کا ساتھ دیا۔ پورا یروشلم گونج اٹھا۔ ''ہم اس شریعت کی جو موسیٰ ہمارے لیے لائے تھے پوری پوری پابندی کریں گے۔''

مذہبی جوش اپنے عروج پر تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہودہ کسی مذہبی انقلاب سے دوچار ہونے والے ہیں۔ ان کا یہ مذہبی اتحاد انہیں سیاسی میدان میں بھی آگے کی طرف لے جائے گا۔ اردگرد کی قومیں ان کی مطیع ہوجائیں گی اور خداوند خدا ان کی مدد کرے گا کیونکہ وہ اس کے فرمانبردار بندے بننے والے ہیں۔

توریت میں حکم دیا گیا تھا۔

''پہلے مہینے کی چودھویں تاریخ کو شام کے وقت خداوند کی ''فسح'' ہوا کرے (فسح کے معنی ہیں چھوڑنا۔ چونکہ بنی اسرائیل نے سال کے پہلے مہینے میں مصر چھوڑا تھا لہٰذا یہ دن قومی تہوار کی طرح منایا جانے لگا تھا۔ توریت غائب ہوئی تو لوگ اس رسم کو بھی بھول گئے) اور اسی مہینے کی پندرھویں تاریخ کو عید فطیر ہو۔ اس میں تم سات دن تک بے خمیری روٹی کھانا۔ پہلے دن تمہارا مقدس مجمع ہو۔ اس میں تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا اور ساتوں دن تم خداوند کے حضور آتشیں قربانی گزارنا اور ساتویں دن پھر مقدس مجمع ہو۔ اس روز تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا۔''

عید فسح منانے کی تیاریاں شروع کردی گئیں۔ کاہن مقرر کیے گئے اور ہیکل میں عبادت کو دوبارہ شروع کیا گیا۔ شموئل نبی کے بعد یہ عید پھر کبھی نہیں منائی گئی تھی۔

☆☆☆

یروشلم کی مشرقی دیوار پر بوزی کاہن کا مکان تھا۔ کہانت کا منصب اس خاندان کو ورثے میں ملا تھا اور نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ بوزی کاہن نہایت پاکباز اور بت پرستی سے کوسوں دور تھا۔ اس کی زندگی میں بس ایک دکھ تھا۔ اس کی بیوی بوڑھی ہوچکی تھی اور اب بھی اولاد سے محروم تھی بلکہ اب تو کوئی امید ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

یروشلم میں عید فسح کی تیاریاں شروع ہوئیں تو شہر کی ساری خوشیاں اس کے گھر میں سمٹ آئیں۔ اس کی بیوی نے اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتایا کہ وہ امید سے ہے۔ اس نے یہ خبر بڑے تعجب سے سنی کیونکہ اس کی بیوی اب اولاد پیدا کرنے کی عمر سے دور نکل آئی تھی لیکن خدا پرست تھا، دوسرے ہی لمحے اسے یقین آ گیا کہ خدا کی قدرت سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

''یہ بادشاہ کی نیک چلنی ہے کہ خدا کی رحمت نے ہمارا گھر بھی دیکھ لیا۔'' کاہن نے اپنی بیوی سے کہا۔

''اس میں کیا شک ہے۔ گہرا ہی کے اندھیرے دور ہوں تو رحمت کی روشنی کو جگہ مل جاتی ہے۔''

''تمہارے اس بڑھاپے میں اللہ نے اپنا معجزہ دکھایا ہے تو آنے والا بچہ بھی غیر معمولی ہوگا۔ میرا وجدان تو یہ کہتا ہے کہ اللہ اس بچے سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اسی لیے اس نے معجزہ دکھایا ہے۔''

''آپ کا قیافہ غلط نہیں ہے۔ جب سے یہ بچہ میرے پیٹ میں آیا ہے میں اپنے اردگرد روشنی کا ایک ہالہ سا دیکھتی ہوں کبھی کبھی ایک پسندیدہ خوشبو مجھے اپنے حصار میں لے لیتی ہے اور میں ڈر جاتی ہوں۔''

'بچہ واقعی بابرکت ہوگا۔''

''آپ تو مجھ سے زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ دعا کیا کریں کہ اس بچے کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہماری عزت و توقیر میں اضافہ کرے۔''

''میری تو یہی دعا ہے۔ خدا اسے اچھا زمانہ دے۔''

''اللہ ہمارے بادشاہ کو زندگی دے۔ اس نے سب کو دین کا پابند بنا دیا ہے۔ ہمارا بچہ جب اس فضا میں آنکھ کھولے گا یقیناً نیک بنے گا۔''

''میں اس کے ہوش سنبھالتے ہی اسے توریت کے اسباق پڑھانا شروع کر دوں گا۔''

''میں اسے نماز میں اپنے ساتھ کھڑا کیا کروں گی۔''

''میں اسے برے لڑکوں کی صحبت سے بچاؤں گا۔''

''اب تو ہیکل میں عبادت کا آغاز ہو گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہیکل لے جایا کیجیے گا۔''

''گھر سے ہیکل تک کا فاصلہ ہی کتنا ہے۔ وہ خود بھی دن میں دس چکر کیا کرے گا۔''

''میں اپنے بچے کو بہت بڑا کاہن بناؤں گی۔''

''اسے کیا بننا ہے یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔ وہی اسے جو بنانا چاہے گا بنا دے گا۔''

میاں بیوی میں رات گئے تک یہ باتیں ہوتی رہی تھیں اور پھر یہ باتیں روزانہ کا معمول بن گئیں۔ بے چینی سے اس دن کا انتظار ہو رہا تھا جب ان باتوں پر عمل کرنے کا موقع ملے۔

بوزی کاہن اس روز سخت مضطرب تھا۔ بچے کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا تھا۔ محلے کی عورتیں اس کی بیوی کی مدد کرنے کے لیے آ گئی تھیں۔ وہ باہر ٹہل رہا تھا کہ جیسے ہی بچے کے رونے کی آواز کانوں میں آئے وہ دوڑ کر اندر جائے اور اپنی امیدوں کا روشن چہرہ دیکھے۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک عورت نے دروازے سے سر نکالا اور اسے بیٹے کی خوش خبری سنائی۔

''مبارک ہو، ہارون کی نسل میں ایک مرد کا اضافہ ہوا ہے۔''

''تم مجھے اجازت دو گی تو میں اندر آؤں گا۔''

''ہم جب تمہارے گھر سے نکلیں تو تم اندر چلے جانا۔ بچے کو غسل دے دیں تو پھر ہمارا کام ختم۔''

کاہن کو اطمینان تو ہو گیا تھا کہ بچہ خیریت سے ہے لیکن بے تابی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو جلد سے جلد دیکھ لینا چاہتا تھا۔ مختلف بچے اس کے تصور میں جگہ بنا رہے تھے۔ کبھی سوچتا تھا وہ ایسا ہوگا، کبھی سوچتا نہیں ایسا ہوگا۔ پھر سوچتا تھا، وہ ان جیسا کہاں۔ وہ تو سب سے مختلف ہوگا۔ یروشلم تو کیا اردگرد کے علاقوں میں بھی کوئی اس کی طرح نہیں ہوگا۔ وہ انہی خیالوں میں گم دالان دروازے کے قریب بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے گھر سے عورتوں کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کا مطلب ہے اب میں اندر جا سکتا ہوں۔ وہ اندر گیا اور اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹے ہوئے بچے کو دیکھا۔ اس کا خیال درست تھا۔ وہ اس کے تصور میں آباد تمام بچوں سے مختلف تھا۔ اس کی چوڑی پیشانی سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر سکتا تھا کہ پورا کمرا خوشبو سے بسا ہوا ہے۔ اس نے نومولود کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ بوزی، کاہن تھے۔ عالم کامل تھے۔ ان کا عرفان نہیں بتا رہا تھا کہ ان کی گود میں جو بچہ ہے وہ معمولی بچہ نہیں۔

''معلوم نہیں اس وقت تک میری زندگی وفا کرے نہ کرے جب تک یہ اپنے مقام و مرتبہ تک پہنچے۔''

''ہم دونوں ہی اسے جوان ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔'' ان کی بیوی نے کہا۔

نام رکھنے کا وقت آیا تو آپ کے والد نے آپ کا نام حزقی ایل (حزقیل) رکھا۔ عبرانی زبان میں ''ایل'' اسم جلالت ہے اور حزقی کے معنی قدرت اور قوت کے ہیں۔ عربی زبان میں اس مرکب نام کا ترجمہ قدرت اللہ کیا جا سکتا ہے۔

بڑھاپے میں بیٹا نصیب ہوا تھا اور بیٹا بھی ایسا کہ جو دیکھے پیار کرے۔ ابھی وہ بولنے اور کچھ سمجھنے کے لائق بھی نہیں ہوا تھا کہ باپ اسے اپنے پاس لٹا کر اسے بنی اسرائیل کی تاریخ سناتا۔ اس کی بیوی اس کی اس حرکت پر ہنسا کرتی تھی۔

''آپ تو اسے ایسے سبق پڑھا رہے ہیں جیسے یہ سمجھ بھی رہا ہے اور یاد بھی کر رہا ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔ میں نے تم سے کہا تھا یہ عام بچہ نہیں ہے۔ میں جب اس سے باتیں کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے یہ سب کچھ سمجھ رہا ہے اور یاد کر رہا ہے۔ یوں بھی بچہ جو کچھ سنتا ہے اسے یاد رکھتا ہے۔ بڑے ہو کر یہی باتیں اس کے ذہن میں گردش کریں گی۔ ابھی تو اپنی تاریخ اسے یاد کرا رہا ہوں۔ ذرا ہوش آ جائے تو مذہبی رسمیں بھی سکھاؤں گا۔ اسے اتنا علم سکھا دوں گا کہ دنیا کہے گی، دیکھو! انھا کاہن جا رہا ہے۔''

باپ نے کیا کیا سوچ رکھا تھا لیکن قدرت کی منشا کچھ اور تھی۔ حضرت حزقیل علیہ السلام ابھی چلنا اور بولنا سیکھے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ کی طرف سے کاہنوں کے لیے وظیفہ مقرر تھا اس لیے مالی پریشانی تو نہیں ہوئی البتہ والدہ کو یہ فکر ضرور لاحق ہو گئی کہ اب ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا ہوگا؟ کبھی کبھی شوہر کی کہی ہوئی یہ بات یاد آ جاتی تھی کہ یہ کوئی معمولی بچہ نہیں۔ بس اسی سے تسلی ہو جاتی تھی کہ اللہ خود کوئی بندوبست کرے گا۔

اس کا بندوبست یہ ہوا کہ جب وہ خوب چلنے پھرنے لگا تو ہیکل کے بیرونی صحن اس کے لیے کھیل کا میدان بن گئے۔ عام بچوں کی طرح گلیوں میں کھیلنے کے بجائے وہ ہیکل میں چلے جاتے۔ جب تک جی چاہتا کھیلتے پھر ایک طرف بیٹھ کر لوگوں کو عبادت کرتے ہوئے دیکھتے رہتے۔ وہاں جمع ہونے والے کاہن آپس میں جو باتیں کرتے، انہیں سنتے اور ذہن نشین کرتے۔ وہاں ادا ہونے والی رسوم کو دیکھتے اور گھر جا کر ماں کے سامنے دہراتے کہ کون سی رسم کس طرح ادا ہوتی ہے اور اس کا ہماری شریعت میں کیا مقام ہے۔ اگر ہم یہ رسم ادا نہ کریں تو خدا کا ردعمل کیا ہوگا۔ ایک روز انہوں نے ہیکل میں بادشاہ کو دیکھا تو ہیکل کی عظمت ان کی نظروں میں دوبالا ہو گئی۔ وہ سوچ رہے تھے، ہیکل بس ایک عمارت نہیں ہے جہاں قیمتی ظروف رکھے ہوئے ہیں بلکہ یہ ایسا پُرجلال مقام ہے جہاں بادشاہ بھی آ کر سر جھکاتا ہے۔

یہاں صرف مذہبی باتیں ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ لوگ جمع ہوتے تو اردگرد کی اقوام کے قصے بھی چھڑ جاتے۔ بابل کی ہمارے لیے کیا اہمیت ہے۔ نینوا سے کیا خطرات ہیں۔ کون یروشلم کا دشمن ہے۔ بادشاہ اپنی مملکت کو وسیع کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے یا اسے کیا کرنا چاہیے۔ کاہنوں کا کیا کام ہے۔ نبوت کو کیا کرنا چاہیے۔ غرض ہر قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آتی تھیں، کچھ نہیں آتی تھیں لیکن پھر بھی یہ مقام ان کے لیے مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں آہستہ آہستہ ان کی تربیت ہو رہی تھی۔

جب وہ ذرا بڑے ہوئے تو کاہنوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ ہر وقت کی قربت نے ان پر علم کے بہت سے دروازے کھول دیے۔ ہر جگہ اپنی پاکبازی اور واقفیت علم کی وجہ سے نگاہِ عزت سے دیکھے جانے لگے۔

بیرونی حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ اسرائیلیوں کے دشمن اسوریوں کو شکست ہو گئی تھی۔ نینوا تباہ ہو گیا تھا۔ پرانے دشمن مٹ رہے تھے، نئے دوست بن رہے تھے۔

نینوا کی تباہی کی خبریں یروشلم میں گردش کرنے لگیں تو یوسیاہ نے بین الاقوامی امور کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ فوجی لحاظ سے وہ تیار تھا مگر اس سے ایک مہلک غلطی سرزد ہوئی جس نے اس کا چراغِ عروج گل کر دیا۔

اسوری، خاران میں جلاوطن حکومت کے خلاف لڑائی میں پسپا ہو رہے تھے۔ شاہ مصر نکوہ، اسوریوں کی کمک کے لیے اپنی فوجوں کو لے کر آگے بڑھا۔ یوسیاہ نے موقع غنیمت جانا۔ وہ اپنی فوجیں لے کر تیزی سے مجدو کی طرف بڑھا تاکہ مصریوں کو ابھی اسوریوں کو شکست کھانے دے۔ یوسیاہ کو مہلک زخم لگے اور فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے ملازم کسی نہ کسی طرح اسے رتھ میں ڈال کر یروشلم لے آئے لیکن وہ مر چکا تھا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کیا، کوئی بھی اس وقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یوسیاہ کی اس مداخلت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے لیکن جلد ہی معلوم ہو گیا۔ یوسیاہ کے بیٹے یہوآخز کو یروشلم میں بادشاہ بنایا گیا تھا لیکن اسے صرف تین مہینے کی بادشاہت نصیب ہو سکی۔

یوسیاہ کی مجدو میں شکست کے بعد مصری شمال میں کرمیس کی طرف بڑھے۔ بابل کی مغرب کی طرف پیش قدمی عارضی طور پر رک گئی۔ فرعون مصر نکوہ نے ربلہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ یہوآخز کو تخت سے اتار کر ربلہ لے آیا اور پھر اسے مصر پہنچا دیا۔ اس کے ملک پر سو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قنطار چاندی اور ایک قنطار سونا خراج مقرر کیا۔ یوسیاہ کے دوسرے بیٹے یہویقیم کو بادشاہ مقرر کیا جس نے یہ خراج دینا منظور کر لیا تھا۔

یہویقیم نے ان تمام برائیوں کو دوبارہ رواج دے دیا جو یوسیاہ کے دور میں ختم ہو گئی تھیں۔ بتوں کی پرستش کھلم کھلا ہونے لگی۔ اس دور میں یرمیاہ علیہ السلام موجود تھے جو سامنے آئے اور لوگوں کو تنبیہ کرنے لگے۔

یہ اپنے ہوش میں پہلا موقع تھا جب حضرت حزقیل علیہ السلام نے یرمیاہ نبی کا نام سنا اور ان کے پیغام سے آگاہی ہوئی۔ وہ حسبِ معمول ہیکل میں تھے کہ انہوں نے یرمیاہ نبی کو دیکھا اور سنا۔

''خداوند فرماتا ہے جو قوم اور جو سلطنت اس کی یعنی شاہ بابل کی خدمت نہ کرے گی اور اپنی گردن اس کے جوئے تلے نہ جھکائے گی اس قوم کو میں تلوار اور کال اور وبا سے سزا دوں گا یہاں تک کہ میں اپنے ہاتھ سے ان کو نابود کر دوں گا۔''

''یروشلم کے لوگ بابل کی اسیری میں جائیں گے اور یروشلم کھنڈر بن جائے گا۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ نبی یروشلم کی تباہی کی پیش گوئی کیوں کر رہا ہے لیکن جلد ہی اس وقت سمجھ میں آ گئی جب ہیکل میں دیوتاؤں کے بخور جلائے جانے لگے اور بتوں کی پرستش عام ہونے لگی۔ ملک میں دو گروہ بن گئے تھے ایک وہ جو حضرت یرمیاہ علیہ السلام کے ساتھ تھا اور دوسرا ان کی مخالفت پر کمر بستہ۔ دوسرے گروہ کو چونکہ سرپرستی حاصل تھی اس لیے عام غریب لوگ جو ان کے ہم نوا تھے اس وقت کی آمد سے کڑھتے رہتے تھے جو حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی کے مطابق بہت جلد آنے والا تھا۔

یہویقیم کی حکومت کا چوتھا سال تھا کہ کرکمیس کے مقام پر ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں بابل کی فوجوں نے مصر کو شکستِ فاش دے دی۔ یروشلم چونکہ مصر کا باج گزار تھا اور بابل کے خلاف تھا لہٰذا مصر کی شکست کے بعد یہ نزلہ اس پر گرا۔ شاہ بابل بنوکدنضر جو تاریخ میں بخت نصر بھی کہلاتا ہے، جنوبی فلسطین میں اتنی دور تک گھس آیا کہ یروشلم کے خزانے لوٹ کر ہزاروں کو یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے یہ منظر بھی دیکھا ہو گا اور شکر بھیجا ہو گا کہ وہ اس سے بچ گئے لیکن حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی پوری ہوتی ہوئی بھی دیکھی ہو گی اور یہ یقین بھی آ گیا ہو گا کہ یہ سب بداعمالیوں کی وجہ سے ہوا ہے۔

یہویقیم کے خزانے چھن گئے۔ اس کے لوگ یرغمال بنا لیے گئے لیکن اس کا تخت خراج ادا کرنے کی شرط پر باقی رہا۔ تین سال تک شاہ بابل کا خادم بنا رہا اور خراج ادا کرتا رہا لیکن پھر منحرف ہو گیا۔ اس کی اس گستاخی پر بخت نصر نے کئی سال تک فوجوں کو یروشلم کی طرف نہیں بھیجا مگر وہ لوٹ مار کرنے والے کسدی جتھوں کی حوصلہ افزائی کرتا رہا کہ یہوداہ پر حملے کرتے رہیں۔ اسی جنگ بازی کے دوران میں یہویقیم فوت ہو گیا۔

یہویقیم کے بعد اس کا بیٹا یہویاکین تخت پر بیٹھا لیکن اسے صرف تین مہینے بادشاہت کرنا نصیب ہوا، 597 ق م میں بابل کی فوجوں نے شہر کو گھیر لیا۔ اس نے دیکھا کہ مقابلہ کرنا فضول ہے اس لیے اس نے شاہ بابل کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

اس مرتبہ شاہ بابل بخت نصر نے زبانی وعدوں اور خراج کی ادائی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ہیکل کا سونا چاندی اور خزانے لوٹ لیے۔ یہویاکین اور اس کی مادر ملکہ کو گرفتار کر لیا۔

بخت نصر نے ہیکل کے صحن میں دربار آراستہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ شہر میں جتنے کاریگر، دستکار اور نوجوان تندرست افراد ہیں، سب ہیکل میں حاضر ہوں۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اس وقت پچیس سال نوجوان تھے اور ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ سیاست کے ہنگاموں سے دور اپنے گھر میں بند بیٹھے تھے کہ منادی کرنے والے کی آواز سنی۔

''بخت نصر، شاہ بابل نے فرمان جاری کیا ہے کہ جتنے نوجوان اس شہر میں بستے ہیں اور جتنے دستکار ہیں، ہیکل کے صحن میں جمع ہوں۔ اس کے بعد گھروں کی تلاشی لی جائے گی۔ خبردار، کوئی گھر میں چھپے رہنے کی غلطی نہ کرے۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام کو ایک مرتبہ پھر حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پیش گوئی یاد آ گئی۔ تو کیا وقت آ گیا جب ہم اسیر بنا لیے جائیں گے؟ یہ سب بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔

انہوں نے روشن دان سے جھانک کر باہر گلی میں دیکھا۔ بابل کے فوجی ادھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ منادی کرنے والا آگے نکل گیا تھا لیکن اس کی آواز کی گونج ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ پھر انہوں نے دیکھا گھروں کے دروازے دھڑا دھڑ کھلنے لگے تھے۔ کچھ نوجوان باہر نکلے۔ ان کے پیچھے ان کے بوڑھے ماں باپ کی آہیں اور سسکیاں صاف سنائی دے رہی

تھیں۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ بخت نصر ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ قتل کرتا ہے یا چھوڑ دیتا ہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے شکر ادا کیا کہ ان کے والدین زندہ نہیں ہیں ورنہ مجھے رخصت کرتے ہوئے وہ بھی اسی طرح آہ و بکا کر رہے ہوتے۔ اگر میں گھر میں چھپا بیٹھا رہا تو کچھ دیر بعد یہی فوجی جو گلیوں میں گھوم رہے ہیں، گھر میں گھس آئیں گے اور مجھے مجرم سمجھا جائے گا۔ اسی میں عافیت ہے کہ میں بھی دوسروں کی طرح بخت نصر کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے ہیکل پہنچ جاؤں۔ آپ گھر سے نکلے اور ہیکل کے راستے پر ہو لیے۔ آپ کا پڑوسی بھی آپ کے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔

''حزقیل، تم تو بہت سمجھ دار ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو، بخت نصر نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟''

''کیا تمہیں اور ہمیں یاد نہیں کہ یہویقیم کے دورِ حکومت میں بھی اسی قسم کی منادی ہوئی تھی اور کچھ لوگ اسیر بنا کر بابل لے جائے گئے تھے۔ شاید ہماری اسیری بھی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں تنبیہ کر کے چھوڑ دے۔''

''کیوں، ہم نے کیا، کیا ہے جو وہ ہمیں تنبیہ کرے گا۔ جو بادشاہ اچھے منتظم نہیں ہوتے ان کی رعایا کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے کہ وہ غلام بنا لیے جاتے ہیں۔ میرے دوست! ہم بہت جلد اپنے وطن سے بچھڑ جائیں گے۔''

''یہ تو بہت برا ہو گا۔ سنا ہے ہمارا بادشاہ پہلے ہی گرفتار ہو گیا ہے۔''

''اپنی فکر کرو میرے دوست۔''

وہ ہیکل کے دروازے کے قریب پہنچ گئے تھے اس لیے سلسلۂ کلام منقطع کرنا پڑا۔ اندر کا صحن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے پورا شہر یہاں جمع ہو گیا ہے۔ بابل کے فوجی ہاتھوں میں ہنٹر لیے نگرانی پر مامور تھے کہ کوئی بھاگنے نہ پائے۔ دھوپ سروں سے گزرنے لگی تھی یہاں تک کہ بخت نصر مطمئن ہو گیا کہ مطلوبہ لوگ جمع ہو چکے ہیں۔ اس نے یہویاکین کے بیٹے صدقیاہ کو یروشلم میں بچے کھچے لوگوں کا حاکم مقرر کیا اور دس ہزار کے قریب انسانی ریوڑ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکاتا ہوا بابل کی طرف چل دیا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کا بچپن ہیکل کے صحن میں کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ سے انہیں محبت تھی اور آنِ واحد میں یہ ہوا کہ یروشلم بھی چھوٹا اور وہ ہیکل بھی چھوٹ گئی۔ اگرچہ ہیکل تباہ نہ کی گئی مگر سنگ دل حملہ آوروں نے اس کے بہت سے مقدس ظروف کو ناپاک کیا اور انہیں مالِ غنیمت کے طور پر لے گئے تاکہ اپنے بت خانوں میں استعمال کریں۔

دس ہزار اسیروں کا یہ قافلہ چپ چاپ سر جھکائے بابل کی طرف رواں دواں تھا۔ رات آئی اور اس قافلے نے پڑاؤ کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا جیسے قبرستان میں دور تک مشعلیں روشن ہیں۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی فوجیوں کی للکار سنائی دیتی تھی تاکہ اسیروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے نگراں جاگ رہے ہیں اور کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ قریب قریب لیٹے ہوئے یہ اسیر اتنے خوف زدہ تھے کہ آپس میں بھی باتیں نہیں کر رہے تھے یا پھر اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ کسی کو اپنا گھر یاد آ رہا ہو گا کسی کو اپنے والدین۔ اس قید سے کب رہائی ملتی ہے؟ سوچنے کے لیے یہ بھی بڑا موضوع تھا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی پکار یاد آ رہی تھی۔

''شمال کی طرف سے اس ملک کے تمام باشندوں پر آفت آئے گی کیونکہ خداوند فرماتا ہے دیکھ! میں شمال کی سلطنتوں کے تمام خاندانوں کو بلاؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں کے مدخل پر اور اس کی سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے مقابل قائم کرے گا۔''

پھر انہیں یرمیاہ نبی کا یہ خطبہ یاد آیا۔

''تیرے بت کہاں ہیں جن کو تو نے اپنے لیے بنایا۔ اگر وہ مصیبت کے وقت تجھے بچا سکتے ہیں تو اٹھیں، کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے بت ہیں۔''

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی ہر پیش گوئی پوری ہو رہی ہے لیکن افسوس! کسی نے ان کی بات نہیں مانی۔ لوگ تو ان کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ اسی نافرمانی کا نتیجہ ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ گھر سے بے گھر ہوئے پڑے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب خدا انہیں چار سو سال کی غلامی سے نجات دلا کر مصر سے نکال لایا تھا ایک یہ وقت کہ ہم غلام بن کر بابل جا رہے تھے۔ کیا پھر چار سو سال؟ حضرت حزقیل علیہ السلام نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس بے وفائی کی سزا ہے جو بنی اسرائیل نے اپنے خدا سے کی ہے۔ توبہ کے سوا ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''اے، کیا تم یہوداہ میں سے نہیں ہو؟'' ایک فوجی نے آپؑ کو آنکھیں بند کیے بیٹھے دیکھ کر ڈپٹ کر کہا۔

''ہاں میں انہی میں سے ہوں۔ اسی لیے تو تمہارا اسیر ہوں۔'' آپؑ نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

''پھر یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ قافلہ تو چلنے کو تیار ہے۔ کیا تم یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی تمہیں دیکھ نہیں رہا ہے۔ یہیں بیٹھے رہ جاؤ گے اور بعد میں فرار ہو جاؤ گے۔''

''میں وہ نہیں ہوں جو کسی سے بے وفائی کروں۔ مجھے میرے خدا نے تمہارے حوالے کیا ہے۔ میں تم سے بے وفائی کروں گا تو اپنے خدا سے بے وفائی کروں گا۔''

''اچھا اچھا، زیادہ باتیں مت بناؤ۔'' وہ فوجی انہیں لے کر چلا اور انسانوں کی بھیڑ میں شامل کر دیا۔ یہ قافلہ میدانوں، دریاؤں اور گھاٹیوں کو عبور کرتے ہوئے بابل پہنچ گیا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو تل ابیب میں نہر کبار کے کناروں پر بسا دیا گیا۔ ہر ایک نے اپنی ضرورت کے مطابق خطۂ زمین گھیر لیا۔ زمین زرخیز تھی لہٰذا اچھی پاڑی بھی شروع کر دی۔

حالات بظاہر خوشگوار تھے۔ انہیں ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔ اس میں مذہبی آزادی بھی شامل تھی۔ زندگی ایک وقفے کے بعد پھر سے شروع ہو چکی تھی لیکن جب ان لوگوں کو اپنے وطن کی یاد آ جاتی تھی تو ہر خوشی ماتمی لباس پہن لیتی تھی، ہر سکون منتشر ہو جاتا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بخت نصر اپنی طاقت اور سلطنت کی حدود بڑھا رہا ہے اور واپسی ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

ان اسیروں میں اکثر بحث ہوتی تھی کہ وہ اپنے وطن لوٹ بھی سکیں گے یا نہیں۔ جلاوطنوں کے درمیان جھوٹے نبی بھی موجود تھے جو خدا کے نام سے یہ پیغام پہنچایا کرتے تھے کہ بہت جلد وطن واپسی ہوگی۔ دو سال کے اندر اندر بابل کا ''جوا'' ٹوٹ جائے گا۔ اسیروں کی حوصلہ افزائی ضرور ہو رہی تھی لیکن واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں حضرت یرمیاہ علیہ السلام کا خط تل ابیب پہنچا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے اس خط کی نقول کر کے لوگوں میں تقسیم کیں اور پڑھ کر سنایا۔

''رب الافواج اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے، تم گھر بناؤ اور ان میں بسو اور باغ لگاؤ اور ان کا پھل کھاؤ۔ بیویاں کرو تاکہ تم سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوں اور اپنے بیٹوں کے لیے بیویاں لاؤ اور اپنی بیٹیاں شوہروں کو دو۔ اس شہر کی خیر مناؤ جس میں، میں نے تم کو اسیر کر کے بھیجا ہے اور اس کے لیے خدا سے دعا کرو کیونکہ اس کی سلامتی میں تمہاری سلامتی ہوگی۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تم کو یاد فرماؤں گا اور تم کو اس مکان میں واپس لانے سے پہلے اپنے نیک قول کو پورا کروں گا۔''

اس خط نے اسیروں میں ہلچل پیدا کر دی۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے اس خط کو شہرت دی اور اپنے لوگوں کو آمادہ کیا کہ اب وہ اسی کو اپنا وطن سمجھیں اور جھوٹے نبیوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ اب تک جو خدا کی نافرمانی ہو چکی وہی بہت ہے اب مزید نافرمانی اختیار نہ کریں۔

یہاں جو جھوٹے نبی تھے، جب لوگ انہیں ٹھکرانے لگے تو یرمیاہ علیہ السلام کے خلاف ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔ ان میں سے ایک نخلامی سمعیاہ نے یروشلم خط بھیجا جس میں الزام لگایا گیا کہ ہماری اسیری کا ذمے دار یرمیاہ ہے اور مطالبہ کیا کہ اسے قید کر کے کاٹھ میں ڈال دیا جائے (کاٹھ ملزموں کو سزا دینے کے لیے ایک آلہ ہوتا تھا۔ لکڑی سے بنا ہوا ایک ایسا آلہ جس میں ملزم کی گردن اور ہاتھ پاؤں پھنسا دیے جاتے تھے)

صفنیاہ کاہن نے یہ خط پڑھ کر یرمیاہ علیہ السلام کو سنایا۔ تب خداوند کا کلام یرمیاہ پر نازل ہوا۔

''اسیری کے سب لوگوں کو کہلا بھیج کہ خداوند نخلامی سمعیاہ کی بابت یوں فرماتا ہے۔ اس لیے کہ سمعیاہ نے تم سے نبوت کی حالانکہ میں نے اسے نہیں بھیجا اور اس نے تمہیں جھوٹی امید دلائی۔ اس لیے خداوند یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں سمعیاہ کو اور اس کی نسل کو سزا دوں گا۔ اس کا کوئی آدمی نہ ہوگا جو ان لوگوں کے درمیان بسے اور وہ اس نیکی کو جو میں اپنے لوگوں سے کروں گا ہرگز نہ دیکھے گا۔''

حضرت یرمیاہ علیہ السلام کا خط ایک مرتبہ پھر اسیروں تک پہنچا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام نے اس خط کو بہت شہرت دی۔ جھوٹے نبیوں کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہونے لگے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام ابھی نبی نہیں بنائے گئے تھے لیکن کاہن کی حیثیت سے لوگوں کو نصیحت تو کر سکتے تھے۔ یسعیاہ جیسے لوگوں کی طرف سے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار تو کر سکتے تھے اور وہ یہی کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کا ایک گروہ ان کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ انہوں نے ایک مذہبی تنظیم قائم کر لی۔ بت پرستی کے خلاف تقریریں کرنا اور لوگوں کو خدا کی ہدایت کی طرف راغب کرنا آپؑ کا مشغلہ بن گیا تھا۔ آپؑ پر یہ بات پہلے دن ہی سے روشن ہو گئی تھی کہ یہوداہ اس بے سزا کے مستحق ٹھہرے ہیں کہ

انہوں نے خدا کی نافرمانی کی تھی اور اگر آج بھی وہ صدقِ دل سے توبہ کر لیں تو خدا کی رحمتوں کے حق دار بن سکتے ہیں۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جو لوگ ان کے پیچھے یروشلم میں رہ گئے ہیں انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی ہوگی۔ اسی وجہ سے یروشلم بہت جلد تباہ ہو جائے گا۔ وہ لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ خدا انہیں چاہتا تھا کہ ہم تباہی کا ذائقہ چکھیں۔ اسی لیے اس نے ہمیں وہاں سے دور کر دیا۔ اس نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ ہمیں محفوظ کر دیا۔ اب ہم اسی خطۂ ارض کو اپنا مقدر، اپنا وطن سمجھیں۔

لوگ جلد از جلد اپنے گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے لیکن حضرت حزقیل علیہ السلام کی باتیں ان کے زخموں پر مرہم رکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ وہ وطن سے دور ہیں لیکن خدا کی نظروں میں تو سرخرو ہیں۔

صدقیاہ کی حکومت کا چوتھا سال تھا کہ اسیروں نے یہ خوش خبری سنی کہ ان کا بادشاہ صدقیاہ بابل آ رہا ہے اور یقیناً اسی راستے سے گزرے گا۔ ان میں سے بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ یہاں اسیروں کی رہائی کے لیے بات چیت کرنے آ رہا ہے اور اب ان کی رہائی قریب ہے۔ انہوں نے یہ بھی چاہا تھا کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر اس کے رتھ کو گزرتے ہوئے بھی دیکھیں گے۔ ہو سکتا ہے ہمارا جوش و خروش دیکھ کر وہ ہماری رہائی کے لیے زیادہ شدومد کے ساتھ کوشش کرے۔

اس کا رتھ آیا بھی اور گزر بھی گیا۔ ان اسیروں کو اجازت نہیں تھی کہ اس کے راستے میں کھڑے ہوں۔ پھر انہوں نے سنا صدقیاہ یروشلم واپس چلا گیا ہے۔ امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یسعیاہ جیسے جھوٹے نبی یہ امید دلاتے رہے تھے کہ انہیں رہائی مل جائے گی۔ ان کی باتیں غلط ثابت ہوئی تھیں۔ اب ان پر اعتبار کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ لوگوں کا جھکاؤ حضرت حزقیل علیہ السلام کی طرف ہونے لگا۔ ان کا گھر یہکل کے صحن کا منظر پیش کرنے لگا۔ ان اسیروں میں جو نیک لوگ تھے، آپؑ کے مکان پر جمع ہو جاتے اور دن بھر کی خبروں سے آپؑ کو باخبر کرتے۔ ان خبروں کا ذریعہ وہ تاجر یا مسافر ہوتے تھے جو یروشلم سے ہوتے ہوئے اس راستے سے گزرتے تھے۔

صدقیاہ فقط کٹھ پتلی بادشاہ تھا جو بابل کے شہنشاہ کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ اس کی حکومت نہایت کمزور تھی۔ اس کی متزلزل پالیسیاں ملک کو تباہی سے دوچار کر رہی تھیں۔ مذہبی حالت بھی بہت بری تھی۔ عبادت گاہوں میں خدائے واحد کی عبادت کرنے والے بہت کم تھے جبکہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش عام تھی۔ سونے چاندی کے بت اور مورتیاں تیار ہو رہی تھیں۔ ان کی سرپرستی سرکاری سطح پر ہو رہی تھی۔ بادشاہ کے اردگرد جھوٹے اور مفاد پرست مشیر جمع تھے۔ جھوٹے کاہن مذہبی پالیسیوں میں دخیل تھے۔ ہر طرف حرص و طمع کا بازار گرم تھا۔ فوج عیش و عشرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان کے ہتھیار زنگ آلود ہو چکے تھے۔ پچھلے واقعات سے اس قوم نے کچھ نہیں سیکھا تھا۔

صدقیاہ کے نادان مشیر اسے اکساتے رہتے تھے کہ بابل کے خلاف بغاوت کر دے اور مصر کا ساتھ دے۔ جھوٹے نبی اسے اکساتے رہتے تھے۔

حضرت یرمیاہ علیہ السلام مسلسل آگاہ کر رہے تھے کہ بخت نصر کی اطاعت قبول کر لو۔ اس نافرمانی میں ان پر سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ حضرت حزقیل علیہ السلام تک یہ خبریں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتی تھیں۔ وہ اپنے وطن کی طرف سے فکرمند رہنے لگے۔ وہ اپنے وطن کا موازنہ دوسری قوموں سے کرتے انہیں سخت مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ دوسری قومیں متحرک تھیں۔ اپنی فتوحات میں اضافے کر رہی تھیں۔ خوش حالی اور فتح مندی ان کا ساتھ دے رہی تھی جبکہ یروشلم بے جس تھا۔ ان کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ اپنے نبی کی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔

اسیروں کو..... ان کے ملک میں رہتے ہوئے پانچ برس ہو گئے تھے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کی عمر تیسویں برس میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ ابھی نبی مقرر نہیں کیے گئے تھے۔

ایک دن حالات پر غور کرتے ہوئے وہ نہر کبار کے کنارے کنارے بڑی دور تک چلے گئے۔ بستیاں آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ خدا انہیں اور آگے لے جا رہا تھا۔ آج شاید انہیں وہ دکھانا تھا جو دوسروں کو نہیں دکھانا تھا۔ اچانک آسمان کھل گیا۔ شمال کی جانب تیز ہوائیں چلنے لگیں جیسے آندھی آتی ہے۔ یہ آندھی گہری گھٹا اور آگ کا ایک بڑا گولا اپنے ساتھ لے کر آئی۔ آگ میں تپش نہیں، روشنی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے بیچ سے صیقل کیے ہوئے پیتل کی سی صورت جلوہ گر ہوئی اور اس میں چار انسانی شکلیں نمودار ہوئیں۔ ہر انسان کے چار چہرے اور چار پر تھے۔ ان کی ٹانگیں سیدھی تھیں اور ان کے پاؤں بچھڑے کے پاؤں کے تلوے کے مانند تھے اور ان کے چاروں طرف پروں کے نیچے انسان کے ہاتھ تھے اور چاروں کے چہرے اور پر ایک دوسرے سے باہم پیوستہ تھے اور وہ چلتے ہوئے مڑتے نہ تھے بلکہ ہر ایک آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حضرت حزقیل علیہ السلام نے ان جاندار چہروں کی طرف غور سے دیکھا تو معلوم ہوا ہر چہرے کے پاس زمین پر ایک پہیا ہے۔ ان پہیوں کی شکل اور بناوٹ ایسی تھی گویا پہیا، پہیے کے بیچ میں ہے۔ وہ چلتے وقت اپنے چار پہلوؤں پر چلتے تھے اور پیچھے نہیں مڑتے تھے۔ جب وہ جاندار چلتے تھے تو پہیے بھی ان کے ساتھ چلتے تھے اور جب وہ جاندار زمین پر سے اٹھائے جاتے تھے تو پہیے بھی اٹھائے جاتے تھے کیونکہ جاندار کی روح پہیوں میں تھی۔ جب وہ چلتے تھے، یہ چلتے تھے اور جب وہ ٹھہرتے تھے، یہ ٹھہرتے تھے اور جب وہ زمین پر سے اٹھائے جاتے تھے تو پہیے بھی ان کے ساتھ اٹھائے جاتے تھے۔

جانداروں کے سروں کے اوپر کی فضا بلور کے مانند درخشاں تھی اور ان کے سروں کے اوپر پھیلی ہوئی تھی۔ اس فضا کے نیچے ان کے پر ایک دوسرے کی سیدھ میں تھے۔

جب یہ جاندار چلے تو شور کی آواز بلند ہوئی جیسے لشکر کی آواز ہوتی ہے۔ اس فضا سے اوپر جو ان کے سروں کے اوپر تھی، تخت کی صورت تھی اور اس کی صورت نیلم کے پتھر کی سی تھی اور اس تخت نما صورت پر کسی انسان کی سی شبیہہ اس کے اوپر نظر آئی۔

یہ ایسے مناظر نہیں تھے جو کوئی انسان آسانی سے برداشت کرسکتا۔ کچھ خوف تھا کچھ ادب۔ حضرت حزقیل علیہ السلام اوندھے منہ زمین پر گر گئے۔ ان کے کانوں میں کسی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی پھر یہ آواز بلند ہوئی۔ کوئی تھا جو انہیں مخاطب کررہا تھا، انہیں پکار رہا تھا۔

''اے آدم زاد! اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کہ میں تجھ سے باتیں کروں۔''

اس آواز کے بلند ہوتے ہی حضرت حزقیل علیہ السلام کے پیروں میں جان آگئی اور وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''میں حاضر ہوں ان باتوں کو سننے کے لیے جن کی آواز میرے کانوں میں آئے گی۔''

آواز پھر بلند ہوئی۔ ''اے آدم زاد! میں تجھے بنی اسرائیل کے پاس یعنی اس باغی قوم کے پاس جس نے مجھ سے بغاوت کی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ اور ان کے باپ دادا آج کے دن تک میرے گناہ گار ہوتے آئے ہیں۔ وہ بے حیا اور سخت دل فرزند ہیں۔ تو ان سے کہنا کہ خداوند یوں فرماتا ہے۔ تیرا کام ان تک میرا پیغام پہنچانا ہے پھر وہ سنیں یا نہ سنیں۔ انہیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں ایک نبی آیا ہے۔''

''میں تو بہت کمزور ہوں، وہ میری کہاں سننے والے۔''

''تو ہراساں کیوں ہوتا ہے۔ ان کی باتوں سے مت ڈر اور ان کا خوف دل سے نکال دے کیونکہ میں تیرے ساتھ ہوں۔ تو اب بھی ڈرتا ہے تو جو میں تجھے دیتا ہوں، کھالے۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک ہاتھ ان کے سامنے تھا جس میں ایک کتاب کا طومار تھا۔ اس میں نوحہ اور ماتم اور آہ و نالہ مرقوم تھا۔ وہ کچھ دیر اس کتاب کو غور سے دیکھتے رہے۔

''اس طومار کو نگل اور جا کر اسرائیل کے خاندان سے کلام کر۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام نے منہ کھولا اور اس ہاتھ نے وہ طومار ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں کھلا دیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کا منہ شہد کی مٹھاس اور خوشبو سے بھر گیا۔

''اب تو بنی اسرائیل کے پاس جا اور میری باتیں ان سے کہہ۔ یہ لوگ تیری ہی زبان سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ سمجھنے اور سننے کو تیار نہیں ہوں گے کیونکہ وہ سننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ سب بنی اسرائیل سخت پیشانی اور سنگ دل ہیں۔ میں نے بھی ان کے چہروں کے مقابل تیرا چہرہ درشت کیا ہے اور تیری پیشانی ان کی پیشانی کے مقابل سخت کردی ہے۔ اب تو ان سے نہ ڈر۔''

اس کے بعد کسی طاقت نے انہیں اوپر اٹھالیا۔ انہوں نے اپنے پیچھے ایک بڑی کڑک کی آواز سنی۔ جان داروں کے پروں کے ایک دوسرے سے لگنے کی آواز اور ان کے مقابل پہیوں کی آواز اور ایک بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر میں انہوں نے اپنے آپ کو تل ابیب میں اسیروں کے درمیان دیکھا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو سوچنے بیٹھ گئے۔ جو کچھ دیکھ لیا تھا اس کے بعد سراسیمہ ہونا لازمی تھا۔ خوف کی ایک لہری سارے بدن میں تھی۔ ذمے داری کا احساس الگ تھا۔ کاہن تھے، انہیں یہ معلوم تھا کہ انہیں کس بات کی گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ بچھوؤں اور کانٹوں کے درمیان تھے۔ انہیں ان سب کے زہر کو زائل کرنا تھا۔

سات دن تک اپنے گھر میں اس طرح بیٹھے رہے جیسے کوئی چھپ کر بیٹھتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ نبوت پر فائز کرنے کا اشارہ ہو چکا تھا لیکن اب خاموشی تھی۔ انہیں مزید حکم کا انتظار تھا۔ آخر ایک ہفتے بعد خدا کا کلام ان پر نازل ہوا۔

''اے آدم زاد! میں تجھے بنی اسرائیل کا نگہبان مقرر کرتا ہوں۔ پس تو میرا کلام سن اور میری طرف سے انہیں آگاہ کردے۔ تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔ ہاں اگر تو نے میرے پیغام کو نہیں پہنچایا اور کسی نے عمل نہ کیا تو اس کی باز پرس میں تجھ سے کروں گا۔''

پھر اس آواز نے آپ کو حکم دیا کہ اس مقام سے اٹھ کر کسی کھلے میدان میں پہنچ جائیں۔ آپ نے عمل کیا اور مکان سے نکل کر ایک کھلے میدان میں چلے آئے۔ یہاں انہوں نے خدا کی جلالت کا وہی منظر دیکھا جو نہر کیبار کے کنارے دیکھ چکے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر منہ کے بل زمین پر گر پڑے۔

''اے آدم زاد! اٹھ اور اپنے گھر جا۔ اپنی زبان تالو سے چپکا لے۔ کسی سے کچھ نہ کہہ۔ ہاں جب میں تجھ سے ہم کلام ہوں تو اپنی زبان کھولنا۔''

اس کے بعد کچھ باتیں ان کے کان میں کہی گئیں جن پر انہیں عمل کرنا تھا۔ ان باتوں پر عمل کرا کے انہیں ایک آزمائش سے گزارنا تھا تاکہ وہ اپنے آپ کو نبوت کا اہل ثابت کرسکیں۔ اس کے بعد آپ کا ہر عمل حکم الٰہی کے مطابق تھا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق مٹی کا ایک ڈھیر کھڑا کیا پھر وحی الٰہی کے الفاظ اپنے دل میں دہرائے تاکہ اس کے مطابق عمل کریں۔ وحی میں کہا گیا تھا۔

''اے آدم زاد! تو ایک کھپرا لے اور اپنے سامنے رکھ کر اس پر ایک شہر ہاں یروشلم کی تصویر کھینچ اور اس کا محاصرہ کر اور اس کے مقابل برج بنا اور اس کے سامنے دمدمہ باندھ اور اس کے گرد خیمے کھڑے کر اور اس کے چاروں طرف منجنیقیں لگا۔ پھر تو لوہے کا ایک توا لے اور اپنے شہر کے درمیان اسے نصب کر کہ وہ لوہے کی دیوار ٹھہرے اور تو اپنا منہ اس کے مقابل کر اور وہ محاصرے کی حالت میں ہو اور تو اس کا محاصرہ کرنے والا ہوگا۔ یہ بنی اسرائیل کے لیے نشانی ہے۔

حضرت حزقیل علیہ السلام کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ ان کی زندگی یروشلم میں گزری تھی۔ وہ اس کے ایک ایک کوچے سے واقف تھے۔ انہوں نے مٹی پر دیکھی ہی تصویر کشی کردی جیسا کہ حکم ہوا تھا۔ ان کا یہ عمل قوم کے لیے دلچسپی کا سبب بن گیا۔ انہوں نے پانچ سال سے یروشلم کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا اور اب اس کی تصویر دیکھ رہے تھے۔ پہلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ تصویر انہوں نے کیوں بنائی ہے لیکن پھر سب کچھ سمجھ میں آگیا۔ یہ شہر محاصرے کی حالت میں کیوں ہے۔ کیا یروشلم پر تباہی آنے والی ہے؟ کیا فوجیں اس کا محاصرہ کرلیں گی؟ اس سے زیادہ تعجب انہیں یہ دیکھ کر ہو رہا تھا کہ حضرت حزقیل علیہ السلام گونگوں کی طرح خاموش بیٹھے ہیں۔ کوئی بات پوچھی جائے تو ان کے پاس اس کا جواب ہی نہیں۔ جلاوطن اسرائیلی جوق در جوق آرہے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کررہے تھے۔

''یہ نقشہ تو یروشلم ہی کا ہے لیکن یہ تو حالتِ جنگ میں ہے۔ ہم اسے اس حالت میں تو چھوڑ کر نہیں آئے تھے۔''

''یہ تو مستقبل کا یروشلم بنایا گیا ہے۔''

''انہیں کیا معلوم مستقبل کا یروشلم کیا ہوگا؟''

''شاید انہیں کہیں سے معلوم ہوگیا ہو۔''

''ہمیں نہیں معلوم ہوا تو انہیں کیسے معلوم ہوگیا؟''

''یہ ہمیں خوفزدہ کرکے اپنی کوئی بات منوانا چاہتے ہیں۔''

''اور یہ بولتے کیوں نہیں؟''

''اس لیے کہ کوئی جواب دینا نہ پڑے۔ بہرحال نقشہ اچھا بنایا ہے۔''

حضرت حزقیل علیہ السلام ان کی باتیں سن رہے تھے۔ انہیں خدا کا کہا یاد آرہا تھا۔ ''بنی اسرائیل تیری بات نہیں سنیں گے کیونکہ وہ میری سننا نہیں چاہتے۔''

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس نقشے کو دیکھ کر افسوس کررہے تھے کہ ان کے پیارے یروشلم کی یہ حالت ہونے کو ہے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی کہ حضرت حزقیل علیہ السلام گونگے کیسے ہوگئے۔ وہ بنی اسرائیل سے ناراض ہیں یا انہیں کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہے؟

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ لوگ آتے رہے۔ کچھ لوگوں کو نصیحت ہوئی کچھ نے مذاق اڑایا۔ آپ کسی کی بات کا جواب نہیں دے سکتے تھے کیونکہ یہی حکم تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک اور حکم جاری ہوا۔

''اب تو اپنی بائیں کروٹ پر لیٹ رہ اور بنی اسرائیل کی بدکرداری اس پر رکھ دے۔ جتنے دنوں تک تو لیٹا رہے گا، ان کی بدکرداری برداشت کرے گا۔''

حکم الٰہی کے مطابق 39 دن تک حزقیل علیہ اسلام اپنے بائیں پہلو پر لیٹے رہے۔ یہ اسرائیل یعنی شمالی سلطنت کا نشان تھا۔ پھر چالیس دن تک دائیں پہلو پر لیٹے رہے۔ یہ نشان تھا یہوداہ یعنی جنوبی سلطنت پر آنے والے غضب کا۔ اس عرصے میں حضرت حزقیل علیہ السلام کی رسد مقرر تھی۔ یہ اسی قدر تھی جتنی عام محاصرے کے دوران میں معمول کے مطابق ہوتی ہے۔ انھیں ہدایت تھی کہ پکانے کے لیے انسانی نجاست کو ایندھن کے طور پر استعمال کرنا۔ اس سے اسرائیل کی ناپاکی ظاہر ہوتی ہے۔

اسیروں کے لیے آپ کا یہ عمل بھی تماشے سے کم نہیں تھا۔ لوگ یکے بعد دیگرے ان کے گھر پہنچتے تھے تاکہ اپنی آنکھوں سے سارا ماجرا دیکھ لیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حضرت حزقیل علیہ السلام ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ نہر کیبار کے کنارے ابھرنے والی آواز نہیں سن سکتے تھے جبکہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے یہ آواز سنی تھی اس لیے ان کا ایمان پختہ تھا۔

''اے آدم زاد!'' آواز ابھری۔ ''تو ایک تیز تلوار لے اور اپنا سر منڈا اور ترازو لے اور بالوں کو تول کر ان کے حصے بنا۔ ان کا ایک حصہ لے کر آگ میں جلا۔ دوسرا حصہ لے کر تلوار سے ادھر ادھر بکھیر دے اور تیسرا حصہ ہوا میں اڑا دے اور میں تلوار لے کر ان کا پیچھا کروں گا اور ان میں سے تھوڑے بال گن کر لے اور ان کو اپنے دامن میں باندھ پھر ان میں سے کچھ نکال کر آگ میں ڈال اور جلا دے۔ اس میں سے ایک آگ نکلے گی جو اسرائیل کے تمام گھرانوں میں پھیل جائے گی۔ خدا ان پر ہرگز رحم نہ کرے گا سزا کا وقت آ گیا ہے۔ انہوں نے خدا کے تقدس کو مکروہ اور نفرتی کاموں سے ناپاک کیا ہے۔

اسیروں کی ساری آبادیوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت حزقیل علیہ السلام نے اپنا سر مونڈ لیا ہے۔ نہ جانے ان پر کیا آفت آنے والی ہے جو انہوں نے اپنا یہ حال کیا ہے؟ ساری آبادیوں کے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ اس طرح حضرت حزقیل علیہ السلام نے عملاً سب کو بتا دیا کہ خدا اپنی عدالت میں یروشلم سے کیا کرنے والا ہے۔

آپ نے حکم الٰہی سے انہیں باخبر کیا۔

''خداوند فرماتا ہے کہ مجھے اپنی حیات کی قسم چونکہ تو نے اپنی تمام مکروہات سے اور اپنے نفرتی کاموں سے میرے تقدس کو ناپاک کیا ہے اس لیے میں بھی تجھے گھٹاؤں گا۔ میری آنکھیں رعایت نہ کریں گی۔ میں ہرگز رحم نہ کروں گا۔ تیرا ایک حصہ مر جائے گا اور کال سے تیرے اندر ہلاک ہو جائے گا اور دوسرا حصہ تیرے چاروں طرف تلوار سے مر جائے گا۔ میں تجھ کو ان قوموں کے درمیان جو تیرے آس پاس ہیں اور ان سب کی نگاہوں میں جو ادھر سے گزریں گے ویران اور باعث ملامت بناؤں گا اور میں تم کو قحط زدہ کروں گا۔''

یروشلم کے متعلق یہ بھیانک تصویر کھینچ کر آپ نے اپنے لوگوں کی طرف دیکھا لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ کسی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں، یہ سب تو یروشلم میں رہنے والوں کے لیے ہوگا ہم تو یروشلم سے باہر ہیں۔

حضرت حزقیل علیہ اسلام خود یہ سوچتے تھے کہ وہ یروشلم جا نہیں سکتے ورنہ وہاں جا کر یہوداہ کو خدا کا پیغام سناتے شاید ان پر کچھ اثر ہوتا۔

خدا کا کلام پھر نازل ہوا۔ ''اے آدم زاد! اسرائیل کے پہاڑوں کی طرف منہ کر کے ان کے خلاف نبوت کر اور یوں کہہ کہ اے اسرائیل کے پہاڑو! خداوند کا کلام سنو! خداوند خدا پہاڑوں اور ٹیلوں کو اور نہروں اور وادیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو میں ہاں میں ہی تم پر تلوار چلاؤں گا اور تمہارے اونچے مقاموں کو غارت کروں گا اور تمہاری قربان گاہیں اجڑ جائیں گی اور تمہاری سورج کی مورتیں توڑ ڈالی جائیں گی اور میں تمہارے مقتولوں کو تمہارے بتوں کے آگے ڈال دوں گا۔ تمہاری بود و باش کے تمام علاقوں کے شہر ویران ہوں گے اور اونچے مقام اجاڑے جائیں گے تاکہ تمہاری قربان گاہیں خراب اور ویران ہوں اور تمہارے بت توڑے جائیں اور باقی نہ رہیں لیکن میں ایک بقیہ چھوڑ دوں گا یعنی وہ چند لوگ جو قوموں کے درمیان تلوار سے بچ نکلیں گے جب تم غیر ممالک میں پراگندہ ہو جاؤ گے۔

(جاری ہے)

ماخذات

توریت۔ عابد عقیق کے تاریخی سفر۔ قصص الانبیاء۔ قصص القرآن۔ انبیائے قرآن

کبھی محبت میں انسان خود کو سنوارتا ہے تو کبھی اسی شوق کے ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ عشق ایک ایسا احساس ہے جس میں عام سی شکل صورت بھی بڑی خاص لگتی ہے... نہایت دلکش... لیکن یہاں معاملہ ذرا الٹا ثابت ہو رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ صورتِ حال بدلتی جا رہی تھی... اور پھر اس کی صورت اس قدر بدل گئی کہ حالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ نہ صرف یہ بلکہ جانے والوں کو بھی بالآخر ایک روز پلٹنا ہی پڑا۔

غیر متوازن حالات میں توازن برقرار رکھنے والوں کا قصہ

ثمر عباس

باوزن

مائیکل جونز کی آنکھ کھلی تو صبح ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے بیڈ روم کی کھڑکی سے آتی سورج کی کرنوں کا مطلب تھا کہ سورج خاصا بلند ہو چکا ہے۔ مائیکل کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے کیونکہ گزشتہ رات ڈنر کی جگہ اس نے وہسکی کو ترجیح دی تھی۔ مائیکل نے بہ مشکل اٹھ کر ایک چولہے پر چھ عدد انڈے ابلنے کے لیے رکھے اور دوسرے پر کافی کا پانی رکھا۔ پھر کپڑے اتار کر اس وقت تک شاور کے نیچے کھڑا رہا جب تک اس کے حواس پر چھائے، خمار کے بادل نہ چھٹ گئے۔ وہ کچن میں آیا تو انڈے ابل چکے تھے اور کافی کا پانی خشک ہو گیا تھا اس نے کافی کا پانی دوبارہ رکھا اور سینڈوچ تیار کرنے لگا۔

مائیکل جونز اداکار تھا اور ہالی وڈ کی نصف درجن کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قریب بڑے بجٹ کی فلموں میں کام کر چکا تھا۔ نام کی طرح اس کے چہرے کی ساخت بھی ہیرو والی تھی اور اس نے آخری دو بڑی فلموں میں سائڈ ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ اس وقت لگ رہا تھا کہ جلد وہ سیڑھی چڑھ کر ہیرو کی پوزیشن پر آ جائے گا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ شاید ایسا کبھی نہ ہو سکے گا۔ اس کی واحد وجہ مائیکل کا حد سے بڑھ جانے والا وزن تھا۔ صرف تین مہینے میں اس کا وزن ایک سو ستر پونڈز سے بڑھ کر تین سو پونڈز ہو گیا تھا۔ دراصل ہوا یہ کہ ہالی وڈ کے ایک نامور ڈائریکٹر، مائیکل شان نے مائیکل کو اپنی آنے والی فلم میں ایک اہم کردار کے لیے چن لیا۔ شان کے بارے میں تمام فلمی نقادوں کی مشترکہ رائے تھی کہ اس کی تمام فلمیں خاص اور ہر فلم کا ہر کردار خاص ہوتا ہے۔ اس لیے جب وہ کسی اداکار کو اپنی فلم میں کسی کردار کے لیے چنتا تو وہ یہ نہیں دیکھتا تھا کہ کردار کیا ہے بلکہ وہ تو اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا تھا کہ اسے شان کی فلم میں کام کرنے کا موقع مل رہا ہے۔

ظاہر ہے مائیکل بھی خوشی سے اچھل پڑا تھا لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس کردار کے لیے اسے کیا کرنا ہے تو اس کا جوش و خروش کچھ دھیما پڑ گیا تھا۔ شان نے اسے بتایا کہ ”تمہیں اس کردار کے لیے اپنا وزن کم سے کم تین سو پونڈز کرنا ہوگا۔“

”وزن بڑھانا ہوگا۔“ مائیکل نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”کیا اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا ہے؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ شان نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”مجھے کردار کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ تمہارے اندر موجود ہیں لیکن تمہارا وزن تین سو پونڈز نہیں ہے۔ ہالی وڈ میں تین سو پونڈز وزن رکھنے والے کئی اداکار ہیں لیکن ان میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں جو اس کردار کے لیے لازمی ہونی چاہئیں۔ میں تین سو پونڈز رکھنے والے اداکاروں میں مطلوبہ صلاحیتیں تو پیدا نہیں کر سکتا ہوں لیکن تم اپنا وزن تین سو پونڈز تک بڑھا سکتے ہو اور اس کے لیے تمہارے پاس تین مہینے کا وقت ہے۔“

”کیا یہ مناسب ہوگا؟“ مائیکل نے ہچکچا کر کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں پچھلی دو فلموں میں سائڈ ہیرو آ چکا ہوں اور خاصا پسند کیا گیا ہوں۔ ابھی میرے پاس ایک فلم میں ہیرو کی آفر بھی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ شان نے کہا۔ ”جو تمہیں ہیرو کی آفر کر رہا ہے وہ اوسط درجے کا فلم میکر ہے اور اس کی فلم بھی اوسط درجے کی ہے۔ جہاں تک میری فلم کا تعلق ہے تو تم میرے نام پر مت جاؤ میں تمہیں فلم اور تمہارے کردار کا اسکرپٹ دے دیتا ہوں تم خود فیصلہ کر لو۔“

شان نے اسے فلم اور اس کے کردار کا اسکرپٹ تھما دیا اور ایک گھنٹے میں مائیکل قائل ہو گیا کہ یہ فلم اور یہ کردار اس کے لیے زیادہ اہم ہے۔ مگر مسئلہ وہی وزن بڑھانے کا تھا اور اس میں سب سے بڑی رکاوٹ لیزا تھی۔ لیزا اس کی بیوی تھی۔ دونوں نے حال ہی میں طوفانی قسم کے عشق کے بعد شادی کی تھی۔ مائیکل اور لیزا کے عشق کی شدت بعد میں بھی برقرار رہی اور اس کی ایک ہی وجہ تھی کہ لیزا کا تعلق کسی طرح بھی ہالی وڈ سے نہیں تھا۔ وہ کیلیفورنیا کی ایک کسان فیملی سے تعلق رکھتی تھی جس کی زمین پر امریکا کی بہترین نارنگیاں اور سیب اگتے تھے۔ مائیکل کی لیزا سے ملاقات، اس کی پہلی بڑی فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ہوئی تھی۔ فلم کی شوٹنگ نہ صرف لیزا کے علاقے میں بلکہ اس کے فیملی باغات میں ہوئی تھی۔

فلم میں اگرچہ مائیکل کو دھڑا دھڑ گولیاں چلانا نہیں لیکن یہ سب نقلی گولیاں تھیں۔ حقیقت میں اس پر کیوپڈ کا تیر چل گیا اور وہ حسین لیزا کی سنہری زلفوں کا اسیر ہو گیا۔ وہ دو ہفتے وہاں رہا اور اس کی ہر شام لیزا کے ساتھ گزرتی اگرچہ روایتی مغربی انداز میں نہیں گزرتی تھی کیونکہ عقل مند لیزا نے اسے خود کو ہاتھ لگانے نہیں دیا تھا۔

طے ہوا کہ جیسے ہی اس کی فلم کی شوٹنگ ختم ہوگی۔ وہ شادی کر لیں گے۔ ایک مہینے بعد مائیکل اور لیزا میاں بیوی بن چکے تھے۔ شادی لیزا کے گاؤں میں ہوئی تھی کیونکہ آدھا گاؤں اس کے رشتے داروں پر مبنی تھا اس لیے چرچ میں آدھا گاؤں موجود تھا۔ اتنا بڑا سسرال دیکھ کر مائیکل پریشان ہوا تھا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا سسرال فلاس اینجلس سے کوئی چار سو میل دور تھا۔ وہ شادی کر کے لیزا کو لاس اینجلس لے آیا کیونکہ اسے دوسری فلم میں کام کرنا تھا اس لیے ہنی مون اس فلم کے بعد تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دو مہینے بعد اس فلم کی شوٹنگ مکمل ہوئی تو وہ ہنی مون منانے ہوائی کی طرف روانہ ہو گئے۔ مائیکل کو ان دو فلموں سے اچھا خاصا معاوضہ ملا تھا اس لیے اس نے ہنی مون میں دل کھول کر خرچ کیا اور لیزا کی تمام فرمائشیں پوری کیں۔ واپسی پر اس کا ہاتھ تنگ ہو گیا تھا اور اسے فوری طور پر کسی فلم کی ضرورت تھی جس کا معاوضہ بھی اسے جلد مل جائے۔

شان کی فلم میں اسے کام مل رہا تھا لیکن اس کی شرط بڑی پیچیدہ تھی۔ لیزا کو موٹے آدمیوں سے نفرت تھی۔ اس نے اپنے اسکول کے زمانے کے ہوائے فرینڈ کو بھی صرف اسی

وجہ سے مسترد کر دیا تھا۔ اس کا وزن ذرا سا بڑھ گیا تھا اور اس کا خوب صورت جسم بے ڈول ہو گیا تھا۔ خود مائیکل کا بھی ہیرو جیسا جسم تھا اور لیزا اسی وجہ سے اس کی طرف آئی تھی۔ اس نے مائیکل کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ اسے اپنا وزن ایک حد میں رکھنا ہوگا اور اگر وہ موٹا ہوا تو وہ اسے برداشت نہیں کرے گی۔ مائیکل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لیزا سے کیسے بات کرے؟ وہ اس کردار کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنا وزن بڑھا کر تین سو پونڈز تک لے آئے۔ شان نے واضح کر دیا تھا کہ یہ لازمی شرط ہے اور اس کے بغیر اسے کام ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تھوڑا وزن بڑھانے کی بات ہوتی تو مائیکل کے خیال میں یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تین سو پونڈز کا مطلب تھا وہ مکمل طور پر بے ڈول ہو جائے۔ اسے معلوم تھا لیزا کسی صورت اس چیز کو برداشت نہیں کرے گی۔

آخر ہمت کر کے مائیکل نے لیزا سے بات کی۔ جب لیزا کو پتا چلا کہ شان نے مائیکل کو اپنی فلم کے ایک کردار کے لیے منتخب کیا ہے تو وہ خوش ہو گئی لیکن جب یہ پتا چلا کہ اس کردار کے لیے شان کی شرط کیا ہے تو اس کی خوشی غصے میں بدل گئی۔ ”شان کا دماغ خراب ہے بھلا اس کردار کا وزن سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“

”تعلق تو ہے ڈیئر۔“ مائیکل نے شیریں لہجے میں کہا۔ ”میں نے فلم اور اس کردار کا مکمل اسکرپٹ پڑھا ہے اور شان درست کہہ رہا ہے کہ کردار ادا کرنے والے کا وزن تین سو پونڈز ہونا لازمی ہے، یہ ایک بہت موٹے آدمی کا کردار ہے۔“

”تب اس سے کہو کوئی سوٹا آدمی تلاش کر لے۔ ہالی وڈ میں تین سو پونڈز والے بے شمار اداکار ہوں گے۔“

”وہ تو ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی صلاحیتوں کا مالک نہیں ہے جو اس کردار کو ادا کر سکے۔ لیزا تم سوچو شان کسی کو خاص طور سے اپنی فلم کے لیے منتخب کرے یہ کتنا بڑا اعزاز ہے۔“

”ہوگا۔“ لیزا بے پروائی سے بولی۔ ”تم انکار کر دو وہ کسی اور کو اس کردار کے لیے منتخب کر لے۔“

مائیکل کے ہوش اڑ گئے اس کا خیال تھا کہ لیزا اس بات پر کم سے کم غور تو کرے گی۔ لیکن اس نے تو بالکل ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ مائیکل نے گڑگڑا کر کہا۔ ”پلیز جان! تم سوچو تو سہی، ایسا چانس ہر ایک کو نہیں ملتا۔ اگر میں نے اس فلم میں کام کر لیا تو میرا کیریئر بن جائے گا۔“

”کیریئر بن جائے گا۔“ لیزا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یا برباد ہو جائے گا۔ تین سو پونڈز وزنی اداکار کو ہر فلم میں کام نہیں مل سکتا پھر تمہیں انتظار کرنا پڑے گا کہ کب کسی فلم میں تین سو پونڈز وزنی آدمی کا کردار آتا ہے؟“

”نہیں... نہیں یہ عارضی ہوگا جیسے ہی میں شان کی فلم میں کام ختم کروں گا اپنا وزن واپس ایک سو ستر پونڈز پر لے آؤں گا۔“

لیزا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مائیک میں نے دبلے آدمیوں کو موٹے تو ہوتے دیکھا ہے لیکن بہت کم موٹے آدمیوں کو دوبارہ دبلا ہوتے دیکھا ہے۔ موٹاپا ایک بیماری ہے ایک بار یہ آدمی کو لگ جائے تو پھر ساری عمر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔“

”میں ہو سکتا ہوں۔“ مائیکل نے دعویٰ کیا۔

لیزا نے غور سے اسے دیکھا۔ ”تو کیا تم شان کی فلم میں کام کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟“

”تقریباً ڈیئر، بس تمہاری طرف سے او کے کا منتظر ہوں۔ دیکھو میرے پاس جو جمع پونجی تھی وہ شادی اور ہنی مون میں خرچ ہو چکی ہے اور اب میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھے کسی اچھی فلم کی اشد ضرورت ہے جس میں کام کرنے کا معاوضہ بھی اچھا ملے۔ شان کی یہ فلم میری دونوں ضرورتیں پورا کر رہی ہے۔ وہ مجھے بہت اچھا معاوضہ آفر کر رہا ہے۔“

یہ سن کر لیزا بھی سوچ میں پڑ گئی۔ اسے معلوم تھا مائیکل بیجا کر رکھنے والوں میں سے نہیں ہے یقیناً اب اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اگر مائیکل موٹا ہو جائے، یہ تصور اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ دوسری طرف روزی کا معاملہ بھی تھا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔ ”تین مہینے تمہیں وزن بڑھانے میں لگیں گے اور اس کے بعد تم واپس اپنے وزن پر کب آؤ گے؟“

”میرا خیال ہے تین مہینے کے اندر میں واپس اپنی فٹنس حاصل کر لوں گا۔“ مائیکل نے تخمینہ سے کہا۔

اگرچہ لیزا کے خیال میں تین مہینے میں ایک سو تیس پونڈز وزن کم کرنا ممکن نہیں تھا اور مائیکل کو اس میں زیادہ ہی وقت لگتا۔ مگر وہ مائیکل کی اس یقین دہانی پر تیار ہو گئی کہ وہ... بہرصورت اپنا وزن کم کر لے گا۔ لیزا کی طرف سے اجازت ملتے ہی مائیکل نے جسمی بنیادوں پر اپنا وزن بڑھانے کی کوشش شروع کر دی۔ لیزا نے اس سے کہا کہ اب کمپیوٹرز گرافکس کی مدد سے جس اداکار کو جیسے چاہے دکھایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میں میں اس کا تجربہ بھی کیا گیا تھا جو کامیاب رہا۔ اس میں ایک پونے چھ فٹ کے سیاہ فام اداکار کو صرف ڈھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فٹ کا بونا دکھایا گیا تھا۔ مائیکل نے لیزا سے کہا۔
"میں نے شان کو یہ تجویز پیش کی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی فلموں میں اس قسم کی مصنوعی ترکیبیں استعمال کرنے کے خلاف ہے۔"
"چاہے اس کے لیے کسی اداکار کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر رکھ دے۔" لیزا نے جل کر کہا۔
"ڈیئر اسی سے تو فلم میں حقیقی پن آتا ہے اور فلم بین اسی لیے تو شان کی فلموں پر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ اس کی سابق فلم کو بنے ہوئے دو سال ہونے کو آئے ہیں لیکن ابھی تک سینماؤں میں اس کے ہاؤس فل جا رہے ہیں۔"
لیزا بادل ناخواستہ مانی تھی اور وہ مائیکل کو کئی بار خبردار کر چکی تھی کہ فلم کے فوراً بعد اس نے اپنے وزن میں کمی شروع نہیں کی تو وہ اپنا سامان باندھ کر اپنے ماں باپ کے گھر چلی جائے گی۔ مائیکل کسی صورت لیزا سے دور نہیں رہ سکتا تھا اس لیے اس نے اس وقت صدقِ دل سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے آخری شوٹ کے فوراً بعد ہنگامی بنیادوں پر وزن کم کرنا شروع کر دے گا جیسا کہ اس وقت وہ ہنگامی بنیادوں پر وزن بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وزن بڑھانے کے لیے مائیکل نے سب سے پہلے وہ تمام ورزشیں ترک کر دیں جو وہ فٹ رہنے کے لیے کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے وہ تمام چیزیں کھانا شروع کر دیں جو انسان کا وزن بہت تیزی سے بڑھاتی ہیں۔ اس نے ڈاکٹر سے مشورہ بھی کیا تھا اور اس نے مائیکل کو کچھ تجاویز دی تھیں جن پر عمل کرنے سے اسے بھوک لگتی۔ مائیکل ایک وزن کرنے والی مشین بھی لے آیا تھا اور روز اس پر وزن کرتا تھا۔
مائیکل کا وزن حیرت انگیز طور پر بڑھنے لگا اور یہ رفتار روزانہ تقریباً ایک پاؤنڈ تھی۔ ایک مہینے میں وہ اپنی جسمانی ساخت کھو چکا تھا۔ اس کا پیٹ نکل آیا تھا اور سینہ پیٹ کے مقابلے میں کم ہو گیا تھا۔ اس کی کلائیاں موٹی ہو کر تقریباً بازوؤں کے برابر آ گئی تھیں۔ اس کے جسم کے پٹھے چربی میں غائب ہونے لگے تھے۔ دو مہینے میں اس کا وزن بڑھ کر دو سو چالیس پونڈز ہو گیا تھا۔ شان اس کی کارکردگی سے مطمئن تھا اور اسے امید تھی کہ شوٹنگ کے آغاز تک مائیکل اپنا ٹارگٹ حاصل کر لے گا۔
دوسری طرف، لیزا کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ مائیکل کے موٹاپے کو بہت مشکل سے برداشت کر رہی ہے۔ اس نے مائیکل کو اپنے قریب آنے سے تو پہلے ہی روک دیا تھا۔ اب وہ کوشش کرتی کہ اس سے دور رہے اور مائیکل پر اس کی نظر کم سے کم پڑے۔ مائیکل اس کی کیفیت سوس کر رہا تھا اس لیے اس کی بھی یہی کوشش ہوتی تھی کہ لیزا کے سامنے کم سے کم رہے۔ ان کے تعلقات میں سرد مہری سی آ گئی تھی۔
دو مہینے بعد لیزا نے اس سے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں بہت دنوں سے ماما اور پاپا کے پاس نہیں گئی ہوں، وہاں سے ہو آتی ہوں۔"
مائیکل لیزا کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی خاطر وہ مان گیا اور لیزا اپنا بڑا سا سوٹ کیس تیار کر کے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے مائیکل کو واپسی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ مائیکل کا خیال تھا کہ وہ جلد واپس آ جائے گی۔ مگر ایک ہفتے بعد لیزا نے اسے کال کر کے کہا کہ وہ اب اس فلم کی شوٹنگ ختم ہونے کے بعد آئے گی۔ یہ سن کر مائیکل پریشان ہو گیا تھا۔ "ڈیئر ابھی تو شوٹنگ شروع بھی نہیں ہوئی ہے اور تم جانتی ہو، شان اپنی فلم بہت سکون اور آرام سے بناتا ہے۔"
"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔" لیزا نے سرد لہجے میں کہا۔ "جب شوٹنگ ختم ہو جائے اور تم اپنا وزن کم کرنا شروع کر دو تو مجھے اطلاع کر دینا میں آ جاؤں گی۔"
گویا لیزا نے اپنی واپسی اس کے کم وزن سے مشروط کر دی تھی۔ اس وقت مائیکل کے سامنے ایک مشن تھا۔ اسے ہر صورت فلم میں اپنا کردار اتنا اچھا ادا کرنا تھا کہ اس کے وزن میں اضافے کا ازالہ ہو جائے۔ وہ لیزا سے سچ مچ محبت کرتا تھا اور اس سے جدائی اسے شاق گزر رہی تھی لیکن یہ اس کی پیشہ ورانہ مجبوری تھی۔ اس نے اپنا ذہن شوٹنگ کی طرف کر لیا اور پوری طرح دل لگا کر کام کرنے لگا۔ شان اس کے کام سے خوش تھا۔ ابتدائی چند شاٹس کے بعد اس نے مائیکل کے کردار میں غیر محسوس انداز میں اضافہ کرنا شروع کر دیا اور اسے نمایاں بھی کر دیا۔ اب وہ فلم کی اے کیٹگری میں شامل ہو گیا تھا، یعنی فلم میں وہ جہاں کہیں نمودار ہوتا، کیمرا اسے خاص طور سے شوٹ کرتا۔ اس سے بہت فرق پڑا تھا۔ فلم کے ہیرو نے شان سے اس بات پر اعتراض کیا کہ اسے اب اتنی اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔ شان نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس وقت مائیکل زیادہ اچھا کام کر رہا ہے اگر تم زیادہ اچھا کام کرو تو تمہیں بھی زیادہ اہمیت مل جائے گی۔ کردار کے لحاظ سے وہ تم سے کم نہیں ہے۔"
شان کا یہی طریقہ تھا وہ اپنے اداکاروں کو اچھے سے اچھا کام کرنے پر اکساتا تھا۔ ابتدائی شوٹنگ کے بعد وقفہ آیا تو مائیکل نے سوچا کہ وہ جا کر لیزا کو واپس لانے کی ایک

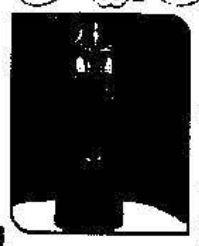

کوشش کرے۔ وہ روانہ ہوا اور لیزا کے ماں باپ کے گھر پہنچ گیا کیونکہ اس کے موٹاپے والے کردار کی میڈیا پبلسٹی نہیں کی گئی تھی اس لیے لوگ بے خبر تھے کہ اس کا وزن کتنا بڑھ گیا ہے۔ لیزا نے بھی اپنے ماں باپ کو نہیں بتایا تھا اس لیے وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ خود لیزا دنگ رہ گئی تھی کیونکہ جب وہ آئی تھی تب بھی مائیکل کا وزن اتنا نہیں بڑھا تھا۔ اب تو وہ ایک چلتا پھرتا ڈرم لگ رہا تھا۔ اس کے گال لٹک گئے تھے۔ اس کی ساس چلائی۔

"مائیک، میرے خدا! یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟"

مائیکل کھسیا گیا۔ "مام میں ایک فلم میں کام کر رہا ہوں اس کے کردار کو اتنا ہی موٹا ہونا چاہیے۔"

"لیکن برخوردار تم نے سوچا کہ لیزا کو موٹاپے سے کتنی چڑ ہے یہ تو ہمیں بھی اوور ویٹ ہونے نہیں دیتی تھی تم تو اس کے شوہر ہو؟"

"جی پاپا، مجھے معلوم ہے لیکن یہ میرے کیریئر کا سوال ہے۔ مائیکل شان کی فلم میں ہر ایک کو کام نہیں ملتا ہے اور اب تو مجھے فلم کے اے گریڈ اداکاروں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے اس فلم کی کامیابی کے بعد میں ہالی وڈ کے صف اول کے اداکاروں میں شامل ہو جاؤں گا۔"

"تو کیا تم ہر موی میں اتنے ہی موٹے نظر آؤ گے؟"

"نہیں یہ تو صرف اس فلم کی حد تک ہے میں جلد اپنا وزن دوبارہ گھٹا لوں گا۔" مائیکل نے اپنے ساس سسر اور ان سے زیادہ لیزا کو یقین دلایا۔ لیزا نے اس کی بات مان لی لیکن اس کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا۔

"میں کہہ چکی ہوں جب تم وزن کم کرنا شروع کر دو گے تو میں واپس آ جاؤں گی۔"

"اچھا۔" مائیکل نے مردہ لہجے میں کہا۔ "ابھی تو شوٹنگ کا پہلا اسپیل ہوا ہے۔"

"باقی فلم بھی کبھی نہ کبھی نمٹ جائے گی۔" لیزا بولی وہ مائیکل کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کر رہی تھی۔ اس کے رویے سے مائیکل کو تکلیف ہوتی تھی لیکن وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ جب وہ واپس جانے لگا تو لیزا نے اس سے کہا۔ "پلیز اب دوبارہ اس وزن کے ساتھ یہاں مت آنا، سارا گاؤں جانتا ہے مجھے موٹے لوگ اچھے نہیں لگتے اور میں نہیں چاہتی کہ میرا مذاق اڑایا جائے۔"

"ٹھیک ہے ڈیئر۔" مائیکل نے سرد آہ بھری اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ شوٹنگ کے پہلے اسپیل کے دوران میں اس کے وزن میں مزید اضافہ ہوا تھا اور یہ تین سو بیس پونڈز ہو گیا تھا۔ مائیکل اب اپنا کوئی پرانا لباس نہیں پہن سکتا تھا اس نے اپنے وزن کے لحاظ سے کچھ سوٹ لے لیے تھے اور گھر میں زیادہ تر نیکر اور گاؤن میں رہتا تھا۔ اب وہ اپنی فراری اسپورٹس کار میں نہیں سماتا تھا۔ اس لیے آنے جانے کے لیے اس نے ایک ویگن لے لی تھی۔ شوٹنگ کا دوسرا اسپیل بھی بہت اچھا رہا اور مائیکل نے جم کر کام کیا۔ شان اس سے بہت خوش تھا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔

"مجھے امید ہے پروڈیوسر تمہارے طے شدہ معاوضے سے زیادہ ہی دے گا اور اگر فلم بلاک بسٹر نکلی تو اس کے منافع میں تمہارا حصہ بھی ہوگا۔"

مائیکل کو اس اطلاع سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی تھی کیونکہ اب لیزا کے بغیر اسے زندگی بور لگنے لگی تھی۔ وہ اس سے روز ہی فون پر بات کرتی تھی لیکن جب وہ اسے واپس آنے کو کہتا تو لیزا کا موڈ بدل جاتا۔ وہ کسی صورت اس موٹاپے کے ساتھ سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ مائیکل پر رفتہ رفتہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ اسے لیزا یا موٹاپے میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی اس نے شوٹنگ کے دوسرے اسپیل کے بعد شعوری طور پر وزن کم کرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن جب تیسرا اسپیل شروع ہوا تو شان نے اسے دیکھ کر اعتراض کیا۔

"یہ کیا تمہارے چہرے پر چمک کیوں نہیں ہے؟"

"کیونکہ میں ان دنوں کھانے پینے میں احتیاط کر رہا ہوں اور یوں سمجھو کہ ہمہ وقت بھوکا رہتا ہوں۔"

"بالکل نہیں تمہارے چہرے پر چمک اور تازگی ہونی چاہیے، تم کھانے پینے میں احتیاط ترک کر دو۔" شان نے اسے حکم دیا۔

"میری بیوی کو موٹاپا پسند نہیں ہے۔ میں نے صرف تمہاری فلم کی خاطر وزن بڑھایا ہے۔ کیونکہ فلم نصف ہو چکی ہے اس لیے میں اب وزن کم کر رہا ہوں۔"

مگر شان اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا اس کا کہنا تھا کہ وزن کم کرنے کی کوشش میں مائیکل نے اپنا چہرہ کسی فاقہ زدہ جیسا کر لیا تھا۔ اس نے تجربے کے طور پر مائیکل کو ایک شاٹ لے کر دکھایا تو مائیکل حیران رہ گیا، وہ واقعی اس شاٹ میں بالکل مرجھایا ہوا اور اپنے کردار سے ہٹ کر محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پرانی شوٹنگز بھی دیکھی تھیں۔ ان میں وہ واقعی اپنے کردار میں نگینے کی طرح فٹ نظر آ رہا تھا۔ مجبوراً اسے ڈائٹنگ پروگرام ترک کرنا پڑا تھا۔ اس کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی اور وہ پہلے کی طرح ٹھیک نظر آنے لگا۔ تیسرا

اسپیل بھی شاندار گیا اور اس بار طے ہو گیا تھا کہ اسے طے شدہ معاوضے سے کم سے کم دوگنا دیا جائے گا۔ یہی نہیں فلم میں اس کا کردار تقریباً ہیرو جیسا کر دیا گیا تھا۔ شان اپنی فلم کا اسکرپٹ خود لکھتا تھا اس لیے اسے اس کام میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

فلم کا چوتھا اسپیل بھی شاندار گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شوٹنگ مکمل ہو گئی۔ مائیکل بے تابی سے انتظار کر رہا تھا کہ شوٹنگ ختم ہو اور وہ وزن کم کرنے کا آغاز کرتے ہوئے لیزا سے واپس آنے کی درخواست کر سکے۔ شوٹنگ کے دوران میں ہی اس کے بینک اکاؤنٹ میں کئی ملین ڈالرز کی رقم منتقل ہو چکی تھی اور مالی لحاظ سے وہ اب سے زیادہ کبھی مضبوط نہیں رہا تھا۔ مگر لیزا اس کے پاس نہیں تھی تو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آخری شوٹ کے بعد وہ گھر آیا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہی خوراک لے گا جو وہ موٹے ہونے سے پہلے لیتا تھا اور ورزش شروع کرے گا۔ اس نے لیزا کو کال کر کے اطلاع دی۔ "ڈیئر شوٹنگ ختم ہو گئی ہے میں نے آج سے وزن میں کمی کا آغاز کر دیا ہے۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" لیزا بولی۔

"تو تم واپس آ رہی ہو؟" مائیکل نے پرامید لہجے میں کہا۔

"ہاں میں واپس آ رہی ہوں۔" لیزا مان گئی تو مائیکل کھل اٹھا۔

لیزا دوسرے دن گھر آ گئی لیکن اس نے مائیکل کو دیکھ کر کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے مائیکل کے وزن میں ابھی تک کوئی کمی نہیں آئی تھی اور اس نے ایک دن پہلے جو وزن کیا تھا وہ تین سو اٹھارہ پونڈز تھا۔ لیزا کو گھر میں پا کر مائیکل خوش ہو گیا تھا اور اس نے اسے بتایا کہ وہ ورزش بھی شروع کر رہا ہے۔ وہ کل سے جم جائے گا اور باقاعدہ پروگرام بنا کر وزن کم کرے گا۔ "تم دیکھنا زیادہ سے زیادہ چار مہینے میں، میں پہلے جیسا ہو جاؤں گا۔"

لیزا کو اس کی بات پر شک تھا کیونکہ اس نے موٹے افراد کو بہت کم اپنا وزن گھٹاتے دیکھا تھا اور اتنا وزن تو بہت کم لوگ کم کر پاتے تھے۔ بہر حال مائیکل نے اگلے دن سے جم جانا شروع کر دیا لیکن جب اس نے ورزش شروع کی تو اسے یہ کام بہت مشکل لگا۔ سات مہینے سے اسے ورزش کرنے کی بالکل عادت نہیں رہی تھی۔ وہ کھائے بغیر بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ گھر میں خود پر جبر کر لیتا تھا لیکن جب کہیں باہر جاتا اور اسے کہیں کوئی ریستوران یا پیزا شاپ ٹائپ کی کوئی جگہ نظر آتی تو وہ بے اختیار گاڑی وہاں روک دیتا تھا۔ جم میں وہ کئی گھنٹے گزارتا تھا لیکن اس کا زیادہ وقت کسی ایکسر سائز مشین پر بیٹھ کر ہانپتے ہوئے گزرتا تھا۔ ورزش وہ کم ہی کرتا تھا۔

یہی وجہ تھی جب اس نے ایک ہفتے بعد اپنا وزن کیا تو وہ تین سو سترہ پونڈز نکلا۔ گویا ایک ہفتے میں اس کا وزن صرف ایک پونڈ کم ہوا تھا۔ لیزا اس وقت موجود تھی اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "ایک ہفتے میں ایک پونڈ گویا تمہیں پہلے جیسا وزن حاصل کرنے میں کوئی ڈیڑھ سو ہفتے لگ سکتے ہیں یعنی تین سال۔"

مائیکل گڑبڑا گیا تھا۔ "ڈیئر یہ تو آغاز ہے جلد میں ردھم پکڑ لوں گا اور تم دیکھنا پھر روز ایک پونڈ وزن کم ہوگا۔"

لیزا جانتی تھی کہ یہ صرف طفل تسلی ہے اور وہ طفل نہیں تھی۔ "مائیک تم جس طرح کوشش کر رہے ہو اس طرح تم ساری عمر بھی ردھم نہیں پکڑ سکو گے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم گھر میں معمولی سا کھاتے ہو لیکن باہر جاتے ہی فاسٹ فوڈ پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ ایکسر سائز کے نام پر تم صرف وقت ضائع کرتے ہو۔" لیزا کو غصہ آ گیا تھا۔

مائیکل کھسیا گیا۔ "میں کوشش تو کر رہا ہوں۔"

"تم مجھے اور خود کو بے وقوف بنا رہے ہو۔" لیزا کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہے۔" مائیکل نے دفاعی انداز میں کہا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں ڈیئر۔"

"نہیں تم صرف اپنے کیریئر سے محبت کرتے ہو اس کی خاطر تم نے وزن بڑھا لیا، اگر تم مجھ سے محبت کرتے تو میری خاطر وزن گھٹانے کی کوشش کرتے۔" لیزا کہتے ہوئے رو دی تھی۔ مائیکل نے اسے چپ کرانا چاہا تو وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ مائیکل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ جب وہ وزن بڑھا رہا تھا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ دوبارہ وزن کم کرنا اتنا مشکل ہوگا۔ مائیکل کو خدشہ تھا کہیں لیزا پھر واپس نہ چلی جائے۔ اس کے جانے کا سوچ کر ہی وہ دہل گیا تھا۔ فی الحال ورزش کرنا مشکل لگ رہا تھا لیکن وہ اپنی کھانے کی عادت پر تو قابو پا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بلا وجہ گھر سے باہر نہیں جائے گا۔ اس نے جم جانے کے بجائے ایکسر سائز کی مشینیں اپنے گھر میں منگوانے کا سوچ لیا تھا۔

دوسرے دن کمپنی والے آ کر مشینیں اس کے عالی شان گھر کے بیس منٹ میں فٹ کر گئے۔ مائیکل نے باہر جانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کم کر دیا اور وہ دن کے بیشتر حصے میں بیس منٹ ہی بس رہتا تھا۔ اگرچہ اس دوران میں وہ ورزش کم کرتا تھا بلکہ صرف اسی وقت کرتا تھا جب لیزا اسے نیچے آتی نظر آتی تھی۔ ہاں اس نے باہر جا کر کھانا چھوڑ دیا تھا اور اب صرف گھر میں پکے معمول کے کھانے کھاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے وزن میں کوئی خاص کمی نہیں آ رہی تھی۔ وہ دن میں کئی بار وزن کرنے والی مشین پر چڑھ کر بڑی پر امید نظروں سے کانٹے کی طرف دیکھتا کہ شاید وزن میں کوئی کمی آئی ہو لیکن وزن وہیں کا وہیں رہتا تھا۔ لیزا اسے بعض اوقات ترحم آمیز نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس کے خیال میں وہ خود کو دھوکا دے رہا تھا۔

''ڈیڑھ وزن اس ورزش سے کم نہیں ہوگا جو تم دن میں کئی بار کرتے ہو۔''

''کون سی ورزش؟''

''یہی وزن کرنے والی مشین پر چڑھنے اور اترنے کی ورزش۔'' لیزا بولی۔ ''گزشتہ ایک ہفتے میں تمہارے وزن میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔''

مائیکل نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''حالانکہ تم دیکھ رہی ہو میں نے اب جنک فوڈ بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''تب وزن کیوں کم نہیں ہو رہا ہے؟'' لیزا بولی۔

''میں نہیں جانتا۔'' مائیکل نے سادگی سے کہا۔

لیزا رونے والی ہو گئی تھی۔ ''مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ ایک بار تمہارا وزن بڑھ گیا تو تم اسے کم نہیں کرو گے۔''

''میں نے ہر ممکن کوشش کر لی ہے۔'' مائیکل نے صفائی پیش کی۔

''اسے ہر ممکن کوشش نہیں کہتے ہیں۔'' لیزا کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے ماما اور پاپا کے گھر سے واپس آ کر زندگی کی دوسری بڑی غلطی کی ہے۔''

''پہلی بڑی غلطی کون سی ہے؟''

''تم سے شادی کرنے کی۔'' لیزا نے دھیرے سے منہ سے جاتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد مائیکل اوپر آیا تو لیزا اپنا سامان پیک کر رہی تھی اور اس کے تیور خطرناک لگ رہے تھے۔ مائیکل نے اسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر لیزا رکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس نے اپنا سامان سوٹ کیسوں میں بند کیا اور ٹیکسی منگوا کر چلی گئی۔ اس بار شاید ہمیشہ کے ارادے سے گئی تھی۔ مائیکل نے سوچا تھا کہ جب لیزا کو پتا چلے گا کہ وہ ایک بڑا سپر اسٹار بن گیا ہے اور اس کے اکاؤنٹ میں کئی ملین ڈالرز کی رقم آ گئی ہے تو شاید وہ اس کے موٹاپے کو نظر انداز کر دے۔ مگر مائیکل کا اندازہ غلط نکلا تھا۔ لیزا دولت کی دولت اور سپر اسٹار ہونے کی قطعی پروا نہیں تھی۔ اسے تو اپنا اسمارٹ شوہر واپس چاہیے تھا۔

لیزا واپس چلی گئی اور مائیکل اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ فلم کی شوٹنگ ختم ہوئے ایک مہینا ہونے کو آیا۔ اس نے شان سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شوٹنگ ختم ہونے کے ایک مہینے کے اندر فلم ریلیز ہو جائے گی مگر ابھی تک اس کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مائیکل نے اسے کال کی۔

''ابھی تک فلم پریمیر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔''

''اسی مہینے ایڈیٹنگ کا کام مکمل ہو جائے گا اور پریمیر کی تاریخ کا اعلان بھی جلد ہو جائے گا۔ لیکن تم کہاں ہو؟''

''ابھی تو میں گھر پر ہوں۔'' مائیکل نے سرد آہ بھری۔ ''میں کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا ہوں۔''

''فکر مت کرو۔'' شان ہنسا۔ ''فلم ریلیز ہونے دو۔ اس کے بعد لوگ خود تمہارا گھر سے نکلنا محال کر دیں گے۔''

مائیکل اچھا خوبرو ہیرو تھا لیکن شان کی فلم میں اس نے جس حالت میں کام کیا تھا اسے امید نہیں تھی کہ لوگ اسے اتنا پسند کریں گے۔ اس کی اداکاری اور کردار کو تو پسند کیا جا سکتا تھا لیکن ذاتی حیثیت میں عوام اسے پسند کرے گی اس کی اسے توقع نہیں تھی۔ چند دن بعد فلم کی پبلسٹی مہم شروع ہو گئی۔ شان نے پبلسٹی مہم بھی اتنے شاندار طریقے سے چلائی کہ چند ہفتوں میں پورے امریکا بلکہ دنیا میں اس فلم کی ریلیز کا انتظار کیا جانے لگا تھا۔ شان نے مائیکل کے خصوصی شاٹس جو شوٹنگ کے دوران میں ہی تیار کر لیے تھے اور فلم کا ٹریلر بھی ریلیز کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میڈیا اور فلمی رپورٹرز نے مائیکل پر یلغار کر دی تھی لیکن فل الحال اس نے کسی قسم کا انٹرویو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ فلم کا پریمیر لندن میں ہوا اور پوری کاسٹ پریمیر کے موقعے پر موجود تھی۔ مائیکل کو اندازہ نہیں تھا کہ لوگ فلم کی ریلیز سے پہلے اسے اتنا پسند کرنے لگے ہیں۔ جب وہ مووی ہال کے سامنے کار سے اترا تو لوگ اسے دیکھتے ہی دیوانے ہو گئے اور کاؤنٹر توڑ کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ اس سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمام انتظامات درہم برہم کر دیتے، مائیکل خود ان کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ اسے پاس دیکھ کر بالکل ہی پاگل ہو گئے تھے اور اگر پولیس والے آ کر اسے لوگوں کے پاس سے نہ ہٹاتے تو شاید وہ اس کے کپڑے تک پھاڑ لے جاتے۔ اندر آ کر مائیکل نے فلم کی ہیروئن جیسی میری سے کہا۔

''میرے خدا! لندن کے لوگ تو بالکل پاگل ہیں۔ میرے دادا نے اچھا کیا جو یہاں سے چلے گئے تھے۔''

''صرف لندن نہیں اب تم جہاں جاؤ گے، تمہیں ایسے ہی پاگل ملیں گے۔'' جیسی نے کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ اس فلم میں شان نے تم سے کس طرح کام لیا ہے تم ایک لیجنڈ بن جاؤ گے۔''

جیسی کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ریلیز کے پہلے ہفتے میں ہی فلم نے ریکارڈ توڑ بزنس کیا تھا اور اس کی دنیا بھر میں اگلے چھ مہینے کی سیٹس فروخت ہو چکی تھیں۔ اتنا شاندار بزنس دیکھ کر شان نے اس کی ڈی وی ڈی ریلیز روک دی کیونکہ ڈی وی ڈی ریلیز کے فوراً بعد فلم انٹرنیٹ پر مفت دستیاب ہوتی ہے اور لوگ اسے ڈاؤن لوڈ کر کے فری میں لطف اٹھاتے ہیں۔

ایک مہینے کے دوران میں مائیکل کوئی نصف درجن پریمیرز اور فلم کے حوالے سے دوسری تقریبات میں شامل ہوا تھا اور ہر جگہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کے مقابلے میں باقی تمام کاسٹ کو ملا کر بھی اتنی پذیرائی نہیں ملی تھی جتنی اس اکیلے کو ملی تھی۔ مائیکل حیران تھا کہ لوگوں نے فلم میں اسے اتنا پسند کیا تھا۔ شان نے اس سے کہا۔ ''لوگوں نے نہیں بلکہ اس کردار کو پسند کیا ہے۔ لوگوں کی وابستگی کردار سے ہوتی ہے اور اداکار کو وہ اس لیے پسند کرتے ہیں کہ اس نے یہ کردار ادا کیا ہوتا ہے۔''

''میں اپنی نہیں بلکہ کردار کی ہی بات کر رہا ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس کردار کو اتنا پسند کریں گے۔''

''لیکن مجھے اندازہ تھا اور اس میں سب سے منفرد بات اس کردار کا موٹے ہونا ہے۔ دیکھو امریکا اور تمام ترقی یافتہ ممالک میں لوگوں میں موٹے ہونے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ہر چار میں سے ایک امریکی اوور ویٹ ہے۔ جب کہ فلموں میں موٹاپے کو منفی معنوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ کسی اچھے کردار کو بہت کم موٹا دکھایا جاتا ہے۔ زیادہ تر اچھے کردار اسمارٹ ہوتے ہیں، اس سے موٹے لوگوں کی دل شکنی ہوتی ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ موٹے ہونا اچھی بات نہیں ہے۔''

''بالکل بھی نہیں ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''خود میری بیوی میرے موٹاپے کو پسند نہیں کرتی ہے۔''

''لیزا خود اسمارٹ ہے اس لیے موٹاپے کو پسند نہیں کرتی ہے لیکن تم ذرا موٹے لوگوں کے نقطۂ نظر سے اس کردار کو دیکھو۔ انہیں اپنے جیسا ایک وزنی شخص فلم میں مرکزی کردار ادا کرتا نظر آ رہا ہے، اس کی اہمیت ہیرو جیسی یا اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے وہ فلم کو کیوں پسند نہیں کریں گے؟''

''تو کیا فلم کی کامیابی کی صرف یہی ایک وجہ ہے؟''

''نہیں فلم کسی ایک وجہ سے کامیاب نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ تم جانتے ہو جب تک تمام لوگ اپنا کام صحیح طریقے سے نہ کریں فلم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔''

مائیکل سوچ رہا تھا کہ فلم تو کامیاب ہو گئی تھی لیکن اس کی ازدواجی زندگی ناکامی کے قریب تھی۔ وہ اپنی زندگی کو دوسروں سے شیئر کرنے کا قائل نہیں تھا اسی وجہ سے اس کے قریبی دوستوں اور ساتھیوں کو بھی علم نہیں تھا کہ لیزا اس سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے اور امکان بھی یہی تھا کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔ شان نے اسے خوشخبری سنائی۔ ''تمہیں مبارک ہو، فلم کے منافع میں تمہارا بھی دو فیصد حصہ ہوگا اور فلم جس طرح سے بزنس کر رہی ہے یہ دو فیصد کم سے کم ایک ملین ڈالرز تک چلا جائے گا۔''

ایک ملین ڈالرز خاصی بڑی رقم ہوتی ہے اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو مائیکل شاید خوش ہو جاتا لیکن اس وقت اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے شان سے کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں تھک گیا ہوں۔''

شان نے اس کا شانہ تھپکا۔ ''ابھی تمہارے پاس وقت ہے اس لیے تم آرام کرو۔''

مائیکل نے اس کی بات پر غور نہیں کیا تھا۔ شان نے بھی واضح الفاظ میں دوسری فلم کی بات نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اس کی عادت تھی کہ ایک فلم بنا کر درمیان میں اچھا خاصا وقفہ دے کر دوسری فلم شروع کرتا تھا، اسے لگاتار فلمیں بنانے کی عادت نہیں تھی۔ مائیکل نے اپنے ایجنٹ، مارون کو ذمے دار بنا دیا کہ وہ اس کی طرف سے میڈیا کو ڈیل کرتا رہے اور اسے بالکل تنگ نہ کیا جائے۔ ابھی وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ مارون نے اس سے کہا۔

''تم غلطی کر رہے ہو ابھی تو بزنس کا وقت آیا ہے میرا خیال ہے دوسرے فلم ساز تمہیں اپنی فلموں میں لینے کے لیے بے تاب ہوں گے۔''

''مجھے فل الحال کسی دوسری فلم میں کام نہیں کرنا ہے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔ ''مہربانی کر کے مجھے ایک مہینے تک کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔''

مائیکل گھر میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے فون بند کر دیا تھا اور صرف اس کا سیل فون آن تھا جس کا نمبر سوائے چند

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاص افراد کے اور کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ کسی سے رابطے میں نہیں تھا اس کے باوجود آنے والے چند مہینوں میں وہ ملک کا مشہور ترین اداکار بن چکا تھا۔ فلم بین اس کے دیوانے تھے اور اس کے گھر کے سامنے ہمہ وقت، اس کی ایک جھلک کے متلاشیوں کا ہجوم رہتا تھا۔

جب لیزا گئی تو مائیکل کے اندر کہیں تھوڑی بہت امید پھر بھی باقی تھی کہ شاید وہ اتنی ناراض نہ ہو اور صرف دکھاوے کے طور پر کچھ عرصے کے لیے جا رہی ہو۔ وہ جلد واپس آ جائے گی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی امید ختم ہونے لگی۔ پھر اس کی فلم کو شاندار کامیابی ملی تب بھی اسے امید ہوئی کہ شاید اب لیزا واپس آ جائے۔ ایک مشہور فلمی سیلیبرٹی کی بیوی ہونا بہت بڑے اعزاز کی بات تھی اور یہ اعزاز ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا ہے لیکن لیزا نے اس کی پروا بھی نہیں کی۔ بس اس نے کال کر کے مائیکل کو اس کی فلم کے پریمیر کی مبارک دی تھی۔ اس کے بعد اس نے کامیابی کے حوالے سے بھی اسے کال نہیں کی تھی۔ مائیکل سمجھ گیا کہ وہ اس طرح اسے پیغام یہ دے رہی تھی کہ اسے مائیکل کی کامیابیوں کی پروا نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس وجہ سے اس کے پاس واپس آئے گی۔

مائیکل کے لیے یہ وقت بہت مشکل تھا۔ اس نے گھر کے واحد ملازم کی بھی چھٹی کر دی تھی اور ان دنوں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہتا اپنی لیزا کے ساتھ ہی ویڈیوز دیکھتا اور پیتا رہتا تھا۔ اس شغل سے فرصت ملتی تو اپنے لیے کھانے کو کچھ بنا لیتا ورنہ زیادہ تر بھوکا ہی رہتا تھا۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ خود سے، لیزا کے ناراض ہو کر جانے کا انتقام لے رہا ہو۔ اس نے سیل فون پر اپنے ایجنٹ اور شان کی کالز ریسیو کرنا بھی بند کر دی تھیں اس لیے وہ اسے ایس ایم ایس کر کے بتاتے تھے کہ اس کی فلم کتنی کامیاب جا رہی ہے اور وہ امریکا میں ایک لیجنڈری اداکار بن گیا ہے لوگ اس کے دیوانے ہیں۔

لوگ اس کے دیوانے تھے لیکن یہ چیز اسے اگلی فلم میں کام نہیں دلا سکتی تھی۔ تین سو پونڈ وزنی شخص کو کون اپنی فلم میں لیتا؟ اس کے لیے تو خاص کردار کی ضرورت تھی اور ہر فلم ساز اس کے لیے خاص کردار نہیں لکھوا سکتا تھا۔ موٹاپے نے اسے شہرت اور دولت تو دی تھی لیکن ساتھ ہی اس کی بیوی اور ممکنہ طور پر اس کا کیریئر بھی چھین لیا تھا۔ مائیکل گزشتہ تین مہینے سے اسی چیز کا سوگ منا رہا تھا۔ اس نے اس دوران میں اپنی پسندیدہ وہسکی کا پورا کریٹ ختم کر دیا تھا۔ اس میں چار درجن بوتلیں موجود تھیں۔ گزشتہ رات بھی وہ وہسکی سے شغل کرتا رہا تھا اور اسے کھانے کا خیال ہی نہیں آیا۔

وہ سینڈوچ تیار کر کے کھانے بیٹھا تو دو سینڈوچ کھا کر اچانک ہی اس کی بھوک مر گئی اور باقی سینڈوچ اس نے اٹھا کر فریج میں رکھ دیے اور پھر کافی لے کر لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے لاؤنج کا پردہ کھسکا کر باہر جھانکا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے پرستار اس کے گریز سے تنگ آ کر واپس چلے گئے ہوں گے لیکن اب بھی اس کے مکان کے سامنے سڑک کے پاس کم سے کم پچاس افراد موجود تھے۔ وہ انہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک کار آ کر گیٹ کے سامنے رکی اور اس میں سے شان اترا۔ اس نے کال بیل بجائی۔ مائیکل انٹرکام کے پاس آیا اور اس کا بٹن دبا کر کہا۔

''شان کیا بات ہے کیوں آئے ہو؟''

''میں تم سے ایک بہت اہم بات کرنے آیا ہوں۔''

''لیکن میں فی الحال کوئی بات نہیں کرنا چاہتا ہوں۔'' مائیکل نے انکار کر دیا۔

''پلیز شان، تم مجھے اندر نہیں بلا سکتے، یہاں اتنے لوگ جمع ہیں اور وہ مجھے یوں واپس جاتا دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے؟''

''ٹھیک ہے۔'' مائیکل نے بادل ناخواستہ کہا۔ ''میں گیٹ کھول رہا ہوں تم کار اندر لے آؤ۔''

مائیکل نے بٹن دبا کر اندر سے ہی گیٹ کھول دیا۔ شان کار میں بیٹھا اور اندر آ گیا۔ مائیکل مانیٹر پر دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلتے دیکھ کر بعض بے قابو شائقین اس طرف دوڑے تھے لیکن موجود پولیس اہلکاروں نے انہیں روک دیا۔ شان کے لیے مکان کا دروازہ مائیکل کو خود کھولنا پڑا تھا۔ شان نے اندر آ کر اسے دیکھا اور اچھل پڑا۔ ''میرے خدا مائیک یہ تم نے خود کو کیا کر لیا ہے؟''

''تم اچھی طرح جانتے ہو تمہارے کہنے پر میں نے وزن بڑھایا تھا۔'' مائیکل اس کی بات کا برا مان کر بولا۔ ''اب میں ایسا ہو گیا ہوں۔''

''نہیں دوست تم نے خاصا وزن کھو دیا ہے۔'' شان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''میرے خدا! تمہیں نئے سرے سے محنت کرنا پڑے گی۔''

''محنت کس بات کی؟'' مائیکل نے وہسکی کی نئی بوتل کھولتے ہوئے کہا۔

''دوبارہ سے پہلے جیسا موٹا ہونے کے لیے۔''

''میں موٹا ہوں تین سو پونڈ وزنی ہوں۔'' مائیکل نے یقین سے کہا۔ ''کیا اب تم مجھے چھ سو پونڈ کا کرنا چاہتے ہو؟''

''مائیک لگتا ہے تم نے خاصے عرصے سے آئینہ نہیں دیکھا ہے لیکن کیا کسی اور نے بھی تمہیں نہیں بتایا۔ لیزا کہاں ہے؟''

''میکے چلی گئی ہے، اسے گئے ہوئے چار مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔'' مائیکل نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''وہی تو مجھے بتاتی تھی کہ میں کتنا موٹا ہو گیا ہوں اور اسی وجہ سے وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔''

''صرف موٹے ہونے کی وجہ سے؟'' شان کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں اسے موٹا شوہر قبول نہیں ہے۔''

''اس کا دماغ خراب ہے اسی موٹاپے کی وجہ سے تو تم سپر اسٹار بنے ہو۔ اسے معلوم نہیں ہے اب امریکا میں تم سے زیادہ مقبول اداکار اور کوئی نہیں ہے۔''

''اسے میرے سپر اسٹار ہونے کی کوئی پروا نہیں ہے وہ چاہتی ہے میں پہلے کی طرح اسمارٹ اور کم وزن ہو جاؤں۔ میں نے کوشش بھی کی تھی لیکن نہیں ہو سکا۔ میں سوچ رہا ہوں کوشش پھر کروں۔''

''ایسا غلطی سے بھی مت سوچنا۔'' شان نے جلدی سے کہا۔ ''تم نے شاید پی پی کر اپنا بیڑا غرق کر لیا ہے، اب تمہیں پھر سے معمول پر آنا پڑے گا۔''

''میں لیزا سے محبت کرتا ہوں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''دیکھو تمہارے پاس دولت اور شہرت ہو گی تو لیزا کبھی نہ کبھی تمہارے پاس واپس آ جائے گی لیکن یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔'' شان نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھ دیا۔

''کیسا موقع؟'' مائیکل نے اپنا گلاس تیسری بار بھرتے ہوئے پوچھا۔

''فلم کے دوسرے پارٹ میں کام کرنے کا۔'' شان نے کہا۔ ''تم جانتے ہو میں ایک فلم کے بعد دوسری فلم بہت عرصے بعد بناتا ہوں اور سیریز تو میں نے کبھی نہیں بنائی۔ لیکن اس فلم اور تمہارے کردار نے کچھ ایسی مقبولیت حاصل کی ہے کہ میں نے اور ٹیڈ نے اسے سیریز کی صورت میں بنانے کا فیصلہ کر لیا اس بار مرکزی کردار تمہارا ہو گا۔''

ٹیڈ اس فلم کا پروڈیوسر تھا۔ مائیکل نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''تمہارا مطلب ہے تم اسی کردار پر دوبارہ مووی بنانا چاہتے ہو؟''

''بالکل کردار اور واقعات اور حالات یہی ہوں گے اور بھی سارے یہی ہوں گے بس تم اس بار مرکزی کردار ادا کرو گے۔ سوچو کیسے لوگ پاگل ہو رہے ہیں۔ ان کا

ماہنامہ سرگزشت

اکتوبر 2011ء کی جھلکیاں

کامیڈین

دنیا کے ہر خطے میں مقبول اداکار کی سوانح حیات جسے وطن سے دور قبر نصیب ہوئی

گل جی

پاکستان کے ایک نامور مصور کی داستان حیات جس کا قتل ایک معما بنا ہوا ہے

کراچی ٹرام ویز

تاریخ کے آئینے میں ایک بھولی ہوئی داستان

خواجہ پرویز

لازوال گیتوں کے خالق کو خراج عقیدت

وہ ایک لمحہ

ایک دل دکھا دینے والی آپ بیتی

اس کے علاوہ

دلچسپ سفرنامہ، کراچی کی ٹرام کا تذکرہ، فلمی الف لیلہ، طویل آپ بیتی ''سراب'' اور مزید سیو آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، سچے واقعات اور بھی بہت کچھ۔ بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں پھر آپ خود گرویدہ ہو جائیں گے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے طلب کریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مطالبہ ہے کہ فلم کا دوسرا حصہ فوراً شروع کیا جائے ورنہ وہ ہمیں کچا چبا جائیں گے۔''

مائیکل اس کی بات سن رہا تھا۔ شان خاموش ہوا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا دوبارہ اس کردار میں کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ میں اب وزن کم کرنا چاہتا ہوں تاکہ لیزا واپس آجائے۔''

شان کا خیال تھا کہ مائیکل اس کی پیش کش سن کر اچھل پڑے گا مگر الٹا مائیکل کی بات نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے۔ یہ کروڑوں ڈالرز کا پروجیکٹ ہے اور تمہارا معاوضہ کم سے کم بھی پچاس ملین ڈالرز ہوگا۔ فلم کے منافع میں حصہ الگ ہوگا۔''

مائیکل اس بار بھی نہیں اچھلا تھا۔ اسے پہلی فلم کا کُل معاوضہ تین ملین ڈالرز ملا تھا اور اس بار اسے پچاس ملین ڈالرز دیے جا رہے تھے۔ معاوضے پر اسے یاد آیا کہ ابھی تک اسے فلم کے منافع میں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ اس نے شان سے کہا تو اس نے جلدی سے ایک چیک نکال کر مائیکل کے سامنے رکھ دیا۔ ''میں چیک لایا ہوں دو ملین ڈالرز ہیں اس میں کچھ بونس بھی ہے ٹیڈ کی جانب سے۔''

مائیکل نے کہا۔ ''تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا تھا اس فلم کو سیریز کی شکل میں بنانے کا؟''

''اس وقت ارادہ تھا بھی نہیں یہ تو ریلیز کے بعد عوام کی طرف سے آنے والے ردِعمل کے بعد خیال آیا۔ میں نے ٹیڈ کے ساتھ مل کر اگلی فلم کے اسکرپٹ پر کام کیا اور اسے مکمل کرنے کے بعد میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ اگر ہم آنے والے ایک مہینے میں شوٹنگ شروع کر دیں تو پہلی فلم کے ٹھیک ایک سال بعد دوسری فلم ریلیز کر سکتے ہیں۔''

''میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا۔''

''شاید اسی وجہ سے تم نے وزن خاصا کم کر لیا ہے۔ بہرحال ایک مہینا ہے تم دوبارہ سے کھا پی کر وزن حاصل کر سکتے ہو۔''

مائیکل نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ ''میرا وزن اتنا ہی ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

شان نے گہری سانس لی۔ ''واقعی تم نے عرصے سے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔''

''نہیں آئینہ تو میں روز دیکھتا ہوں شیو کرتے ہوئے اور منہ دھوتے ہوئے۔''

''تم شاید غور نہیں کرتے ہو اور کتنے دن ہو گئے جب تم نے وزن کیا تھا؟''

مائیکل نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یاد نہیں آیا کہ اس نے آخری بار اپنا وزن کب کیا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے یاد نہیں ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' شان نے سر ہلایا اور اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''آؤ میرے ساتھ مشین کہاں ہے؟''

''کون سی مشین؟''

''وزن کرنے والی۔'' شان نے کہا اور اس کے احتجاج کے باوجود اسے بیس منٹ میں رکھی وزن کرنے کی مشین پر لے آیا۔ اس نے صرف ایک ریشمی گاؤن اور سلیپرز پہن رکھے تھے ان کو اتارنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایسے ہی مائیکل کو مشین پر کھڑا کر دیا اور اسے کہا۔ ''ذرا کانٹے کی طرف دیکھو۔''

مائیکل نے کانٹے کی طرف دیکھا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا سوئی دو سو بیس پونڈز پر تھی۔ اس نے ہڑبڑا کر شان کی طرف دیکھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ مشین خراب ہو گئی ہے۔''

''ابھی تین دن پہلے مکمل میڈیکل چیک اپ میں میرا وزن ہوا ہے۔'' شان نے اسے بتایا ''اور میرا وزن ایک سو چالیس پونڈز ہے۔'' شان خود مشین پر کھڑا ہو گیا۔ ''دیکھو ٹھیک ایک سو چالیس پونڈز ہے یعنی مشین ٹھیک ہے۔''

مائیکل نے بے یقینی سے ایک طرف دیوار میں لگے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس نے گاؤن اتار رکھا تھا نیچے صرف نیکر تھی۔ اس کا جسم نمایاں نظر آ رہا تھا۔ واقعی اس نے خود پر غور نہیں کیا تھا، اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں کم تھا لیکن کیونکہ وہ ڈھیلا تھا اس لیے مائیکل کو احساس نہیں ہوا۔ شان نے اشارہ کیا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تازہ فلمی میگزین نکالا جس میں مائیکل کی بڑی سی تصویر تھی اس نے وہ تصویر مائیکل کے سامنے کر دی۔

''فرق تم خود دیکھ لو۔''

اس بار مائیکل خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ ''واہ میرا وزن خود بہ خود اتنا کم ہو گیا ہے اور اب مجھے صرف پچاس پونڈز کم کرنا ہوگا اور پھر میں پہلے جیسا ہو جاؤں گا۔ جب لیزا میرے بارے میں سنے گی تو وہ یقیناً واپس آجائے گی۔''

''ایک منٹ... ایک منٹ۔'' شان نے جلدی سے کہا۔ ''ہمارا موضوع وزن کم کرنا نہیں وزن بڑھانا ہے۔ آنے والے ڈیڑھ مہینے میں دوبارہ تین سو پونڈز وزنی

ہونا ہے۔''

''میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

شان خوش ہو گیا۔ ''میری فلم آفر پر؟''

''نہیں مجھے یہ بتانے پر کہ میں اب تین سو پونڈز وزنی نہیں رہا ہوں۔''

''مائیک تمہیں میری فلم میں کام کرنا ہوگا۔'' شان کی خوشی ہوا ہو گئی۔

''ایسا ممکن نہیں ہے۔'' مائیکل نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

''مائیک تمہیں اس فلم میں کام کرنا ہے اور تمہیں اس کے بدلے ریکارڈ معاوضہ دیا جا رہا ہے۔'' شان نے اس بار جھنجھلا کر کہا۔

''مجھے فلم قبول نہیں ہے کیونکہ میرا دوبارہ تین سو پونڈز وزن کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' مائیکل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''البتہ اب میں ایک سو ستر پونڈز وزنی ہونا چاہوں گا۔''

''مائیک یہ حماقت ہے تم اتنا بڑا چانس مس کر رہے ہو۔ ان دو فلموں میں کام کر کے اگر تم باقی ساری عمر کچھ نہ کرو تب بھی تم ایک فلمی لیجنڈ کے طور پر یاد رکھے جاؤ گے۔ تمہیں معلوم ہے تمہیں بہترین اداکار کے آسکر نومینیٹ کیا جا رہا ہے۔''

''مجھے فلمی لیجنڈ نہیں بننا ہے۔'' مائیکل نے کہا اور شان کو بازو سے پکڑ کر اوپر لے آیا۔ شان نے راستے میں کہا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو ایک عورت کی خاطر تم میری فلم ٹھکرا رہے ہو۔''

''تم نے درست کہا، وہ عورت میری بیوی ہے اور میری محبت ہے۔ میں باقی عمر فلم میں کام کیے بغیر تو رہ سکتا ہوں لیکن اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' مائیکل کہتے ہوئے اسے مکان کے دروازے تک لے آیا۔ شان اس کے عزائم بھانپ گیا اس نے مزاحمت کی۔

''اے تم مجھے اس طرح نہیں نکال سکتے، تمہیں بات کرنا ہوگی۔''

''میں بات کر چکا ہوں تم نے مجھے آئندہ فلم کی آفر کی تو میں اسے مسترد کرتا ہوں۔ بات ہو گئی اب تم جا سکتے ہو۔'' مائیکل نے اسے دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ شان گرتے گرتے بچا اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ حصہ مکان کے باہر سے نظر نہیں آتا تھا ورنہ اس کی بے عزتی کا یہ منظر بہت سے لوگ دیکھتے۔ اس نے سمجھ کر کہا۔

''مائیک تمہارے پاس وقت ہے میرا خیال ہے تم لیزا سے بھی بات کر سکتے ہو۔ صرف دو سال کی بات ہے۔ اس کے بعد تم چاہو تو اپنا وزن دوبارہ کم کر سکتے ہو۔''

مائیکل سوچ میں پڑ گیا۔ شان ذرا آگے آیا اسے خوش فہمی ہوئی کہ مائیکل اس کی بات سے متاثر ہوا ہے لیکن مائیکل نے کہا۔ ''میرا خیال ہے میں نے تمہیں کچھ نرمی سے دھکا دیا ہے اسی وجہ سے تم صحیح سے میری بات سمجھ نہیں پا رہے ہو اب اگر تم ایک منٹ کے اندر یہاں سے نہیں گئے تو میں باہر آ کر تمہیں گیٹ تک پہنچاؤں گا اور یہ منظر دیکھنے والے، یقیناً بہت سارے لوگ ہوں گے۔''

شان نے دانت پیسے۔ ''تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''میں نے پہلے اچھا نہیں کیا تھا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''جب میں نے تمہاری باتوں میں آ کر اپنا وزن بڑھا لیا تھا۔''

''اس کے بدلے آج تم امریکا کے سب سے بڑے اداکار ہو۔'' شان نے اسے یاد دلایا۔

مائیکل نے سرد آہ بھری۔ ''میری ساری خوشیاں اور ساری کامیابیاں میری بیوی کے بغیر ادھوری ہیں۔''

''مائیک میری بات سنو...'' شان نے کہنا چاہا لیکن مائیکل نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ تیزی سے واپس بیس منٹ میں آیا اور اس نے دوبارہ وزن کرنے والی مشین پر اپنا وزن دیکھا۔ واقعی وہ دو سو بیس پونڈز کا ہو گیا تھا۔ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''یاہو...''

اب وہ لیزا کو واپس بلا سکتا تھا اسے یقین تھا کہ وہ اس کے وزن میں اتنی کمی کے بارے میں سن کر ضرور واپس آجائے گی۔ وہ اوپر آیا پہلے اس نے ایک جام بنا کر پیا اور پھر لیزا کا نمبر ملایا۔ بیل جانے لگی۔ وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ ایک بار بیل بند ہوئی تو اس نے دوبارہ نمبر ملایا۔ اس بار لیزا نے خاصی دیر بعد سہی لیکن کال ریسیو کر لی۔

''مائیک کیسے ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔'' مائیکل نے بے تابی سے کہا۔ ''میں تمہیں خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میں نے اپنا وزن پورے سو پونڈز کم کیا ہے۔'' مائیکل نے چھوڑنے میں حرج نہیں سمجھا تھا کیونکہ عروج کے دور میں اس کا وزن تین سو بیس پونڈز بھی ہو گیا تھا۔

''واقعی۔'' لیزا نے کہا اس کے لہجے میں تعجب تو تھا لیکن خوشی نہیں تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو تم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آکر خود دیکھ لو۔" مائیکل نے کہا اور پھر پُر امید لہجے میں بولا۔ "لیزا تم آرہی ہونا، میں وعدہ کرتا ہوں زیادہ سے زیادہ دو مہینے میں، میں پہلے والا مائیک ہوں گا ایک سو ستر پونڈز کا اور مکمل طور پرفٹ۔"

"اچھا۔" لیزا نے بدستور پہلے والے لہجے میں کہا "لیکن مائیک میں نہیں آسکتی ہوں۔"

مائیکل کو دھچکا لگا تھا۔ "لیکن کیوں؟"

"وہ... میں امید سے ہوں... میں ماں بننے والی ہوں۔"

مائیکل کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ "کیا... تم ماں بننے والی ہو اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"مجھے خود دو مہینے پہلے پتا چلا ہے۔ اس وقت میں سمجھ رہی تھی کہ کوئی مسئلہ ہے پھر میں ڈاکٹر کے پاس گئی تو اس نے بتایا۔"

"لیزا دو مہینے بھی بہت ہوتے ہیں۔" مائیکل برہم ہو گیا۔ "تم نے مجھے بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ تم مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگی ہو؟"

"نہیں... نہیں۔" لیزا نے بے ساختہ کہا۔ "یہ بات نہیں ہے۔ بہرحال ڈاکٹر نے مجھے طویل سفر کرنے سے منع کیا ہے۔"

مائیکل خود پر قابو پانے لگا۔ آج اسے بیک وقت دو خوشخبریاں ملی تھیں اور وہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آرہا ہوں۔"

لیزا ہچکچائی اور مائیکل کو یوں لگا جیسے وہ اسے آنے سے منع کردے گی لیکن پھر وہ مان گئی۔ مائیکل نے اسے شان کی آمد کے بارے میں بتایا۔ "وہ کیوں آیا تھا یہ میں تمہیں آکر بتاؤں گا۔"

"تم کب آرہے ہو؟"

"میں دو دن بعد یہاں سے نکلوں گا۔" مائیکل نے کہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی روانہ ہوجائے لیکن وہ دو دن ذرا ایکسر سائز اور سوئمنگ کرکے اپنے آپ کو تھوڑا فٹ کرنا چاہتا تھا تاکہ کم وزن نظر بھی آئے۔ اس نے اپنے منصوبے پر فوری عمل درآمد شروع کردیا۔ وہ کئی گھنٹے تک بیس منٹ میں ایکسر سائز مشینوں کے ساتھ لگا رہا اور جب تھک کر چور ہوگیا تو اس نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر سوئمنگ پول میں آگیا۔ اگلے دو دن تک اس کا یہی معمول رہا۔ اس دوران میں وہ صرف سیب اور سنگترے کا جوس لیتا رہا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لیے وہ صرف پاپ کارن کھا رہا تھا۔ دو دن میں اس نے خاصا فرق محسوس کیا تھا اس کے جسم کی ڈھیلے پڑنے والے حصے پھر سے سخت ہونے لگے تھے اور وہ پہلے سے بہتر نظر آرہا تھا۔ روانہ ہونے سے ایک رات پہلے وہ اچھی طرح سویا تاکہ اگلے دن تروتازہ نظر آئے۔ صبح وہ اٹھا تو خود کو بچ بچ فریش محسوس کررہا تھا۔ اس نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور اپنا ایک بہترین سوٹ نکالا۔ یہ اسے اگرچہ تنگ تھا لیکن اس میں وہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔

ہائی وے سے راستہ پانچ گھنٹے کی ڈرائیو کا تھا لیکن لیزا کے پاس جلد از جلد پہنچنے کی دُھن میں اس نے یہ فاصلہ ساڑھے چار گھنٹے میں طے کرلیا۔ اس کا سسر اپنے ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ وہ مائیکل سے گرم جوشی سے ملا اور اسے لیزا کے بارے میں بتایا کہ وہ مکان میں اوپر، اپنے سے پہلے والے بیڈروم میں موجود ہے۔ سسر نے کہا "اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے ڈاکٹر نے اسے زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کو کہا ہے۔"

مائیکل سسر اور پھر ساس سے نمٹ کر اوپر آیا اور اس نے لیزا کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ "کون ہے؟"

مائیکل دروازہ کھول کر اندر آیا تو پہلے اسے نیم تاریک کمرے میں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ پھر اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو لیزا اسے آرام کرسی پر دکھائی دی۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ "لیزا کیسی ہو تم؟"

مگر لیزا نہ تو اٹھی اور نہ ہی اس نے کوئی گرمجوشی دکھائی تھی۔ "میں ٹھیک... نہیں ہوں۔"

مائیکل رک گیا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟... یہاں روشنی اتنی کم کیوں ہے۔" اس نے دروازے کے قریب سوئچ ٹٹولا اور اس سے پہلے کہ لیزا اسے منع کرتی اس نے بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی کمرا روشن ہوگیا تھا۔

"نہیں۔" لیزا نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپالیا۔

مائیکل اسے دیکھ کر دم بخود رہ گیا تھا۔ "میرے خدا لیزا یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔"

لیزا کا پیٹ تو بڑھا ہوا تھا لیکن ساتھ ہی اس کے پورے جسم پر موٹاپا طاری تھا۔ چہرہ اور گردن جیسے سوج گئے تھے۔ بازو اور ٹانگیں بھی موٹی ہورہی تھیں۔ وہ کہیں سے بھی پہلے والی لیزا نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ مائیکل اس کے پاس بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے نرمی سے لیزا کا ہاتھ چہرے سے ہٹایا۔ "لیزا مجھے بتاؤ یہ کیا ہوا ہے؟"

وہ رو رہی تھی۔ "مجھے خود بھی نہیں معلوم، یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد میرا وزن جیسے خود بہ خود بڑھنے لگا۔ حالانکہ میں وہی کھا پی رہی تھی اور ایکسر سائز بھی کررہی تھی۔ تم یقین کرو گے صرف تین مہینے میں میرا وزن ایک سو دس پونڈز سے بڑھ کر ایک سو ساٹھ پونڈز ہوگیا اور تب میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں امید سے ہوں اور اسی وجہ سے مجھ پر موٹاپا آرہا ہے۔ اب میرا وزن ایک سو اسی پونڈز ہے۔"

مائیکل پریشان ہوگیا۔ "اس میں تمہارے یا بچے کے لیے کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"

"نہیں... نہیں ڈاکٹر کا کہنا ہے سب بالکل ٹھیک ہے۔ بعض عورتیں ایسے وقت میں موٹی ہوجاتی ہیں اور میں ان میں سے ایک ہوں۔ میں اور بچہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ہر تیسرے دن چیک اپ کرانے جاتی ہوں اور اب وزن بڑھنا رک گیا ہے لیکن کم نہیں ہورہا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے یہ بچے کے بعد ہی کم ہوگا۔"

"تھینکس گاڈ۔" مائیکل نے سکھ کا سانس لیا۔ "میں تو ڈر ہی گیا تھا۔"

"تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں ناراض تو تم مجھ سے ہو کہ میں اپنا وزن کم نہیں کر پا رہا تھا لیکن دیکھو میں نے کتنا کم کرلیا ہے۔" مائیکل نے اٹھ کر اسے دکھایا۔ "میں دو سو بیس پونڈز کا ہوں اور مجھے اب صرف پچاس پونڈز وزن کم کرنا ہوگا۔"

"واقعی تم پہلے کے مقابلے میں بہت کم ہوگئے ہو۔" لیزا نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "لیکن اب میں موٹی اور بھدی ہوگئی ہوں۔"

مائیکل دوبارہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "ایسا مت کہو تم ایک وجہ سے ایسی ہوئی ہو اور ہمارے لیے تو یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔"

لیزا نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں برا نہیں لگ رہا کہ میں موٹی اور بھدی ہوگئی ہوں۔"

مائیکل نے اسے گود میں اٹھا کر بستر پر لٹایا اگرچہ اس کام میں اسے مشکل پیش آئی تھی۔ پھر وہ خود اس کے برابر میں نیم دراز ہوگیا۔ "لیزا تم میری بیوی ہو۔ اگر تم خوب صورت اور اسمارٹ ہو تو مجھے اچھی لگتی ہو لیکن اصل وجہ یہ ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ اگر تم اسمارٹ اور خوب صورت نہ رہو تب بھی مجھے اچھی لگو گی۔"

"یعنی میں تمہیں اب بھی اچھی لگ رہی ہوں۔" لیزا کو اب بھی شک تھا۔ مائیکل اس کی طرف جھک گیا تھا۔

"اب تم مجھے زیادہ اچھی لگ رہی ہو کیونکہ تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔"

کچھ دیر بعد جب ان کے جذبات اعتدال پر آئے تو لیزا کو یاد آیا۔ "تم نے بتایا کہ شان تمہارے پاس آیا تھا۔"

"ہاں وہ پیش کش لے کر آیا تھا۔"

"کیسی پیش کش؟"

"وہ اپنی فلم کے مزید دو پارٹ بنانا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اس بار مرکزی کردار میرا ہو۔ اس نے مجھے اگلی فلم کے لیے پچاس ملین ڈالرز نفع میں حصے کی پیش کش کی ہے۔"

"پچاس ملین ڈالرز۔" لیزا چونک کر اٹھ بیٹھی۔ "یہ تو ریکارڈ معاوضہ لگ رہا ہے۔"

"ہاں یہ ریکارڈ معاوضہ ہے۔"

"تب تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے انکار کردیا۔" مائیکل نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "کیونکہ میں تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ شان کی شرط وہی پرانی تھی کہ میں تین سو پونڈز وزنی نظر آؤں۔"

"تم نے صرف میری خاطر شان کو منع کردیا؟"

"اگر تمہیں یقین نہیں آرہا ہے تو اسے کال کرکے معلوم کرلو۔" مائیکل نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ "میں نے تو اس بے چارے کو تقریباً دھکا دے کر گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے نکالا ہے۔"

"میرے خدا! یہ تم نے کیا کیا۔" لیزا اضطراری انداز میں بولی۔ "مائیکل مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ شان کتنی شاہکار مووی بنانے جا رہا ہے اور تمہارا کردار تو اتنا زبردست ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔"

"تم نے مووی دیکھی ہے لیکن کیسے؟ ابھی تو ڈی وی ڈی پر بھی نہیں آئی ہے۔" مائیکل کو لیزا کی بات سن کو خوشی... ہوئی تھی۔

"اگرچہ ڈاکٹر نے مجھے منع کیا ہے لیکن میں تین بار جا کر یہ مووی، تھیٹر میں دیکھ چکی ہوں۔"

"تو میں تمہیں فلم میں برا نہیں لگا؟"

"نہیں تم اس کردار میں یوں فٹ تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ فٹ ہوتا ہے۔" لیزا نے جوش سے کہا۔ "میرے خاندان میں سب کو یہ فلم بہت پسند آئی ہے۔ جب میں تیسری بار دیکھنے گئی تو ہمارے گاؤں کے لوگوں نے پورا تھیٹر بک کرایا تھا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس دن مجھے تم پر کتنا فخر محسوس ہوا تھا۔"

مائیکل کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے تو لگا تھا کہ لیزا اس کی فلم دیکھنا گوارا نہیں کرے گی۔ "تم سچ کہہ رہی ہو یا میرا دل رکھ رہی ہو؟"

"نہیں ڈیئر میں نے سچ مچ تمہاری فلم کو دیکھا ہے اور پسند کیا ہے۔" لیزا نے کہا اور پھر اس نے فلم کے کئی سین اتنی وضاحت سے بتائے کہ مائیکل کو یقین آ گیا کہ اس نے واقعی فلم کو پسند کر کے دیکھا ہے۔ "مجھے تو پتا ہی نہیں تھا مائیکل لوگ تمہیں اس کردار میں اتنا پسند کریں گے۔ تم اس وقت ہر طرف چھائے ہو۔ ہر طرف تمہاری دھوم مچی ہے۔"

مائیکل نے سر ہلایا اور سرد آہ بھری۔ "ہاں لیکن یہ دھوم بس اتنی ہی رہ جائے گی۔"

"نہیں اگر تم اس فلم کے اگلے پارٹ میں کام کرو تو..."

مائیکل کو ایک بار پھر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ "یہ تم کہہ رہی ہو لیزا...؟"

"ہاں مائیک! یہ میں کہہ رہی ہوں۔ اب مجھے احساس ہو گیا ہے کہ اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے اس کے جسم کی نہیں۔ مجھے افسوس ہے میں نے سخت خودغرضی کا مظاہرہ کیا۔ فلم کی شوٹنگ اور اس کے بعد کامیابی میں تمہارے ساتھ شامل ہونے کے بجائے میں تم سے دور رہی۔ ڈیئر! میں اپنی اس غلطی اور خودغرضی کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔"

مائیکل نے تصدیق چاہی۔ "تم مجھے اس فلم میں کام کرنے کی اجازت دے رہی ہو؟"

"بالکل، بلکہ اب میری خواہش ہے تم اس فلم کے دونوں پارٹس میں کام کرو۔" لیزا نے جوش سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے ان دو فلموں کی شوٹنگ آنے والے دو سال تک جاری رہے گی اور اس دوران میں مجھے اپنا وزن تین سو پونڈز رکھنا ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اب مجھے سمجھ آ گئی ہے، مجھے تم سے محبت ہے تمہارے جسم سے نہیں اس لیے اگر تم ایک سو ستر پونڈز کے ہو یا تین سو پونڈز کے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مائیک تم نے میری محبت میں اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ آج امریکا کا کوئی اداکار اپنی بیوی کے لیے اتنا بڑا چانس نہیں چھوڑ سکتا ہے لیکن میں فخر سے کہہ سکوں گی کہ میرے شوہر نے میرے لیے چانس چھوڑا ہے۔ اب میری باری ہے میں چاہوں گی کہ تم یہ چانس حاصل کرو۔"

"کیا تم سچ مچ ایسا چاہتی ہو یا صرف میری محبت میں ایسا کہہ رہی ہو؟"

اس پر لیزا نے اسے عملی طور پر بتایا کہ وہ دل سے ایسا کہہ رہی ہے۔ مائیکل ہنسنے لگا۔ "بس... بس ڈیئر مجھے یقین آ گیا۔"

لیزا خوشی سے اچھل پڑی تھی۔ "تو تم شان کی فلموں میں کام کرنے کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں میں تیار ہوں۔" مائیکل نے سر ہلایا۔ "لیکن کیا وہ اب مجھے کام دے گا خاص طور سے اس بےعزتی کے بعد جو میں نے اس کی اپنے گھر میں کی تھی؟"

"وہ سچا پروفیشنل ہے۔" لیزا نے یقین سے کہا۔ "تمہارے سوائے تمہارے، کسی دوسرے کو یہ فلم نہیں بنائے گا اور اگر تم نے انکار کیا تو وہ فلم ہی نہیں بنائے گا۔"

"پھر بھی میری ہمت نہیں ہو رہی کہ میں اس سے بات کروں۔" مائیکل بستر پر دراز ہو گیا۔

"سیل فون دو میں اس سے بات کرتی ہوں۔" لیزا نے اس سے سیل فون لیا اور شان کا نمبر ملایا۔ "ہیلو شان... ہاں میں لیزا بات کر رہی ہوں... شان میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے کال کی ہے کہ مائیکل تمہاری آنے والی دونوں فلموں میں کام کرے گا... ہاں ہاں! تین سو پونڈز وزن کے ساتھ کرے گا... اس کے بغیر وہ جچے گا کیسے...؟"

لیزا شان سے بات کر رہی تھی اور مائیکل آنکھیں بند کیے مسکرا رہا تھا۔ بہت عرصے بعد وہ دل سے مسکرایا تھا۔

گزرتے لمحوں کی فکر سے آزاد ایک پریمی جوڑے کا نظریہ

خزاں سے پہلے

رضوانہ منظر

کبھی تدبیر سے تقدیر بنتی ہے اور کبھی تقدیر ہر تدبیر پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کوئی لاکھ روکنا چاہے، پانی کے بہاؤ کو نہیں روک سکتا۔ یہ اور بات کہ رخ بدل جائے مگر... پانی کو ہر حال میں بہنا ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں بھی محبت کا ایک سمندر مؤجزن تھا جس میں اٹھنے والی لہریں انہیں آگے بڑھنے پر اکسا رہی تھیں۔ پھر وہ کیسے آگے نہ بڑھتے۔

ہیلری نے حسبِ معمول چلاتے ہوئے ہدایات دیں تو ایلی سوچنے لگی کہ بحالی کے مرکز میں ایسی سخت گیر، بدمزاج اور بدتمیز عورت کو کیوں رکھا گیا ہے؟ وہ فزیو تھراپسٹ کے بجائے کسی ڈرل ماسٹر کے انداز میں ان چار عمر رسیدہ مریضوں کو جسمانی مشقیں کروا رہی تھی جن کے اعضا فالج سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ چاروں مریض پیٹ فارم پر پیٹ کے بل پاؤں پھیلا کر رینگ رہے تھے۔ ان پلیٹ فارمز پر پتلے گدّے بچھے ہوئے تھے جن پر ہلکی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ ایک پلیٹ فارم پر ایلس اور بیٹی ایکسر سائز کر رہی تھیں جبکہ دوسرے پلیٹ فارم پر ایلی کے ساتھ ایک مرد تھا۔ اسی لیے وہ دونوں عورتیں جن کی عمر ستر سال سے زیادہ ہی ہوگی، ایلی کو رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ قام کے جبڑے مضبوط، بال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

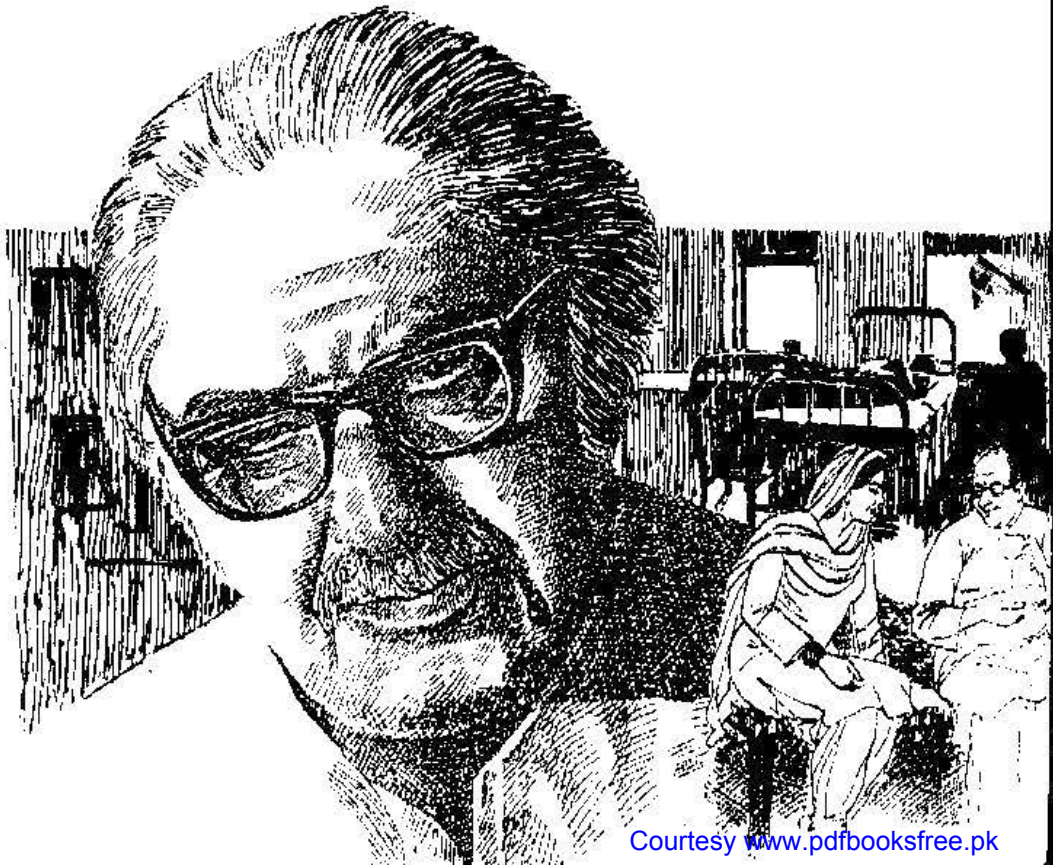

چمکیلے سفید اور آنکھیں پال نیومن جیسی تھیں۔ ایکی نے سوچا کہ جب وہ ستر سال کی عمر میں ایسا نظر آتا ہے تو جوانی میں کیا قیامت ڈھاتا ہوگا۔

''تم سب اپنے گالوں کو دباؤ۔'' ہیلری نے اپنے مریضوں کے سامنے اکڑ کر چلتے ہوئے کہا۔ اس لمحے ایکی کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے آگ کے شعلوں میں جھونک دیتی۔ وہ کتنے بے ہودہ انداز میں اپنے مریضوں پر حکم چلا رہی تھی۔ جو فالج کے حملے سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے انہیں وہیل چیئر کے ذریعے وہاں لایا جاتا تھا۔

''ایکی!'' ہیلری چلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم اپنے گالوں کو دبا رہی ہو؟''

ایکی شرما گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہیلری، ٹام جیسے پرکشش شخص کی موجودگی میں ایسی بات کرے۔ ٹام نے اسے دیکھا اور آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ایکی سوچنے لگی کہ اس شخص کو میرا کتنا خیال ہے۔

''ایکی۔ کیا تم سو رہی ہو؟'' ہیلری ایک بار پھر چلائی تو ایکی نے سوچا کہ اس کی بات کا جواب دے دینا ہی بہتر ہے ورنہ وہ اس سے بھی زیادہ بدصورت جملہ کہہ سکتی ہے۔ اسکول کے زمانے میں بھی وہ بہت لڑاکا ہوا کرتی تھی اور اب اس اسپتال میں فزیوتھراپسٹ بن کر اپنے اختیارات سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ایکی اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''یہ تم ہو۔ ہیلری ٹامسن؟''

ایکی نے جان بوجھ کر اپنی آواز میں کپکپاہٹ طاری کر لی۔ وہ کسی توتلے بچے کی طرح بول رہی تھی۔ فالج کے حملے کے بعد اسے بولنے میں لکنت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی تین انگلیاں اور دایاں جبڑا بھی متاثر ہوا تھا۔ اس کے نیورولوجسٹ نے یقین دلایا تھا کہ اگر ایکی باقاعدگی سے ایکسرسائز کرتی رہی تو یہ مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اسے اپنی غذا اور دواؤں کا بھی خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ایکی گھر نہیں جا سکتی تھی جب تک اس کا نیورولوجسٹ اس کی پروگریس سے مطمئن نہ ہو جائے اور اس کا انحصار ہیلری کی رپورٹ پر تھا۔ اس طرح ایکی اپنے فزیوتھراپسٹ کی اسیر ہو کر رہ گئی تھی، اس کی طرف سے کلیئرنس ملنے کے بعد ہی وہ گھر جا سکتی تھی۔

قسمت بھی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ اسکول کے زمانے کی لڑاکا لڑکی پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ایکی پر حکومت کر رہی تھی۔ اس کے طور طریقے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو اسکول کی طالبہ ہی سمجھتی ہے۔

''ہاں، یہ میں ہی ہوں۔'' ہیلری نے جواب دیا۔ ''تمہاری یادداشت اب بھی بہت اچھی ہے، البتہ تمہارے جسم پر چربی چڑھ گئی ہے جسے کم کرنے کی ضرورت ہے۔ چلو، اب جلدی سے گالوں کو دباؤ۔''

سفید بالوں والا ٹام ایک بار پھر ایکی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

ہیلری ٹہلتے ہوئے بولی۔ ''ہائی اسکول چھوڑنے کے بعد سے لے کر اب تک میرے وزن میں ایک پونڈ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔''

ایکی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہیلری کا وزن پہلے سے کم ہوا ہے۔ اسکول کا ڈھیلا ڈھالا یونیفارم بھی اس کے جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو چھپانے سے قاصر تھا لیکن اب اس کا جسم ڈھلک گیا تھا اور ستواں بازوؤں پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔

''یہ ابھی تک اپنے آپ کو بیس کی ہی سمجھ رہی ہے۔'' ٹام نے سرگوشی کی۔ ایکی نے زور زور سے کھانسنا شروع کر دیا تاکہ اس کھانسی میں ٹام کی سرگوشیاں دب جائیں۔ ہیلری نے ایکی کو گھورا۔ اس کی نظریں ایکی کے بالوں پر جم گئیں۔ پھر وہ ٹام سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''اگر تمہارے اندر بولنے کی طاقت ہے تو تم زیادہ سخت مشقیں بھی کر سکتے ہو۔'' ہیلری نے کہا۔ ''اپنی ٹانگوں کو اس طرح حرکت دو جیسے سائیکل چلا رہے ہو۔ ایکی تم بھی کوشش کرو۔''

ایکی نے اپنے گھٹنوں کو حرکت دی لیکن بیس مرتبہ کی مشق کے بعد ان میں درد شروع ہو گیا۔ اس کے باوجود ہیلری نے اسے رکنے نہیں دیا اور بولی۔ ''تمہیں مزید محنت کی ضرورت ہے۔ جیسا میں نے تمہارے بارے میں سوچا تھا تم آج بھی ویسی ہی ہو۔ اسکول کے زمانے میں بھی تم اپنی ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا فرائیڈ چکن کھایا کرتی تھیں اور روز بروز موٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی لیے تمہاری شادی نہ ہو سکی۔''

''میں اپنی ماں کا بہت خیال رکھتی تھی۔'' ایکی نے کہا۔

''اسی طرح وہ بھی.....''

ایکی کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ہیلری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''وہ تمہارے لیے بہت دولت چھوڑ کر مری ہے۔ تمہارا کوئی بھائی یا بہن بھی نہیں ہے۔ اس لیے تم ہی اس کی وارث ہو اور گرامونون کمپنی سے ریٹائر ہونے کے بعد آرام دہ زندگی گزار رہی ہو۔ زیادہ کھانے اور حرکت نہ کرنے کی وجہ سے ہی تم پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔''

''کسی عورت سے بات کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔''

ٹام بولا۔

''بہتر ہوگا کہ تم زبان کے بجائے اپنے پیروں کو حرکت دو۔'' ہیلری ناگواری سے بولی۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ تم بھی زیادہ کھانے اور آرام کرنے کی وجہ سے اس مرض میں مبتلا ہوئے ہو۔''

ٹام کا پیٹ تھوڑا سا نکلا ہوا تھا لیکن اس سے اس کی مردانہ وجاہت پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ایکی نے سوچا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

ہیلری سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ غصے سے بولی۔

''تم دونوں اپنی ایکسرسائز جاری رکھو۔ میں یہاں تمہاری زندگی پر سکون بنانے کے لیے نہیں بیٹھی ہوں۔''

ایکی کہنا چاہ رہی تھی کہ اسے زندگی میں کبھی سکون نہیں ملا۔ اسے کسی سے اتنی محبت نہیں ملی کہ وہ شادی کر لیتی، شاید اتنی فرصت بھی نہیں ملی۔ پہلے وہ اپنی ماں کی تیمارداری کرتی رہی پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے گھر کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا خالی پڑا تھا۔ وہاں اس نے اپنی ماں کے نام پر ایک پارک بنا دیا اور خود ایک یتیم خانے میں رضاکارانہ طور پر کام کرنے لگی۔ اس نے کچھ بہت اچھے دوست بھی بنا لیے تھے ورنہ وہ تنہا مر جاتی۔ جس دن فالج کا حملہ ہوا، اس روز بھی بار بار کا فون آیا تھا جب اس نے جواب نہیں دیا تو وہ سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ فوراً گھر آئی اور اسے اسپتال پہنچایا ورنہ وہ بچ نہ پاتی۔ اب بھی وہ اس کی بلی کیسی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

لگتا تھا جیسے ہیلری نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا جس میں شادی کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی اور تحقیر آمیز لہجے میں بولی۔ ''تمہیں کبھی یہ انگوٹھی پہننا نصیب نہ ہوئی۔ میری تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی بھی شادیاں ہو گئی ہیں، میرے پانچ نواسے نواسیاں ہیں لیکن تمہارے مرنے کے بعد کون تمہارا وارث ہوگا؟''

''میں نے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ لوگوں کو میری یاد دلاتا رہے گا۔'' اس بار ایکی کا لہجہ قدرے تیز تھا۔ ''جب بھی بہار کا موسم آئے گا اور بچے اس پارک میں کھیلیں گے.....''

''اپنا بازو اوپر اٹھاؤ۔'' ہیلری مداخلت کرتے ہوئے بولی۔ ''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ پہلے سیدھا ہاتھ۔ ایک، دو، تین۔ شاباش اور ٹام اگر تم اسی طرح ورزش کے گھوڑے کے ساتھ لگے رہے تو کبھی ٹھیک نہیں ہو سکو گے۔ ایکی، تم نے پھر خلا میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اسی طرح تم جم کی کلاس میں بھی کرتی تھیں اور تمہاری دن میں خواب دیکھنے کی عادت مجھے ہائی اسکول کے دوران میں بہت مہنگی پڑی تھی۔''

''کیا؟'' ایکی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں ابھی تک پچاس سال پہلے کا وہ ٹورنامنٹ یاد ہے؟''

''بالکل۔'' وہ فخریہ انداز میں بولی۔ ''میں ایتھلیٹ ہوا کرتی تھی اور میری الماری ٹرافیوں اور میڈلز سے بھری ہوئی ہے۔ ہم وہ ٹورنامنٹ بھی جیت جاتے مگر تم نے گول کرنے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔''

ایکی کا دل چاہا کہ اس کی پشت پر زوردار لات رسید کرے۔ وہ اسے پچاس سال پہلے کی بات یاد دلا کر ٹام کی نظروں میں گرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے بے دھیانی میں اپنا ہاتھ زور سے اوپر اٹھا لیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ٹام جلدی سے اس کے قریب آیا اور آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے وہ مسکرا دی۔

اسی وقت جیمس اس کی وہیل چیئر لے کر آ گیا اور بولا۔

''مس ایکی کے کمرے میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

جیمس نے سہارا دے کر ایکی کو پلیٹ فارم سے اتارنے کی کوشش کی لیکن ہیلری نے اسے منع کر دیا اور بولی۔ ''تمہیں مدد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے خود سے کوشش کرنے دو۔''

ایکی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کے کنارے تک آئی اور درد سے کراہتے ہوئے وہیل چیئر پر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹام کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب جواب میں ٹام نے بھی ایسا ہی کیا۔ جیمس اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ہیلری کی نظروں سے دور ہو گیا۔ راستے میں اس نے ایکی سے پوچھا۔ ''یہ بڑھیا کیا کہہ رہی تھی؟''

''بہ ظاہر تو یہ بڑی نامعقول سی بات ہے۔ میں ہائی اسکول کے بعد اس سے کبھی نہیں ملی۔ وہاں بھی وہ مجھ سے اسی طرح لڑتی تھی۔ وہ ابھی تک یہ سوچ کر پاگل ہو رہی ہے کہ پچاس سال پہلے وہ میری وجہ سے ہاکی ٹورنامنٹ ہار گئی تھی۔''

''وہ تم سے حسد کرتی ہے کیونکہ ٹام تمہیں پسند کرنے لگا ہے اور اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اسی لیے وہ اوچھی حرکتیں کر رہی ہے۔''

''تم نے جو کچھ ٹام کے بارے میں بتایا۔ کیا وہ سچ ہے؟'' ایکی نے پوچھا۔

''ہاں، اسے تم سے ہمدردی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہیلری تمہارے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔'' جیمس نے جواب دیا۔

یہ سنتے ہی ایکی کی ساری تھکن غائب ہو گئی۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے اپنی دوست باربرا کو فون کیا۔

''کیا تم میرا ایک کام کر سکتی ہو۔ میں نے گزشتہ جنوری میں جو ٹریک سوٹ خریدا تھا۔ وہ میری الماری کی سب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوپر والی دراز میں رکھا ہے۔ تم وہ سوٹ مجھے پہنچا دو۔''
''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' باربرا نے وعدہ کرلیا۔
ایمی نے اسپتال کے ہیئر ڈریسنگ سیلون میں جاکر بال بنوائے۔ اب اس کا ہیئر اسٹائل پہلے سے مختلف لگ رہا تھا۔ باربرا شام میں آئی۔ وہ اپنے ساتھ اس کے سوٹ کے علاوہ گھر کا بنا ہوا چکن سوپ اور سیب کا جوس بھی لائی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔
''تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ تمہارے گالوں میں سرخی جھلک رہی ہے۔''
ایمی نے کھانے کے دوران میں باربرا کو ہیلری کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کے بارے میں بتایا۔''وہ سینتالیس سالوں میں ذرا بھی نہیں بدلی۔ سوائے اس کے کہ پہلے سے زیادہ مطلبی اور حقیر ہوگئی ہے۔''
اگلی صبح ایمی نے بیماری کے بعد پہلی بار اپنے اندر خوشی محسوس کی۔ بالوں کے نئے اسٹائل کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو قدرے جوان محسوس کر رہی تھی۔ اس کا گلابی ٹریک سوٹ بہت نرم اور آرام دہ تھا۔ ایمی کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی پتلون کچھ ڈھیلی ہوگئی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس کا وزن کم ہوگیا ہے۔ اس نے ہونٹوں پر گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائی اور آئینے میں اپنا جائزہ لے کر مطمئن ہوگئی۔
جیمس اس کے لیے وہیل چیئر لے کر آیا تو اس کے ہونٹوں سے بے اختیار سیٹی نکل گئی اور بولا ۔''زبردست تم تو پہچانی نہیں جا رہی ہو۔''
ٹام نے ایمی کو دیکھا تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ خود بھی بن سنور کر آیا تھا۔ اس نے نیوی بلیو سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کے سفید بالوں اور نیلی آنکھوں سے خوب میل کھا رہا تھا۔
''تم واقعی بہت اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے ایمی سے کہا۔
''تم بھی۔'' ایمی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔
''ہم یہاں کام کرنے آئے ہیں۔'' ہیلری نے اپنے نتھنے سکیڑتے ہوئے کہا۔''اگر تم اتنی ہی توجہ اپنی ایکسرسائز پر دیتیں جتنی کہ بننے سنورنے پر دی ہے تو اب تک صحت یاب ہوکر گھر جا چکے ہوتے۔''
''میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنی سطحی باتیں بھی کرسکتی ہو۔'' ایمی نے کہا۔
''اسپتال کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے مس۔'' ہیلری نے طنزاً کہا۔''ہم حقائق کو دیکھتے ہیں۔ تم اس وقت تک گھر نہیں جاسکتیں جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں۔''

اس روز ہیلری نے کچھ زیادہ ہی سخت قسم کی مشقیں کروائیں۔ ایمی اتنی تھک گئی تھی کہ اپنے کمرے میں پہنچ کر اسے اسپتال کے کپڑے پہننے کا بھی ہوش نہ رہا اور وہ اسی حلیے میں اپنے بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کی آنکھ رات کے کھانے کے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سے کھلی۔ اس نے ٹام کو اپنے بستر کے برابر بیٹھے ہوئے دیکھا۔
''اوہ، تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟''
''میں دیکھ رہا تھا کہ تم سوتے میں کتنی خوب صورت لگتی ہو۔''
''اس بڑھاپے میں تم نے خوب صورتی کہاں دیکھ لی۔'' وہ تھوڑا سا شرماتے ہوئے بولی۔
''تم اپنے آپ کو کمتر مت سمجھو۔ میں جانتا ہوں کہ ہیلری بہت بری عورت ہے اور اس کی بے ہودہ باتیں سن کر پریشان ہو جاتی ہو۔''
''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''
''تم ایسی ہی پیاری نظر آؤ جیسی کہ ہو۔'' ٹام نے یہ کہہ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایمی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے ٹام کی جانب سے اتنی جلدی پیش قدمی کی توقع نہیں تھی۔
''آج کے بعد اگر وہ تم سے ایسی باتیں کرے تو یاد رکھنا کہ تم پوری طرح میری ہوچکی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ اس پر جھکا اور اس کے ساتھ ہی ایمی کے دل سے اسپتال کی وحشت رخصت ہوگئی۔
اس روز ٹام نے ایمی کے کمرے میں ہی ڈنر کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی صحت میں بہتری آرہی تھی۔ اب انہیں نس میں لگنے والے انجکشن کی ضرورت نہیں رہی تھی اور وہیل چیئر کی جگہ بھی واکر نے لے لی تھی جبکہ دوسرے مریض اس لحاظ سے خوش قسمت نہیں رہے۔ بیٹی کو انفیکشن ہوگیا تھا اس لیے اسے ایک علیحدہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔
شام کے اوقات میں ٹام اور ایمی بڑے ہال میں چہل قدمی کرتے اور ایک دوسرے کو اپنے حالات کے بارے میں بتاتے۔
''مارتھا کے انتقال کے بعد سے میں تنہا زندگی گزار رہا ہوں۔ میری دو بیٹیاں کیری اور کیتھی اور چار نواسے نواسیاں ہیں۔ سب لوگوں کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا ہے لیکن اس کے باوجود زندگی بے کیف سی لگتی ہے۔''
جب اس کی بیٹیاں ملنے آئیں تو ٹام نے فخریہ انداز میں ایمی سے ان کا تعارف کروایا۔ کیری اور کیتھی دونوں ہی اچھی فطرت رکھتی تھیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی

تھیں اور اس کے لیے گھر کی بنی ہوئی کئی چیزیں لے کر آئی تھیں۔ ایمی نے بھی ٹام کو اپنی کئی دوستوں سے ملوایا۔ وہ اس کے لیے مختلف رنگوں کے ٹریک سوٹ لے کر آئی تھیں۔ اس طرح ایمی ہفتے کے سات دن الگ الگ رنگ کا ٹریک سوٹ پہن سکتی تھی۔
ایمی اور ٹام کا تعلق دوسرے لوگوں سے مخفی نہ رہ سکا اور اسپتال کی نرسوں نے انہیں لوبرڈ کہنا شروع کر دیا۔ اب ایمی کی دوستوں نے بھی آنا کم کر دیا تھا تاکہ اس جوڑے کو زیادہ سے زیادہ تنہائی میسر آسکے۔ ایمی کا کمرا پھولوں، غباروں اور کارڈز سے بھر گیا۔ رات میں وہ دونوں لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفے پر برابر برابر بیٹھ جاتے۔ ٹام ٹی وی کا سوئچ بند کر دیتا تاکہ کوئی انہیں تنگ نہ کرے۔ ایمی کو زندگی میں پہلی بار کسی کی محبت ملی تھی اور وہ اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔
جیسے جیسے ان کے پیار میں شدت آتی گئی۔ ہیلری کی نفرت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تنگ آکر ایمی نے مسز جان سے شکایت کر دی جو مریضوں کی نمائندہ تھی اور ہر سوموار کو اسپتال کا دورہ کیا کرتی تھی۔
''میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس کی شکایت نہ کروں لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔'' ایمی نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
''کوئی بات نہیں۔ اگر تمہیں کوئی مسئلہ ہے تو کسی وقت بھی میرے پاس آسکتی ہو۔'' مسز جان نے کہا۔
جب ایمی نے اسے ہیلری کی زیادتیوں کی تفصیل بتائی تو وہ بولی۔''یہ تو بہت تکلیف دہ بات ہے۔ میں کل تمہاری کلاس میں آؤں گی اور بذات خود اس کا مشاہدہ کروں گی۔''
یہ بات سن کر ایمی کی امید دم توڑ گئی۔ ظاہر ہے کہ مسز جان کی موجودگی میں ہیلری محتاط ہو جاتی اور کوئی ایسی حرکت نہ کرتی جس سے اس کا منفی تاثر قائم ہوتا۔ ایمی کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ دوسرے دن مسز جان کلاس میں داخل ہوئی اور خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ ہیلری نے اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بدستور اپنے کام میں مصروف رہی۔
''یہاں آؤ ایمی۔'' اس نے بڑے پیار سے ایمی کو اپنے پاس بلایا اور انتہائی میٹھے لہجے میں بولی۔''صرف ایک بار ہاتھ پیر اوپر کر کے اٹھاؤ۔ صرف ایک بار۔''
کلاس ختم ہونے کے بعد مسز جان اس کے کمرے میں آئی اور بولی۔''میں جانتی ہوں کہ ہیلری کبھی کبھی کھردرے لہجے میں بات کرتی ہے لیکن وہ یہ سب کچھ تمہاری بھلائی کے

لیے ہی کرتی ہے اور تمہارا ناراض ہونا بھی ایک فطری عمل ہے، اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ تم تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہو۔''
ایمی کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ مسز جان بولی۔
''تم اپنی بہتری کے لیے یہ ایکسرسائز جاری رکھو۔ اس طرح کی چھوٹی موٹی باتیں تو ہوتی رہتی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایمی کا شانہ تھپتھپایا اور چلی گئی۔ ایمی نے دیکھا کہ ہیلری دروازے کی آڑ میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔
دوسرے دن ہیلری نے اور بھی زیادہ سخت اور مشکل مشقیں کروائیں جو ایمی کی برداشت سے باہر تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بے ہوش ہوگئی۔ اس کا بلڈ پریشر بھی بڑھ گیا تھا۔ نرس بھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی اور اس نے فوراً اس کے نیورولوجسٹ ڈاکٹر بلیک کو اطلاع دی۔ ڈاکٹر کو جب پوری بات معلوم ہوئی تو اس نے ہیلری کو آڑے ہاتھوں لیا۔
''تم نے میری مریضہ کو اس حال تک پہنچایا ہے۔''
''میں نہیں جانتی تھی کہ......'' ہیلری نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔
''تمہیں جاننا چاہیے، یہ تمہارے فرائض میں شامل ہے۔ جانتی ہو کہ وہ ایک بیمار عورت ہے۔ اس کے باوجود تم نے اس سے اتنی سخت مشقیں کروائیں۔ میں تمہیں ایمی کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اسے تم میری طرف سے وارننگ سمجھو۔ ایمی ایک دن مکمل طور پر بستر میں رہنا ہوگا۔''
رات کے کھانے کے وقت ایمی کی آنکھ کھلی تو اس نے ٹام کو اپنے پاس بیٹھے پایا۔ وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔
''تمہارے نیورولوجسٹ نے ہیلری سے جو کچھ کہا وہ سب میں نے سن لیا ہے۔ اس لیے آج وہ کافی خاموش تھی۔'' پھر اس نے ایمی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔''کیا تم کل میرے ساتھ اسپتال کی کافی شاپ میں ڈنر کرنا پسند کرو گی؟''
ایمی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ایمی نے اگلے دن خاصا اہتمام کیا اور پورا دن تیار ہونے میں لگا دیا۔ اس نے ایک بار پھر ہیئر ڈریسنگ سیلون میں جاکر اپنے بال نئے سرے سے بنوائے۔ ناخنوں پر گلابی نیل پالش لگائی۔ سیاہ سوٹ پہنا اور کانوں میں وہ بالیاں پہن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیں جو بار برا اس کے لیے لائی تھی۔ ٹام نے بھی کچھ کم تیاری نہیں کی تھی۔ اس نے اپنا وہی نیوی بلیو رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جو ایمی کو بہت پسند تھا۔ ان دونوں نے اپنے واکرز کافی شاپ کی سیڑھیوں کے نیچے رکھے۔ ہوسٹس انہیں ایک کونے کے کیبن میں لے گئی جو پہلے سے ان کے لیے مخصوص تھا۔ اس کی میز پر ایک شمع اور گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔

"یہ پھول تمہارے لیے ہے۔" ٹام نے وہ گلاب اسے پیش کرتے ہوئے کہا۔

اس ملاقات میں ایمی نے ٹام کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ماں کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں جتنا عرصہ گزرا، دوستوں کے ساتھ رہ کر اس نے کس طرح اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں کی بھلائی کے لیے رضاکارانہ خدمات انجام دیں اور آخر میں اس نے اپنی بلی کیسی کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"تمہیں بھی بلیاں پسند ہیں۔" ٹام نے پوچھا۔ "میرے پاس بھی ایک بلی ہے، میں اسے دلبر کہہ کر بلاتا ہوں۔ ان دنوں میری بیٹی کیرن اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔"

"لگتا ہے کہ ہمارے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔"

"بالکل۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" ٹام نے کہا اور اچانک ہی خاموش ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مخملی ڈبیا نکالی جس میں ایک ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ایمی! کیا تم میری بیوی بننا پسند کرو گی؟"

"تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" ایمی حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ جلد بازی نہیں ہے؟ میں تم سے کبھی اس اسپتال کے باہر نہیں ملی۔ کبھی تمہارے گھر نہیں گئی اور نہ ہی تم میرے گھر آئے۔ ہم تو ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں۔"

"ہم یہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد شادی کر سکتے ہیں۔ ہم نے مشکل حالات میں ایک دوسرے کو سمجھ لیا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے، مجھے تمہارے ساتھ رہ کر خوشی ہوگی۔"

"تم جانتے ہو کہ میری عمر بہت زیادہ ہے۔"

ٹام نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "ہوگی لیکن میرے لیے بالکل مناسب ہے۔"

اس کے بعد ایمی مختلف خدشات کا اظہار کرتی رہی اور ٹام ان سب کا جواب دیتا گیا۔ یہاں تک کہ شمع بجھ گئی اور شاپ سے آخری گاہک بھی چلا گیا۔ بیروں نے ساری میزیں صاف کر دی تھیں اور فرش پر پوچا لگا رہے تھے۔ ٹام نے اس سے پہلے ایک بار پھر کہا۔

"ایمی! ہم دونوں زیادہ عرصے زندہ نہیں رہ سکیں گے کیوں نہ بقیہ عمر سے پوری طرح لطف اندوز ہو لیں۔ پلیز مجھ سے شادی کر لو۔"

ایمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے اتنی خوب صورت انگوٹھی کہاں سے خریدی؟"

"میرا دوست جیک کارمر، جیولری شاپ کا مالک ہے یہ انگوٹھی اسی نے منتخب کی ہے، کیا تمہیں پسند نہیں آئی؟"

"نہیں، بہت اچھی ہے لیکن یہ سب کچھ اچانک ہو گیا۔ مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔"

یہ کہہ کر اس نے انگوٹھی کی ڈبیا اپنی جیب میں رکھ لی۔ وہ بہت خوش تھی اور اپنے آپ کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ٹام اسے کمرے کے دروازے تک چھوڑنے آیا اور اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔

"اس خوب صورت شام کے لیے تمہارا شکریہ۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب مجھے اپنے کمرے میں جانا چاہیے۔"

ایمی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی جب اس کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو وہ بھی اپنے بستر پر آ گئی اور سرہانے وہ گلاب رکھ لیا جو ٹام نے اسے دیا تھا۔

اس رات وہ ٹھیک طرح سے سو نہ سکی۔ اس کے ذہن میں امیدیں، امکانات، وسوسے اور خدشات سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ صبح جب بار برا ملنے آئی تو اس نے یہ خبر اسے بھی دی۔ وہ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولی۔

"واہ، یہ تو بڑی زبردست خبر ہے۔ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ ہولناک بیماری تمہیں ایک نئی زندگی کی طرف لے جائے گی۔ اگر، میں پریشان ہونے والی تو کوئی بات ہی نہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ایمی بولی "لیکن میں ٹام کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتی۔ گو کہ وہ ہمارے ہی علاقے میں رہتا ہے لیکن میں پہلے کبھی اس سے یا اس کی مرحومہ بیوی سے نہیں ملی۔ نہ جانے اس کا ماضی کیسا ہے؟ وہ اب تک کیا کرتا رہا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بس وہی کچھ جانتی ہوں جو اس نے خود بتایا ہے۔"

"میں آج ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے چرچ جا رہی ہوں۔" بار برا بولی۔ "تم تو جانتی ہو کہ اس طرح کی ملاقاتوں میں گپ شپ کا بھی موقع مل جاتا ہے۔ کوشش کروں گی کہ اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔"

دوسرے دن ایمی کلاس میں گئی تو ایلس اپنے پلیٹ فارم پر موجود نہیں تھی اور اس کی ساتھی بیٹی اکیلے ہی مشقیں کر رہی تھی۔ اس نے ہیلری سے پوچھا۔ "کیا ایلس گھر چلی گئی؟"

"نہیں۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کیا اس کی تکلیف بڑھ گئی ہے؟"

"تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔" ہیلری نے ناگواری سے کہا۔

ایمی کا دل چاہا کہ اس کا منہ نوچ لے۔ پتا نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے لیکن ٹام کے اشارہ کرنے پر وہ خاموش رہی۔ اس شام ٹام جب اس سے ملنے آیا تو کافی پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے ایمی کو بتایا۔

"میرے روم میٹ مسٹر ولیم کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹرز ان کا مسلسل معائنہ کر رہے ہیں۔"

"خدا خیر کرے۔" ایمی ہمدردی سے بولی۔ "میں ان کے لیے دعا کروں گی۔"

"میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔" ٹام اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اتنی جلدی کیا ہے، تھوڑا سا انتظار کر لو۔"

دوسری صبح بار برا اس سے ملنے آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔ "میں نے ٹام کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مخلص اور وفادار انسان ہے۔ اس نے جہاں تک ممکن ہو سکا اپنی بیوی کی آخر وقت تک خدمت گزاری کی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کی بیوی کی بیماری کے دوران میں محلے کی کچھ عورتوں نے ٹام پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن اس نے انہیں بالکل بھی منہ نہیں لگایا اور ہمیشہ اپنی بیوی کا وفادار رہا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس کا کچھ عورتوں سے ہلکا سا تعلق رہا لیکن یہ کوئی اتنی سنجیدہ بات نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوگا۔"

"میں جانتی ہوں۔" ایمی بولی۔ "اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔"

"میرے پاس اور بھی بہت سی معلومات ہیں۔ تم سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔" بار برا پُرجوش لہجے میں بولی۔

"ہیلری کا شوہر مین دس سال پہلے اسے چھوڑ کر اپنی سیکریٹری کے ساتھ میکسیکو چلا گیا تھا۔ اب ہیلری اپنی

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

خبطی — محی الدین نواب

سچائی اور دانائی کا راستہ ہر شخص کا منتظر رہتا ہے لیکن اس راستے کو بہت کم لوگ منتخب کرتے ہیں..... سچ اور جھوٹ کا انوکھا امتزاج

للکار — طاہر جاوید مغل

جانِ للکار..... عمران کی زندگی کے گمشدہ اوراق جس کی ہر سطر میں جوش جستجو اور سنسنی پنہاں تھی

گرداب — اسما قادری

ماہ بانو کی نہ ختم ہونے والی مشکلات..... جو ہر دفعہ اسے ایک نئے دوراہے پر لا کھڑا کر دیتی ہیں.....

سرورق کے رنگ

مدفن — مریم کے خان

ظلم اور جبر کا دورانیہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو..... مکافاتِ عمل کا ایک دن ضرور آتا ہے

مسافتیں — سلیم فاروقی

زندگی کی اونچی نیچی پگڈنڈیاں جہاں ہر قدم لغزش کی زد میں تھا

جرم کہانیاں

ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی واقعہ مضمر ہوتا ہے..... انہی تغیرات سے جنم لینے والی..... ناقابل فراموش کہانیاں

چینی نکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... آپ کے قلم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزر اوقات کے لیے یہ ملازمت کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بیٹی بھی اس کی مدد کرتی ہے۔''

''مجھے ہیلری کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' ایمی بےزاری سے بولی۔

اگلی صبح ایمی بیدار ہوئی تو ایک اور خیال اسے پریشان کر رہا تھا اور وہ اس سلسلے میں ٹام سے فوراً بات کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ سیدھی اس کے کمرے میں چلی گئی جہاں مسٹر ولیم زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ ٹام فکرمندی سے بولا۔

''کئی ڈاکٹر ان کا معائنہ کر چکے ہیں لیکن ان کی حالت میں کوئی بہتری نظر نہیں آ رہی۔''

''تم میرے کمرے میں چلو۔ میں انہیں بےآرام نہیں کرنا چاہتی۔'' ایمی بولی۔

اپنے کمرے میں آ کر ایمی نے اس سے کہا۔ ''کیرن اور کیتھی کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔ شاید وہ سوتیلی ماں کو قبول نہ کر سکیں؟''

''میری بیٹیاں یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گی۔ وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔''

''باتوں کی حد تک تو ٹھیک ہے۔'' ایمی بولی۔ ''لیکن پیسا ایک بہت بڑی حقیقت ہے، کیا تمہارے بچے تمہاری دولت میں اپنے حصے سے محروم ہونا چاہیں گے؟''

ٹام نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''میرے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ بینک میں تھا وہ مارتھا کی بیماری میں ختم ہو گیا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنا مکان بھی بیچنا پڑا اور میں کرائے کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ اگر تم چاہو تو وکیل کے ذریعے ایک ایسا معاہدہ تیار کروایا جا سکتا ہے جس کے تحت ہم ایک دوسرے کے اثاثوں پر اپنا حق نہیں جتا سکیں گے ویسے میرا ابھی جلدی مرنے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''میں بھی کافی عرصے تک زندہ رہنا چاہتی ہوں۔'' ایمی بولی۔

''ایسی صورت میں ہمیں فوراً شادی کر لینی چاہیے۔''

ایمی نے اپنی دراز میں سے وہ ڈبیا نکالی اور ٹام کو پکڑا دی۔ وہ مسکرایا اور انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی۔

اس روز ایمی سارا دن ہال میں اپنا بایاں ہاتھ باہر نکالے پھرتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ سب لوگ اس کی انگوٹھی دیکھیں۔ بالآخر ایک نرس سے رہا نہ گیا اور وہ بولی۔ ''تمہیں یہ انگوٹھی سیف میں رکھوا دینی چاہیے۔ اسپتال میں اس کے چوری ہونے کا خطرہ ہے۔''

''میں اسے پہنے رہوں گی۔'' ایمی نے جواب دیا۔ وہ اس انگوٹھی کو کیسے اتار سکتی تھی۔ یہ ٹام کی نشانی تھی۔ وہ کاش میں بھی یہ انگوٹھی پہن کر گئی۔ ہیلری کی نظر انگوٹھی پر پڑی تو وہ بولی۔

''کیا تم نے اس سے منگنی کر لی؟'' انداز ایسا تھا جیسے وہ اس پر الزام لگا رہی ہو۔

''ہاں۔'' ایمی اتراتے ہوئے بولی۔ ''ہم یہاں سے ڈسچارج ہوتے ہی شادی کر لیں گے۔''

''اس عمر میں شادی کر کے تم حماقت کرو گی۔'' ہیلری بولی۔ ''تمہاری حیثیت ایک نرس سے زیادہ نہ ہوگی۔''

''کم از کم میرے پاس ایک شوہر تو ہوگا جو اچھے برے وقت میں میرا ساتھ دے سکے۔''

ہیلری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ ایمی اس پر طنز کر رہی ہے۔ شاید اسے ہیلری کے نکھٹو شوہر کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا۔ اس روز اس نے ایمی کے ساتھ ساتھ ٹام کی بھی بہت بےعزتی کی، تاہم وہ دونوں خاموشی سے برداشت کرتے رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہیلری سے الجھنا ان کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ وہ ان کی خوشیوں کو تباہ کرنے کی طاقت رکھتی تھی کیونکہ اس کی کلیئرنس کے بغیر ان دونوں میں سے کوئی بھی اسپتال سے ڈسچارج نہیں ہو سکتا تھا۔

ان دنوں ایمی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نے ٹام کے ساتھ مل کر پروگرام بنایا کہ ان کی شادی اسی پارک میں ہوگی جو ایمی نے اپنی ماں کے نام پر بنوایا تھا۔ ایمی کا خیال تھا کہ اس طرح اسے اپنی ماں کی موجودگی کا احساس ہوگا اور اس کی روح بھی خوش ہو جائے گی۔

''ہم خزاں میں شادی کریں گے۔ مجھے یہ موسم ہمیشہ سے ہی پسند ہے۔'' ایمی نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔

''اس موقعے پر میری خاص پہلی بار برا ہوگی، تمہاری فیملی اور سارے دوست بھی موجود ہوں گے۔ البتہ شادی کی دعوت ہم گھر پر بھی کر سکتے ہیں۔''

''شادی کے بعد بھی ہم تمہارے مکان میں ہی رہیں گے۔'' ٹام بولا ''کیونکہ میرا اپارٹمنٹ بہت چھوٹا ہے اس لیے ہم تمہارے مکان میں آرام سے رہ سکیں گے بشرطیکہ تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' ایمی خوش دلی سے بولی۔

منگنی کے بعد ایمی کی صحت تیزی سے بہتر ہو رہی تھی۔ اس کے نیورولوجسٹ نے بھی یہ بات نوٹ کی اور بولا۔

''ہیلری نے تمہاری پروگریس کے بارے میں اچھی رپورٹ دی ہے۔''

''اچھا!'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''اب تک تم کتنا وزن کم کر چکی ہو؟'' ڈاکٹر بلیک نے پوچھا۔

''اکتیس پونڈز۔'' ایمی نے جواب دیا۔

''ویری گڈ۔ اب تمہارا وزن نہیں بڑھنا چاہیے، تم دو دن بعد گھر جا سکتی ہو۔''

''اوہ۔'' ایمی بولی۔ ''مجھے یہاں صرف ایک مہینا ہوا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمیشہ سے ہی یہاں رہ رہی ہوں۔''

ایمی کی خوشی ادھوری رہ گئی جب اسے معلوم ہوا کہ ٹام کو مزید کچھ عرصہ اسپتال میں رہنا ہوگا۔ اس کی حالت تسلی بخش نہیں تھی۔ یہ بات ٹام نے اسے خود بتائی تھی۔

''ہیلری نے میرے ڈاکٹر کو رپورٹ دی ہے کہ میں فی الحال اس قابل نہیں کہ خود چل کر باتھ روم جا سکوں یا کار میں سواری کر سکوں۔ میری بیٹیاں مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہ رہی تھیں مگر ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی جب تک میں یہ سارے کام خود کرنے کے قابل نہ ہو جاؤں۔''

''تم یہ سارے کام اب بھی کر سکتے ہو۔'' ایمی نے کہا۔ ''ہم اس ہال میں دن بھر چلتے رہتے ہیں۔ دیکھنے میں تم بالکل ٹھیک لگتے ہو، ایکسرسائز بھی کر رہے ہو اور تم نے اپنا وزن بھی کم کر لیا ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔ میں نے پندرہ پونڈ وزن کم کیا ہے۔''

''پھر کیا وجہ ہے کہ تم گھر نہیں جا سکتے؟''

''میں نے یہی بات ڈاکٹر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ قائل نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ سب مریض گھر جانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ جب تک ہیلری مطمئن نہیں ہو جاتی۔ وہ مجھے اسپتال سے ڈسچارج نہیں کرے گا۔''

''وہ کبھی تمہیں گھر نہیں جانے دے گی۔'' ایمی نے کہا۔ ''وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے، وہ ہماری منگنی کا سن کر حسد کرنے لگی ہے۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے ساری عمر یہاں نہیں رکھ سکتی۔'' ٹام ہنستے ہوئے بولا۔ ''ویسے بھی دسمبر تک میرے انشورنس کی میعاد ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد اسپتال والے مجھے خود ہی چلتا کر دیں گے۔''

جب وہ دونوں واپس آئے تو انہوں نے ٹام کے کمرے میں ڈاکٹر اور نرسوں کا ہجوم دیکھا۔ ٹام بولا۔ ''بےچارہ ولیم! نرس کہہ رہی تھی کہ اسے انفیکشن ہو گیا ہے۔''

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی نرس باہر آئی اور بولی۔ ''تمہیں

MoB: 0300-2219514,0344-2609828
Tel: 021-34519074
معقول فیس میں ہنرمند بنیں
بذریعہ ڈاک
SMS
ہنر سیکھیے روزگار لیجیے
صبح 9 بجے تا شام 5 بجے
Registered with CBR
Govt. of Pakistan
حکمت
ڈسپنسر
ایکوپنکچر
کشیدہ کاری
لیڈیز ٹیلرنگ
U.P.S
کیمیکل
بیوٹی پارلر
یوگا
کمپیوٹر
سرویئر
فارمیسی
میجک
ویلڈنگ
حجامہ
دی انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر 3349 ملیر سعود آباد کراچی 75080

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ دیر باہر ہی انتظار کرنا ہوگا۔ ہم مسٹر ولیم کو آئسولیشن روم میں منتقل کر رہے ہیں۔"

"میں نے کسی میگزین میں پڑھا تھا کہ یہ جراثیم مریضوں میں ایک دوسرے سے منتقل ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ہر سال دس لاکھ لوگوں کی موت واقع ہوتی ہے۔ جتنے دن تم یہاں رہو گے۔ خطرہ بڑھتا ہی جائے گا۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔" ایمی خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میرے بس میں کچھ نہیں۔" ٹام بولا۔ "صرف ہیلری ہی مجھے اس خطرے سے نجات دلا سکتی ہے۔"

اس رات ایمی ٹھیک طرح سو نہ سکی۔ اسے ہر طرف موت نظر آ رہی تھی۔ یہ جراثیم کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ ٹام کی میز کے نیچے، فرش پر، بغیر دھلے برتنوں میں۔ وہ گھبرا کر کمرے سے باہر چلی آئی۔ اس کا رخ ٹام کے کمرے کی جانب تھا، وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ ایمی واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے محبوب کی زندگی بچائے گی۔

دوسری صبح وہ وقت سے پہلے ہی مشقوں کے لیے چلی گئی۔ ہیلری اسے دیکھ کر حیران تو ہوئی لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایمی بول پڑی۔ "میں تم سے ٹام کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ اس کا گھر جانا بہت ضروری ہے۔"

"جب تک اس کا علاج مکمل نہیں ہو جاتا وہ گھر کیسے جا سکتا ہے؟"

"تم جانتی ہو کہ اسپتال کے مریضوں میں انفیکشن پھیل رہا ہے جو ٹام کے لیے بھی خطرناک ہے۔"

"ایسے مریضوں کو علیحدہ رکھا جاتا ہے، ٹام بالکل محفوظ ہے۔"

"یہاں کوئی محفوظ نہیں۔" ایمی بولی۔ "بیٹی، ایلس اور مسٹر ولیم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔"

"تم اتنی مایوس کیوں ہو رہی ہو؟" ہیلری طنزاً بولی۔ "ویسے بھی تم نے چھپن سال مرد کے بغیر گزار لیے۔ چند برس اور اسی طرح رہ لو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

ٹام کلاس میں آیا تو خاصا پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے ایمی کو بتایا کہ مسٹر ولیم کا رات میں انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر ایمی خوفزدہ ہو گئی۔ ٹام کا بستر بھی تو مسٹر ولیم کے برابر میں ہی تھا۔ اسی طرح کلاس میں بھی بیٹی اور ایلس اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ایمی کا دل مشقوں میں بالکل نہیں لگا اور وہ سارا وقت یہی سوچتی رہی کہ ٹام کی زندگی کس طرح بچائی جائے؟

وہ بدحواسی کے عالم میں کلاس سے نکلی اور بے مقصد اسپتال میں ٹہلنے لگی۔ گفٹ شاپ کے برابر میں نصب اے ٹی ایم مشین پر اس کی نظر پڑی تو اچانک ہی اسے ٹام کی زندگی بچانے کا طریقہ سوجھ گیا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ہیلری کی کلاس ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ آہستہ آہستہ لفٹ کی طرف گئی اور اس کی کلاس ختم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

ہیلری اس وقت اپنے کمرے میں تنہا تھی اور چادریں سمیٹ کر لانڈری بیگ میں رکھ رہی تھی۔ ایمی کو دیکھتے ہی بولی۔

"تم کل جا رہی ہو؟"

"میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔" ایمی بولی۔ "میرا مکان اونچائی پر واقع ہے اور مجھے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے مزید مشق کی ضرورت ہے۔"

"تم نے پہلے ہی کلاس میں سیڑھیاں چڑھنے کی کافی مشق کر لی ہے۔" ہیلری لکڑی کی سیڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "تم محض اپنے دوست کے ساتھ رہنے کا بہانہ ڈھونڈ رہی ہو۔ بہرحال کل صبح گیارہ بجے تمہاری روانگی ہے۔"

"میں خود بھی جانا چاہتی ہوں۔" ایمی نے کہا۔ "لیکن میرے مکان کی بیس سیڑھیاں ہیں۔ اس لیے مجھے کسی بڑی سیڑھی پر مشق کی ضرورت ہے جیسی کہ آگ بجھانے والوں کے پاس ہوتی ہے۔"

"یہ اسپتال کے قوانین کے خلاف ہے۔" ہیلری بولی۔ "ہمارے پاس ایک ایسی سیڑھی ہے لیکن میں تمہیں اس پر مشق نہیں کروا سکتی۔ ویسے بھی وہ سیڑھی سارا دن اسپتال کے عملے کے استعمال میں رہتی ہے۔"

"میں اپنے گھر کی سیڑھیوں سے گرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" ایمی نے کہا۔ "اگر تم مجھے پرائیویٹ طور پر مشق کروا دو تو میں تمہیں سو ڈالرز دوں گی۔"

ہیلری لالچ میں آ گئی۔ پیسا ہمیشہ سے اس کی کمزوری اور ضرورت رہا تھا۔ اس نے اپنا بھاؤ بڑھانے کے لیے کہا۔

"اس کام میں خطرہ بہت ہے۔ اس لیے دو سو ڈالرز لوں گی۔ یہ مشق صبح چار بجے ہوگی، اس وقت یہ سیڑھی فارغ ہوتی ہے کیونکہ رات میں لوگ زیادہ تر لفٹ کا استعمال کرتے ہیں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" ایمی بولی۔ "اس طرح میں صبح چھ بجے نرس کے آنے سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ جاؤں گی۔"

"مجھے نقد رقم چاہیے۔" ہیلری نے کہا۔

"مل جائے گی۔"

وہ اپنا واکر گھسیٹتے ہوئے اے ٹی ایم مشین تک گئی اور وہاں سے دو سو ڈالرز نکالے پھر اس نے گفٹ شاپ سے ٹام

کے لیے ایک نیا جاسوسی ناول خریدا۔ جب ایمی نے یہ ناول اسے دیا تو وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم ناراض ہو، اسی لیے کسی کو خدا حافظ کہے بغیر کلاس سے چلی آئیں۔"

"میں یہ سن کر پریشان ہو گئی تھی کہ مزید لوگ اس انفیکشن میں مبتلا ہو گئے ہیں، سچ پوچھو تو میں تمہارے بارے میں فکرمند ہوں۔"

ٹام نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کوئی میرے لیے بھی فکرمند ہوتا ہے۔"

ایمی اور ٹام دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب ٹام کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں تو ایمی نے چپکے سے اس کا گفٹ بیگ اٹھایا اور اپنے واکر کے خانے میں رکھ لیا پھر وہ ہال کے آخری سرے تک گئی جہاں ایک کوڑے دان میں پلاسٹک کی استعمال شدہ ٹیوبیں رکھی جاتی تھیں۔ اس نے ایک لمبا پلاسٹک کا ٹکڑا اٹھایا اور اسے رول کر کے گفٹ بیگ میں رکھ لیا پھر وہ اپنے کمرے میں گئی اور اپنی دراز سے چپکانے والا ٹیپ اور ایک چھوٹی قینچی نکال کر بیگ میں رکھ لی۔ وہ دو جوڑی دستانوں کا پہلے ہی انتظام کر چکی تھی۔

ایمی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ سوتی نہ رہ جائے لیکن وہ لاشعوری طور پر ساڑھے تین بجے ہی جاگ گئی اور وقت گزاری کے لیے ہال میں پڑی بینچ پر بیٹھ کر پرانے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ اچانک ہی لاؤڈ اسپیکر پر ہنگامی صورت حال کا اعلان ہو گیا اور تمام ڈاکٹرز، نرسیں ایک کمرے کی جانب لپکے۔ شاید کسی مریض کی حالت بگڑ گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں بالکل سناٹا ہو گیا۔ ایمی نے موقع غنیمت جان کر سیڑھیوں کی طرف والا دروازہ کھولا۔ دستانے پہنے، پلاسٹک کی ٹیوب کو سیڑھی کے آر پار پھیلایا اور اس کے دونوں سروں پر ٹیپ چسپاں کر دیا گو کہ اسے تھکن تو نہیں ہوئی لیکن اس کا سانس ضرور پھول گیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ایمی واپس ہال میں آ گئی اور دوبارہ پرانے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ چار بجنے میں پانچ منٹ پر ہیلری بھی آ گئی۔ اس نے پہلا سوال پیسوں کے بارے میں کیا۔ ایمی نے فوراً ہی اپنی جیب سے وہ رقم نکال کر اسے پکڑا دی۔ ہیلری نے اسے اشارہ کیا اور وہ آہستہ آہستہ آگ بجھانے والی سیڑھی پر چڑھنے لگی۔ جب وہ واپس آ رہی تھی تو ایک سیڑھی پر پہلے لڑکھڑائی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"تم نے ایک بار پھر اپنا دھیان ہٹا دیا۔" ہیلری بولی۔ "تم اسکول میں بھی اسی طرح کیا کرتی تھیں۔ میں بتاتی ہوں کہ سیڑھیاں کس طرح اترنی چاہئیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایمی کے ہاتھ سے واکر لے لیا اور نیچے جانے والی سیڑھی کی طرف قدم بڑھایا۔ واکر کا نچلا حصہ پلاسٹک کی ٹیوب میں پھنس گیا جو ایمی نے سیڑھی کے آر پار چپکا رکھی تھی۔ ہیلری لڑکھڑا کر گری۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔ ایمی نے جلدی سے واکر باسکٹ میں سے دستانوں کی دوسری جوڑی نکالی۔ پلاسٹک کی ٹیوب اور ٹیپ کو ریلنگ سے علیحدہ کیا اور دونوں چیزیں باسکٹ میں ڈال دیں۔

ہیلری بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کی گردن ہاکی اسٹک کی طرح ایک خاص زاویے سے مڑ گئی تھی۔ ایمی نے اس کی جیب سے دو سو ڈالرز نکالے اور گفٹ بیگ میں رکھ لیے۔ اگر یہ ڈالرز ہیلری کی جیب سے برآمد ہوتے تو لوگوں کے ذہنوں میں کئی سوالات جنم لے سکتے تھے۔ چھ بجے کے قریب نرس اس کے کمرے میں آئی اور معمول کے مطابق اس کا بلڈ پریشر اور ٹمپریچر وغیرہ چیک کیا۔ تھوڑی دیر بعد باربرا بھی آ گئی اور اس کا سامان پیک کرنے میں مدد کرنے لگی۔ رخصت ہوتے وقت وہ ٹام سے ملنے گئی اور وعدہ کیا کہ وہ روزانہ اس سے ملنے آیا کرے گی۔

ہیلری کی جگہ دوسری فزیوتھراپسٹ آ گئی۔ یہ ایک جوان اور خوش اخلاق لڑکی تھی جس نے حال ہی میں کالج سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ صاف دل اور نرم مزاج تھی اور ہیلری کی طرح لوگوں سے بغض اور کینہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے ٹام کا معائنہ کیا اور دو دن بعد اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ایمی کو اپنے کیے پر کوئی افسوس نہیں تھا بلکہ وہ مطمئن تھی کہ اس طرح اس نے ٹام اور دوسرے فالج زدہ مریضوں کی زندگی بچا لی تھی۔

ایمی اور ٹام نے خزاں کا موسم شروع ہوتے ہی شادی کر لی۔ تقریب کے دوران میں ایمی ہاتھوں میں گلدستہ لیے اپنی ماں کو یاد کر رہی تھی۔ باربرا نے اس موقعے پر دلہن کی سہیلی کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ٹام نے اپنی دلہن کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہی کہ اس بار ہمارے لیے خزاں بھی بہار بن کر آئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے ہیلری کا کرخت چہرہ آ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اس کی زندگی میں ایسا ممکن تھا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اذیتوں کے گرداب میں الجھی ایک معصوم دوشیزہ کی داستانِ الم

پارسائی

مُحی الدین نواب

سچ ہی کہا ہے "آنکھ دھوکا ہے... کیا بھروسا ہے... آدمی ٹھیک سے دیکھ پاتا نہیں اور پردے پہ منظر بدل جاتا ہے..." وہاں بھی جو کچھ ہو رہا تھا، ایسا کب ہوا تھا' جیسا دکھائی دے رہا تھا... کسی مظلوم کی آہوں اور سسکیوں کو ایک بے حس خاموشی نے اپنے اندر اتار لیا تھا۔ بے شمار تماشائی تھے مگر کان سن رہے تھے... نہ آنکھ دیکھ رہی تھی اور نہ ہی دلوں میں کوئی احساس کروٹ لے رہا تھا... پھر کچھ لمحے بیتے... موسم بدلا... کسی کا حال' ماضی میں ڈھل گیا۔ پھر وقت کی رفتار میں کسی کی آہٹ سنائی دی... کچھ گنگناتی سرگوشیاں دلوں میں چُٹکیاں لینے لگیں... سرد مہری سے بھنچے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ کھیلنے لگی کہ اچانک ماضی آئینہ بن کر سامنے آگیا... اور پھر ساری صورتیں گڈمڈ ہوگئیں... ایسا تو ہونا ہی تھا... جب ٹھیک سے دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو تو فیصلے صادر نہیں کئے جاتے... کیونکہ جب پارسا نظر آنے والے نارسائی کے بھنور میں پھنستے ہیں تو اپنی ذات، اپنی سچائی کو ثابت کرنا کس قدر آزمائش میں ڈال دیتا ہے اس کا اندازہ کرنا اگرچہ مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں۔ مگر مقدر کی آزمائش پر پورا اترنا ہر کس وناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب رات اپنا کالا منہ چھپانے کو ہو اور دن کا اجالا پوری آب و تاب کے ساتھ پھیلنے کو ہو' تب اس ہونے اور نہ ہونے کے دوران ایک صدا گونجتی ہے۔

ایک پیغام ابھرتا ہے۔ وہ مقدس پیغام کھلے عام دعوت دیتا ہے' غفلت کی نیند سونے والوں کو پکار پکار کر کہتا ہے۔

''آؤ صوم و صلوٰۃ کی طرف... آؤ اپنی فلاح اور کامیابی کی طرف... نماز نیند سے بہتر ہے... نماز نیند سے بہتر ہے...''

جو بہتر سمجھتے ہیں' وہ اپنی بہتری کے لیے بستر چھوڑ دیتے ہیں۔ فلاح پانے کے لیے اُس صدائے مقدس کی سمت چل پڑتے ہیں اور جو عاقبت نااندیش ہوتے ہیں' وہ بستر کی راحت میں سجدے کا سکون بھول کر اوندھے پڑے رہ جاتے ہیں۔

مولانا فضل کریم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فجر کی اذان جیسے ان کے خوابیدہ دماغ میں آ کر صبح بخیر کہتی تھی۔ نئے سورج کے ابھرنے کی نوید سناتی تھی۔ یہ ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

معمولات زندگی میں کہیں ایک ذرا سا بھی فرق آ جائے تو وہی بات غیر معمولی ہو جاتی ہے۔ ان کے ساتھ بھی کچھ غیر معمولی ہو گیا تھا۔ وہ روز کی طرح اٹھ کر بیٹھے تھے۔ مگر اس کی وجہ اذان نہیں تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا' تب سے اب تک عشا کی نماز کے بعد ایسی گہری نیند آتی تھی جیسے ماں نے لوری سنائی ہو اور فجر کی اذان انہیں گہری نیند سے آپ ہی آپ اٹھا کر بٹھا دیتی تھی۔ لیکن اس روز کیا ہوا تھا؟

وہ بستر پر بیٹھے کمرے میں ادھر ادھر ایسے دیکھ رہے تھے' جیسے اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ رہے ہوں۔ انہیں اپنی الجھن سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر ہوا کیا تھا؟

اذان نے دستک نہیں دی تھی' پھر آنکھوں کی کھڑکیاں کیسے کھل گئی تھیں؟ خود بخود کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ ہونے کے لیے پہلے سے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔

چند لمحوں بعد ہی اذان گونجنے لگی مگر ان کے دماغ میں چوڑیوں کی کھنک گونج رہی تھی۔

ہاں... وہ چوڑیوں کی کھنک ہی تو تھی۔ الجھن اسی لیے تھی کہ اس گھر میں کسی عورت کا وجود نہیں تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد کوئی عورت کسی رشتے سے اس گھر میں نہیں آئی تھی۔ پھر چوڑیاں کہاں سے آ جاتیں؟

چوڑیاں سُر میں بولتی ہیں۔ مگر اُن کے لیے جو محبت کے سُر تال اور جذبوں کی چال ڈھال کو سمجھتے ہوں اور یہ سوجھ بوجھ تب ہی آتی ہے' جب انسان جذبوں میں ڈوب کر سمجھتا ہے۔

مولانا فضل کریم نے زندگی کے بہت سے اسباق پڑھے تھے۔ مگر ابھی وہ... آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے... کے سبق سے قطعی نا آشنا تھے۔ اسی لیے چوڑیوں کی سرگم نے انہیں چونکا دیا تھا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے۔

وہی کھنکتی ہوئی آواز پھر کہیں سے لہراتی ہوئی آئی۔ وہ فوراً ہی بستر سے اتر گئے۔ اب تک اس تذبذب میں تھے کہ کسی خواب کے باعث آنکھ کھل گئی تھی۔ اب پورے ہوش و حواس میں رہ کر انہوں نے سنا تھا۔ چوڑیوں نے کہیں سرگوشی کی تھی۔

مگر کہاں.....؟

وہ متلاشی نظروں سے کمرے کو دیکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں آئے۔ ان کا گھر سونی کلائی جیسا تھا۔ چوڑیوں کی کھن کھن' ریشمی آنچل کی سن سن اور پائل کی چھن چھن سے نامانوس... پھر وہ آواز...؟

انہوں نے بڑے کمرے میں اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کو دیکھا۔ ذرا رک کر سننے کی کوشش کی۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ باہر آنگن میں آ گئے۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔

وہ کبھی کسی عورت کے پیچھے نہیں بھاگے' کسی کو اپنی زندگی میں نہیں لائے۔ مگر اب کوئی تھی' جو چوڑیوں کی دستک دے کر انہیں جانے انجانے میں اپنے پیچھے لگا رہی تھی۔

وہ کون تھی؟ کہاں تھی؟

وہ گھر کے نچلے حصے کا کونا کونا دیکھنے کے بعد پچھلے حصے میں نصب کیے گئے لکڑی کے زینے سے اوپر آ گئے۔ وہاں کھلی چھت کے بیچوں بیچ ایک کمرا بنا ہوا تھا اور ایک طرف پختہ زینہ تھا جو نیچے بڑے کمرے میں اترتا تھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے' چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے کمرے کے دروازے کے پاس آئے پھر اس کے ہینڈل کو دھیرے سے گھما کر ایک جھٹکے سے پوری طرح کھول دیا...

کوئی بھی تو نہیں تھا۔ وہ کمرا ایک طرح کا اسٹور روم تھا۔ وہاں گھر کی غیر ضروری اشیا اور دیگر کاٹھ کباڑ رکھا جاتا تھا۔ اس کمرے سے ملحقہ باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ محتاط انداز میں چلتے ہوئے وہاں آئے۔ گھر کے دوسرے حصوں کی طرح وہ بھی خالی تھا۔

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ پختہ زینے سے اترتے ہوئے نیچے بڑے کمرے میں آ گئے۔ یہ چوڑی والی ملی تھی اور نہ ہی اب چوڑیوں کی کھنک مل رہی تھی۔ معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ وہ آواز ان کا وہم ہو سکتی ہے۔

الجھن سلجھ جائے تو دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ مگر وہ الجھے

ہوئے تھے۔ کیونکہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ ایسے ہی وقت بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ ''مولانا صاحب...!''

مولانا فضل کریم نے زیر لب کہا۔ ''اوہ۔ قادر جان...''

انہوں نے فوراً ہی باہر آ کر دروازہ کھول دیا۔ قادر جان چائے کی دو پیالیاں اور تھرماس لیے کھڑا تھا۔ اندر آتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا دروازہ بند دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ تو اذان سنتے ہی بستر سے نکل کر سب سے پہلے دروازے کی چٹخنی گراتے ہیں۔ پھر فجر کے بعد ہی یہ دروازہ بند ہوتا ہے۔ مجھے کبھی دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پھر آج کیا ہوا؟''

وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ''ہاں۔ آج کیا ہو رہا ہے؟ میں قادر جان سے کیسے کہوں...؟''

انہوں نے کہا۔ ''نہیں، کچھ نہیں ہوا۔''

''آپ کو دیکھ کر ایسا بھی نہیں لگ رہا کہ میری دستک سن کر جاگے ہیں اور ابھی بستر سے نکل کر آئے ہیں۔''

''کیونکہ میں جاگ رہا تھا۔''

''جاگ رہے تھے پھر بھی دروازہ بند تھا؟''

''ارے بھئی کیا معمول سے ہٹ کر کچھ نہیں ہو سکتا؟''

''بے شک ہو سکتا ہے مگر ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے نا...؟''

مولانا فضل کریم کے دماغ میں چوڑیوں کی کھنک سوالیہ نشان بنی ہوئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر الجھ رہے تھے۔ کترانے کے انداز میں بولے۔ ''تم تھرماس کمرے میں رکھ دو۔ میں وضو کر کے آتا ہوں۔ جماعت کھڑی ہونے میں زیادہ وقت نہیں ہے۔ آ کر چائے پئیں گے۔''

وہ آستین چڑھاتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔ قادر جان سوچتی ہوئی نظروں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر کمرے میں چلا گیا۔ وہاں تھرماس اور پیالیاں رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

پچھلی رات اچھو پان والے نے کہا تھا۔ ''قادر بھائی! ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ غصہ تو نہیں کرو گے؟''

قادر جان ایک قد آور، صحت مند پہلوان جیسا شخص تھا۔ مرنے مارنے کے معاملات میں سب سے آگے رہتا تھا۔ محلے کے بدمعاش اس کے آگے ہاتھ جوڑتے تھے۔

اس پر پھرے کو مولانا فضل کریم سے عقیدت ہو گئی تھی۔ وہ ڈیوٹی پر جانے سے پہلے اور شام کو ڈیوٹی سے آنے کے بعد ان کی خدمت میں لگا رہتا۔ ان کی سبق آموز باتیں سنتا اور متاثر ہوتا تھا۔ ان کی ہدایات کے مطابق اب کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتا تھا مگر مولانا کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔

اُس نے اچھو پان والے سے کہا۔ ''بولو! کیا بات ہے؟''

وہ ذرا ڈرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ابھی ایک گھنٹا پہلے مولانا صاحب کی چھت پر ایک عورت کو دیکھا ہے۔''

قادر جان نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر پلٹ کر مولانا صاحب کے مکان کی چھت پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ''وہاں تو اندھیرا ہے۔ تم نے کسی کو کیسے دیکھ لیا؟''

وہ بولا۔ ''میں نے صاف طور پر نہیں دیکھا۔ اس کا دوپٹا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ بس وہ ذرا دیر کو دکھائی دی تھی۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔''

''مولانا صاحب کی چھت کے ساتھ تین مکانوں کی چھتیں ملی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان چار چار فٹ کی منڈیریں بنائی گئی ہیں۔ کوئی بھی مرد ہو یا عورت... کسی ضرورت سے ان کی چھت پر آ جاتی ہو گی۔'' قادر جان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''میں یہاں برسوں سے پان لگا رہا ہوں۔ رات کے ایک بجے تک دکان کھلی رکھتا ہوں۔ آج سے پہلے کبھی کسی عورت کا سایہ تک وہاں نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار دیکھا تو تمہیں بتا رہا ہوں۔''

''کیا رات کو کوئی عورت کسی ضرورت کے تحت چھت پر نہیں آ سکتی؟ مولانا صاحب کا یہ سامنے والا دروازہ بھی صبح اذان کے بعد سے رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہے۔ کسی کے لیے آنے جانے کی ممانعت نہیں ہے۔'' قادر جان اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

وہ پھر ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ہاں۔ مگر وہ عورت... اور رات کے وقت چھت پر...؟''

وہ غصے سے بولا۔ ''ابے تُو کہنا کیا چاہتا ہے؟''

وہ سہم کر بولا۔ ''کچھ نہیں، میں نے جو دیکھا' وہی تم سے کہہ دیا۔ اسے میری غلطی سمجھ کر بھول جاؤ۔ مجھے معاف کر دو۔''

قادر جان نے گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اسی صورت میں معاف کروں گا کہ اب یہ بات کبھی تمہاری زبان پر نہیں آئے گی۔ کسی کے سامنے مولانا صاحب کی چھت پر کسی عورت کی موجودگی کا ذکر نہیں کرو گے۔''

وہ کان پکڑتے ہوئے بولا۔ ''میری توبہ... میرے باپ کی توبہ... سمجھو میں یہ بات بالکل بھول گیا ہوں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قادر جان نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ لیکن اچھوکی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ پچھلے دس برسوں میں پہلی بار ان کا دروازہ اندر سے بند ملا تھا۔

وہ مولانا صاحب سے ایسی عقیدت رکھتا تھا کہ اس سلسلے میں ان سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ذرا سی بے ادبی کا بھی مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

مولانا فضل کریم وضو کر کے آ گئے۔ پھر اس کے ساتھ مسجد کی طرف جانے لگے۔ اس وقت انہیں یوں لگا' جیسے وہ اپنے پیچھے اس گھر میں کسی کو چھوڑ کر جا رہے ہوں۔ وہ گھر ہمیشہ کی طرح ان کے جانے کے بعد خالی نہیں ہے بلکہ وہاں کوئی ہے۔

کون ہے...؟ جس طرح وہم کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح شاید وہ بھی بے وجود تھی مگر بے آواز نہیں تھی۔

مولانا صاحب نے پوری توجہ سے نماز پڑھنے کے بعد جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو وہ پھر چھم سے خیالوں میں آ گئی۔ سوال بن کر ابھری۔ ''بولو! میں کون ہوں؟''

وہ دعا مانگتے مانگتے سوچ میں پڑ گئے۔ ''آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ اگر مجھے وہم بھی ہوا ہے تو کیوں ہوا...؟ لیکن میں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر سنا ہے۔''

قادر جان نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''مولانا صاحب! دعا مانگتے مانگتے آپ کے ہاتھ نیچے ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے ایک ذرا چونک کر اسے دیکھا۔

''آں...'' انہوں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ زانو پر دھرے ہوئے تھے' جیسے مانگتے مانگتے تھک گئے ہوں۔ انہوں نے قادر جان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

وہ خاموشی سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے۔ وہ ٹوٹتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا جب انہوں نے آمین کہہ کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اسے دیکھا تو وہ بولا۔ ''آپ دعا مانگتے مانگتے رک کیوں گئے تھے؟''

انہوں نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بس ذرا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔''

''بات کیا ہے مولانا صاحب! آج وہ ہو رہا ہے' جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آپ کا دروازہ بند دیکھ کر تعجب ہوا۔ مگر اب یہ سن کر اور دیکھ کر شدید حیرانی ہو رہی ہے کہ عبادت کے دوران میں آپ کا دھیان ہٹ گیا تھا۔''

انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بات بناتے ہوئے کہا۔ ''ارے میں کوئی ولی اللہ تو نہیں ہوں۔ عام سا انسان ہوں... میرے خیالات بھی بھٹک سکتے ہیں۔ کوئی سوچ دماغ میں آ سکتی ہے۔''

''پھر تو یقیناً کوئی خاص معاملہ ہے' جس کی وجہ سے یہ گڑبڑ ہو رہی ہے۔''

انہوں نے سوچتی ہوئی نظروں سے قادر جان کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''تمہیں بھی کسی طرح کا وہم ہوا ہے؟''

''وہم...؟ کیسا وہم...؟''

''وہم کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جیسے تنہا ہوتے ہوئے کسی کی موجودگی کا احساس ہونا۔''

اس نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں انہیں دیکھا۔ وہ بولے۔ ''یوں سمجھو کہ تمہارے آس پاس کوئی نہیں ہے مگر اچانک ایسا لگے جیسے کسی کی آواز سنائی دی ہے۔''

وہ ذرا پریشان ہو کر بولا۔ ''مولانا صاحب! یہ وہم تو نہ ہوا۔ یہ تو کسی جگہ کے آسیب زدہ ہونے کی نشانیاں ہیں۔''

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔''

اس نے ٹوہ لینے کے انداز میں پوچھا۔ ''تو کیسی بات ہے؟ کیا آپ کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے؟''

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ میں نے اپنے گھر میں ایسی آواز سنی ہے' جس کی توقع کبھی نہیں کر سکتا تھا۔''

''آپ نے کیسی آواز سنی ہے؟''

وہ بولے۔ ''سب جانتے ہیں کہ میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے' پھر بھی میں نے چوڑیوں کی آواز سنی ہے۔''

قادر جان نے کہا۔ ''آپ کے مکان میں ایک زینہ اندر سے اور ایک زینہ آنگن سے چھت کی طرف جاتا ہے۔ اوپر کوئی دروازہ نہیں ہے۔ کوئی بھی عورت چھپ کر مکان کے اندر آ سکتی ہے۔''

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔ میرے مکان کی چھت سے جن پڑوسیوں کی چھتیں ملتی ہیں' وہ سب انتہائی شریف ہیں۔ ان کی خواتین میری بہت عزت کرتی ہیں۔ میرا دروازہ صبح سے رات گئے تک کھلا رہتا ہے۔ کسی کو آنا ہو تو وہ دروازے سے آ سکتی ہے۔ پھر بھلا چھپ کر کیوں آئے گی؟''

''آپ نے وہ آواز سننے کے بعد اسے مکان میں تلاش کیا تھا؟''

''ہاں۔ میں نے پورا مکان چھان مارا۔ اسی لیے تو صبح اٹھتے ہی دروازہ نہ کھول سکا اور تم الجھن میں پڑ گئے کہ خلافِ معمول ایسا کیوں ہوا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اچھا' تو وہاں کوئی نہیں تھا۔''

''نہیں۔ کسی کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

''مولانا صاحب! یہ جن اور شیطان کی باتیں قصے کہانیاں تو نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان کا ذکر موجود ہے۔''

''بیشک' ہماری دنیا جن و انس اور شیطان سے آباد ہے۔''

''تو اگر ہمارے ساتھ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ ہو جائے تو ہم اسے صرف وہم نہیں کہہ سکتے۔''

وہ سوچنے لگے۔ قادر جان نے کسی حد تک پراسرار لہجے میں پوچھا۔ ''یہ جن بھوت ہی رہتے ہیں ناں...؟ ہمارے ساتھ ہمارے آس پاس نادیدہ بن کر۔''

اس نے ذرا اور پراسرار انداز میں پوچھا ''اور کبھی طرح طرح کی آوازیں سناتے ہیں۔ جیسے کہ آپ نے سنی ہیں۔''

انہوں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا مگر اب اس کی یہ باتیں سن کر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ چوڑیوں کی وہی کھنک یاد آ رہی تھی۔ یہ سوال بھی تھا کہ آج گھر سے نکلتے ہوئے انہیں ایسا کیوں لگا' جیسے وہ اپنے پیچھے کسی کو چھوڑ کر آئے ہیں؟

قادر جان نے پوچھا۔ ''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں' میں نے تم سے وہم کے بارے میں پوچھا اور تم جن بھوتوں کی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔''

''کچھ تو ہے مولانا صاحب! اگر وہاں کسی کا کوئی وجود نہیں ہے تو پھر یہ آپ کا وہم ہی ہے۔ ورنہ اولیاء کے گھر میں بھوتوں کا کیا کام؟ آپ تو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ کم سے کم آپ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہم جیسے گناہ گار بندے ہیں' جنہیں جن بھوت اپنے شر سے پریشان کر سکتے ہیں۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولے۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ میں بھی گناہ گار بندہ ہوں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔''

ان کے درمیان تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر قادر جان نے انہیں بڑی عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ کی صحبت سے فیض حاصل ہوتا ہے' پھر احسان مندی سے ڈوبے لہجے میں کہا۔ ''آپ کی باتوں سے اور قربت سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ آپ کی خدمت کر کے روحانی سکون ملتا ہے۔ سچ پوچھیں تو میں بہت خوش نصیب ہوں۔''

''یہ تمہاری عقیدت مندی ہے۔''

''ایک میں ہی کیا' پورا علاقہ آپ کا عقیدت مند ہے۔''

اسی وقت مسجد کے امام صاحب ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے دیکھا مولانا صاحب! کل آپ کی ایمان افروز تقریر کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ روز کی طرح آج بھی نمازیوں کی تعداد وہی کی وہی رہی۔ بہ مشکل دو کا اضافہ ہوا ہے۔''

مولانا فضل کریم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''اذان کی صدا فلاح کی طرف بلاتی ہے' صبح و شام بلاتی ہے لیکن ہم غفلت میں پڑے رہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے' وہ قومیں تباہ و برباد ہو گئیں' جنہوں نے غفلت برتی اور اللہ کی رسی کو چھوڑ دیا۔''

قادر نے کہا۔ ''یہ حقیقت کون نہیں جانتا؟''

امام صاحب نے کہا۔ ''ہم جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے۔''

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ''آپ حوصلہ نہ ہاریں۔ یہ نہ سوچیں کہ ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ کل کی تقریر سے اگر دو افراد کے دلوں میں بھی ایمان تازہ ہوا ہے تو یہی ہماری کامیابی ہے۔''

امام صاحب نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک' جس طرح قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔ اسی طرح ہم ایک ایک کر کے لوگوں کو مسجد کی راہ دکھائیں گے۔ ذرا وقت تو لگے گا مگر یہ سچ ہے کہ جو کامیابی دیر سے ملتی ہے' وہ دیر تک قائم رہتی ہے۔''

''خدا ہماری کامیابی کو دائمی بنائے۔''

انہوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''آمین...''

دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ وہ قادر جان کے ساتھ مسجد سے باہر آ گئے۔ سورج نے پوری طرح نکلنے سے پہلے ہر چیز کو آسمانی رنگ کی چادر میں ڈھانپ رکھا تھا۔

قادر نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''صبح کا یہ وقت کتنا پرسکون دکھائی دیتا ہے۔ کوئی ہلچل نہیں' کوئی بھگدڑ یا افراتفری نہیں۔''

وہ بولے۔ ''اصل میں یہ سکون نہیں' ہماری بدبختی ہے۔ لوگ عبادت کے وقت بھی غفلت کی نیند میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہم سے اچھے تو یہ چرند پرند ہیں۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہوئے تو قادر جان نے دور ایک گھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب کھلے گی وہ کھڑکی...''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مطلوبہ گھر کی کھڑکی کھل گئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کھڑکی کے پاس سے گزرے تو وہاں کھڑی ہوئی لڑکی نے کہا۔ ''شکریہ مولانا صاحب! آپ کے فیصلے کا احسان میں ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔ مجھے جس بدنامی کی دلدل میں پھینکا گیا ہے' اس دلدل کی ایک چھینٹ بھی اگر آپ کے دامن پر لگ جائے تو آپ کو معلوم ہو کہ میں کس اذیت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں...؟ کاش! آپ حقیقت کو جاننے کے بعد مجھے گناہ گار ٹھہراتے۔"

وہ دونوں چپ چاپ وہاں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی آواز اب بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ "او زمین کے خداؤ...! میرا معاملہ' میری حقیقت، میرا رب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے' وہ سب جانتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے...."

آنسوؤں میں رُندھی ہوئی آواز دور ہوتے ہوتے آخر خاموشی میں ڈھل گئی۔ قادر جان نے سر جھٹک کر کہا۔ "یہ پلمبر سلیمان کی بیٹی تو بہت ہی ڈھیٹ اور بے حیا ہے۔ روز صبح یہی باتیں دہراتی ہے۔ گلی سے گزرنا دوبھر کر دیا ہے۔ گھر تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ خدا کی قسم! آپ نے میری زبان بند نہ کرائی ہوتی تو میں اسے اس کی اوقات یاد دلا دیتا۔"

"گالی کے جواب میں گالی دے کر اپنی زبان کو اور کیچڑ میں پتھر مار کر اپنے لباس کو گندا نہیں کرنا چاہیے۔"

"لیکن مولانا صاحب! حد ہوتی ہے۔"

"درگزر کرنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ کیا تمہیں وہ تاریخی واقعہ یاد نہیں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روز ایک گلی سے گزرتے تھے اور ایک عورت روز آپ پر کچرا پھینکا کرتی تھی' جس کی وجہ سے آپ کا لباسِ مبارک ناپاک ہو جایا کرتا تھا۔"

اس نے سر ہلا کر کہا۔ "جی اچھی طرح یاد ہے۔"

"آپ نے اس عورت سے کبھی شکایت نہیں کی۔ آخر وہ دن آیا' جب وہ اپنی کافرانہ حرکتوں سے باز آ گئی اور دین اسلام قبول کر لیا۔"

"وہ کچرا پھینکا کرتی تھی اور اس نے اپنے والدین سمیت پورے محلے کی عزت کا کچرا کر دیا ہے۔ ایک خالی گھر میں اس جوان لڑکے کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔ کس کس نے نہیں دیکھا؟ ایسی حرام کاری کے بعد بھی آپ کو الزام دیتی ہے کہ آپ نے حقیقت کو سمجھے بغیر اسے آبرو باختہ قرار دیا ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ مولانا فضل کریم نے آنگن میں قدم رکھتے ہوئے گہری نظروں سے پورے گھر کا جائزہ لیا اور کچھ الجھتے ہوئے قادر جان کے ساتھ کمرے میں آ گئے۔

قادر جان نے تھرماس اٹھا کر پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ "آپ کسی بھی معاملے میں کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں سناتے۔ ہمیشہ حقائق کو سمجھنے کے بعد رائے دیتے ہیں۔ اسی لیے پورا علاقہ آپ کی قدر کرتا ہے، جب بھی کسی کو کوئی الجھن پیش آتی ہے تو وہ اپنے مسائل حل کروانے آپ کے پاس دوڑا چلا آتا ہے۔"

انہوں نے چائے کی پیالی اٹھا کر ایک چسکی لی۔ پھر کہا۔ "میں باقاعدہ کوئی منصف تو نہیں ہوں لیکن جب کسی معاملے میں رائے دینے یا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں دینی احکامات کے مطابق معاملے کو سمجھوں اور فیصلہ دوں۔ ہمارا دین یہی حکم دیتا ہے کہ کانوں سنی بات پر نہیں' آنکھوں دیکھی حقیقت پر یقین کرو۔"

"اور پلمبر سلیمان کی بیٹی انیلا نے جو گل کھلایا ہے' وہ تو سب ہی نے دیکھا تھا۔ بوڑھے باپ کا سر جھک گیا ہے۔ اس نے تو لوگوں سے ملنا جلنا تک چھوڑ دیا ہے مگر وہ اور اس کی ماں آنکھوں دیکھی حقیقت کو بھی جھٹلاتی ہیں۔ یعنی ہم سب جھوٹے ہیں' بس وہ ماں بیٹی سچی ہیں۔" قادر جان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

انہوں نے دو چار گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ "جس طرح پاگل کبھی خود کو پاگل نہیں کہتا' اسی طرح مجرم بھی خود کو کبھی مجرم نہیں کہتا۔ انیلا بھی یہی کر رہی ہے۔"

"بے شک کرتی رہے لیکن جب وہ یہ کہتی ہے کہ آپ کے فیصلے نے اس کے مقدر میں بدنامی لکھی ہے تو بہت غصہ آتا ہے۔ یعنی اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا' آپ کے فیصلے نے اسے گناہ گار بنا دیا ہے۔"

وہ چائے کی خالی پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے بولے۔ "تم کیا سمجھتے ہو' جب کوئی جج کسی قاتل کو سزائے موت کا حکم سناتا ہے تو کیا وہ قاتل اس جج کو درست تسلیم کرتا ہے؟"

وہ ذرا ٹھہر کر بولے۔ "ہرگز نہیں۔ تختۂ دار تک پہنچنے کے بعد بھی وہ اس جج کو لعنت ملامت کرتا رہتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ اس کے مقدر میں ابھی سانسیں تھیں مگر جج کا غلط فیصلہ انہیں وقت سے پہلے چھین رہا ہے۔ موت سے پہلے اسے موت دے رہا ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "فیصلہ حمایت میں ہو تو منصف سچا لگتا ہے... لیکن فیصلہ مخالفت میں ہو تو وہی منصف جھوٹا اور فریبی بن جاتا ہے۔ ہمیں جذبات اور رشتے داری سے بالاتر ہو کر فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ کوئی ہمیں جھوٹا سمجھتا ہے تو سمجھتا رہے لیکن ہمارے دل میں یہ کامل یقین ہونا چاہیے کہ ہم دینی احکامات کے مطابق فیصلہ سنا رہے ہیں۔"

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے' انیلا جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے۔ دل ہی دل میں اپنے گناہ کو مانتی ہے مگر آپ کے دل و دماغ پر یہ بوجھ ڈالنا چاہتی ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔"

مولانا فضل کریم بیٹھے بیٹھے چونک گئے۔ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "تم نے یہ آواز سنی...؟"

"کیسی آواز مولانا صاحب...؟"

"ابھی تو سنائی دی تھی جیسے کوئی کھٹکا ہوا ہو۔"

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "شاید ہوا ہوگا۔ میں بات کر رہا تھا' اس لیے سن نہ سکا۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے کمرے کی چھت کو دیکھ رہے تھے۔ قادر جان نے ایک نظر چھت کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا اوپر سے آواز آئی تھی؟"

"ہاں۔ شاید..."

"پھر تو ہمیں اوپر جا کر دیکھنا چاہیے۔"

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ قادر جان نے پوچھا۔ "آواز کس سمت سے آئی تھی؟"

انہوں نے پختہ زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر سے آئی تھی۔ میں ادھر سے اوپر جا رہا ہوں۔ تم لکڑی والے زینے سے اوپر آؤ۔"

وہ ادھر جاتے ہوئے بولا۔ "جلدی اوپر آئیں۔ ایسا نہ ہو' وہ کسی دوسری چھت پر جا کر گم ہو جائے۔"

مولانا بڑے کمرے سے گزر کر پختہ زینے کی طرف آئے۔ پھر تیزی سے ایک ایک پائدان پر قدم رکھتے ہوئے اوپر پہنچے۔ قادر جان لکڑی والے زینے کے ذریعے اوپر آ گیا تھا۔ وہ دونوں چاروں طرف دیکھنے لگے۔ مولانا نے چھت والے کمرے کے اندر جا کر دیکھا۔ وہ کمرا اور باتھ روم خالی تھا۔ باقی تین چھتیں بھی دور تک ویران دکھائی دے رہی تھیں۔ انسان تو کیا وہاں ایک پرندہ بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں نیچے آ گئے۔ قادر جان نے کہا۔ "پہلے آپ نے چوڑیوں کی آواز سنی۔ پھر ایک کھٹکا سنا۔ بار بار آوازیں آ رہی ہیں تو یہ وہم نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ مکان آسیب زدہ ہو گیا ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "میرے پاس جنات اور ابلیس سے متعلق کچھ کتابیں ہیں۔ میں ابھی ان کا مطالعہ کروں گا۔"

وہ بولا۔ "آپ تو شر سے بچنے کے وظیفے جانتے ہیں۔"

"ہاں، میں ایک وظیفے کا ورد کرتا رہوں گا۔ اگر یہ کسی جن یا شیطان کی شرپسندی ہے تو انشاءاللہ جلد ہی دفع ہو جائے گی۔"

"تو پھر بسم اللہ پڑھ کر فوراً شیطان کو بھگائیں۔" قادر جان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے کہا۔ "میں کچھ دیر بعد بسم اللہ کروں گا۔ ابھی تھکن محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پیچھے گاؤ تکیہ رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ میں پاؤں دباتا ہوں۔"

"ارے نہیں۔ پیروں میں درد نہیں ہے۔ بس ذرا ذہنی تھکن ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

اس نے پریشان ہو کر انہیں دیکھا۔ پھر ان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "تو میں سر دبا دیتا ہوں۔"

وہ چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولے۔ "نہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے' تھوڑی سی نیند آ جائے گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔ پھر میں وظیفہ پڑھوں گا اور کتابوں کا مطالعہ کروں گا۔ ذرا طبیعت سنبھلنے دو۔"

"مولانا صاحب! آپ نے تو مجھے پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ سب ٹھیک تو ہے نا...؟"

"ہاں بھئی۔ سب ٹھیک ہے۔ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ آرام سے گھر جا کر ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کرو۔ انشاءاللہ رات کو ملاقات ہوگی۔"

انہوں نے بولتے بولتے آنکھیں بند کر لیں جیسے کہہ رہے ہوں۔ "اب چلے ہی جاؤ۔"

قادر جان کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رک گیا۔ چپ چاپ کمرے سے نکل گیا پھر اس نے باہر آ کر دروازے کو اچھی طرح بند کر دیا۔ وہاں سب ہی جانتے تھے کہ مولانا فضل کریم جب گھر میں ہوتے ہیں تو کبھی اپنے دروازے کو اندر سے بند نہیں کرتے۔ دن بھر وہ دروازہ کھلا رہتا تھا۔

قادر جان کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ سوچتی ہوئی نظروں سے چھت کو دیکھنے لگے۔

محلے کی تمام خواتین ان کی عزت کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ایسا کوئی مذاق کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ اگر ایسی کوئی عورت نہیں تھی اور وہ چھت کے ذریعے وہاں نہیں آئی تھی تو کیا آسمان سے اتری تھی؟

تب ہی انہیں بیرونی دروازے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے وہاں آ کر دیکھا۔ قادر جان دروازہ لگا کر گیا تھا مگر کوئی بھی اسے کھول کر آ سکتا تھا۔

انہوں نے چٹخنی چڑھا دی۔ ہوا کی آہٹ پر خوامخواہ کسی کی آمد کا گمان ہوا تھا اور گمان تب ہی ہوتا ہے' جب کوئی دھیان میں تسلط جما رہا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ کبھی کسی عورت کی طرف نہیں دیکھتے تھے لیکن نہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہ جلوے تو خود رَو ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر لاشعور میں پنپتے رہتے ہیں۔ ہوا دکھائی نہ دے پھر بھی اُس کا احساس بتا دیتا ہے کہ وہ سرد ہے یا گرم...؟

اور وہ گرما رہی تھی۔ بیٹھے بٹھائے کھلبلی پیدا کر رہی تھی۔ خوامخواہ اپنے پیچھے لگا رہی تھی۔ سوچا جائے تو وہ خوامخواہ پیچھے نہیں لگ رہے تھے۔ کوئی تو بات تھی۔

عورت کی کشش بڑی ہی طلسماتی ہوتی ہے۔ دکھائی نہ دینے کے باوجود بھائی دیتی ہے۔

وہ عورتوں سے کتراتے تھے۔ سوچتے تھے' نہ جانے لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے؟ کیوں خواتین کے پیچھے بھاگتے ہیں؟ جبکہ ان لمحات میں وہ خود یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ کسی نامعلوم کی کشش کیسے حیلے بہانے سے انہیں اپنے پیچھے لگا رہی ہے؟

وہ اس کمرے میں آ گئے جہاں دینی معلومات کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ وہ جنات اور ابلیس سے تعلق رکھنے والی کتابیں تلاش کرنے لگے۔ دھیان اب بھی اُدھر ہی تھا۔

لاکھ کترانے کے باوجود وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ اُن کے خیالوں میں آج تک کوئی نہیں آئی تھی۔ ایک فطری تقاضا سمجھا تا تھا کہ حیات کو گزارنے کے لیے ایک شریک حیات ضروری ہے.... مگر وہ صبح ہوتے ہی اس تقاضے کو محض ایک خواب سمجھ کر بھول جایا کرتے تھے اور یہی اُن کی سب سے بڑی بھول تھی۔ ضرورت دبانے سے دب جاتی ہے۔ چھپانے سے چھپ جاتی ہے لیکن ٹالنے سے ٹلتی نہیں ہے۔ اندر ہی اندر ہمکتی رہتی ہے۔

اُن کی مطلوبہ کتابیں مل گئیں لیکن انہیں پڑھنے سے پہلے وہ ایک وظیفہ پڑھنے لگے۔

وہ تھوڑی دیر تک ڈوب کر پڑھتے رہے پھر جنات سے متعلق ایک کتاب کھول لی۔ کہا جاتا ہے' جو جنات شر پسند نہیں ہوتے' ان کے آنے سے گھر میں ایک عجب طرح کی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ انہوں نے کتاب کو کھولا تو اچانک ہی انہیں خوشبو کا احساس ہوا۔

کیا وہاں کوئی عبادت گزار جن ہے؟

لیکن جنات چوڑیاں تو نہیں پہنتے؟

انہوں نے کتاب بند کر دی۔ اس کے باوجود بھی کمرے کی محدود فضا میں خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔ دروازے کے پاس آ کر وہ خوشبو کچھ اور قریب محسوس ہونے لگی۔

وہ پختہ زینے کی طرف سے آ رہی تھی۔ مولانا بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے زینے کے پاس پہنچے تو خوشبو کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ اوپر جانا چاہتے تھے لیکن ٹھٹک گئے۔

زینے کے درمیانی پائدان پر ایک رومال پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ اس کے ایک گوشے میں گلاب کا پھول کڑھا ہوا تھا۔ خوشبو اسی رومال سے آ رہی تھی۔

وہ کوئی عود' عنبر یا عطر کی خوشبو نہیں تھی۔ اس رومال کو جیسے کسی امپورٹڈ پرفیوم میں ڈبو کر وہاں پھینک دیا گیا تھا۔

وہ اسے ایک چٹکی میں پکڑ کر اوپر لائے۔ پھر اسے چھت پر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ کسی نامحرم کا تھا۔ رومال کا حاشیہ اور کڑھا ہوا پھول کہہ رہا تھا کہ وہ کسی لڑکی کا ہے۔

وہ کسی عورت کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ پھر بھلا کسی کا رومال چھونا کیسے گوارا کرتے؟ وہاں چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگے۔ دن کے وقت دھوپ میں کوئی چھت پر نہیں آتا تھا۔ کہیں بھی اس رومال والی کا وجود نہیں تھا۔

ویسے جو کچھ ہو رہا تھا' اس کے نتیجے میں مولانا کے اندر ایک نئی سوچ ابھر رہی تھی۔ ایک فطری تقاضا جوان کے اندر خوابیدہ تھا' اب اس کی آنکھ کھل رہی تھی۔ یوں بھی دینِ اسلام میں رہبانیت کی اجازت نہیں ہے۔ شادی اور ازدواجی زندگی لازمی ہوتی ہے۔

وہ چھت والے کمرے کے ایک طرف سے ہوتے ہوئے دوسری طرف آئے تو ٹھٹک گئے۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا' صبح انہوں نے دروازے کو ٹھیک سے بند کیا تھا مگر ابھی وہ کھلا ہوا تھا۔ ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ چلے مگر اس سے دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔

انہوں نے فوراً ہی کمرے کے اندر آ کر دیکھا۔ پھر واش روم میں بھی دیکھا... وہ تو خوشبو تھی' ہوا ہو گئی تھی۔

وہ سوچتے سوچتے ایکدم سے چونک گئے۔ تقریباً دوڑتے ہوئے چھت کی دوسری طرف آئے۔ وہاں سے لکڑی کا زینہ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر انہیں واضح طور پر اس کی چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی کھنک بھی سنائی دی تھی۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے وہاں آئے۔ پھر اسی تیز رفتاری سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آ گئے۔

ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں' لیکن اسے سایہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ سایہ تو دکھائی دیتا ہے جبکہ اس کی ایک جھلک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

انہیں تھک ہار کر ہانپنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ تیس برس کے صحت مند جوان تھے۔ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے تھے۔ تہجد گزار تھے۔ دن رات دینی کتب کے مطالعے میں مصروف

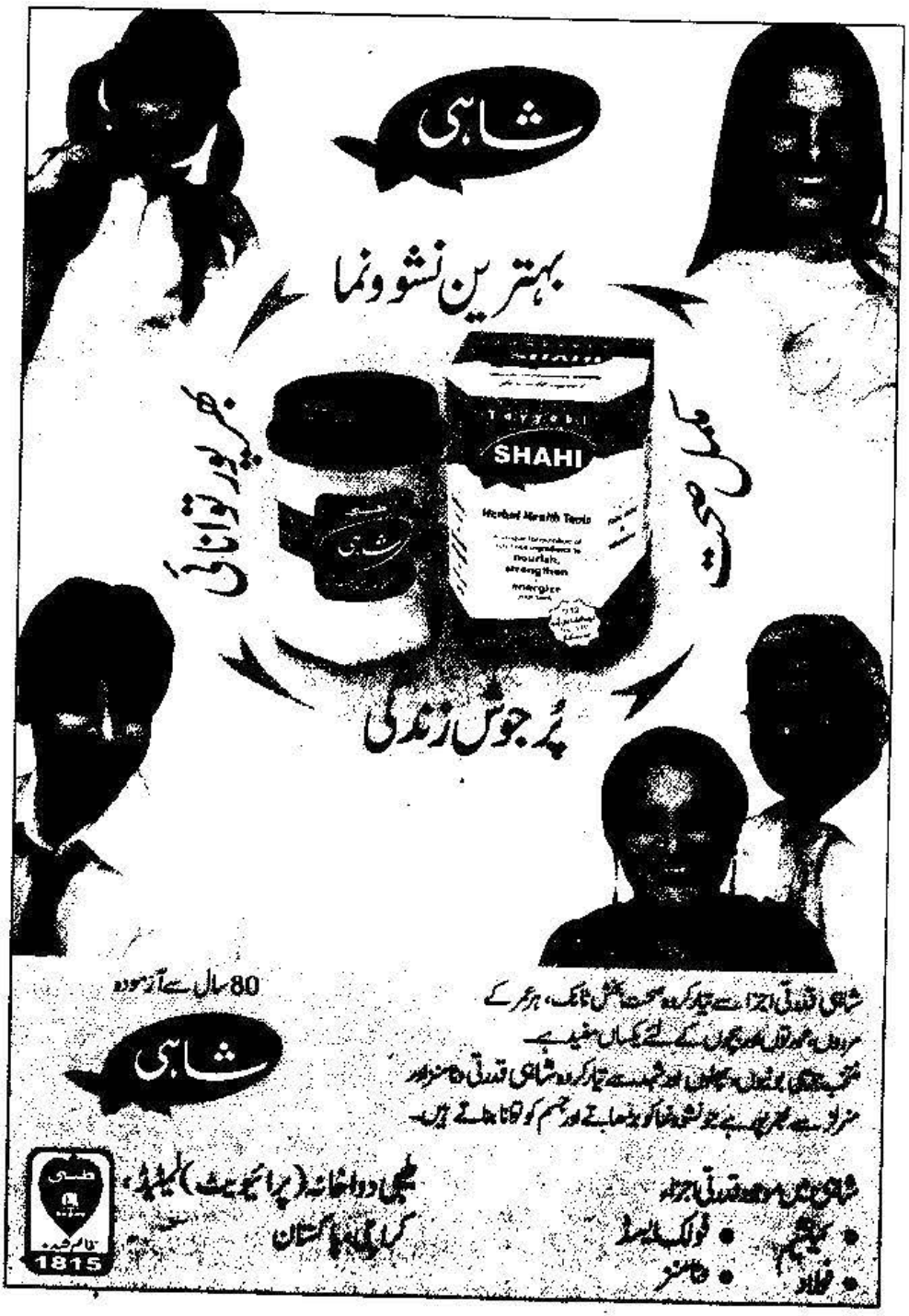

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہتے تھے۔ پاکیزگی' عبادت گزاری اور پارسائی نے ان کی شخصیت میں ایک نامعلوم سی روحانی کشش پیدا کردی تھی۔

قادر جان' امام صاحب اور کئی بزرگ انہیں سمجھاتے تھے کہ اب شادی کرلینی چاہیے اور وہ بھی چاہتے تھے کہ ایک شریک حیات آجائے۔ مگر..... وہ شادی کرتے نہیں تھے۔ اندر ہی اندر بیوی کے خیال سے خوف کھاتے تھے۔ آئے دن دیکھتے تھے کہ میاں بیوی میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بنتی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ دو قیدیوں کی طرح گزارا کرتے ہیں۔

محلے کی پنچایت میں وہ سرپنچ تھے۔ جب بھی طلاق کے مسئلے کا فیصلہ کرتے تو یہی دیکھتے تھے کہ مرد بیویوں کو دھوکا دیتے ہیں اور بیویاں شوہروں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی ہیں۔

فی الحال یہی کہا جاسکتا تھا کہ شریک حیات بنانے کے سلسلے میں وہ کسی عورت پر بھروسا نہیں کررہے تھے۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہے؟ یہاں کون ہے...؟''

وہ ایک ایک کمرے میں جاتے ہوئے بولے۔ ''چھپتی کیوں ہو؟ سامنے آؤ۔ کیا تم انسان نہیں ہو؟ بے وجود ہو؟ بھوت پریت ہو؟ آخر کیا ہو...؟''

اسی وقت قادر جان ایک محلے دار کے ساتھ وہاں آیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر جانا چاہتا تھا مگر بند دروازے نے ایک بار پھر اسے چونکا دیا۔ محلے دار نے بھی ذرا تعجب سے پوچھا۔ ''ارے یہ کیا؟ مولانا صاحب کا دروازہ بند ہے؟''

''صبح بھی یہی انہونی ہوئی تھی۔ ابھی آدھے گھنٹے پہلے میں انہیں سوتے چھوڑ کر گیا تھا۔ بھلا وہ خاص طور پر اٹھ کر اسے اندر سے بند کرنے کیوں آئیں گے؟''

''وہ کبھی اسے اندر سے بند نہیں کرتے۔''

قادر نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر دروازے کو دیکھا۔ اسی وقت ایک اور شخص نے ان کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

''مولانا صاحب سے ملنے آئے ہیں۔''

''تو اندر جاؤ۔''

قادر نے کہا۔ ''کیسے جائیں؟ دروازہ بند ہے۔''

اس شخص نے دروازے کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''باہر تالا نہیں ہے پھر دروازہ کیسے بند ہوسکتا ہے؟''

اس شخص نے قریب آکر دروازے کو ہولے سے دھکا دیا' پھر کہا۔ ''یہ تو اندر سے بند ہے۔''

قادر نے کہا۔ ''ہم یہی تو کہہ رہے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''مولانا صاحب کا گھر تو ہمیشہ مسجد کی طرح کھلا رہتا ہے۔''

محلے دار نے کہا۔ ''قادر بھائی بتا رہے ہیں کہ دروازہ صبح کے وقت بھی بند تھا۔''

اس نے قادر سے پوچھا۔ ''کیا کوئی مسئلہ ہے؟''

قادر جان نے سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کو دیکھا۔ مسئلہ ایسا تھا کہ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے انجان بن کر کہا۔ ''شاید مولانا صاحب کے معمولات میں فرق آگیا ہے۔ اب وہ دروازے کو اندر سے بند رکھنا چاہتے ہوں گے۔ اسی لیے یہ بند ہے۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''وہ تو کہتے تھے' ان کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ نہ ہی چور ڈاکو ان کے گھر میں آئیں گے۔ اسی لیے وہ اسے کھلا رکھتے تھے۔ اب کیا بات ہوگئی؟''

ایک نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا خاموش رہو۔''

وہ دروازے سے لگ کر کچھ سننے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ابھی لگا تھا' جیسے مولانا صاحب کچھ بول رہے ہیں۔''

قادر نے دروازے سے کان لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اکیلے کیوں بولیں گے؟''

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔ ''ضرور ان کے ساتھ کوئی ہوگا۔''

''ایسا کون ہوسکتا ہے' جس سے وہ دروازہ بند کرکے بات کررہے ہیں؟''

قادر جان کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چوڑیوں والی انہیں مل گئی ہے اور وہ اس سے بول رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مولانا صاحب بدنام ہوجائیں گے۔

پھر اسے یاد آیا' مولانا صاحب نے کہا تھا' وہ وظیفہ پڑھیں گے۔ شاید اونچی آواز میں پڑھ رہے ہیں۔ لیکن وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ وظیفہ کیوں پڑھ رہے ہیں؟ طرح طرح کے سوالات کرنے والے وہاں ایک ایک، دو دو کرکے جمع ہورہے تھے۔ دوسرے لوگ بھی سننے کی کوششیں کررہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ''عجیب بات تو یہ ہے کہ صرف مولانا صاحب بول رہے ہیں اور جواب میں کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی۔''

کسی نے کہا۔ ''ذرا توجہ سے سننے کی کوشش کرو۔ اندر کوئی تو ہوگا' جس سے وہ بول رہے ہیں۔''

وہ شخص دروازے سے کان لگائے کھڑا تھا' اس نے

کہا۔ ''ہاں۔ اندر کوئی نہیں ہے۔ دوسری کوئی آواز نہیں آرہی صرف وہی بول رہے ہیں۔''

''ان کے پاس تو کوئی فون بھی نہیں ہے۔ کیوں قادر بھائی؟''

قادر جان نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''انہیں فون پسند ہی نہیں ہے۔''

پیچھے سے امام صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ پلمبر سلیمان کے ساتھ اُن کی طرف آتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟ تم لوگ مولانا صاحب کے دروازے کے باہر کیا کررہے ہو؟''

قادر جان کان لگا کر سن رہا تھا۔ فوراً ہی سیدھا ہوکر دلیز سے اترتے ہوئے بولا۔ ''وہ، دراصل... میں۔ یہ مولانا صاحب کا دروازہ بند ہے۔''

''تو...؟''

ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ امام صاحب نے کہا۔ ''کسی کا دروازہ بند ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کان لگا کر وہاں کی مخبری کی جائے؟''

قادر جان نے کہا۔ ''ہم مخبری نہیں کررہے۔ دراصل ہم حیران ہیں کہ...''

مولانا فضل کریم نہیں جانتے تھے کہ ان کے گھر کے باہر لوگوں کے درمیان کیسی کھلبلی مچی ہوئی ہے؟ وہ تو بس اپنی الجھن کا سرا تلاش کرلینا چاہتے تھے۔ جاننا چاہتے تھے' کون ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے؟

اور باہر والے بھی یہی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مولانا صاحب کے ساتھ کیا ہورہا ہے؟

وہ وظیفہ پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ بیرونی دروازے پر دستک سنائی دے رہی تھی اگرچہ اس وقت وہ کسی کی مداخلت نہیں چاہتے تھے۔ دروازہ کھولنے سے انکار بھی نہیں کرسکتے تھے۔

انہوں نے دروازہ کھولا تو لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

ادھر یہ حیران و پریشان تھے۔ ادھر آنے والے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے قادر جان سے پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟''

امام صاحب نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''یہ انبلا کا باپ سلیمان آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ باقی سب یہ جاننے کے لیے یہاں پہلے سے موجود ہیں کہ آپ کا دروازہ بند کیوں ہے؟''

مولانا نے ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کو کہا۔

امام صاحب نے لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب نے دیکھ لیا ہے' مولانا صاحب خیریت سے ہیں۔ دروازہ بند رکھیں یا کھلا چھوڑ دیں۔ یہ ان کا اپنا گھر ہے۔ یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔''

قادر جان نے کہا۔ ''آپ لوگ دروازے کے بند ہونے پر مسئلہ نہ کھڑا کریں بلکہ اپنے اپنے گھر جائیں۔''

ایک نے کہا۔ ''ہم جارہے ہیں لیکن یہ تجسس تو رہے گا کہ مولانا صاحب تنہائی میں کس سے باتیں کررہے تھے؟''

مولانا کے یہ کہنے پر کہ میں ایک وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ سب کو چپ لگ گئی۔ وہ ایک ایک کرکے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ مولانا نے قادر جان سے پوچھا۔ ''تم تو ڈیوٹی پر جانے والے تھے، اس وقت یہاں کیا کررہے ہو؟''

وہ اپنے ساتھ آئے ہوئے محلے دار کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''الیاس بھائی اپنے بیٹے کے لیے پانی دم کروانے آپ کے پاس آرہے تھے۔ میں آپ کے لیے پریشان تھا کہ صبح سے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ چلا آیا۔''

وہ سب ایک کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ امام صاحب نے پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت کو کیا ہوا مولانا صاحب؟''

وہ بولے۔ ''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس ذرا نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے دماغ بوجھل سا ہے۔''

''پھر تو آپ آرام کریں۔ ہم بعد میں آجائیں گے۔''

امام صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

انہوں نے امام صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''میری طبیعت اب سنبھل گئی ہے۔''

پھر انہوں نے الیاس سے کہا۔ ''تم یہ پانی کی بوتل یہاں چھوڑ جاؤ۔ میں ظہر کے بعد انشاءاللہ دم کردوں گا۔ آکر لے جانا۔''

وہ بوتل رکھ کر چلا گیا۔ انبلا کا بوڑھا باپ پلمبر سلیمان سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مولانا نے قادر جان کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''میں بھی چلتا ہوں۔ آپ کو دیکھ کر اطمینان ہوگیا ہے۔ اب شام کو ملاقات ہوگی۔''

وہ ان سے مصافحہ کرکے وہاں سے چلا گیا۔ مولانا نے سلیمان سے پوچھا۔ ''ہاں اب بولو! کیا بات ہے؟''

اس نے پہلو بدل کر امام صاحب کو دیکھا۔ وہ بولے۔ ''دراصل یہ اپنی بیٹی کے سلسلے میں پریشان ہے۔ اُس لڑکی نے اپنے مقدر میں جو بدنامیاں لکھی ہیں، وہ مٹنے والی نہیں ہیں۔''

مولانا نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''بے شک۔ اُس کی جذباتی گمراہی نے بوڑھے باپ کا سر جھکا دیا ہے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سلیمان نے بڑے ہی شکستہ انداز میں کہا۔ ''اب نہ تو یہ سر اٹھ سکے گا اور نہ ہی اُس بدبخت کی ڈولی اٹھ سکے گی۔ اس کی بدنامی میری چھوٹی بیٹیوں کو بھی سہاگن بننے نہیں دے گی۔ ابھی تو یہی آثار نظر آرہے ہیں کہ میری دوسری بیٹیوں کو بیاہنے بھی کوئی میری دہلیز پر نہیں آئے گا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ ''یہ سوچ کر ہی میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ میں آخری سانس تک اس بدنامی کا بوجھ اٹھاتا رہوں گا۔ اگر میری گھر والی اور بچے بیچ میں نہ آتے تو میں اس کم بخت کو اسی دن مار ڈالتا اور خود سولی چڑھ جاتا۔''

''یہ اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ تم اپنے خاندان کے واحد کفیل ہو۔ کیا دوسرے بچوں سے ان کا سہارا چھیننا چاہتے تھے؟ باپ کا سایہ سر پر نہ رہے تو بچے خوار ہو جاتے ہیں۔ زمانے کی ٹھوکروں میں آجاتے ہیں اور پھر تمہاری بیٹیوں کا کیا ہوتا؟ بیٹا ایک ہی تو ہے اور وہ بھی سب سے چھوٹا ہے۔''

سلیمان نے کہا۔ ''اس مسئلے کو ختم کرنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ انیلا جس کے ساتھ بدنام ہوئی ہے' وہی اُس کا ہاتھ تھام لے۔''

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ''یہ مشورہ تو ہم نے پہلے بھی دیا تھا۔ وہ لڑکا کوئی غیر تو نہیں ہے۔ تمہاری بہن کا بیٹا ہے۔ گھر کا معاملہ گھر میں ہی نمٹ جاتا۔''

اس نے کہا۔ ''اُس وقت معاملہ گرم تھا اور اس سے بھی زیادہ میری بہن کا دماغ گرم ہو رہا تھا۔ تب میں یہ بات نہیں چھیڑ سکتا تھا۔ سوچا تھا' تھوڑا وقت گزر جائے پھر بات کروں گا، مگر وہ تو اب بھی ناراض ہے۔ انیلا کے سلسلے میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔''

''ناراض ہے تو اُسے منانے کی کوشش کرو۔'' مولانا فضل کریم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''بیٹی کی ڈولی اٹھانے اور بدنامی پر مٹی ڈالنے کے لیے میں اس کے دروازے پر گیا تھا۔ خیرات کی طرح رشتہ مانگا تھا۔ مگر وہ کہتی ہے چونکہ لہو کے رشتے ختم نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اُس کا رشتہ اب صرف مجھ سے ہے۔ میرے گھر سے اور بیوی بچوں سے نہیں ہے۔''

امام صاحب نے کہا۔ ''اگر وہ مان جائے گی تو بدنامی یکسر ختم ہو جائے گی۔''

مولانا فضل کریم نے کہا۔ ''اور وہ لڑکا... کیا نام ہے اس کا...؟''

سلیمان نے کہا۔ ''نعیم...''

''ہاں۔ نعیم... وہ کیا کہتا ہے؟''

''وہ تو اسی دن سے غائب ہے، پلٹ کر نہیں آیا لیکن ماں ضرور جانتی ہوگی کہ کہاں ہے؟ مجھے یقین ہے کہ اس مسئلے کے حل کے لیے وہ اسے بلائے گی تو وہ گھر لوٹ آئے گا۔''

امام صاحب نے کہا۔ ''یہ ہمارے پاس اسی لیے آیا ہے کہ ہم اس کی بہن دُردانہ سے بات کریں۔ بچے بہک گئے تھے' انہیں بزرگ سدھار سکتے ہیں۔ بہت کچھ بگڑنے کے باوجود بات بن سکتی ہے۔''

سلیمان نے کہا۔ ''دُردانہ میری نہیں سن رہی ہے مگر آپ حضرات اس علاقے کے معزز ہیں۔ وہ آپ کے سامنے ہٹ دھرمی نہیں دکھائے گی۔ جو کہیں گے' اسے مان لے گی۔''

مولانا نے سوالیہ نظروں سے امام صاحب کو دیکھا۔ وہ بولے۔ ''اس سلسلے میں ہمیں کچھ کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ ایک بیٹی کا کیا دھرا اس کی ساری اولاد کو بھگتنا پڑے گا۔''

وہ تقریباً روتے ہوئے بولا۔ ''میں تو جیتے جی مر چکا ہوں۔ انیلا ٹھکانے لگے گی تو کچھ دن کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کم سے کم میری دوسری بیٹیوں کے لیے شادی خانہ آبادی کے راستے کھل سکیں گے۔''

مولانا نے کہا۔ ''میں تمہاری حالت سمجھ رہا ہوں مگر برا نہ ماننا۔ غلطی تمہاری بیٹی سے ہوئی ہے لیکن وہ بڑی ڈھٹائی سے آج بھی انکار کر رہی ہے بلکہ میں تمہارے گھر کے پاس سے گزرتا ہوں تو مجھے یوں باتیں سناتی ہے' جیسے میں نے کوئی غلط فیصلہ کیا ہو جبکہ سارے حقائق سب کے سامنے تھے۔''

سلیمان نے تائید میں سر ہلایا۔ مولانا نے کہا۔ ''خود تم نے سب کے سامنے کہا تھا کہ غلطی تمہاری بیٹی کی ہی ہے۔''

اس نے پھر سر ہلایا۔ مولانا نے کہا۔ ''باپ ہونے کے ناتے تمہاری گواہی سب سے اہم تھی۔ میں نے کوئی ذاتی فیصلہ نہیں دیا تھا۔''

سلیمان نے ناگواری سے کہا۔ ''میری بیٹی پر لعنت بھیجیں۔ بس مجھ غریب کی بات مان لیں۔ دُردانہ کو کسی طرح راضی کر لیں۔''

وہ گڑگڑانے کے انداز میں بول رہا تھا۔ مولانا فضل کریم نے کہا۔ ''میں صرف تمہارا لحاظ کرتا ہوں ورنہ تمہاری بیٹی کی باتوں سے تو ایسا لگتا ہے' جیسے میں نے اس پر کیچڑ اچھالی ہے۔ دراصل میں اس معاملے میں پھر سے الجھنا نہیں چاہتا۔''

وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر عاجزی سے بولا۔ ''خدا کے لیے مولانا صاحب! انکار نہ کریں۔ آپ اور امام صاحب مل کر میری بگڑی بنا سکتے ہیں۔''

''بگڑی بنانے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔''

وہ بولا ''مگر وسیلے تو زمین پر پیدا کرتا ہے۔ آپ دونوں میرے لیے وسیلہ بن سکتے ہیں۔''

پھر وہ امام صاحب کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آپ میری سفارش کریں۔ بڑا احسان ہوگا۔ میری بیٹیاں آپ کو دعائیں دیں گی۔''

امام صاحب نے کہا۔ ''مان جائیں مولانا صاحب! یہ بے چارہ تو بھنور میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ خدا ہمارے نوجوانوں کو ہدایت دے۔ ان کی ایک غلطی پورے خاندان کو لے ڈوبتی ہے۔''

مولانا نے تائید میں سر ہلایا۔ سلیمان نے کہا۔ ''آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔''

وہ بولے۔ ''بات ہماری نہیں ہے؟ دُردانہ بہن کی ہے۔ اب دیکھنا یہی ہے کہ وہ ہماری بات مانے گی بھی یا نہیں...؟''

''مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گی۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔''

مولانا نے امام صاحب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ابھی چلنا ہوگا؟''

سلیمان نے جلدی سے کہا۔ ''جی مولانا صاحب! دردانہ گھر پر ہے۔ آپ ابھی چلیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔''

مولانا نے کن انکھیوں سے بڑے کمرے کی طرف دیکھا۔ امام صاحب نے کہا۔ ''ایک اجڑی ہوئی بیٹی کا گھر بسانے کی بات ہے۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔ پھر چلتے ہیں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر آنگن میں آگئے۔ سر اٹھا کر چھت کی سمت دیکھا۔ یہ تو یقین ہو چکا تھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ پہلے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی تھی۔ اب ان لوگوں کے آنے سے پہلے اس خوشبودار رومال نے اور سیڑھیوں کی چرچراہٹ نے چونکا دیا تھا۔

وہ ان باتوں کو محض وہم سمجھ کر فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ جلد سے جلد اس حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔

ان کا ذہن بڑی حد تک الجھا ہوا تھا پھر بھی وہ سلیمان کا معاملہ سلجھانے کے لیے اس کے ساتھ دُردانہ کے گھر کی طرف چل پڑے۔

دُردانہ اپنے کئی مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ دو برس پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ جوان بیٹا بدمزاج تھا۔ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہیرا پھیری کرتا تھا۔ دو نمبر کے دھندے سے پانچ دس ہزار روپے کماتا پھر مہینے دو مہینے تک آرام کرتا تھا۔

دردانہ نے گھر کا چولہا گرم رکھنے کے لیے ایک مرد کو پھانس لیا تھا۔ اس شرط پر اس سے نکاح پڑھوایا تھا کہ وہ ماہانہ پندرہ ہزار روپے ادا کیا کرے گا۔ جوان بیٹے نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ اسے گھر کی ذمے داریوں سے نجات مل گئی تھی لیکن جوان بیٹی عینی نے کہا۔ ''آپ کو اس عمر میں شادی نہیں کرنی چاہیے۔''

ماں نے چیخ کر جواب دیا۔ ''کیا میں عمر والی ہو گئی ہوں؟ کیا تم مجھے بوڑھی کہہ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''جوان بیٹے اور بیٹی کے ہوتے ہوئے سب یہی کہیں گے۔''

''جو کہے گا' اس کا منہ توڑ دوں گی۔ دنیا والے کیا جانیں کہ میرے سوتیلے باپ نے گیارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی تھی۔ ایک برس کے اندر ہی نعیم پیدا ہو گیا۔ آج وہ بیس برس کا ہے۔ میں پورے بتیس برس کی جوان عورت ہوں۔''

عینی نے کہا۔ ''مجھے آپ کی عمر سے کیا لینا لیکن آپ مجھ پر سوتیلا باپ لاکر وہی غلطی کر رہی ہیں' جو آپ کی امی نے کی تھی۔ سوتیلا پھر سوتیلا ہوتا ہے۔ اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے میری نانی نے اچانک ہی ایک دن کے اندر آپ کی شادی کر دی تھی۔''

دردانہ نے تصحیح کی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ فضول باتیں نہ کرو۔''

''میں کب کہتی ہوں کہ کچھ ہوا تھا۔ ایک بار آپ نے ہی بتایا تھا۔ مگر یہ اچھی طرح سن لیں کہ اگر وہ آپ کی غیر موجودگی میں آئے گا تو میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔''

''تم یہاں رہتی ہی کب ہو؟ تمہارا تو اپنے چچا کے گھر میں دل لگتا ہے۔''

''مگر اب میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

وہ اپنے چچا کے گھر میں پلی بڑھی تھی۔ کبھی کبھار ماں اور بھائی سے ملنے کے لیے آجاتی تھی۔ دردانہ اسے سمجھاتی تھی کہ اب اسے اپنے گھر آجانا چاہیے۔ وہ ماں کے کہنے پر بڑے عرصے بعد وہاں رہنے چلی آئی تھی۔ مگر اس سوتیلے باپ کی وجہ سے آئے دن ماں بیٹی کے درمیان تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن وہی ہوا' جس کا اندیشہ تھا۔ جوان بیٹی گھر سے بھاگ گئی۔ اس نے فون پر کہا۔ ''میں اپنی سہیلی کے گھر میں ہوں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ بیٹی گھر آجائے تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کمینے سے رشتہ توڑ دیں۔ اس کے منہ پر تھوک دیں۔“

”بات کیا ہے، کچھ تو بتاؤ؟“

”میں کیا بتاؤں؟ آپ نادان بچی نہیں ہیں۔ جائیں اور اس کتے سے پوچھیں۔ اس نے کیسی ذلیل حرکت کی ہے؟“

دردانہ بڑی لڑاکا تھی۔ اپنے مرد پر حاوی رہنا جانتی تھی۔ اس نے پہلے شوہر کو بھی انگلیوں پر نچایا تھا۔ دوسرا شوہر جسیم الدین اس کی کوئی ضرورت پوری نہ کرتا تو لڑنے کے لیے اس کے آفس میں پہنچ جاتی تھی۔ اعلیٰ عہدے داروں اور ملازموں کے سامنے اسے دوکوڑی کا کر دیتی تھی۔

جسیم الدین ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی عزت اور نیک نامی کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اس کی کمزوری یہی تھی کہ حسین اور جوان عورتوں کا رسیا تھا اور یہ کمزوری اسے لے ڈوبتی تھی۔

اب وہ پچھتا رہا تھا۔ کان پکڑ کر کہتا تھا۔ ”دردانہ! خدا کے لیے آفس میں نہ آیا کرو۔ بس فون پر کہو، میں دوڑا چلا آؤں گا۔“

اور واقعی وہ ایک کال پر اپنی عزت کی خاطر بھاگم بھاگ چلا آتا تھا لیکن اس روز بات بگڑ گئی تھی۔ اس نے سوتیلی بیٹی کو پھانسنے کی کوشش کی تھی اور ناکام رہا تھا۔ دردانہ نے فون پر کہا۔ ”اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں آؤ۔ تمہاری ذلالت سے میری بیٹی مجھ سے باغی ہو گئی ہے۔ وہ اپنی سہیلی کے گھر سے اس وقت تک نہیں آئے گی‘ جب تک میں اس کے سامنے تمہیں جوتے نہیں ماروں گی۔“

وہ عاجزی سے بولا۔ ”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ میں شرم سے مرا جا رہا ہوں۔ تم ابھی غصے میں ہو۔ میں تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔“

”میں آفس میں آؤں گی۔ وہاں تمہاری عزت اتاروں گی۔“

”جب تک تمہارا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ میں آفس بھی نہیں جاؤں گا۔“

”میں تمہاری کوٹھی میں پہنچ جاؤں گی۔ میں منکوحہ ہوں تمہاری کوئی داشتہ نہیں ہوں۔ میرے پاس نکاح نامہ ہے۔ سیدھی طرح یہاں آ جاؤ۔“

”آ جاؤں گا مگر پلیز۔ میری ایک بات مان لو۔ مجھے صرف ایک دن کی مہلت دو۔ تم مجھے جو سزا دینا چاہو گی‘ جو جرمانہ لو گی‘ میں ادا کروں گا۔ مجھ سے رابطہ کرو۔ کوئی ایسا سمجھوتا کرو کہ میری عزت رہ جائے اور تمہارا غصہ دور بھی ہو جائے۔ میں تمہارا مطالبہ مان کر تمہاری زندگی سے دور ہو جاؤں گا۔“

رابطہ ملتوی ہونے کے بعد وہ سوچنے لگی۔ ”جب تک جسیم الدین کو اپنی زندگی سے نہیں نکالوں گی‘ تب تک بیٹی گھر واپس نہیں آئے گی۔ یہ اچھا موقع ہے، جسیم الدین سے ایک تگڑی رقم وصول کر کے اس سے طلاق لے لینی چاہیے۔ بعد میں کوئی تیسرا مرد پکڑ لوں گی۔“

اس نے ایک گھنٹے بعد فون پر کہا۔ ”دیکھو میاں! تم اچھی طرح جانتے ہو‘ میں کیسی عورت ہوں؟ مرتے دم تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ تم نے جو حرکت کی ہے‘ اس کے بعد اپنے گھر میں گھسنے نہیں دوں گی لیکن تمہاری کوٹھی میں گھس کر ڈیرا جما لوں گی۔“

وہ گھبرا کر بولا۔ ”خدا کے لیے ایسا نہ سوچو۔ میں اپنی عزت اور نیک نامی کے لیے تمہیں ایک بڑی رقم دے کر طلاق نامہ لکھ دوں گا۔“

”معلوم تو ہو‘ کتنی بڑی رقم دو گے؟“

”پورے دو لاکھ روپے دوں گا۔“

وہ اندر سے خوش ہوئی۔ اوپر سے غصہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”میں کوئی بھکارن نہیں ہوں۔ پورے پانچ لاکھ روپے لوں گی۔“

وہ بولا۔ ”میرے جوان بیٹوں کو معلوم ہوگا تو وہ مجھے پھوٹی کوڑی دینے سے بھی روک دیں گے۔ پولیس والوں کو کھلا پلا کر تمہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ میں بات بڑھانا نہیں چاہتا۔ صرف اپنی نیک نامی کی خاطر تمہیں دو لاکھ دوں گا۔ راضی ہو جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

وہ راضی ہو گئی۔ ”چلو منظور ہے۔ بولو رقم کب دے رہے ہو؟“

”کل تمہیں طلاق نامہ اور دو لاکھ روپے کا چیک مل جائے گا۔“

دردانہ کے تو جیسے دن پھر گئے۔ گھر بیٹھے دو لاکھ روپے ملنے والے تھے۔ اس نے فون پر بیٹی سے کہا۔ ”میں اس آدمی کو چھوڑ رہی ہوں۔ کل وہ طلاق کے ساتھ مجھے دو لاکھ روپے کا چیک دے گا۔ تم واپس آ جاؤ۔“

”پہلے میں عرفان سے نکاح پڑھواؤں گی۔ اس کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گی پھر آپ کے پاس آؤں گی۔“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”کئی بار سمجھایا ہے کہ اس کا نام میرے سامنے نہ لیا کرو۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“

”اور میری دونوں آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ کل آپ کو دو لاکھ کا چیک ملے گا۔ پرسوں آپ مجھے ایک لاکھ روپے دیں گی۔“

جواب میں وہ غصے سے بولی۔ ”مجھے کیا پاگل کی بچی سمجھا ہے کہ عرفان کے لیے تجھ پر اتنی بڑی رقم لٹا دوں؟“

”وہ تو آپ کو لٹانا ہی پڑے گی۔ ابھی یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔ پتا نہیں‘ کس کے ساتھ منہ کالا کر رہی ہوں؟ بدنامی سے بچنے کے لیے میرا مطالبہ پورا کریں۔ میں منکوحہ بن کر نیک نامی سے گھر واپس آ جاؤں گی۔“

یہ کہہ کر بیٹی نے فون بند کر دیا۔ وہ ماں کے پیروں تلے سے زمین کھسکا رہی تھی۔ اس نے اپنی بھتیجی انیلا پر الزام لگایا تھا۔ اب یہی الزام اپنی بیٹی پر بھی آ سکتا تھا۔

وہ اپنی ماں کی طرح تیز طرار تھی۔ ایک لاکھ روپے وصول کیے بغیر نیک نامی سے گھر واپس آنے والی نہیں تھی۔ خوب جانتی تھی کہ ماں کو اس کے سامنے ہار ماننا پڑے گی اور بیٹا بھی اتنی بڑی رقم دیکھ کر کاروبار کے لیے بیس پچیس ہزار مانگ کر لے جائے گا پھر ایک آدھ ہفتے بعد خالی ہاتھ واپس آ جائے گا۔

دردانہ اپنے مسائل میں الجھی ہوئی تھی۔ جب ہی اس کا بھائی سلیمان، مسجد کے پیش امام اور مولانا فضل کریم کے ساتھ اس کے دروازے پر آیا۔ بھائی کو محلے کے معزز افراد کے ساتھ دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ کس مقصد کے لیے آئے ہیں۔

اس نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ امام صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”دردانہ بہن! ہم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اگر اجازت ہو تو اندر آ جائیں؟“

وہ فوراً ہی ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔ ”جی بسم اللہ۔ تشریف لائیں۔“

اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر جانے لگے۔ سلیمان بھی ان کے پیچھے جانا چاہتا تھا کہ دردانہ نے اس کی کلائی تھام لی۔ اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے آئی اور دبی آواز میں بولی۔ ”میں سب سمجھ گئی ہوں کہ تم اپنی سفارش کے لیے انہیں یہاں لائے ہو۔“

وہ سر جھکا کر بولا۔ ”تم درست سمجھ رہی ہو۔“

”جبکہ میں نے کہا تھا کہ رشتے کی بات اپنے دماغ سے نکال دو پھر بھی یہ تماشا کر رہے ہو؟“

”میری تو اپنی زندگی تماشا بن کر رہ گئی ہے۔ تم چاہو تو اپنے بھائی کو اس دلدل سے نکال سکتی ہو۔“

وہ ذرا تن کر بولی۔ ”پتھر پر کھنچی ہوئی لکیر تو مٹ سکتی ہے مگر دردانہ کی زبان سے نکلی ہوئی بات کبھی نہیں بدلتی۔“

حفظِ مراتب

ادب آداب‘ تکلفات اور حفظِ مراتب کے ذکر میں پولیس کا نام آنے پر قارئین ضرور چونکے ہوں گے لیکن یہ حقیقت ہے اور ہم اس میں رتی بھر مبالغے سے کام نہیں لے رہے۔ اس کے ثبوت میں ہم وہ چند اہم اعلانات یہاں درج کرتے ہیں جو ٹریفک پولیس والے ان دنوں شارع قائداعظم پر لاؤڈ اسپیکر سے نشر کرنے میں مشغول رہتے ہیں، اس سے پتا چلے گا کہ چھوٹے بڑے کا لحاظ آج اگر کسی میں ہے تو وہ صرف پولیس میں ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔ نیلی ٹویوٹا والے صاحب، زحمت تو ہوگی مگر براہِ کرم اپنی گاڑی زیبرا کراسنگ سے ذرا پیچھے لے جائیں، اس سے ٹریفک میں دشواری پیش آ رہی ہے۔ بہت نوازش، شکریہ...... ویسپا والے صاحب۔ دائیں طرف مڑنے کی کوشش نہ کریں پہلے مین روڈ کا ٹریفک گزرنے دیں، اتنی بے صبری کی ضرورت نہیں، شکریہ۔ اوئے سائیکل والے اندھا ہو گیا ہے؟ دیکھتا نہیں اشارہ بند ہے، یہ سڑک تیرے باپ کی نہیں ہے۔ دفع ہو جا۔ شکریہ۔

عطاالحق قاسمی کی کتاب ”روزنِ دیوار“ سے اقتباس

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

”میں تمہاری ضدی فطرت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”جانتے ہو پھر بھی سفارش لے کر چلے آئے؟ کیا سمجھتے ہو اِن کے کہنے سے میں مان جاؤں گی؟“

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”مان جاؤ گی تو میری عزت رہ جائے گی۔“

”تمہاری عزت تو تمہاری چہیتی نے مٹی میں ملائی ہے۔“

”میری بیٹی اور تمہارے بیٹے نے مل کر ہم سب کے سروں پر خاک ڈالی ہے۔“

”میرے نعیم کو کچھ نہ کہنا۔ وہ نہیں گیا تھا تمہارے سر پر خاک ڈالنے کے لیے بلکہ تمہاری لاڈلی آئی تھی‘ اُسے ورغلانے کے لیے۔ پوری ایک رات گزاری تھی اُس نے یہاں۔ میرے گھر میں... میرے بیٹے کے ساتھ... وہ بھی میری غیر موجودگی میں۔“

وہ اسے چپ کرانا چاہتا تھا۔ مگر وہ دھیمی آواز میں یوں بول رہی تھی‘ جیسے دھیرے دھیرے اسے زندہ درگور کر رہی ہو پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”غضب خدا کا... میں بڑی آپا کے پاس رہنے کیا گئی تمہاری بیٹی نقب زنی کرنے چلی آئی۔ اپنے ساتھ میرے بچے کو بھی بدنام کر ڈالا۔ وہ تو لڑکا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہکاوے میں آ گیا۔''

''تم اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو تو بگڑی ہوئی بات بن سکتی...''

اس نے انگلی اٹھا کر اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔ ''بات بنانے کی کوشش بھی مت کرو۔ جاؤ جا کر اندر بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''جاتا ہوں مگر یاد کرو' ہمارے خاندان میں ایسی غلطی تم سے بھی ہو چکی ہے۔''

وہ تڑخ کر بولی۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''سچ بول رہا ہوں اور تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔ امی نے ایک رات ہمارے سوتیلے باپ کے ساتھ تمہیں پکڑا تھا اور پھر دوسرے ہی دن اپنے بھتیجے سے تمہارا نکاح پڑھوا دیا تھا۔''

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ''امام صاحب اور مولانا صاحب ابھی یہاں نہ ہوتے تو میں تمہارا منہ توڑ دیتی۔ کیا تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت ہے کہ میں نے یہ گناہ کیا تھا؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''جب تک ثبوت اور گواہ نہ ہوں' تب تک کوئی گناہ گار نہیں کہلاتا۔ میں پارسا ہوں اور پارسا ہی رہوں گی۔ تمہاری بیٹی کا، کالا منہ سب نے دیکھا ہے۔ اس لیے وہ گناہ گار کہلا رہی ہے اور کہلاتی رہے گی۔''

وہ بے بسی سے بولا۔ ''میں نے یہ بات تم پر کیچڑ اچھالنے کے لیے نہیں کہی ہے۔ بس اتنی سی التجا کرتا ہوں کہ اپنی غلطی کو یاد کرو اور میری بیٹی کو اس لیے اپنا لو کہ وہ تمہارے ہی بیٹے کے ساتھ گناہ گار ہوئی ہے۔''

''یہاں آ کر مجھ پر کیچڑ اچھال رہے ہو۔ میں خوب جانتی ہوں۔ اگر ابھی تمہارے پاس ثبوت اور گواہ ہوتے تو تم میری کمزوری سے ضرور فائدہ اٹھاتے۔ زبردستی اپنی بیٹی کو میرے بیٹے کے سر پر لا کر بٹھا دیتے اور میں چپ چاپ دیکھتی رہ جاتی۔''

''میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ امی نے تمہاری غلطی پر پردہ ڈالا تھا۔ تم میری بیٹی کی غلطی پر پردہ ڈالو۔ خاندان میں یہی ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی پردہ پوشی کر کے ہی گھرانے کی عزت رکھی جاتی ہے۔''

''میں تو ایسا نہیں کر سکتی۔ نیک مشورہ دیتی ہوں' کسی دوسرے شہر میں جاؤ۔ وہاں بیٹی کو پارسا بنا کر اسے کسی کے پلے باندھ دو۔ یہی ایک راستہ ہے۔''

پھر وہ وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ''اب جاؤ یہاں سے۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ بڑی بے بسی سے سر جھکا کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ امام صاحب نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ بولا۔ ''مجھے لگتا ہے' آپ لوگوں کو بیچ میں ڈالنے سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔''

''کیا دردانہ بہن نے یہ کہا ہے؟''

''اُس کی تو وہی ایک ضد ہے۔ کہتی ہے' کسی بھی حال میں نہیں مانے گی۔''

مولانا فضل کریم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بات کرنے کا اور منوانے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ تم حوصلہ رکھو۔''

امام صاحب نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''نعیم کو کون نہیں جانتا؟ ایک نمبر کا نکھٹو ہے۔ کوئی ہیرا نہیں ہے۔ لیکن ہاں اس وقت تمہاری بیٹی کے لیے پارس ثابت ہو سکتا ہے۔''

مولانا نے کہا۔ ''اور اس مجبوری کو دردانہ بہن اچھی طرح سمجھ رہی ہے۔''

سلیمان نے کہا۔ ''افسوس تو اسی بات کا ہے۔ مجبوری کو سمجھنے کے باوجود وہ راضی نہیں ہو رہی ہے اور اُسے منانے کے لیے میں تو اس کے پاؤں پکڑنے کو بھی تیار ہوں۔''

امام صاحب نے اس کے شانے کو حوصلہ دینے کے انداز میں تھپتھپایا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ برے حالات کی مار ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب پڑتی ہے تو انسان نہ چاہنے کے باوجود گرتا پڑتا رہتا ہے۔ پھر اسے اٹھنے اور سنبھلنے کا سہارا نہیں ملتا۔

وہ بیٹی کو نیک نامی دینے کے لیے بہن کے قدموں میں گرنے آیا تھا اور وہ اسے ٹھوکروں میں اڑا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں چائے کی پیالیاں لے کر وہاں آ گئی۔ امام صاحب نے مولانا صاحب کو یوں دیکھا' جیسے اشارہ کر رہے ہوں کہ بات شروع کی جائے۔ وہ پہلو بدل کر بولے۔ ''دردانہ بہن! بات یہ ہے کہ...''

وہ سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کے آنے کا مقصد سمجھ گئی ہوں۔''

''اور ہم بھی یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمہارے لیے سلیمان کا یہ مطالبہ مان لینا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔''

وہ چائے کی پیالیاں ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''مشکل نہیں مولانا صاحب! ناممکن ہے۔ میں ایک ناقابلِ اعتماد لڑکی کو اپنی بہو تسلیم نہیں کر سکتی اور میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔''

''مگر اب حالات سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں تو سوچنا سمجھنا چاہیے۔''

وہ شانے اچکا کر بولی۔ ''میری کوئی مجبوری نہیں ہے۔''

''اپنے بھائی کی طرف دیکھو۔ تمہارا خون کا رشتہ ہے۔''

وہ بولی۔ ''خون کا رشتہ ہے' اسی لیے جڑا ہوا ہے ورنہ انیلا نے تو اسے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔''

''قصور صرف انیلا کا نہیں بلکہ نعیم بھی شریک گناہ رہا ہے۔ دو گناہ گاروں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دینا دانشمندی ہوگی۔ پورے خاندان کی نیک نامی بحال ہو جائے گی۔''

''میں اپنے بیٹے کی حمایت نہیں کروں گی۔ اگر حمایت کرنی ہی ہوتی تو اُس روز اپنے بچے کو گھر سے کیوں نکالتی؟ پورا محلہ جانتا ہے' میں نے اسے سزا دی ہے۔ گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔ نہ جانے میرا بچہ کہاں سڑکوں پر دن رات گزار رہا ہوگا؟''

اس نے ذرا رک کر چہرے کو آنچل سے یوں صاف کیا' جیسے آنسو پونچھ رہی ہو پھر بولی۔ ''بے شک۔ اُس سے غلطی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ کوئی فرشتہ نہیں تھا مگر آپ یہ دیکھیں کہ ابتدا کہاں سے ہوئی تھی؟''

وہ اپنا ہاتھ ان کے سامنے کرتے ہوئے انگلیوں پر گننے لگی۔ ''ایک... میرا بیٹا اُسے اٹھا کر نہیں لایا تھا۔ دو۔ وہ اپنے قدموں سے چل کر یہاں آئی تھی۔ تین... صبح آپ سب کے سامنے اس گھر سے برآمد ہوئی تھی۔ چار... وہ اس رات میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر بے حیائی کے لیے آئی تھی۔ پانچ... سب کو انیلا کے حلیے سے معلوم ہو گیا تھا کہ نعیم نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ اب اس سے زیادہ میں کیا بولوں؟ آپ لوگ تو گواہ ہیں۔''

وہ زخموں کو کرید رہی تھی۔ اگرچہ سچ بول رہی تھی مگر وہ سچ بہت ہی کڑوا تھا۔ سلیمان کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکائے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑے یوں کھینچ رہا تھا' جیسے اس شرمناک حقیقت کا منہ نوچ رہا ہو۔

مولانا نے اسے دیکھا پھر دردانہ سے کہا۔ ''ہم اس قصے کو دہرانے نہیں آئے ہیں مسئلے کا حل نکالنے آئے ہیں۔ سلیمان بہت پریشان ہے۔ انیلا کی بدنامی اس کی دوسری بیٹیوں کو بھی تباہ کر ڈالے گی۔ بچوں نے گناہ کیا ہے۔ تم نیکی کرو۔''

وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''غلطی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس پر پردہ نہیں ڈالا جاتا اور یہ باتیں تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔''

مولانا نے امام صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹیوں کی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے پردہ پوشی سے کام لیا جاتا ہے۔ دردانہ بہن! ہم بڑی امید یں لے کر یہاں آئے ہیں۔ سوچا تھا' تم اپنے بھائی کی نہیں تو کم از کم ہماری بات ضرور مانو گی۔''

وہ بولی۔ ''آپ دونوں علاقے کے معزز افراد ہیں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ آپ کی ہر بات میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔''

اس نے بھائی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ''لیکن ذرا سوچیں! اگر اسی طرح گناہوں کی پردہ پوشی کی جاتی رہی تو آئندہ دوسری لڑکیوں کو بھی شہ ملے گی۔ یہ حوصلہ ملے گا کہ گھر سے باہر رات گزارنے اور منہ کالا کرنے کے باوجود انہیں ڈولی نصیب ہو جائے گی۔ آپ صرف ایک پہلو سے سوچ رہے ہیں۔ انجانے میں ایک گناہ گار کو بچانے کے لیے کتنے ہی نادان ذہنوں کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔''

مولانا نے کہا۔ ''تم سراسر غلط سوچ رہی ہو۔''

وہ بولی۔ ''برا نہ منائیں مولانا صاحب! مجھے لگ رہا ہے' آپ میری سننے نہیں بلکہ صرف اپنی کہنے آئے ہیں۔ چاہتے ہیں' کسی بھی طرح میں آپ کی بات مان لوں۔''

مولانا فضل کریم نے امام صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ ضد کی پکی ہے۔ جو ٹھان چکی ہے' اُس سے پیچھے نہیں ہٹے گی بلکہ جارحانہ انداز میں الٹی سیدھی دلیلیں دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوششیں کرتی رہے گی۔

مولانا نے امام صاحب کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے سلیمان کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی شکستگی سے بہن کو یوں دیکھ رہا تھا' جیسے وہاں سے اٹھے گا تو بکھر جائے گا۔ کبھی سمٹ نہیں پائے گا۔ اس کی نگاہوں میں ایک بوڑھے اور مجبور باپ کی التجا تھی' ایک بے بس بھائی کی فریاد تھی کہ بہن اسے سمیٹ لے۔

امام صاحب نے آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔ دردانہ سے کہا۔ ''کم سے کم اپنے بھائی کے لیے ہمدردی سے سوچو... یہ بے چارہ تو جیتے جی مر گیا ہے۔''

اس نے ایک نظر بھائی کو دیکھا پھر کہا۔ ''جس کی قسمت میں جو ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ تقدیر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے؟''

وہ بولے۔ ''تدبیر سے تقدیر بھی بدلی جا سکتی ہے۔''

اس نے پہلو بدل کر کہا۔ ''جی بے شک۔ تدبیر سے تقدیر بدلتی ہے۔ اب میں صاف صاف کہہ دوں کہ میں اپنے بیٹے کی تقدیر بدلنا چاہتی ہوں۔ وہ بے روزگار ہے۔ کبھی کام دھندے سے لگتا ہے تو ماہانہ چار پانچ ہزار روپے مل جاتے ہیں۔ شادی کرے گا تو کیا کمائے گا اور بیوی بچوں کو کیا کھلائے گا؟''

سلیمان نے کہا۔ ''میں اسے پان سگریٹ کی دکان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروادوں گا۔''

''میں ایک دکان کرا چکی ہوں۔ پی سی او اور فوٹو اسٹیٹ کاپی کی مشین بھی لگوائی تھی۔ وہ دکان نہیں چلی۔ میرا بیٹا ایک بہت بڑا جنرل اسٹور کرنا چاہتا ہے۔''

''میری اوقات دیکھ کر جو کہو گی' میں وہ کروں گا۔ جنرل اسٹور میں تو لاکھوں روپے لگانے پڑتے ہیں۔''

''اپنا مکان نعیم کے نام کردو۔ میں انیلا کو بہو بنا کر لے آؤں گی۔''

ان تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ بھتیجی کی عزت رکھنے کے لیے اس نے بہت بڑا مطالبہ کیا تھا۔ سلیمان نے عاجزی سے کہا۔ ''میں نے تین بیٹیوں کو دلہن بنانے کے لیے وہ مکان رکھا ہے۔ اس کا ایک ایک پورشن بیچ کر ان کی شادیاں کروں گا۔ اگر ایک ہی بیٹی کو پورا مکان دے دوں گا تو باقی بیٹیوں کا کیا ہوگا؟''

وہ بولی۔ ''یہ تمہارا مسئلہ ہے' تم سمجھو۔ میں تو اسی طرح تمہارا مسئلہ حل کرسکتی ہوں اور کوئی صورت نہیں ہے۔''

مولانا نے کہا۔ ''وہ تمہارے بھائی کی بیٹی ہے۔ انسانیت سے اور لہو کے رشتے سے اسے گھر لاؤ۔ یہ لین دین کی شرط نہ رکھو۔''

''کیا میرے گھر آ کر منہ کالا کرنے والی لڑکی کو مفت میں اپنے گلے کا پھندا بنالوں؟''

''اس گناہ میں تمہارا بیٹا بھی برابر کا شریک رہا ہے۔''

''یہ میں پہلے بھی مان چکی ہوں۔ عقل کی بات یہ ہے کہ سلیمان اپنا مکان نعیم کے نام لکھے گا تو اس میں انیلا کی بھلائی ہے۔ میرا بیٹا وہ مکان بیچ کر بڑا جنرل اسٹور کرے گا۔ انیلا یہاں آ کر راج کرے گی۔''

امام صاحب نے کہا۔ ''تم سلیمان کو اور اس کے بیوی بچوں کو بے گھر کردینا چاہتی ہو۔''

''آپ جو بھی سمجھیں۔ مجھے جو کہنا تھا' کہہ دیا۔ آپ حضرات کا وقت بہت قیمتی ہے۔ یہاں ضائع نہ کریں۔''

اس نے یہ کہہ کر گویا بات ہی ختم کردی۔ اب آگے کچھ بھی کہنے کو نہیں رہ گیا تھا۔ وہ واضح الفاظ میں انکار کر چکی تھی۔ مولانا فضل کریم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے امام صاحب سے کہا۔ ''ہمیں چلنا چاہیے۔''

سلیمان نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر امام صاحب کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں بے چارگی اور بے بسی تھی۔ سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟

وہ اس امید کے سہارے بہن کے پاس آیا تھا کہ وہ اُس کی نہیں تو اُن معزز افراد کی ضرور سنے گی مگر اب یہ امید بھی ٹوٹ گئی تھی۔ امام صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلو سلیمان...!''

سلیمان کی حالت قابل دید تھی۔ اس کے اندر جیسے کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ امام صاحب کے سہارے اٹھ کر اس گھر سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

عبادت کے لیے جائے نماز اور دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے جاتے ہیں۔ انیلا کی ماں رضیہ بیگم نے سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے زیراب بولنے لگی۔ ''یا خدا! ہماری بگڑی بنا دے۔ دردانہ کے دل میں رحم ڈال دے۔ وہ نعیم کے لیے انیلا کو قبول کرلے گی تو اس گھر کی عزت رہ جائے گی۔''

وہ بڑے کرب سے بولی۔ ''اے رب العزت! ہمیں عزت دے۔ ہمیں بدنامی سے بچا لے۔ نعیم اور دردانہ کے دلوں میں گنجائش پیدا کردے میرے مالک..! وہ انیلا کو قبول کرلیں۔''

انیلا دوسرے کمرے میں تھی۔ اس نے وہاں آتے ہوئے ماں کی فریاد سنی تو تڑپ کر کہا۔ ''امی! یہ کیا کر رہی ہیں؟ ماں تو اپنی اولاد کے لیے دعا میں مانگتی ہے' آپ بددعا کیوں کر رہی ہیں؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''کیا کریں؟ علاج کے لیے کڑوی گولی نگلنی پڑتی ہے۔ اچھی طرح جانتی ہوں' نعیم کسی طور تمہارے لائق نہیں ہے۔ میں نے بھی اسے داماد بنانے کے بارے میں نہیں سوچا مگر اب حالات سمجھا رہے ہیں کہ وہی درد کی دوا بن سکتا ہے۔''

''جس نے زخم دیا ہے' اُسی سے مرہم مانگ رہی ہیں؟''

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو نہ چاہو مجبوراً وہی چیز مانگنی پڑتی ہے۔ درد دینے والے سے ہی دوا لینا پڑتی ہے۔''

وہ ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''امی! یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ ابو مجھے گناہ گار سمجھتے ہیں۔ میری صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مگر آپ تو سب سمجھتی ہیں۔ سچائی کو جانتی ہیں۔ پھر یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ نعیم اور پھپھو نے مجھ سے دشمنی کی ہے۔ مفت میں بدنام کیا ہے۔''

''یہ میں جانتی ہوں، تم جانتی ہو اور ہمارا خدا جانتا ہے۔ مگر دنیا والوں کو کیسے سمجھایا جائے کہ وہ نہیں ہوا جو وہ سمجھ رہے ہیں۔ تم سے دشمنی کی گئی ہے۔ سازش کے طور پر بدنام کیا گیا ہے۔ سب کو چھوڑو، تمہارا اپنا سگا باپ تمہاری بات پر

یقین نہیں کرتا تو کسی سے کیا کہوں؟''

وہ بولتے بولتے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ''اس بدنامی نے ہماری نیندیں اڑا دی ہیں۔ بھوک پیاس مرگئی ہے۔ آخر اس مسئلے کا کوئی تو حل ہوگا؟''

''حل تو میں بھی نہیں جانتی مگر مجھ سے ایک بار دشمنی کی جا چکی ہے۔ اب آپ مجھے نعیم کے لیے باندھ کر اس دشمنی کی انتہا نہ کریں۔ وہ دشمن بھی مسیحا نہیں بن سکتا۔ نہ ہی میں اس کی مسیحائی چاہتی ہوں۔''

''بات صرف تمہاری نہیں ہے۔ تمہاری بہنوں کی بھی ہے۔ ان کے بارے میں سوچو گی تو راضی ہو جاؤ گی۔''

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے ماں کو دیکھتی رہی پھر چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ قسمت کے ہیر پھیر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ کیا ہو چکا تھا؟ کیا ہو رہا تھا اور آئندہ کیا ہونے والا تھا؟

حالات نے اچانک ہی اسے یوں اٹھا کر کیچڑ میں پھینکا تھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ جب نیک نامی نہ رہی تو پھر کیا رہ گیا؟ بدنامی اسے مر جانے کا مشورہ دے رہی تھی۔

آخر حقیقت کیا تھی؟

وہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد خود کو پاکیزہ کیوں کہہ رہی تھی؟ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا۔ پھر بھی وہ تسلیم نہیں کر رہی تھی۔ آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار کر رہی تھی۔

کیوں انکار کر رہی تھی...؟

اس ''کیوں'' کا جواب اُس کے اندر چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ اُس رات کوئی گناہ نہیں ہوا تھا۔ وہ گناہگار نہیں بنی تھی، گرچہ شعلوں کے درمیان رہی تھی مگر اس نے دامن پر کوئی آنچ نہیں آنے دی تھی۔

ان دنوں وہ ایک شادی کی تقریب میں گئی تھی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ شادی خانہ آبادی اس کی زندگی میں ایسی بربادی لانے والی ہے؟

وہ اپنی سہیلیوں اور کزنز کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ تب ہی نعیم چند رشتے دار لڑکوں کے ساتھ ان کے پاس چلا آیا۔ اس وقت وہ سب شادی اور محبت کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

انیلا کی ایک کزن نے شرارت بھری نظروں سے نعیم کو اور دوسرے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے خاندان میں خوبصورت لڑکیوں کی کمی نہیں ہے مگر ہمارے یہ کزنز بڑے نا شکرے ہیں۔ گھر کی بریانی چھوڑ کر باہر کی والی ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔''

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟
کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کرکے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک
المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری نے کہا۔ ''دراصل ان کی آنکھیں خراب ہیں۔''

ایک اور نے شوخی سے کہا۔ ''آنکھیں خراب نہیں ہیں۔ ہمارے حسن کی آب و تاب کے سامنے چندھیا جاتی ہیں۔ بے چارے دیکھ نہیں پاتے۔''

وہ سب ہنسنے لگیں۔ نعیم نے کہا۔ ''خوش فہمیاں تو دیکھو ان کی؟ ارے محترمہ! کبھی آئینہ دیکھنے کی فرصت ملے تو ذرا غور کرنا کہ ہم آپ کے حسن کو دیکھ نہیں پاتے یا دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔''

وہ اور اس کے ساتھی لڑکے ہنسنے لگے۔ ایک لڑکے نے کہا۔ ''ہمارے خاندان میں ہے ہی کیا جسے دیکھنے کے لیے ہم اپنا وقت برباد کریں۔''

ایک لڑکی نے کہا۔ ''وقت برباد کرکے تو دیکھو۔ ہم تمہاری زندگی آباد کردیں گی۔''

انیلا نے اپنی کزن سے کہا۔ ''رہنے دو، ہم جیسے ہیرے کسی جوہری کے ہاتھ لگیں تو ہی اچھا ہے۔''

نعیم نے کہا۔ ''اوہو، تو محترمہ خود کو ہیرا سمجھتی ہیں؟''

وہ ایک ذرا تن کر بولی۔ ''بے شک۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سنا ہے ہیرا چاٹ کر لوگ مرجاتے ہیں۔ میں اس بات کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ کیا آزمانے دو گی؟''

اس نے یہ کہتے ہوئے اس کی کلائی تھام لی۔ انیلا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کے دماغ میں جیسے دھواں سا بھر گیا تھا۔ کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے نعیم کے منہ پر ایک طمانچہ جڑ دیا پھر ایک جھٹکے سے کلائی چھڑا کر وہاں سے چلی گئی۔

دور کھڑی ہوئی دردانہ نے بیٹے کو طمانچہ کھاتے ہوئے دیکھا تو تلوے سے سر تک سلگ گئی۔ جو آگ انیلا کے اندر لگی تھی' اس سے کہیں زیادہ شعلے دردانہ کے اندر بھڑک اٹھے تھے۔ جس بیٹے کو اس نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہیں مارا تھا' اُسے بالشت بھر کی لڑکی نے بھری محفل میں طمانچہ مارا تھا۔

اُدھر بیٹا تلملا کر رہ گیا تھا، اِدھر ماں تلملا رہی تھی۔ جی تو کر رہا تھا' ابھی جا کر اس کا مزاج ٹھکانے لگا دے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر سمجھا دے کہ اس کا بیٹا گیا گزرا نہیں ہے کہ اس پر یوں ہاتھ اٹھایا جائے۔

جواب تو دینا تھا۔ دیے بغیر کلیجے میں ٹھنڈ پڑنے والی نہیں تھی۔ اس محفل میں تو وہ بات آئی گئی ہوگئی۔ نازک سے تھپڑ نے نعیم کے چہرے پر کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا مگر وہ دل پر نقش ہوگیا تھا اور اسے مٹانے کے لیے وہ انیلا کو نوچ کھسوٹ کر رکھ دینا چاہتا تھا۔

دُردانہ نے کہا۔ ''وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟ بڑا بھاؤ دکھایا ہے' اسے وہ کوڑی کا بنا کر نہ رکھ دیا تو میرا نام بھی دُردانہ بیگم نہیں۔''

وہ بولا۔ ''آخر آپ کب کچھ کریں گی؟ بہت دن گزر گئے ہیں۔ میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے جب تک بدلہ نہیں لوں گا' تب تک سکون نہیں ملے گا۔''

''سکون تو اب اُس کا برباد ہوگا اور ایسا ہوگا کہ وہ تمام عمر سر پکڑ کر روتی رہے گی۔''

''آخر آپ سوچ کیا رہی ہیں؟ کیا کرنا چاہتی ہیں؟ میں اپنے طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں تو روک دیتی ہیں۔''

وہ بڑی مکاری سے مسکرا کر بولی۔ ''اب رُکنا نہیں ہے بلکہ کر گزرنا ہے۔''

پھر وہ اسے سمجھانے لگی کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔

دوسرے روز محلے کے ایک گھر میں قرآن خوانی کی محفل تھی۔ دردانہ جانتی تھی' انیلا وہاں ضرور آئے گی اور اکیلی آئے گی کیونکہ اس کی ماں دائمی مریضہ تھی۔ گھنٹوں کسی ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ کمر اور گھٹنوں کا درد بار بار اسے بستر پہنچا دیتا تھا اور چھوٹی بہنیں سیکنڈ شفٹ میں اسکول جاتی تھیں۔ دوپہر ایک بجے کی گئی ہوئی شام کو پانچ ساڑھے پانچ بجے لوٹتی تھیں۔

جب دردانہ وہاں پہنچی تو اس کا اندازہ درست نکلا۔ انیلا تنہا آئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ انیلا اسے سلام کرکے سیپارہ پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ بھی ایک سیپارہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔

دھیرے دھیرے عورتوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ دردانہ نے سیپارہ ختم کرکے رکھ دیا۔ اس گھر کی ایک خاتون سے کہا۔ ''آپ نے بہت تاکید کی تھی اس لیے چلی آئی مگر محفل کے اختتام تک رُک نہیں سکوں گی۔''

وہ بولی۔ ''آپ وقت نکال کر آگئیں۔ یہی بہت بڑی بات ہے۔ ویسے نیاز تک رُک جاتیں تو اچھا ہوتا۔ مغرب سے پہلے قرآن خوانی مکمل ہوجائے گی۔ تبرک چکھ کر ہی جاتیں۔''

''یہ کھانا پینا تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اصل بات تو ثواب کی ہے۔ اس محفل میں شریک ہوگئی۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ اب چلتی ہوں۔''

خاتون نے کہا۔ ''جیسے آپ کی مرضی...''

دردانہ نے انیلا کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''یہاں سے فارغ ہوکر میرے گھر چلی آنا۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے پھوپی کو دیکھا۔ یہ سن کر تعجب ہوا تھا کہ اسے بھتیجی سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں... لیکن وہ باتیں کیا ہوسکتی تھیں؟

اس نے آنچل درست کرتے ہوئے کہا۔ ''پتا نہیں یہاں کتنا وقت لگے گا؟ ابھی تو پڑھنے کے لیے اچھے خاصے سیپارے رکھے ہیں۔''

''جتنا بھی وقت لگے۔ یہاں سے سیدھی میرے پاس آجانا۔ میں انتظار کروں گی۔''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔''

دردانہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے ہوئے تاکید کی۔ ''بھول نہ جانا۔ کہیں میں انتظار کرتی ہی رہ جاؤں۔''

''نہیں نہیں۔ مجھے یاد رہے گا، آجاؤں گی۔''

وہ چلی گئی۔ انیلا پھر سے سیپارہ پڑھنے میں مصروف ہوگئی مگر دھیان پھوپی کی طرف تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس سے کیا کام ہوسکتا ہے؟

ایسی کون سی ضروری باتیں ہیں' جنہیں وہ تنہائی میں کرنا چاہتی ہے؟ اس کا بار بار تاکید کرنا سمجھا رہا تھا' یقیناً کوئی خاص بات ہے۔ وہ متجسس ہوگئی تھی۔ سامنے کلام پاک کے الفاظ تھے۔ وہ انہیں پڑھ رہی تھی مگر الجھی ہوئی تھی۔ کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے پھوپی کے گھر جانا آنا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں جانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وہ قرآن خوانی کی محفل سے فارغ ہوکر دردانہ کے گھر چلی آئی۔ یقین تھا کہ پھوپی دروازہ کھولے گی مگر جب اس نے کال بیل بجائی تو خلاف توقع نعیم نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ شادی کی تقریب میں جو کچھ ہوا تھا' اس کے بعد سے وہ اس سے کترانے لگی تھی۔ کوشش کرتی تھی کہ ان کا سامنا نہ ہوا کرے۔ بہت دنوں بعد اب سامنا ہوا تو وہ ڈھیٹ بن کر مسکرا رہا تھا۔

وہ ذرا جھجک سی گئی۔ کترانے کے انداز میں نظریں جھکا کر بولی۔ ''مجھے پھپھو نے بلایا تھا، کہاں ہیں وہ؟''

اسے دیکھ کر تھپڑ کی سنسناہٹ یاد آگئی۔ وہ اپنے گال کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''گھر میں ہی ہیں۔ اندر آجاؤ۔''

وہ ہچکچا کر بولی۔ ''اندر...؟''

''ہاں۔ کیوں اندر نہیں آؤ گی؟ کیا زندگی میں پہلی بار پھوپی کے گھر آئی ہو؟''

''آں۔ ہاں۔ نہیں میں وہ...''

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ اسے اندر آنے کا راستہ دے کر دوسری طرف منہ کرکے بلند آواز میں بولا۔ ''امی! یہ تمہاری بھتیجی صاحبہ آئی ہیں۔''

وہ جھجکتے ہوئے اندر آگئی۔ بیٹے کی توہین کے باوجود پھوپی بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی۔ اسی لیے جب اس نے گھر آنے کو کہا تو وہ انکار نہ کرسکی۔ پھوپی پر اعتماد کرکے چلی آئی۔

وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے گھر کا جائزہ لیتے ہوئے ایک کمرے میں آگئی۔ دردانہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پھپھو کہاں ہیں؟''

''واش روم میں ہیں۔ تم بیٹھو۔ میں بلاتا ہوں۔''

وہ ماں کو پکارتے ہوئے بیٹھک کی طرف چلا گیا۔ وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ اس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

گھر میں بدستور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شام گہری ہوکر رات میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اب تک نہ پھوپی آئی تھی' نہ ہی نعیم پلٹ کر آیا تھا اور عینی کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ کمرے سے نکل کر واش روم کی طرف آئی۔ وہ خالی تھا۔ اس نے کچن میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس نے پریشان ہوکر دردانہ کو پکارا۔ ''پھپھو... ! پھپھو... !''

وہ جب سے آئی تھی' تب سے دردانہ کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو نہیں ملی تھی اور اب نعیم بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عجیب پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے اندر جیسے کوئی انجانا خطرہ شور مچانے لگا۔

وہ پھوپی کو پکارتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف آئی تو دروازے پر پہنچتے ہی ٹھٹک گئی۔ شدید حیرانی سے دیکھنے لگی۔ سامنے ہی ایک صوفے پر نعیم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آگے سینٹر ٹیبل پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور وہ ایک گلاس سے اُس لعنت کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے بڑی خباثت سے مسکرا رہا تھا پھر لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا، پھوپی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہو؟''

اسے اس حالت میں دیکھ کر دماغ کو جھٹکا سا لگا تھا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ وہ دُردانہ کا بگڑا ہوا شہزادہ ہے مگر اس کی آوارگی کس حد تک بڑھ چکی ہے؟ اس کا اندازہ ابھی ہو رہا تھا۔

اب اسے پھوپی کا انتظار نہیں تھا۔ وہ کہاں تھی؟ اسے کیوں بلایا تھا اور بلا کر اب تک سامنے کیوں نہیں آئی تھی؟ کچھ جاننے کا تجسس نہیں رہا تھا۔ وہ بس وہاں سے نکل جانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتی تھی۔

وہ کسی بات کا جواب دیے بغیر تقریباً دوڑتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف آگئی۔ پیچھے سے اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ دروازے پر پہنچ کر سمجھ میں آیا کہ وہ ایسے شیطانی انداز میں قہقہہ کیوں لگا رہا ہے؟

وہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ صرف کنڈی لگی ہوتی تو وہ ایک جھٹکے سے کھول کر پلک جھپکتے ہی باہر نکل جاتی مگر وہاں تو بھاری بھرکم تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کی تو جیسے سانسوں پر تالے پڑ گئے۔

اس نے شدید پریشانی سے پلٹ کر نعیم کو دیکھا پھر اس تالے کو دیکھا۔ بات سمجھ میں آ بھی رہی تھی اور نہیں بھی...

ذہن تسلیم کر بھی رہا تھا اور بے یقینی بھی تھی کہ سگے خون کے رشتے اس کے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔

اس نے تالے کو جھنجوڑ کر دیکھا۔ وہ مضبوط تالا تھا' اس کے نازک ہاتھوں کی زوراوری سے کھلنے والا نہیں تھا۔ وہ قریب آتے ہوئے بولا۔ ''یہ چابی کے بغیر نہیں کھلے گا اور چابی میرے پاس ہے۔''

اس نے پریشانی کو چھپاتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''یہ کیا مذاق ہے؟ اسے کھولو۔ مجھے جانے دو۔ کہیں تو...''

وہ اور قریب آگیا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دروازے سے لگ گئی۔ وہ بولا۔ ''نہیں تو کیا...؟ چیخو گی...؟ چلاؤ گی؟ شور مچاؤ گی؟''

اس نے اچانک ہی اور قریب ہو کر اسے ایک بازو کے حصار میں جکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ کو سختی سے اس کے منہ پر جما کر کہا۔ ''لو... اب چیخو...''

وہ ''اُوں۔ اُوں...'' کی آوازیں نکالتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ شراب کی بو اس کے منہ میں بھری ہوئی تھی۔ سانسوں کے بھبکے ایسے تھے کہ انیلا کا دم گھٹ رہا تھا۔

وہ غصے سے بولا۔ ''ایک کلائی پکڑنے پر اتنا غصہ دکھایا تھا۔ بہت برا لگا تھا ناں؟ اب تو پوری کی پوری میری گرفت میں ہو۔ اب کیسا لگ رہا ہے؟''

وہ خود کو چھڑانے کے لیے اس کے ہاتھوں کو نوچ رہی تھی۔ اسے خود سے دور رکھنے کے لیے دھکے دے رہی تھی۔ اس کے سینے پر اور بازوؤں پر گھونسے مار رہی تھی۔ وہ نشے کے باعث ڈگمگا رہا تھا پھر بھی اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی کسی کا ادھار نہیں رکھتا۔ جلد ہی اتار دیتا ہوں۔ تمہارا وہ تھپڑ مجھ پر ادھار ہے۔ فکر نہ کرو۔ آج سود سمیت لوٹاؤں گا۔''

وہ اس کے شکنجے سے نجات کے لیے مچل رہی تھی۔ کسی بھی مرد کی مضبوط گرفت سے چھٹکارا پانا صنف نازک کے لیے آسان نہیں ہوتا مگر نشے کی زیادتی نے انیلا کی مشکل ایک ذرا آسان کر دی تھی۔

تھوڑی دیر تک زور آزمائی کرنے کے بعد وہ خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئی۔ اسے پرے دھکیلتے ہوئے دور ہو گئی۔ لیکن دور ہونے سے کیا ہونے والا تھا؟

وہ اس چار دیواری میں تھی گویا اس کی پہنچ میں تھی۔ بھاگنے کا راستہ بند تھا۔ وہاں سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی کہ پھوپی گھر میں نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اسے پکارتے ہوئے ایک کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔

وہ ڈگمگاتے قدموں سے خود کو سنبھالتے ہوئے قدموں سے اس کے پیچھے آنے لگا۔ ''بھاگو... پورے گھر میں دوڑتی پھرو۔ پھپو... پھپو پکارتی رہو۔ مگر یاد رکھو! تمہاری آواز باہر جائے گی تو میرے ساتھ بدنام ہو کر کسی کو اپنی پارسائی کا یقین نہیں دلا سکو گی۔''

اس سے نجات کا کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ تب ہی ایک تدبیر دماغ میں آئی۔ اس نے ایک کمرے میں پہنچ کر بڑی پھرتی سے اس کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اس شیطان کو اپنی طرف آنے سے روک دیا۔

جو ہوا تھا' نعیم کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ وہ لپک کر دروازے کے قریب آیا۔ اسے دھکا دیتے ہوئے بولا۔ ''دروازہ کھولو۔ انیلا...! میں کہتا ہوں' دروازہ کھولو۔ تم مجھ سے یہ آنکھ مچولی نہیں کھیل سکتیں۔ کھولو دروازہ...''

وہ دروازے کو ہولے ہولے پیٹنے لگا۔ پھر جھنجلا کر ٹھوکریں مارنے لگا۔ انیلا کو کسی حد تک تحفظ حاصل ہو گیا تھا۔ وہ ذرا مطمئن ہو گئی تھی۔

دوسری طرف بوڑھے والدین کا اطمینان غارت ہو گیا تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ قرآن خوانی کی جس محفل میں گئی تھی' چھوٹی بہنوں نے وہاں جا کر معلوم کیا تو پتا چلا اسے وہاں سے گئے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

اسی دوران میں زردانہ ان کے گھر آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفری بیگ دیکھ کر انیلا کی ماں رضیہ بیگم نے پوچھا۔ ''یہ کہاں کی تیاری ہے؟''

وہ بولی۔ ''بڑی آپا کے گھر جا رہی ہوں۔ صبح آجاؤں گی۔ بھائی صاحب نے کہیں نعیم کی نوکری پکی کرائی ہے۔''

وہ سب بیٹی کے لیے پریشان تھے۔ انیلا کی ماں نے

اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہا۔ ''چلو اچھا ہے۔ نعیم پھر کہیں کام سے لگ جائے گا۔''

تھوڑی دیر پہلے ہی سلیمان نے سوچا تھا کہ بہن کے گھر جا کر انیلا کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے مگر اس کی آمد نے سمجھا دیا تھا کہ بیٹی وہاں بھی نہیں ہے۔

وہ بولا۔ ''اچھی بات ہے۔ تمہیں آپا کے پاس جانا چاہیے۔ وہ تو اپنی بیماری کی وجہ سے گھر کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں بھی کسی روز ان سے ملنے جاؤں گا۔''

زردانہ کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ بوڑھے نادان والدین سمجھ نہیں سکتے تھے کہ اس مسکراہٹ کے پیچھے کیسی کمینگی چھپی ہوئی ہے؟ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''انیلا کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی؟''

رضیہ بیگم نے ہچکچا کر شوہر کو دیکھا۔ پھر بات بناتے ہوئے کہا۔ ''وہ قرآن خوانی میں گئی ہے۔''

وہ بڑے تعجب سے بولی۔ ''اس وقت کہاں قرآن خوانی ہو رہی ہے؟''

اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس محفل میں وہ بھی شریک ہوئی تھی۔ رضیہ بیگم نے کہا۔ ''اصل میں وہاں رات کا کھانا بھی ہے۔ کہہ کر گئی تھی کہ دیر ہو جائے گی۔''

وہ بولی۔ ''ہاں اب تو نیاز نذر کی محفلیں بھی شادی بیاہ جیسی ہو گئی ہیں۔ رات گئے تک چلتی رہتی ہیں۔ ویسے جوان لڑکی کو یوں تنہا اتنی دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیے۔ آزادی بھی ایک حد تک ہو تو اچھی لگتی ہے۔''

رضیہ نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں اپنی بیٹیوں پر پورا بھروسا ہے۔''

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ''بے شک۔ بھروسا کرو مگر اندھا اعتماد نہ کرو۔''

رضیہ نے ناگواری سے پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کہنا نہیں' سمجھانا چاہتی ہوں۔ وہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ لہو ہے میرا۔ کیا اس کی بھلائی کے لیے کچھ بول نہیں سکتی؟''

بہن نے ایک ذرا اپنائیت جتائی تو بھائی پگھل گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ ضرور بول سکتی ہو بلکہ سمجھانے کے لیے ان بچیوں کو ڈانٹ بھی سکتی ہو۔ آخر کو تمہاری بھتیجیاں ہیں۔ تمہاری بیٹی جیسی ہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک بھتیجی کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ ''ویسے مجھے بھی ان پر پورا بھروسا ہے۔ ماشاءاللہ... بہت سمجھدار بچیاں ہیں۔ کبھی اپنے ماں باپ اور خاندان کا سر نیچا نہیں کریں گی۔ ہمیشہ ہمارا فخر بن کر رہیں گی۔''

سلیمان اور رضیہ بیگم نے تائید میں سر ہلایا۔ وہ بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اچھا تو میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ...!''

وہ باتیں بنا کر' اپنائیت جتا کر رخصت ہو گئی۔ ایک ذرا شبہ نہیں ہونے دیا کہ اپنے گھر میں کیسا شیطانی کھیل رچا کر جا رہی ہے؟

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا' تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ انیلا نہ خود آئی تھی' نہ کہیں سے اس کی کوئی خبر مل رہی تھی۔ رضیہ بیگم نے پریشانی سے کہا۔ ''گھر گھر جا کر جوان لڑکی کے بارے میں پوچھنا بھی مناسب نہیں ہے۔ لوگ سوال جواب شروع کر دیں گے۔ بات کو پر لگتے دیر نہیں لگے گی۔''

سلیمان نے کہا۔ ''میں کروں تو کیا کروں؟ جہاں جہاں اس کے جانے کی توقع کی جا سکتی تھی' وہاں تو میں نے کسی نہ کسی بہانے سے معلوم کر لیا ہے۔ یا خدا! وہ کہاں جا سکتی ہے؟''

اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھ کر کہا۔ ''سوچا تھا' شاید دردانہ کی طرف گئی ہو گی۔ جا کر پوچھنا ہی چاہتا تھا تو وہ خود ہی یہاں چلی آئی۔''

ایک بیٹی نے کہا۔ ''پتا نہیں۔ آپی کہاں گئی ہیں؟ کبھی بتائے بغیر گھر سے باہر نہیں رہتیں۔''

دوسری بیٹی نے رونے کے انداز میں کہا۔ ''آپی کہاں گم ہو گئی ہیں؟ میرے دل میں تو ہول اٹھ رہے ہیں۔ عجیب عجیب سے خیالات آ رہے ہیں۔''

ان بیٹیوں کے ماں باپ نے ایک دوسرے کو پریشان ہو کر دیکھا۔ باپ نے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں؟ تھانے میں رپورٹ درج کراؤں گا تو معاملہ اور بگڑ جائے گا۔ بدنامی الگ ہو گی۔''

رضیہ نے جلدی سے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''خدا کے لیے تھانے کا نام نہ لو۔ خاموشی سے اپنے طور پر تلاش کرنے کی کوشش کرو۔''

وقت گزر رہا تھا اور وہ اپنی جان سے گزر رہے تھے۔ اُدھر وہ محفوظ تو ہو گئی تھی مگر یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ اس کی گمشدگی بوڑھے والدین کو نہ جانے کیسے کیسے اندیشوں میں مبتلا کر رہی ہو گی؟

اس کے دل میں ایک امید تھی کہ والدین اسے تلاش کرتے ہوئے اُدھر ضرور آئیں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا' بیرونی دروازے کی کالنگ بیل سنائی دے گی' تب ہی وہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے سے نکلے گی۔

اس نے نعیم کی گرفت سے نکلنے کے بعد سوچا تھا' شور مچا کر وہ پڑوس والوں کو بلائے گی لیکن اسے ایک کمرے میں بند ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ نعیم اب اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ مطمئن تھی۔ خوامخواہ شور مچا کر تماشا بنانا نہیں چاہتی تھی۔

وہ دونوں ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نعیم کے سر پر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ اسے بدنامی کی پروا نہیں تھی لیکن وہ شور مچا کر' محلے والوں کو بلا کر اپنے پورے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بند کمرے کے باہر وہ جھنجلا رہا تھا۔ جو سوچا نہ تھا' وہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کے شکنجے میں رہتے ہوئے بھی اس کی پہنچ سے دور ہو گئی تھی۔ محفوظ ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' اسے کیسے اس پناہ گاہ سے باہر نکالے؟

فی الحال تو وہ دروازے سے لڑ رہا تھا۔ کسی بھی طرح اسے کھول لینا چاہتا تھا مگر شراب کا نشہ اب سر چڑھ رہا تھا۔ وہ ڈگمگا رہا تھا' سنبھل رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی تھی۔ درودیوار گھومتے ہوئے لگ رہے تھے۔

وہ ہاتھ آتے آتے بند دروازے کے پیچھے جیسے ٹھینگا دکھا رہی تھی اور وہ جھنجلا رہا تھا۔ شراب اور شباب کے کھیل کا مزہ کرکرا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے بیزار ہو کر دروازے کو ایک ٹھوکر ماری۔ پھر لڑکھڑا کر' دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک دیوار سے پشت لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔

حسن کی چوکھٹ پر ہوس سوالی بن گئی تھی لیکن ایک کوڑی کی بھی خیرات ملنے والی نہیں تھی۔

وہ اندر سے سہمی ہوئی تھی۔ بند دروازے سے یوں لگی کھڑی تھی' جیسے دور ہٹے گی تو وہ اسے ایک جھٹکے سے کھول کر اندر آ جائے گا۔ نعیم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ نشے اور غصے کی حالت میں خرافات بک رہا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز ڈوبتی چلی گئی۔ انیلا نے توجہ سے سننے کی کوشش کی۔ باہر خاموشی چھا گئی تھی۔

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کو دیکھا پھر نیچے بیٹھ گئی۔ سجدے کے انداز میں جھک کر فرش سے چہرہ لگا کر دروازے کی نچلی ریخ سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کا خیال تھا کہ شاید وہ بیزار ہو کر وہاں سے چلا گیا ہے مگر وہ گیا نہیں تھا۔ بلکہ وہیں ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اس کے دھیمے دھیمے سے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر ایک ذرا حوصلہ ملا کہ شکاری گہری نیند میں ڈوب چکا ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ بند دروازے کو اور اوپری چٹخنی کو دیکھتی رہی۔ موقع اچھا تھا' وہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی۔

مگر یہ سوچ کر مایوسی ہو رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔ وہ اس کمرے سے تو نکل جائے گی لیکن گھر سے کیسے نکلے گی؟ نہ جانے نعیم نے چابی کہاں رکھی ہوگی؟

اس نے پھر ایک بار دروازے کے نیچے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بدستور گہری نیند میں تھا۔ خراٹوں کی آواز بھی ذرا تیز ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے بسم اللہ پڑھ کر دھیرے سے چٹخنی کو نیچے کیا پھر آہستگی سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دعا پڑھنے لگی۔ اس وقت دل تیزی سے یوں دھڑک رہا تھا' جیسے دروازہ کھلتے ہی سینے کی دیوار توڑ کر انیلا سے پہلے باہر نکل بھاگے گا۔

اس نے اللہ کا نام لے کر دروازے کو ایک ذرا سا کھولا پھر وہاں سے آنکھ لگا کر فرش پر پڑے ہوئے نعیم کو دیکھا۔ سونے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔ وہ بے ہوشی کی نیند سو رہا تھا۔

وہ دروازے کو ذرا اور کھول کر دبے قدموں باہر آ گئی۔ سینڈل کھٹ پٹ کر سکتے تھے۔ اس نے انہیں اتار کر ایک ہاتھ میں لے لیا۔ خوف کے مارے جان نکل رہی تھی۔ اگرچہ وہ بے سدھ پڑا ہوا تھا' پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اچانک ہی اٹھ کر حملہ کرنے والا ہے۔

وہ دیوار سے لگ کر محتاط انداز میں ایک طرف بڑھ رہی تھی۔ ایسے وقت اس کی نظریں نعیم کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انیلا کو ایسا ہی لگ رہا تھا' جیسے کسی فلمی سین کی طرح وہ بھی اچانک ہی جاگ جائے گا۔ اس پر حملہ کرے گا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ وہ اس سے ذرا دور آ کر سوچنے لگی.... چابی کہاں ہو سکتی ہے؟

عقل نے سمجھایا' یقیناً اس کی جیب میں ہوگی۔ اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ "اُف خدایا! کیا اس کے لباس کی تلاشی لینا پڑے گی؟ اس طرح تو میں اپنی شامت کو خود ہی دعوت دوں گی۔"

اس نے بیرونی دروازے کو دیکھا۔ "کروں تو کیا کروں؟ تالا کھولنے کے لیے چابی ضروری ہے۔"

نعیم کو چھونا اور لباس کی تلاشی لینا تو دور کی بات تھی، اسے تو دیکھ کر ہی وحشت ہو رہی تھی۔ اسے یاد آیا۔ "پھپھو گھر کی تمام چابیاں ایک کی ہولڈر میں رکھتی ہیں۔ پہلے مجھے وہاں دیکھنا چاہیے۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے لاؤنج میں آئی۔ وہاں ایک

دیوار پر وہ کی ہولڈر تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مایوسی ہوئی۔ وہاں زنگ آلود چابیوں کا ایک گچھا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ سب ناقابل استعمال چابیاں ہیں۔

وہ وہاں سے پلٹ کر اس کمرے میں آئی' جہاں وہ شراب پیتا رہا تھا۔ خیال تھا کہ شاید اس نے وہ چابی وہاں رکھی ہوگی لیکن تلاشی لینے کے بعد وہاں بھی مایوسی ہوئی۔ یہ یقین ہو گیا کہ وہ نعیم کے پاس ہی ہے یا پھر اس نے گھر میں اسے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ "یا اللہ! میں کیسے اندازہ کروں کہ چابی کہاں ہو سکتی ہے؟ ایک چھوٹی سی چابی کو اتنے بڑے گھر میں کہاں تلاش کرتی پھروں؟ اس منحوس کے لباس کو ٹٹولنا سراسر بے وقوفی ہوگی۔"

اس نے کمرے کے دروازے پر آ کر باہر دیکھا۔ وہ کروٹ بدل کر یوں سو رہا تھا' جیسے مخملی بستر پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہو۔ شباب نے اسے ٹھوکر ماری تھی۔ شراب نے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

انیلا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ "یہ پھپھو میرے ساتھ کیا کر رہی ہیں؟ کیا سگے رشتے ایسی گھناؤنی سازشیں بھی کر سکتے ہیں؟"

میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں' مجھے اُس تھپڑ کا جواب دیا جا رہا ہے جبکہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پھپھو انتقام لینے کے لیے میرے خلاف ایسا شرمناک کھیل بھی کھیل سکتی ہیں؟ بیٹے کے ساتھ مل کر میری زندگی کو داغ دار بنانا چاہتی ہیں۔

"اگر اس نے شراب نہ پی ہوتی' وہ کمزور نہ پڑتا اور میں حاضر دماغی سے کام نہ لیتی تو...."

وہ اس سے آگے سوچ نہ سکی۔ آنچل کو منہ میں ٹھونس کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ "یا خدا! یہ ہم کیسی دنیا میں سانسیں لے رہے ہیں؟ ہمارے ضمیر اتنے مردہ ہو چکے ہیں کہ ہم اپنے ہی گھروں میں، اپنی ہی بیٹیوں کو شکار کر کے انہیں ہوس کا نشانہ بنا رہے ہیں؟

محض ایک چھوٹی سی بات کا انتقام لینے کے جنون میں اپنی ہی عزت کا جنازہ نکال رہے ہیں؟ چادر اور چاردیواری میں بھی تحفظ نہیں رہا.... یہ کیسی دنیا ہے میرے مالک....؟"

وہ سوچتے سوچتے ٹھٹک گئی۔ نعیم دھیرے دھیرے کروٹ بدل رہا تھا' اُدھر سے اِدھر ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھتا' وہ فوراً ہی دبے قدموں چلتے ہوئے مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اندر جانا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت اس نے پکارا۔ "انیلا...! رک جاؤ۔"

اس نے تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ نعیم نے لپک کر دروازے پر ایک ہاتھ جما دیا۔ پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر وہ بھی زور لگا رہی تھی۔ کسی بھی طرح اسے بند کر کے چٹخنی چڑھانا چاہتی تھی لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔

دروازے کے پٹ اور چوکھٹ کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ تھا۔ انیلا کے دھکیلنے سے وہ فاصلہ کبھی کم ہو رہا تھا' کبھی نعیم کی زور آزمائی سے وہ دروازہ کھلتا ہوا سا لگ رہا تھا۔

اگرچہ نشے کی دھند چھٹ چکی تھی پھر بھی اس کا سر گھوم رہا تھا۔ شاید اسی لیے پوری قوت لگانے کے باوجود کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر وہ ایک ہاتھ فرش پر ٹیک کر دوسرے ہاتھ سے دروازے پر دباؤ ڈالتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ قدم ذرا ڈگمگائے تھے مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ بس یہی وہ وقت تھا' جب باہر سے دھکیلے جانے کی شدت میں ایک ذرا کمی آئی تھی۔ وہ کمزور پڑ گیا تھا۔ انیلا نے فوراً ہی اسے بند کر کے اوپری چٹخنی چڑھا دی۔

ادھر نعیم نے سنبھلنے کے بعد دروازے کو دھکا دینا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ اندر سے بند ہو چکا ہے۔ وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس | ہیئر ڈریسنگ | ہومیو میڈیسن | بیوٹی پارلر کورس
ریفریجریشن ایئرکنڈیشننگ | الیکٹریکل | بیوٹیشن | آٹو موبائل
ٹیلی ویژن ریڈیو مکینک | الیکٹریشن | ڈرافٹس مین | ڈرائیونگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ | صحافت | فوٹوگرافی | انٹیریئر ڈیکوریشن
کمپیوٹر | مہر سازی | سلائی کڑھائی | حکمت | اردو
موبائل فون | کمپیوٹر | کوکنگ | لیڈیز ٹیلرنگ
ایگریکلچر | سیلز | آئل پینٹنگ | ڈیزائننگ
پولٹری ڈیری فارمنگ | نیوز رپورٹر | کلاتھ میکنگ | پبلک ہیلتھ
اسلام آباد اکیڈمی
1237

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے کو جھنجوڑتے ہوئے بولا۔ "دروازہ کھولو انیلا...!"

وہ اسے دھکے دے رہا تھا' ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اندر اُس کا دل ہول رہا تھا۔ یہ خوف طاری ہو رہا تھا کہ ہوس کی منہ زوری کہیں اس دروازے کو توڑتے ہوئے اندر نہ گھستی چلی آئے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "نعیم! میں مر جاؤں گی مگر اسے نہیں کھولوں گی۔"

"میں بھی دیکھتا ہوں' کب تک نہیں کھولو گی؟ کب تک اندر چھپی رہو گی؟ یاد رکھو! اُس وقت تک یہاں قیدی بن کر رہو گی' جب تک خود کو میرے حوالے نہیں کر دیتیں۔"

اسے نجات کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہاں سے نکلنے کے لیے کیا تدبیر کرے؟ یہ بات بھی سوچ رہی تھی کہ کب تک اس کمرے میں بند رہے گی؟

اسے گھر والوں کا خیال آ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے پریشان ہوں گے۔ اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ نہ جانے پھوپی کہاں مر گئی تھی؟ کب تک واپس آنے والی تھی اور واپس آنے کے بعد بیٹے کو نا کام دیکھ کر نہ جانے کیسا ردِ عمل ظاہر کرنے والی تھی؟

اسے جو بھی آیات یاد آ رہی تھیں' انہیں پڑھ رہی تھی۔ کسی بھی طرح اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہی تھی۔

اس گھرانے پر تو بیٹھے بٹھائے ایک اُفتاد آن پڑی تھی۔ رضیہ بیگم اور سلیمان سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی عزت پر شب خون مارنے والے غیر نہیں ہیں۔ جوان بیٹی کسی دشمن کے نہیں' بلکہ سگے رشتوں کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے' شکار بنی ہوئی ہے اور وہ شکاری کسی بھی وقت اُس پر دھاوا بول سکتا ہے۔

اُن کی امیدوں کے ساتھ رات بھی ڈھلتی جا رہی تھی۔ سلیمان نے کہا۔ "یوں گھر میں خاموش بیٹھے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

"تو کیا کرو گے؟ کیا باہر نکل کر پورے محلے میں ڈھنڈورا پیٹو گے کہ ہماری بیٹی شام سے غائب ہے؟ آدھی رات گزر چکی ہے' اب تک لوٹی نہیں ہے؟"

وہ غصے سے بولا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں نے ایسا کب کہا ہے؟ کیا میں باپ ہو کر بیٹی کے بارے میں ایسی باتیں کرتا پھروں گا؟ تمہاری کھوپڑی الٹ گئی ہے کیا؟"

دوسری بیٹیاں بھی پریشان تھیں۔ بڑی بہن کی واپسی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ماں باپ کو یوں جھگڑتے دیکھ کر اور پریشان ہو گئیں۔ ایک نے کہا۔ "امی...! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ابو سے پوچھ تو لیں' وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ انہیں بات تو پوری کرنے دیتیں۔"

وہ تیز لہجے میں بولا۔ "یہ تمہاری ماں کی پرانی عادت ہے۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولی۔ "خدا کے لیے... اس وقت مجھ سے مت الجھو۔ میں بحث نہیں کر سکتی۔ اپنی بچی کے لیے پریشان ہوں۔"

وہ بولا۔ "ہاں اور میں تو جیسے خوشی میں بھنگڑے ڈال رہا ہوں۔"

ایک بیٹی نے کہا۔ "خدا کے لیے ابو! آپ ہی اس بات کو ختم کر دیں۔ آپس میں الجھنے سے بہتر ہے' آپی کو ڈھونڈنے کی کوئی راہ نکالیں۔ سوچیں کہ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"وہی سوچ رہا تھا مگر کچھ کہنے سے پہلے تمہاری ماں نے بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔"

وہ بولی۔ "ہاں تو اب بول دو ناں... پریشانی میں الٹا سیدھا منہ سے نکل ہی جاتا ہے۔ جوان بیٹی کی گمشدگی نے عقل خبط کر دی ہے۔"

وہ جواباً اسے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ایک بیٹی نے کہا۔ "ابو! پلیز۔ جانے دیں۔ آپ بولیں کیا کہنا چاہتے تھے؟"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر ذرا توقف سے کہا۔ "میں تھانے کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کی گمشدگی جان نکال رہی ہے۔ ہمیں کسی نہ کسی سے مشورہ کرنا ہوگا کہ اس معاملے میں کیا کیا جائے؟"

اس نے بیٹیوں کو دیکھا پھر بیوی سے کہا۔ "سوچ رہا ہوں' مسجد کے امام صاحب اور مولانا فضل کریم کے پاس جاؤں' انہیں اپنی پریشانی بتاؤں۔"

رضیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی' مگر ایک بیٹی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ابو کو بولنے دیں۔"

سلیمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ علاقے کے معزز افراد ہیں۔ معاملات کو سنبھالنا جانتے ہیں۔ یقیناً ہمیں کوئی بہتر صلاح دے سکیں گے۔"

رضیہ نے کہا۔ "یعنی گھر کی بات باہر نکل کر ہی رہے گی۔"

وہ بولا۔ "نکلے گی مگر نکل کر بھی سمجھو گھر میں ہی رہے گی۔ وہ لوگ بات کا بتنگڑ بنانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ قابلِ اعتماد ہیں۔ اسی لیے ان کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ بولا۔ "اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ ان سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ویسے..."

وہ بولتے بولتے ہچکچانے لگی پھر بولی۔ "کہتے ہوئے دل ڈوب رہا ہے مگر مجھے یہ اغوا کی واردات ہی لگ رہی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اس ملک خداداد میں یہی ہو رہا ہے۔ غربت اور مہنگائی کے ساتھ ساتھ جرائم میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب لوٹنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ بندہ غریب ہے یا امیر... زر کے لیے نہ سہی' ہوس کے لیے واردات کرتے ہیں۔"

رضیہ نے کہا۔ "پہلے کروڑ پتی اور صاحب جائداد افراد کو اغوا کیا جاتا تھا۔ اب تو یہ درندے ہم غریبوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ ہمیں بھی ایسی وارداتوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔"

وہ آنچل پھیلا کر روتے ہوئے بولی۔ "خدا کرے ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوں۔ یا اللہ! میری بچی کی حفاظت فرما۔ اس معصوم کو اپنی پناہ میں رکھنا میرے پروردگار...!"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو پھر میں جاتا ہوں۔"

"اس وقت...؟"

"ہاں۔ ایک گھنٹے بعد فجر ہونے والی ہے۔ وہ تہجد کے لیے پہلے ہی اٹھ جاتے ہیں۔ اگر سو بھی رہے ہوں گے تو میں وہیں مسجد میں بیٹھ کر انتظار کرتا رہوں گا۔ تنہائی میں بات کرنے کا یہی موقع ہے۔"

وہ چلا گیا۔ رضیہ بیگم کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ چشمِ تصور سے دیکھ رہی تھی کہ بیٹی کو ہوس پرستوں نے اغوا کیا ہے اور وہ اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں۔ وہ چیخیں مار رہی ہے' مدد کے لیے پکار رہی ہے۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ کبھی چوہے اور لال بیگ کو دیکھ کر ڈر جاتی تو ماں کو پکارتی تھی۔ "امی...! امی...!"

اس وقت ماں کو بیٹی کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ درندوں کے حصار میں امی امی کہہ کر بلا رہی تھی۔

اگرچہ وہ درندوں کے حصار میں تو نہیں تھی لیکن پھوپی زاد کے شکنجے میں تھی۔ اکثر شرمناک جرائم خاندان کے اندر ہی چار دیواری میں ہوتے ہیں۔

ماں سر پکڑ کر سوچ رہی تھی۔ "وہ واپس آ بھی گئی تو کیا ہوگا؟ لوگ اسے آبرو باختہ کہیں گے۔"

اس نے شدید مایوسی سے سوچا۔ "بدنامی کی شروعات تو ہو چکی ہے۔ رات سے صبح ہونے والی ہے۔ کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ پتا نہیں' وہ کہاں ہوگی؟ کیسے حالات سے گزر رہی ہوگی؟ اگرچہ امام صاحب اور مولانا صاحب قابلِ بھروسا ہیں۔ بدنامی کو ہوا نہیں دیں گے مگر پھر بھی یہ بات دوسروں سے کب تک چھپی رہ سکے گی؟"

اس کے دماغ میں دردانہ کی باتیں گونجنے لگیں۔ "جوان لڑکی کو یوں تنہا اتنی دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیے۔ آزادی بھی ایک حد تک ہو تو اچھی لگتی ہے۔ اولاد پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "دردانہ بڑی چالاک ہے۔ پلک جھپکتے میں معاملات کی بو پا لیتی ہے کہ کہاں کیا چل رہا ہے؟ اب غور کر رہی ہوں تو اس کی باتوں سے ایسا ہی لگ رہا تھا' جیسے وہ ہماری پریشانی کو بھانپ گئی تھی۔ میری بیٹی کی آزادی پر لیکچر دے رہی تھی گویا ہمیں چوکنا کر رہی تھی کہ انیلا اس آزادی کا غلط فائدہ اٹھا سکتی ہے۔"

وہ جائے نماز بچھاتے ہوئے بولی۔ "یا خدا! رحم کر۔ ابھی سب کچھ اندھیرے میں ہے۔ اگر اصل معاملہ دردانہ کے کانوں تک پہنچ گیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو اشتہار لگا دے گی۔"

وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ "اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ یہ اچھا ہی ہے کہ وہ بڑی آپا کے پاس گئی ہے۔ اللہ کرے انیلا اس کی واپسی سے پہلے گھر آ جائے۔"

وہ نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ تکبیر پڑھتے ہوئے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ بے شک۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ وہی عزتوں کا رکھوالا ہے۔ مگر زمین پر بسنے والے نا خدا دوسروں کی زندگی اور عزت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ دردانہ اپنے بیٹے کو بہلانے کے لیے ایک کھلونا دے کر گئی تھی۔ بھائی کی نیک نامی کو مٹی میں ملانا چاہتی تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔

بعض اوقات قدرت گہری خاموشی اختیار کر لیتی ہے۔ من مانی کرنے والوں کو چھوٹ دیتی ہے اور صبر کرنے اور ظلم سہنے والوں کا امتحان لیتی ہے۔ ابھی تو امتحان کی ابتدا ہوئی تھی۔

امام صاحب مسجد سے ملحقہ ایک کوارٹر میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ سلیمان جب وہاں پہنچا تو وہ جاگ چکے تھے۔ مسجد کے ایک حصے میں تہجد کی نماز ادا کر رہے تھے۔ وہ خاموشی سے آ کر ان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ انہوں نے سلام پھیرنے اور دعا مانگنے کے بعد اٹھنا چاہا تو اس پر نظر پڑتے ہی رک گئے۔ سلیمان نے انہیں سلام کیا۔

وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولے۔ "تم بھی نماز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں پڑھتے۔ آج پہلی بار تمہیں مسجد میں دیکھ رہا ہوں۔"

اس بات نے اسے رُلا دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر بولا۔ "مجھ بے نمازی کو سزا مل رہی ہے۔ منہ چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے بس یہی ایک مسجد ہے۔"

پیش امام صاحب نہیں جانتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے مگر اس کے آنسوؤں نے اور اس کے بے نمازی ہونے کے احساس نے سمجھا دیا کہ وہ کسی جان لیوا مصیبت میں گرفتار ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "قبلہ رو بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ کے سامنے اللہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری عزت رہ جائے گی' میری بچیوں کے سر پر حیا کا آنچل رہے گا تو میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے مسجد میں آیا کروں گا۔"

انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟"

وہ قمیص کے دامن سے آنسو پونچھنے لگا۔ سوچنے لگا' کن الفاظ میں اپنا دکھڑا بیان کرے؟ اس نے کہا۔ "یہ میرے گھر کا' میری چار دیواری کا راز ہے۔ میں چاہتا ہوں' یہ بات میرے گھر سے اور مسجد سے باہر نہ جائے۔"

"پہلے خدا پر بھروسا کرو پھر مجھ پر اعتماد کرو۔ یہاں جو بھی کہو گے' وہ بات میرے سینے میں محفوظ رہے گی' باہر نہیں نکلے گی۔"

وہ سر جھکا کر' ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ وہ پوری روداد سننے کے بعد بولے۔ "یہ تو واقعی تشویشناک بات ہے۔ ویسے تم نے تھانے نہ جا کر عقلمندی کی ہے۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں؟ اسی لیے آپ کے پاس چلا آیا۔ ایسا لگ رہا ہے' بدنامی کا عفریت مجھے اپنے شکنجے میں جکڑنے ہی والا ہے۔ میرے تو پیروں تلے سے زمین نکل رہی ہے امام صاحب...!"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بولے۔ "مصیبت کتنی ہی جان لیوا کیوں نہ ہو' جب سر پر آتی ہے تو اسے سہنا ہی پڑتا ہے۔"

"مصیبت جان لینے والی ہو تو پروا نہیں مگر نیک نامی ایک بار خاک میں مل گئی تو میرے خاک میں مل جانے کے بعد بھی واپس نہیں آئے گی۔ میں چاہتا ہوں' کسی کو خبر نہ ہو۔ ہم چپ چاپ اسے تلاش کرتے رہیں۔ آپ مجھے صلاح دیں' میں اس سلسلے میں کیا کروں؟"

"فی الحال بات چھپائی جا سکتی ہے۔ ابھی کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر والوں کو بھی سمجھا دو۔ کوئی بھی انیلا کا پوچھے تو کہہ دیا جائے کہ وہ کسی رشتے دار کے گھر رہنے گئی ہے۔ دس پندرہ دن کے بعد لوٹے گی اور خدا کرے وہ جلد ہی لوٹ آئے۔"

وہ اپنے کانوں کو چھو کر بولے۔ "خدا مجھے معاف کرے۔ میں ایک گھرانے کی عزت اور نیک نامی قائم رکھنے کے لیے مصلحتاً جھوٹ بولنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔"

سلیمان نے کہا۔ "محلے والوں سے یہ معاملہ چھپانا مشکل نہیں ہوگا لیکن میری بہن دردانہ تو بال کی کھال نکالتی ہے۔ اسے ٹالنا آسان نہ ہوگا۔ فی الحال اس کی طرف سے اندیشہ نہیں ہے۔ وہ بڑی بہن کے پاس گئی ہے۔"

"اوپر والا پریشانی کے ساتھ ساتھ سہولتیں بھی دیتا ہے۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "ویسے مجھے یہ اغوا کی واردات لگتی ہے۔"

"مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔ خدا سے دعا مانگ رہا ہوں' یہ اندیشہ غلط ہی ہو۔"

وہ اس کے شانے کو تھپک کر بولے۔ "خدا پر بھروسا رکھو۔ انشااللہ سب بہتر ہو جائے گا۔ ویسے اگر تم کہو تو اس سلسلے میں مولانا صاحب سے بھی بات کی جا سکتی ہے۔"

"میں آپ دونوں سے ہی مشورہ کرنے آیا تھا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ وہ فجر کی نماز کے لیے آئیں گے۔ تم بھی یہیں رہنا۔ تنہائی ملتے ہی ان سے ذکر کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے' تب تک تمہیں بیٹی کے سلسلے میں کہیں سے کچھ سن گن بھی مل جائے۔"

فجر کی نماز کے بعد وہ مولانا فضل کریم سے بات کرنا چاہتے تھے مگر قادر جان کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ امام صاحب نے اسے دیکھتے ہوئے مولانا سے کہا۔ "مجھے تنہائی میں آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

اکثر ایسا ہوتا تھا لوگ اپنے مسائل بیان کرنے اور ان کے حل تلاش کرنے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ کبھی کبھی راز داری ضروری ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں وہ قادر جان کو رخصت کر دیتے تھے۔ ان لمحات میں بھی انہوں نے یہی کیا۔ قادر جان ان کی مصروفیات کو سمجھتا تھا۔ ایسے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتا تھا۔ لہٰذا ہمیشہ کی طرح چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی امام صاحب انہیں بتانے لگے کہ سلیمان کیسی مصیبت سے دوچار ہے؟ وہ تمام باتیں سننے کے بعد بولے۔ "اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں اور آپ مل کر اس بارے میں سوچ تو سکتے ہیں' اس

کے پہلوؤں پر غور بھی کر سکتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ کر نہیں سکتے۔ کچھ بھی کرنے کے لیے یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ اسے واقعی اغوا کیا گیا ہے یا اصل معاملہ کچھ اور ہے۔"

سلیمان نے پوچھا۔ "کچھ اور کیا ہو سکتا ہے؟ میری تو کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔"

مولانا نے کہا۔ "دشمن تو خود رو ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کرو' تب بھی اپنے آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"برا نہ مانو تو کچھ ذاتی سوال کر سکتا ہوں؟" مولانا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ "میں نے تو اتنا بڑا بھید آپ کے سامنے بیان کر دیا ہے' اب ذاتی کچھ نہیں رہا۔ آپ پوچھیں؟"

"ہماری نوجوان نسل ذرا سرپھری سی ہو گئی ہے۔ ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گھر میں کوئی کھٹ پٹ ہوئی ہو اور..."

وہ ان کی بات کاٹ کر بولا۔ "نہیں مولانا صاحب! میری وہ بیٹی تو بہت ہی سمجھدار اور سلجھے ہوئے ذہن کی مالک ہے پھر مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسا ہے۔ چاہے گھر کے اندر اس پر قیامت ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے' وہ کبھی فرار کا راستہ نہیں ڈھونڈے گی۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولے۔ "اچھی بات ہے۔ اپنی تربیت پر اور اولاد پر ایسا ہی اعتماد ہونا چاہیے۔ لیکن میرے اس سوال سے یہ مطلب ہرگز نہ نکالنا کہ میں خدانخواستہ اس پر کوئی الزام لگا رہا تھا۔ وہ تمہاری' ہماری اور سارے محلے کی عزت ہے۔"

اور وہ محلے کی عزت گھر کی چار دیواری میں داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ تینوں آپس میں بول رہے تھے۔ صلاح مشورے کر رہے تھے۔ مولانا کا کہنا یہی تھا کہ تھانے جانے سے بہتر ہے' تھوڑا اور انتظار کر لیا جائے۔

اگر اسے اغوا کیا گیا ہے' تب بھی اس کی واپسی تک انتظار کرنا ہی ہوگا ورنہ تھانے جا کر رپورٹ درج کروانا... فی الحال تماشا بننے اور رقم ضائع کرنے والی بات ہوگی۔

امام صاحب نے کہا "اور حقیقت یہ ہے کہ پولیس والوں سے کرنا کرانا کچھ نہیں ہوتا مگر وہ لوگ ایسے معاملات کو یوں اچھالتے ہیں کہ عزت کی دھجیاں بکھر کر رہ جاتی ہیں۔"

سلیمان اس وقت نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ شام سے رات اور رات سے صبح ہو چکی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود کہیں سے بیٹی کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ یہ اندیشہ بھی پیدا ہونے لگا تھا کہ کہیں کسی ظالم نے اسے ہلاک نہ کر ڈالا ہو۔

اس دنیا میں وحشی درندوں کی کمی نہیں ہے۔ لوگ خوانخواہ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے پھرتے ہیں۔

فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد امام صاحب نے سلیمان سے کہا۔ "تم نے اللہ سے وعدہ کیا ہے' پانچوں وقت کی نماز پڑھنے مسجد میں آیا کرو گے۔"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا کر بولا۔ "بیشک۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔"

"اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ نمازیں پڑھتے ہی معجزہ ہو جائے اور تمہاری بیٹی اچانک ہی مل جائے گی تو اس خیال کو دماغ سے نکال دو۔ رشوت دینے کے طور پر نمازیں نہ پڑھو بلکہ خدا سے ڈرو۔"

مولانا نے کہا۔ "اکثر دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور انسان خدا سے مایوس ہو جاتا ہے۔ ہفتوں' مہینوں اور برسوں کے بعد وہ دعائیں اثر دکھاتی ہیں۔ عبادتوں اور دعاؤں کی قبولیت کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ سمجھ میں آتا ہے۔"

امام صاحب نے کہا۔ "آج تم مصیبت میں ہو' بڑے نقصان میں ہو لیکن میری یہ بات ذہن میں نقش کر لو کہ راہِ راست پر چلتے رہو گے تو مسلسل نقصان اٹھانے کے باوجود' درپردہ تمہارے لیے بہتری کے راستے ہموار ہوتے رہیں گے۔ یہ تمہیں آج نہیں تو کچھ عرصے بعد ضرور معلوم ہوگا۔"

وہ دونوں سلیمان کو ہدایات دے رہے تھے۔ سمجھا رہے تھے کہ وہ صبر و تحمل سے خدا پر بھروسا کرے اور نماز قائم کرے پھر دیکھے کہ پردۂ غیب سے کیا سامنے آتا ہے؟

☆☆☆

صبح کی روشنی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ زمانے میں اجالا ہو رہا تھا مگر انیلا کے اندر جیسے اماوس ٹھہر گئی تھی۔ اسے اس سیاہی سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اندیشے کہہ رہے تھے' یہ اندھیرے اب چھٹنے والے نہیں ہیں بلکہ اس کی زندگی میں اندھیر مچانے والے ہیں۔ کوئی طوفان لانے والے ہیں۔

پھر جیسے طوفان آ گیا۔ بیرونی دروازے پر یوں دستک سنائی دی' جیسے اسے جھنجوڑا جا رہا ہو۔ دردانہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی سے بول رہی تھی۔ "ارے بہن! کب سے کھٹکھٹا رہی ہوں۔ بیل بھی بجائی ہے۔ پتا نہیں' کیا بات ہے؟ نعیم دروازہ کیوں نہیں کھول رہا ہے؟ مجھے تو گھبراہٹ ہونے لگی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ سراسر جھوٹ بول رہی تھی۔ آس پاس کے گھروں میں جا کر بتا رہی تھی کہ اندر نعیم ہے مگر دروازہ نہیں کھول رہا۔ آس پڑوس کی عورتیں اور مرد وہاں جمع ہو رہے تھے۔ وہ تماشا شروع کرنے سے پہلے تماشائیوں کی بھیڑ لگا رہی تھی۔

پھر اس نے دروازے کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کیا تھا۔ اور بیٹے کو پکارا تھا۔ ''نعیم.....! دروازہ تو کھولو۔ کب سے آوازیں دے رہی ہوں؟''

نعیم ماں کی طوفانی دستک سن کر ہڑبڑا گیا۔ یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ ماں کو اپنی ناکامی کی رپورٹ دینی ہوگی پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دے رہا تھا کہ ناکامی کے باوجود کامیابی ہوگی۔ انیلا اس کے ساتھ بند کمرے سے نکلے گی تو خود ہی بدنامی کی کہانی بنتی چلی جائے گی۔

دوسری طرف انیلا کمرے کے دروازے سے کان لگائے ان کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا اندازہ تو ہوگیا تھا کہ پھوپی واپس آگئی ہے۔ خیال تھا' شاید ماں باپ بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔ اس نے سوچ لیا تھا' جب نعیم بیرونی دروازے کا تالا کھولے گا' تب ہی وہ اس کمرے سے باہر نکلے گی۔

وہ دروازے پر ہاتھ رکھے انتظار کر رہی تھی۔ باہر تالا کھلنے اور پھر ایک جھٹکے سے کنڈی کھلنے کی آواز سنائی دی جیسے برسوں کے قیدی کو کال کوٹھری سے نکلنے کی نوید مل گئی۔ اُدھر گیٹ کھل چکا تھا۔ اِدھر یہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آگئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پھوپی تنہا نہیں آئی ہے' برات کے ساتھ آئی ہے۔

شادی کے موقعے پر ایجاب و قبول کے بعد نکاح نامے پر دستخط لیے جاتے ہیں۔ اُسے بے حیائی کا سرٹیفکیٹ ملنے والا تھا۔

دُلہن کو قرآن کے سائے میں بیٹیاں نچھاور کرتے ہوئے رخصت کیا جاتا ہے مگر وہاں چار کاندھوں پر آبرو کا جنازہ نکلنے والا تھا۔

مگر ابھی کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور دردانہ سمجھانے کے لیے اُنہیں وہاں لائی تھی۔ وہ بیٹے سے پوچھ رہی تھی کہ وہ دروازہ کیوں نہیں کھول رہا تھا؟ ایسی کیا مدہوشی کی نیند سو رہا تھا کہ آنکھ نہیں کھل رہی تھی؟

پھر وہ اس کے پیچھے انیلا کو دیکھ کر یوں چپ ہوگئی' جیسے ٹھٹک گئی ہو۔ انجان بن کر بولی۔ ''تم...؟ اس وقت یہاں؟''

انیلا کے بجائے نعیم نے جواب دیا۔ ''یہ تو کل رات سے یہاں ہے۔''

اس نے ہائے کے انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''کل رات سے یہاں ہے؟''

اس نے بیٹے کے الفاظ کو یوں دہرایا' جیسے ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو پھر کہا ''لیکن میں تو کل سے گھر پر نہیں ہوں پھر یہ میری غیر موجودگی میں یہاں تمہارے ساتھ کیا کر رہی تھی؟''

نعیم نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ سر جھکا دیا۔ اس کی مجرمانہ خاموشی سے محلے والوں کے درمیان چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔

انیلا نے قریب آکر اسے حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں کہ رات سے مجھے یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔''

''قیدی...؟''

انیلا نے دردانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پھپو! جب آپ کو کہیں جانا ہی تھا تو مجھے یہاں کیوں بلایا تھا؟''

اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا...؟ میں نے تمہیں بلایا تھا؟''

''ایسے انجان کیوں بن رہی ہیں؟ کیا زبیدہ آنٹی کے گھر قرآن خوانی میں آپ یہ کہہ کر نہیں اٹھی تھیں کہ میں وہاں سے فارغ ہو کر آپ کے پاس چلی آؤں؟ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں اور جب میں یہاں آئی تو آپ گھر میں نہیں تھیں۔''

وہ بولی۔ ''میں یہی تو بول رہی ہوں کہ گھر میں نہیں تھی۔ بڑی آپا کے پاس رہنے گئی تھی۔ سب کے سامنے گئی تھی۔ اور دیکھ لو! ابھی سب کے سامنے ہی آئی ہوں۔ اور آکر یہ تماشا دیکھ رہی ہوں۔''

انیلا نے کہا۔ ''یہ تماشا آپ کے بیٹے نے رچایا ہے۔ کل شام سے مجھے تالے میں بند کر کے رکھا ہے۔''

وہ بولی ''یعنی زبردستی بند کر کے رکھا تھا؟''

''ہاں۔''

دردانہ نے ایک خاتون سے کہا۔ ''اے بہن! جب کوئی کسی کے ساتھ زبردستی کرتا ہے۔ خاص طور پر جب کسی کو قیدی بنا کر رکھتا ہے تو مار پیٹ بھی کرتا ہے۔ تم لوگ خود ہی دیکھو! اس کے کپڑوں سے یا حلیے سے ایسا لگ رہا ہے کہ اسے یہاں زبردستی جس بے جا میں رکھا گیا تھا؟''

وہاں موجود لوگ اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ انیلا نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا ''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

''وہ تو بول ہی رہی ہو۔''

وہ سب کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''بند

دروازے کے پیچھے کی باتیں میں نہیں جانتی کہ رات بھر یہاں کیا ہوتا رہا؟ مگر یہ بھی تو جھوٹ ہی ہے کہ میں نے تمہیں بلایا تھا جبکہ میں تو کل شام سے یہاں تھی ہی نہیں۔''

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا اعلان کر رہی تھی کہ بند دروازے کے پیچھے کچھ ہوتا رہا تھا' یہ محلے والے سمجھیں اور اس کا محاسبہ کریں۔

انیلا نے کہا۔ ''آپ نے جانے سے پہلے مجھے بلایا تھا۔ میں بول تو رہی ہوں کہ قرآن خوانی میں...''

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''تم اپنے گھر میں تو بتا کر آئی ہوگی کہ میری طرف جا رہی ہو؟''

''اتنا موقع ہی کہاں ملا؟ میں تو قرآن خوانی سے سیدھا ادھر چلی آئی تھی۔''

''اور کل شام میں تمہارے گھر گئی تھی۔ تم وہاں نہیں تھیں۔''

''کیونکہ میں یہاں تھی۔ نعیم نے مجھے بند کر کے رکھا تھا۔''

''یہ کیا تم نے بار بار بند کر کے رکھا تھا' بند کر کے رکھا تھا کی رٹ لگائی ہوئی ہے؟ ارے کوئی مجھے زبردستی بند کر کے تو دیکھے۔ میں تو ہنگامہ کر دیتی' دروازے توڑ دیتی' دیوار سے کود کر جان دے دیتی۔''

ایک خاتون نے کہا۔ ''مگر تم کیسی ہو؟ تم نے پوری رات چپ چاپ گزار دی۔ اگر چیختی چلاتیں' شور مچاتیں تو کوئی نہ کوئی آکر دروازہ ضرور کھلواتا اور نعیم کا محاسبہ کرتا۔''

ایک محلے والے نے کہا۔ ''بے شک پھر تو ہم یہ پروا بھی نہ کرتے کہ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ محلے میں بے حیائی پھیلانے والے کو کسی صورت معافی نہ ملتی۔''

دردانہ نے اس کی تائید میں کہا۔ ''میں تو خود اسے معاف نہیں کروں گی مگر ابھی کیا کروں؟ یہ کم بخت اسے زبردستی اٹھا کر نہیں لایا ہے۔ یہ تو خود چل کر آئی ہے۔''

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ایک خاتون نے پوچھا۔ ''جب تمہیں معلوم ہوگیا تھا کہ دردانہ گھر میں نہیں ہے تو تم نے اندر قدم ہی کیوں رکھا تھا؟''

وہ بولی ''کیونکہ نعیم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ پھپو گھر میں ہیں۔ تب ہی میں اندر آئی تھی۔''

''اور جب یہ دیکھا کہ وہ یہاں تنہا ہے' اس نے جھوٹ بولا ہے تو واپس کیوں نہیں چلی گئی تھیں؟''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''جانا چاہتی تھی مگر اس نے واپسی کا راستہ بند کر دیا تھا۔ دروازے پر تالا ڈال دیا تھا۔''

''تو شور مچا دیتیں۔ تمہاری چیخ و پکار پورے محلے تک نہ سہی.... کم سے کم پڑوسیوں تک تو ضرور پہنچ جاتی۔''

اس نے آنچل سے چہرے کو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔ لوگوں کو یہ دکھانا نہیں چاہتی تھی کہ میرا پھوپی زاد اس حد تک گر چکا ہے۔ اسی لیے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ خاموشی سے پھپو کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچا تھا' گھر کا مسئلہ ہے۔ ہمارے گھر کے اندر ہی نمٹ جائے گا۔''

دردانہ نے کہا۔ ''ذرا اس لڑکی کی باتیں سنو۔ کتنی جلدی جلدی بیان بدل رہی ہے؟ ابھی کہہ رہی تھی' نعیم نے قید کر کے رکھا تھا اور اب بول رہی ہے کہ خود ہی یہاں بند ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ارے! اسے عزت کی پروا ہوتی تو یہاں تک آتی ہی کیوں..؟''

پھر وہ دہائی دینے کے انداز میں بولی۔ ''اری انیلا! یہ تو نے کیا کیا؟ نعیم پسند تھا تو مجھ سے کہتی۔ میں خود تیرا ہاتھ مانگنے بھائی کے گھر جاتی مگر...''

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''یہ آپ کیا بولتی چلی جا رہی ہیں؟ میں تھوکتی ہوں آپ کے بیٹے پر... اور یہ بھی اچھی طرح سمجھ رہی ہوں کہ آپ نے انتقاماً مجھے یہاں پھنسایا ہے۔''

وہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بیٹے کو دو ہتڑ مارتے ہوئے بولی۔ ''یہ تیرے عشق میں اندھی ہو کر چلی آئی تھی مگر تجھے تو ہوش کے ناخن لینے تھے۔ تو ہی گھر سے باہر آجاتا تو یہ ابھی تجھے بدنام نہ کرتی۔''

وہ بھی پکا ڈرامے باز تھا۔ مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔ ''میں کیا کرتا؟ اس نے دھمکی دی تھی' اگر میں اسے زبردستی یہاں سے نکالوں گا تو یہ شور مچا دے گی۔ محلے والوں کو یہی بتائے گی کہ میں اس کے ساتھ زبردستی کر رہا ہوں۔''

انیلا کا دماغ گھوم رہا تھا۔ وہ ماں بیٹا جھوٹ پر جھوٹ بولتے جا رہے تھے اور ہر جھوٹ سچ ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' اپنی پارسائی کا کیسے یقین دلائے؟ کیسے سمجھائے کہ وہ بے گناہ ہے؟ خدا نے اس کی آبرو کو محفوظ رکھا ہے۔ سننے والے اسی بات کو توجہ سے سنتے اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں' جس میں کچھ خاص ہو۔

اور یہ بات سب ہی محلے والوں کے لیے انوکھی تھی کہ ایک لڑکی کسی لڑکے کے عشق میں خود اس کے گھر چلی آئی تھی اور تنہا اس کے ساتھ پوری رات گزار چکی تھی۔

لوگ باتیں بنا رہے تھے۔ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ آنکھوں دیکھی بات کو بھلا کون جھٹلا سکتا تھا؟ اور اگر جھٹلایا جاتا تو اس دلچسپ گناہ آلود معاملے کا چٹخارا پھیکا پڑ جاتا۔

ان لمحات میں انیلا کو یوں لگ رہا تھا جیسے چاروں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف سے بدنامی کا پتھراؤ ہو رہا ہے۔ وہ لہولہان ہو رہی ہے۔ اگرچہ وہ ایسی ہی کوری تھی' جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم اسے جبراً داغدار بنایا جا رہا تھا۔

وہ چیخ کر بولی۔ ''خدا کے لیے نعیم کی باتوں میں نہ آئیں۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

دربانہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''نیچی آواز میں بات کرو۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری...؟''

پھر وہ بیٹے کے سینے پر دو ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''دفع ہو جا یہاں سے... میں تیری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ غلطی صرف انیلا سے نہیں ہوئی' تجھ سے بھی ہوئی ہے۔ نکل جا میرے گھر سے... چلا جا...''

وہ دھکا کھا کر باہر آ گیا۔ یہ بھی سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق کیا جا رہا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ بیٹے کو معاملے سے دور کرنے کے لیے بڑے ہی جذباتی انداز میں اسے گھر سے نکال دے گی۔ یوں ایک ماں کی بات میں وزن پیدا ہوگا' اس نے بیٹے کو غلطی کی سزا دی ہے۔ اسے بے گھر کر دیا ہے۔

صورتِ حال اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی کہ انیلا کو سنبھلنے کی بھی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ محلے والے ''تھوتھو'' کر رہے تھے۔ اُس نقار خانے میں کوئی اس کی سننے والا نہیں تھا۔ اسے اس ماحول سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ایسی گھٹن تھی' جیسے سانسیں رک رہی ہوں۔

''میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مجھے موت آ جائے۔ یہیں گر کے مر جاؤں۔''

موت آسانی سے آ جاتی ہے لیکن ایسے وقت گڑگڑا کر مانگو تب بھی نہیں آتی پھر مرنے کا فائدہ ہی کیا تھا؟ وہ موت کے بعد بھی نیک نام رہنے والی نہیں تھی۔

وہ بھاگ جانا چاہتی تھی، کہیں جا کر منہ چھپا لینا چاہتی تھی مگر منہ چھپانے سے کیا ہونے والا تھا؟ وہ معاملہ تو چڑھتے سورج کی طرح تھا جسے پوری دنیا دیکھ رہی تھی۔

سلیمان' امام صاحب اور مولانا فضل کریم کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گلی میں بہن کے دروازے پر ہجوم دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ مولانا نے پوچھا۔ ''وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

امام صاحب نے کہا۔ ''وہ تو سلیمان کی بہن کا گھر ہے۔''

سلیمان نے اس طرف بڑھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ ''خدا خیر کرے، یہ ہجوم کیسا ہے؟''

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس بیٹی کو پچھلی رات سے ڈھونڈتا پھر رہا ہے' وہ بہن کے گھر سے... ویا بغل سے برآمد ہونے والی ہے۔ وہ لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے وہاں پہنچا تو سب سے پہلے اپنی بیٹی پر نظر پڑی۔ اس نے شدید حیرانی سے کہا۔ ''انیلا...!''

اس نے باپ کی آواز سنی تو دوڑتے ہوئے آ کر اس سے لپٹ گئی۔ روتے ہوئے بولی۔ ''ابو! مجھے یہاں سے لے چلیں۔''

معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اُس کے بجائے دربانہ نے جواب دیا۔ ''خاندان کی ناک کٹوا رہی تھی۔ کیسے باپ ہو؟ جوان بیٹی رات بھر غائب رہی اور تمہیں کوئی فکر نہیں تھی؟''

اس نے ہچکچا کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ جس بات کو گھل سے چھپاتا پھر رہا تھا' وہ اچانک ہی کھل گئی تھی۔

دربانہ نے کہا۔ ''دیکھو! اس کلموہی نے کیا تماشا کیا ہے؟ یہاں نعیم کے ساتھ منہ کالا کرنے آئی تھی۔''

بوڑھا باپ یہ سن کر لرز کر رہ گیا۔ اُدھر انیلا صدمے سے نڈھال تھی۔ اب تک نہ جانے ان الزامات کو کیسے برداشت کرتی رہی تھی؟ باپ کے سامنے اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ سہہ نہ سکی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے بازوؤں میں جھولتے ہوئے فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔ نیک نامی اس کے بوڑھے ہاتھوں سے پھسل کر مٹی میں مل رہی تھی۔

مولانا فضل کریم اور امام صاحب حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دو خواتین انیلا کو سنبھالنے لگیں۔ سلیمان کے جسم سے تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ بت بنا کھڑا تھا۔ مولانا نے پوچھا۔ ''آخر معاملہ کیا ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

دربانہ انہیں پوری روداد سنانے لگی۔ سلیمان کے کانوں میں جیسے سیسہ اُنڈیلا جا رہا تھا۔ وہ سن رہا تھا اور زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ انیلا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے تھے۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی۔

اس نے باپ کو دیکھ کر فوراً ہی اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ابو! یہ... یہ پھپھو جھوٹ بول رہی ہیں۔ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔''

ایک محلے دار نے کہا۔ ''اگر یہ جھوٹ بول رہی ہیں تو یہ کیا ہے جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں؟''

ایک خاتون نے کہا۔ ''اگر تمہارے ساتھ زبردستی کی گئی ہوتی تو تمہارا حلیہ اس بات کی گواہی دیتا۔ تم نے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھت کے نیچے نعیم کے ساتھ پوری رات گزاری ہے۔ تمہارے پاس بھاگنے کے کئی راستے تھے مگر بھاگا تو وہاں جاتا ہے جہاں مرضی شامل نہ ہو۔"

وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔ "بس کریں۔ خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔"

پھر وہ باپ کا بازو تھام کر بولی۔ "ابو! آپ تو مجھ پر یقین کریں۔ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔ آپ کو یاد ہے' میں نے نعیم کو تھپڑ مارا تھا؟ پھپھو اُسی بات کا بدلہ لے رہی ہیں۔"

وہ تو جیسے پتھر بن گیا تھا۔ وہ اس کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔ "میرا اعتبار کریں ابو! مجھ پر الزام لگایا جا رہا ہے۔"

مولانا نے پوچھا۔ "نعیم کہاں ہے؟"

کسی نے کہا۔ "دردانہ نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"

وہ بولی۔ "میں اُس کی صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔ یہ دونوں گناہ گار ہیں، مجرم ہیں۔ اگرچہ وہ اسے اٹھا کر نہیں لایا تھا مگر ایک بہکنے والی کے ساتھ اس نے بھی بہکنے کی غلطی کی ہے۔"

اسی وقت انیلا کی ماں اور چھوٹی پھپھی بھی وہاں پہنچ گئیں۔ وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی۔ اپنی پارسائی کا یقین دلانے لگی۔

مولانا نے کہا۔ "آپ تمام خواتین انیلا کو لے کر اندر کمرے میں جائیں۔"

وہ سب ایک کمرے میں چلی گئیں۔ مرد حضرات بیٹھک میں آ گئے۔ مولانا فضل کریم نے ایک محلے دار سے کہا۔ "جا کر نعیم کو تلاش کرو۔ اس وقت اُس کی موجودگی ضروری ہے۔"

چند محلے والے اس کی تلاش میں نکل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ علاقے کی کسی دکان پر یا کسی تھڑے پر بیٹھا ہوگا مگر وہ تو سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے مطابق وہاں سے رفو چکر ہوا تھا۔ آسانی سے ملنے والا نہیں تھا۔

مولانا فضل کریم نے کہا۔ "گناہ گار کبھی اپنا گناہ قبول نہیں کرتا۔"

ایک شخص نے کہا۔ "انیلا اور نعیم بھی یہی کر رہے ہیں۔ اگرچہ دونوں ہی گناہ گار ہیں مگر ایک دوسرے پر الزام تھوپ رہے ہیں۔ جس طرح انیلا یہ جتانا چاہتی ہے کہ سارا قصور نعیم کا تھا' اسی طرح وہ بھی ایسا ہی بیان دے رہا تھا۔ حقائق کو سامنے رکھ کر دیکھا اور سوچا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انیلا کو زبردستی یہاں نہیں لایا گیا تھا۔"

دوسرے شخص نے کہا "اور اُس کا بیان بھی یہی ہے۔"

"اگر یہاں اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی جا رہی تھی تو اسے چیخنا چلانا چاہیے تھا۔ کسی کو مدد کے لیے پکارنا چاہیے تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"کسی بھی لڑکی کے لیے اس کی آبرو سے زیادہ کوئی شے قیمتی نہیں ہوتی اور اس کا کہنا ہے کہ وہ اس لیے خاموش رہی تا کہ دو گھرانے تماشا نہ بن جائیں۔ کبھی کہتی ہے کہ نعیم نے اسے تالے میں بند کر کے رکھا تھا اور کبھی کہتی ہے' اس نے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔"

ایک شخص نے کہا۔ "وہ اپنی پارسائی جتانے کے لیے باتیں بدل رہی ہے۔ کبھی کچھ اور کبھی کچھ کہہ رہی ہے۔"

مولانا نے سوچتی ہوئی نظروں سے سلیمان کی طرف دیکھا۔ وہ تو صم بکم بنا ہوا تھا۔ مولانا نے کہا۔ "انیلا کہتی ہے' دردانہ نے اسے یہاں بلایا تھا۔ تم کیا کہتے ہو؟ حقیقت کیا ہو سکتی ہے؟"

وہ بہت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "انیلا جھوٹ بول رہی ہے۔"

تمام افراد نے چونک کر اسے دیکھا۔ امام صاحب نے پوچھا۔ "کیا جھوٹ بول رہی ہے؟ کیا دردانہ نے اسے نہیں بلایا تھا؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "دردانہ کل شام میرے گھر آئی تھی اور وہیں سے بڑی آپا کی طرف چلی گئی تھی۔"

مولانا نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ یہ یاد آیا کہ مسجد میں جب وہ انیلا کے بارے میں باتیں کر رہے تھے تو سلیمان کو یہ فکر تھی کہ بیٹی کی گمشدگی بہن سے چھپی نہیں رہ سکے گی پھر اس نے کہا تھا' یہ بھی شکر ہے کہ فی الحال دردانہ بڑی آپا کے گھر گئی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے دردانہ نے بھی یہی کہا تھا' محلے والے بھی اس بات کی تائید کر رہے تھے کہ وہ کل شام وہاں نہیں تھی۔

یعنی جو بات سچ لگ رہی تھی' وہ چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

باپ نے اس معاملے میں بیٹی کو جھوٹا قرار دے دیا تھا۔ اب وہ ہر معاملے میں جھوٹی پڑنے والی تھی۔ سلیمان کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہاں موجود سب ہی افراد کو چپ سی لگ گئی تھی۔ باپ کی گواہی سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی تھی؟

مولانا فضل کریم اور امام صاحب آپس میں صلح مشورے کرنے لگے۔ محلے کے دیگر معززین بھی اپنی اپنی رائے پیش کر رہے تھے۔ کوئی انیلا کے بیان کو دہرا رہا تھا' کوئی نعیم کی باتوں سے معنی اخذ کر رہا تھا۔ سب کی تان یہاں آ کر ٹوٹ رہی تھی کہ انیلا اس گھر سے برآمد ہوئی تھی۔

مولانا نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "خدا ہمارے بچوں کو نیک ہدایت دے۔ جس معاشرے میں بے باکیاں حد سے تجاوز کر جاتی ہیں' حرام حلال کا فرق مٹ جاتا ہے گناہ کرنے میں کوئی شرم جھجک نہیں رہتی' وہاں ایسے ہی قصے جنم لیتے ہیں۔"

سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ "سلیمان کی بات سننے اور تمام حقائق پر غور کرنے کے بعد حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ اگرچہ غلطی کی ابتدا لڑکی کی طرف سے ہوئی ہے مگر لڑکا بھی برابر کا شریک گناہ ہے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "مگر لڑکی تو مسلسل انکار کر رہی ہے۔"

مولانا نے کہا۔ "گناہ گار فوراً ہی اپنا گناہ قبول نہیں کرتا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باوجود الٹی سیدھی دلیلیں پیش کر کے اپنی پارسائی جتانے کی کوششیں کرتا رہتا ہے مگر ہم جھوٹی دلیلوں سے قائل نہیں ہوتے۔"

وہ ذرا ٹھہر کر بولے۔ "یہ ماننے والی بات ہی نہیں ہے کہ جوان لڑکا لڑکی ایک چھت کے نیچے تنہا رات گزاریں اور گناہ سے بچے رہیں۔ شیطان ایسے ہی موقعوں کی تاک میں رہتا ہے۔"

امام صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔ "جو بھی ہوا' بہت برا ہوا۔ اب یہ سوچیں کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟"

سلیمان غصے سے لرزتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "اس کا ایک ہی حل ہے کہ میں بے حیا بیٹی کا گلا دبا کر مار ڈالوں۔ اس نے میری عزت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

مولانا اور دوسرے افراد نے اسے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ "اپنے غصے پر قابو رکھو۔ کیا قاتل بن کر پھانسی چڑھنا چاہتے ہو؟ ایک بیٹی کے گناہ کی سزا پورے گھرانے کو دینا چاہتے ہو؟"

سب ہی اسے سمجھانے لگے۔ علاقے کا چیئرمین بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "آنے دو نعیم کو... ابھی کے ابھی دونوں کا نکاح پڑھا دوں گا۔"

جو اس کی تلاش میں نکلے تھے۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ اس کا کہیں کچھ پتا نہیں ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟

ایک نے کہا۔ "وہ سر پھرا ہے۔ اکثر کئی دنوں اور ہفتوں تک محلے سے غائب رہتا ہے۔"

ایک عورت نے کہا۔ "آخر وہ مرد ہے۔ کھایا پیا کل کر کے چلا گیا۔ اسے کون پکڑے گا؟"

امام صاحب نے کہا۔ "دردانہ نے اسے گھر سے نکال کر غلطی کی۔ ابھی وہ یہاں ہوتا تو بگڑی ہوئی بات سنبھال لی جاتی۔"

دردانہ نے وہاں آتے ہوئے کہا۔ "جو بات بگڑ چکی ہے' وہ اب کبھی نہیں بنے گی۔ نہ میں ایسی بے حیا لڑکی کو اپنی بہو بناؤں گی اور نہ بیٹے کو معاف کروں گی۔"

انیلا دوسرے کمرے میں ماں کے ساتھ اُن لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ وہاں موجود دیگر خواتین بھی اپنی اپنی بولیاں بول رہی تھیں۔ بات کچھ ایسے انداز میں بگڑی تھی کہ وہ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی پارسائی کا یقین نہیں دلا سکی تھی۔

ایک خاتون نے کہا۔ "کسی کی سچائی کو سمجھنے کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ تم اتنی ہی سچی ہو تو قرآن پر ہاتھ رکھ کر اپنی پارسائی کا یقین دلا دو۔ ساری بات صاف ہو جائے گی۔"

اس نے ذرا جھجک کر اسے دیکھا پھر ماں کو دیکھا۔

ایک اور خاتون نے کہا۔ "ہاں انیلا...! اپنی سچائی ثابت کرنے کا ایک یہی طریقہ ہے۔"

رضیہ بیگم نے اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا۔ "تمہاری پھپھو اُدھر الماری پر قرآن رکھتی ہیں۔ جاؤ لے کر آؤ۔"

وہ جانا چاہتی تھی۔ انیلا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "میں فی الحال کلام پاک پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی۔"

اس کی یہ بات سن کر سب ہی عورتیں چونک گئیں جیسے چور نے اپنی چوری کا اعتراف کر لیا ہو۔ ماں نے بے یقینی سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیوں نہیں رکھو گی ہاتھ...؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ دراصل... میں پاک نہیں ہوں۔"

ماں نے ٹھٹک کر پوچھا۔ "کیا مطلب...؟"

کئی عورتیں منہ پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ ایک نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "ہاں تو نہانے کا موقع ہی کہاں ملا بے چاری کو... صبح صبح تو ہم پہنچ گئے۔"

وہ تڑخ کر بولی۔ "ایسی ناپاکی ہر مہینے آپ کو بھی ہوتی ہے۔"

انیلا نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "چلیں امی... یہ جو سمجھنا چاہتی ہیں' انہیں سمجھنے دیں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں اب اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گی۔ انصاف کرنے والا اوپر بیٹھا ہے۔ مجھے یقین ہے' وہی میری پارسائی ثابت کرے گا۔"

وہ ماں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئی۔ بیٹھک کے دروازے پر مولانا فضل کریم' دردانہ سے کہہ رہے تھے۔ "بیشک۔ دونوں نے انتہائی شرمناک غلطی کی ہے لیکن اب اس بات کو زیادہ نہ اچھالا جائے تو بہتر ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انیلا ان کی بات سن کر رک گئی۔ سر پر آنچل درست کرتے ہوئے بولی۔ ''خدا بہتر جانتا ہے۔ اب بھی میرے سر پر حیا کا آنچل ہے۔ سب ہی آپ کو جہاں دیدہ اور عالم و فاضل مانتے ہیں لیکن آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں' جو سب کہہ رہے ہیں۔ پھر آپ میں اور سب لوگوں میں کیا فرق رہا؟ آپ کا علم اور دانشوری کہاں چلی گئی''

مولانا صاحب کی نظریں عورتوں کے سامنے جھکی رہتی تھیں۔ وہ اس کے قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو لیکن ایسا بھی ہوتا ہے' کبھی تمام لوگ کسی معاملے کو غلط سمجھ لیتے ہیں۔ خدا ہمیں غلطیوں سے بچائے۔''

مولانا نے امام صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا علم' ہماری دانائی' ثبوت اور گواہوں کو مانتی ہے۔ ثبوت ہے کہ تمہیں یہاں لایا نہیں گیا بلکہ تم خود یہاں آئیں اور ایک نامحرم کے ساتھ رات گزاری۔ صبح تمہیں یہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا جا رہا ہے اور اس بات کے ایک نہیں' بے شمار گواہ ہیں تو پھر وہی ماننا پڑتا ہے' جو حالات کہہ رہے ہیں۔''

''مولانا صاحب! حالات نہیں' لوگوں کے خیالات میرے خلاف ہیں۔ اگر سب لوگ ابھی یہ طے کر لیں کہ ان کی بہن' ان کی بیٹی پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے تو سب ہی اپنی شرافت اور پارسائی ثابت کرنے کے لیے جی جان لگا دیں گے لیکن میں کسی کی بہن، بیٹی نہیں ہوں۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے میں جو مزہ آتا ہے' وہ کبھی کبھی ملتا ہے۔ یہاں مردوں سے زیادہ عورتیں مزے لے رہی ہیں۔''

اس نے دروازے اور کھڑکیوں سے جھانکنے والیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تک سنتی آئی تھی' آج دیکھ بھی رہی ہوں۔ کسی عورت کی توہین پر عورتیں ہی زیادہ خوش ہوتی ہیں۔''

وہ ماں کے ساتھ جاتے ہوئے مولانا فضل کریم سے بولی۔ ''اللہ نے آپ کو علم دیا ہے' ایمان دیا ہے۔ اس پہلو سے سوچیں کہ کبھی کبھی آنکھوں دیکھی سچائی بھی غلط ہو جاتی ہے۔ حضرت یوسف کو بھی اسی طرح بدنام کیا گیا تھا جبکہ وہ زلیخا کی تنہائی میں رہ کر بھی اس کی ہوس اور ترغیب کے باوجود پارسا تھے۔''

ماں نے کہا۔ ''میری بیٹی کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔''

انیلا نے کہا۔ ''ہم کسی کو سمجھا نہیں سکتے مگر کسی روز اوپر والا انہیں سمجھائے گا کہ وہ کیسے کسی مظلوم کی نیک نامی بحال کر دیتا ہے؟''

سلیمان بیٹی کی آواز سن کر غصے سے قابو ہو رہا تھا مگر قادر جان اور دوسرے افراد نے اسے روک لیا تھا۔ ادھر وہ ماں کا ہاتھ تھام کر بہنوں کے ساتھ گھر چلی گئی۔

اس دن کے بعد سلیمان نے بیٹی سے بات نہیں کی۔ ساری دنیا کی طرح اُسے آبرو باختہ ہی سمجھتا رہا۔ بیوی نے کئی بار سمجھانا چاہا کہ اسے اپنی بیٹی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ مگر اس کی تو بس ایک ہی خواہش تھی' ایک ہی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح اسے نعیم کے پلے باندھ کر اس بدنامی کو ختم کر ڈالے۔ یہ اندیشہ تھا کہ ایک کی بدنامی دوسری بیٹیوں کو بھی ہمیشہ کے لیے بدنصیب بنا دے گی۔

کبھی کبھی قسمت کا لکھا بدلنے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے' جیسے خدا نے دیکھنا' سننا اور دعاؤں کو قبول کرنا چھوڑ دیا۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ قدرتی عوامل درپردہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ انیلا کو اعتماد تھا کہ خدا دیکھ رہا ہے اور ہماری لاعلمی میں ہمارے پاس ہے۔

☆☆☆

سلیمان کے سامنے صرف یہی ایک راستہ تھا کہ بہن مان جائے اور انیلا کو بہو بنا لے۔ تمام بدنامیاں' فکر و پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ سفارش کے لیے امام صاحب اور مولانا فضل کریم کو بہن کے پاس لے گیا تھا لیکن بات نہیں بنی تھی۔

دردانہ کے رویے نے سمجھا دیا تھا کہ وہ تب مانے گی' جب بھائی کا مکان اپنے بیٹے کے نام لکھوا لے گی اور اس کے پورے خاندان کو بے گھر کر دے گی۔

انیلا کو بدنام کرنے کے بعد دردانہ کی ان سے یہ دوسری بڑی دشمنی ہوتی۔ وہاں سے مایوس ہو کر واپس آتے وقت امام صاحب نے کہا۔ ''یہ صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بھائی سے دشمنی کر رہی ہے۔ کوئی شرط منوائے بغیر کبھی بھتیجی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی..... انیلا اس کے بیٹے کے ساتھ بدنام ہوئی ہے۔ دونوں کی شادی ہو گی تو اس بدنامی پر مٹی پڑ جائے گی۔''

مولانا صاحب نے کہا۔ ''ایک طرف وہ بیتی ہے' انیلا بے حیا بدکار ہے۔ اسے بہو نہیں بنائے گی پھر کہتی ہے' مکان بیٹے کے نام ہو جائے تو اسے قبول کرے گی؟ یعنی بھائی کا مکان حاصل کرنے کے لیے اسے بے حیا اور بدکار کہہ رہی ہے۔''

سلیمان نے کہا۔ ''میری گھر والی ٹھیک ہی کہتی ہے' ہماری بیٹی بے حیا نہیں ہے۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ دردانہ کوئی سازش کر رہی ہے۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''اب میں سمجھ رہا ہوں' ایک بار انیلا نے نعیم کی بدتمیزی پر اسے طمانچہ مارا تھا۔ دردانہ اس طمانچے کا انتقام لے رہی ہے اور ہم سے ہمارا گھر بھی چھین لینا چاہتی ہے۔''

مولانا فضل کریم اور امام صاحب اس کی باتیں سن رہے تھے۔ پہلی بار یہ سوچ رہے تھے کہ شاید انیلا گناہ گار نہیں ہے۔ اسے بدنام کرنے کے لیے دردانہ نے کوئی کھیل کھیلا ہے۔

کیسا کھیل ہے؟ یہ ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن ہوا کا رخ بدل گیا تھا۔ سلیمان اور اس کی بیٹی کے لیے دل میں نرم گوشہ بن گیا تھا۔ اب حالات کو دوسرے پہلوؤں سے جانچنے کے لیے خیالات میں لچک پیدا ہو سکتی تھی۔

امام صاحب نے کہا۔ ''صبر کرو۔ خدا صبر کا میٹھا پھل دیتا ہے اور جبر کرنے والوں کو ان کے برے انجام تک پہنچاتا ہے۔ تم نمازیں پڑھ رہے ہو۔ ہم بھی تمہاری بہتری کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔''

مولانا نے کہا۔ ''نماز تمہیں تحفظ دے رہی ہے۔ ذرا غور کرو' پہلے جو اندیشہ تھا کہ بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔ وہ غلط ثابت ہو گیا۔ یہ گھر کی بات تھی۔ باہر کے درندوں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔''

وہ ذرا ٹھہر کر بولے۔ ''سمجھو تو سمجھ میں آئے گا۔ اللہ نے انیلا کو سلامتی دی ہے۔ اگر وہ بدنام ہو رہی ہے تو اپنے عمل کے باعث ہو رہی ہے۔ وہ خود ہی بدنام ہونے وہاں گئی تھی۔''

امام صاحب نے کہا ''اگر انیلا کا اور تمہارا دعویٰ درست ہے کہ دردانہ نے کسی طرح کی سازش کی ہے تو اللہ عالم الغیب ہے۔ تم اور تمہارے بچے دینی ہدایات پر عمل کرتے رہیں گے تو انشاءاللہ ایک دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ تمہاری بیٹی اگر بے داغ ہے تو اس کی نیک نامی ضرور بحال ہو گی۔''

مولانا نے کہا۔ ''ہم انیلا کے معاملے میں نظر ثانی کریں گے۔ حقیقت کیا ہے' اپنے طور پر چھان بین کریں گے۔ آج دردانہ کے رویے نے سمجھا دیا کہ وہ تم سے انتقام لے رہی ہے۔ تمہارا مکان اپنے نام کرنے کی چالیں چل رہی ہے۔''

دیکھا جائے تو سلیمان کے لیے کچھ اچھا ہونے والا تھا کیونکہ مولانا صاحب اور امام صاحب غیر جانبدار ہو کر انیلا کو اگر اچھا نہیں سمجھ رہے تھے تو برا بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ سلیمان کو حوصلہ دے رہے تھے کہ بہتری ہو گی۔

مولانا فضل کریم کے دروازے پر سلیمان اور امام صاحب مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔ وہ عموماً دروازے کو لاک نہیں کرتے تھے لیکن اب ان کے بھی حالات بدل گئے تھے۔ کوئی نادیدہ ہستی اپنے وجود کا پتا دے رہی تھی۔

انہوں نے پہلی بار گھبرا کر سوچا۔ ''اگر وہ بھی کوئی ہے اور محلے والوں نے اسے دیکھ لیا تو کیا ہو گا؟''

سب سے پہلا سوال یہی پیدا ہوا۔ ''کیا میں اپنی پارسائی کا یقین دلا سکوں گا؟''

کون یقین کرے گا' اگر وہ میرے گھر سے نکلے گی جیسے انیلا نعیم کے گھر سے نکلی تھی۔''

انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ''کوئی خوامخواہ یہاں سے کیوں نکلے گی؟ کیوں یہاں آئے گی؟''

اپنے اندر سے جواب ملا۔ ''انیلا خوامخواہ وہاں نہیں گئی تھی۔ جو ثبوت اور گواہ اس کے خلاف تھے' وہی اس نادیدہ ہستی کے سلسلے میں ہوں گے۔''

انہوں نے گھبرا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ دبے قدموں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ کوئی ہوتا تو دکھائی دیتا۔ انہوں نے ایک بار پھر پورے مکان کو اندر سے چھان مارا۔ اب تو ان کا نفسیاتی تجزیہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ لاشعوری طور پر دل کے مکان میں تھی۔ اس لیے چار دیواری میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ لیٹ کر ذرا کمر سیدھی کرنا چاہتے تھے۔ اس سے پہلے غسل خانے میں آئے۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر بالوں پر دونوں ہاتھ پھیرے پھر کنگھی اٹھائی تو دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ کنگھی میں دو چار بال الجھے ہوئے تھے۔

اور وہ انہیں الجھا رہے تھے۔ ان کے اپنے بال اتنے لانبے نہیں تھے۔ غسل خانے میں اچھی خاصی روشنی تھی پھر بھی انہوں نے لائٹ آن کی۔ ان بالوں کو غور سے دیکھا۔ وہ کسی حسینہ کی الجھی ہوئی زلفیں تھیں۔ انہوں نے ہڑبڑا کر کنگھی کو واش بیسن میں پھینک دیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

یہ ثابت ہو گیا تھا کہ مکان کی چار دیواری میں کوئی نادیدہ بلا نہیں ہے۔ کسی عورت کا وجود ہے۔

وہ کمرے میں آ کر چھت کو تکتے ہوئے سوچنے لگے ''جب میں نیچے تلاش کر کے ایک زینے سے اوپر جاتا ہوں تو وہ دوسرے زینے سے نیچے آ جاتی ہے۔''

انہوں نے فوراً ہی ایک زینے پر جانے والے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر دوسرے زینے سے چھت پر آ گئے۔ چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد چھت والے کمرے میں آئے۔ وہ کمرا اس کے وجود سے خالی تھا۔ وہاں سب نے اپنی اپنی چھت پر چارفٹ کی اونچی منڈیریں بنائی ہوئی تھیں۔ ان منڈیروں پر سے کوئی بھی ایک دوسرے کی چھت پر آ سکتا تھا۔ اگرچہ کوئی ایسا کرتا نہیں تھا لیکن وہ یہی کرتی ہو گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آسان سا طریقہ یہی تھا کہ وہ ان تین مکانات والے پڑوسیوں سے ملتے اور معلوم کرتے کہ کسی مکان میں رہنے والی کوئی خاتون ان کی چھت کے ذریعے اس مکان میں آتی ہے؟

لیکن یہ طریقہ آسان ہونے کے باوجود نامناسب تھا۔ وہ کسی کے دروازے پر جا کر یہ کہتے کہ اس کی ماں' بہن یا بیٹی چھپ کر ان کے گھر آتی ہے تو یہ چادر اور چار دیواری میں رہنے والیوں پر الزام ہوتا۔ وہ کسی کو صورت سے پہچان کر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہی آتی ہے۔

ایسی الزام تراشی پر لوگ مارنے مرنے پر تل جاتے۔ کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اوپر سے یہ بھید کھل جاتا کہ مولانا صاحب کے گھر میں کوئی چھپ کر آیا کرتی ہے۔

اب وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ وہ کوئی آسیب یا چھلاوہ نہیں ہے۔ وہ آتی ہے' ضرور آتی ہے اور اب بھی وہاں موجود ہے۔

وہ نیچے کمرے میں جانا چاہتے تھے کہ رک گئے۔ دوسری چھت پر ایک لڑکی کی جھلک دکھائی دی۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے تھے اور وہ ان کے پیچھے تھی۔ صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اگر نظر آتی' تب بھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ یہ وہی ہے جو اپنے پیچھے لگا رہی ہے۔

اور وہ اس سے یہ احمقانہ سوال نہیں کر سکتے تھے۔ ''کیا تم ہی میرے گھر میں آتی ہو؟''

پھر اچانک ہی ایک سراغ ملا۔ کلائیوں میں چوڑیاں بج رہی تھیں۔ وہ مترنم چھن چھن جیسے کہہ رہی تھی۔ ''ہاں۔ میں ہی ہوں۔ بولو! کیا ارادہ ہے؟ کیا کرو گے؟ مجھے الزام دو گے؟ اونہہ...! میں اکیلا نہیں ہوں۔''

الگنی سے کپڑے اتارتے وقت چوڑیاں گنگنا رہی تھیں۔ وہاں پڑے ہوئے پردے ہوا سے اڑ رہے تھے۔ وہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اچھی پرکشش لڑکی تھی۔ چوڑیوں کی چھن چھن جیسے مولانا صاحب سے کہہ رہی تھی۔ ''لڑکی گھر میں آ گئی ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔ تم بھی اسے چنو گے تو بات آگے بڑھے گی۔''

وہ نظریں نیچی رکھنے والے ایک شریف آدمی تھے۔ محبت کیسے کی جاتی ہے' یہ نہیں جانتے تھے۔ عورت ہر مرد کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ان کے لیے بھی وہ ضروری ہو سکتی تھی۔

اور ضروری ہوتی' تب بھی وہ عشق کرنے والے نہیں تھے۔ محض ایک انداز میں اس کے گھر رشتے کا پیغام بھیج سکتے تھے لیکن ابھی یہ تو معلوم ہو کہ یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں؟ کیسے معلوم کریں؟

وہ ایک لڑکی سے براہ راست ایسی بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے اندر یہ بے چینی تھی کہ اگر بات نہ کی' کچھ نہ پوچھا تو وہ کسی لمحے بھی چلی جائے گی پھر وہی اضطراب' وہی تجسس رہے گا کہ کون آتی ہے؟ کیوں آتی ہے؟

انہوں نے اتنی دیر میں بس ایک نظر اس پر ڈالی تھی پھر منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے تھے مگر دھیان ادھر ہی تھا۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے کہ ابھی وہ چھت پر ہے اور چوڑیوں کی دھن پر الگنی سے ایک ایک کپڑا اتار رہی ہے لیکن کب تک؟ آخر وہاں سے چلی جائے گی۔

خدا کسی شریف آدمی کو ایسے معاملات میں نہ ڈالے۔ اگرچہ وہ کوئی فریاد نہیں کر سکتے تھے مگر اپنے سینے سے ایک آہ تو نکال سکتے تھے۔ کھانس کر یا کھنکار کر یہ اشارہ دے سکتے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

کچھ ہونے والا نہیں تھا۔ وہ خوشبو چھت سے اڑ جانے والی تھی۔ جب ہی اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم...؟''

انہوں نے گھوم کر دیکھے بغیر کہا۔ ''وعلیکم السلام...!''

''آپ یہاں دھوپ میں کھڑے ہیں۔ کوئی پریشانی ہے؟''

''جی نہیں' پریشانی تو نہیں ہے۔ ہاں۔ مگر ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ پریشانی نہیں ہے' مگر ہے؟''

''ہاں۔ وہ... دراصل ایک الجھن ہے۔''

''آپ تو بہت ہی ذہین اور عالم فاضل ہیں۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہیں۔ لوگوں کی الجھنیں دور کرتے ہیں۔ بھلا آپ کیسے الجھن میں پڑ سکتے ہیں؟''

''کبھی کبھی ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے سکون برباد ہو جاتا ہے۔ مجھے آج صبح سے ایسا لگ رہا ہے' جیسے میرے گھر میں کوئی گھس آتا ہے۔''

''ہاں۔ سنا ہے۔ آپ باہر کا دروازہ اندر سے کھلا رکھتے ہیں۔ اسے بند رکھا کریں' کوئی نہیں آئے گا۔''

''وہ دروازے سے نہیں' اس چھت سے آتا ہے۔''

''آپ یہ نیچے جانے والے زینے کا دروازہ کیوں نہیں لگواتے؟ دروازہ بند رہے گا تو کوئی نہیں آئے گا۔''

''میرے گھر میں کوئی قیمتی سامان نہیں ہے۔ چور بدمعاش بھی میری عزت کرتے ہیں۔ کوئی مجھے نقصان پہنچانے نہیں آتا۔''

''تو پھر کیوں آتا ہے؟''

وہ کیسے کہتے کہ وہ آتا نہیں' آتی ہے۔ کسی آنے والی کی بات کرتے تو اس بات کو پرلگ جاتے۔ ایک نادیدہ لڑکی کے

ساتھ ان کی چٹ پٹی کہانی گھر گھر پہنچ جاتی۔

وہ بولی۔ ''میرا نام نورالعین ہے' سب عینی کہتے ہیں۔ آپ نے پہلے مجھے دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ پہلی بار دیکھا ہے۔''

''دیکھ کہاں رہے ہیں؟ جب سے آئی ہوں' منہ پھیر کر کھڑے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی گھر میں آتا ہے' نقصان پہنچاتا ہے تو آپ اسے کیسے پہچانیں گے؟''

''ہاں۔ یہی پریشانی ہے۔ اسی وجہ سے میں بدنام ہو جاؤں گا۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''بدنام...؟ کسی چور کے آنے سے آپ کیوں بدنام ہوں گے؟''

بڑا آسان سوال تھا لیکن جواب بہت مشکل تھا۔ وہ بات بدلتے ہوئے بولے۔ ''بدنامی اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ ہم نامحرم ہیں' کھلی چھت پر باتیں کر رہے ہیں۔ تمہیں جانا چاہیے۔''

وہ ذرا فاصلے پر ان کے روبرو تھی۔ ان کے درمیان چار فٹ اونچی منڈیر تھی۔ شاید وہ زندگی میں پہلی بار تنہائی میں کسی نامحرم کے اس قدر قریب ہوئے تھے۔ انہیں متاثر ہونا چاہیے تھا' اس کے عشق میں مبتلا ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ان پر ایک دم سے گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ کوئی دیکھے گا تو کیا ہو گا؟ وہی ہو گا' جو ہوتا آیا ہے۔ عشق' محبت کے قصے تراشے جائیں گے کہ مولانا صاحب چھت پر عشق فرماتے ہیں۔

اتنے میں وقت ظہر کی اذان سنائی دی۔ انہوں نے سوچا۔ ''ایک عورت کے پیچھے بھاگتے ہوئے صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے۔ خدا عورت کے شر سے بچائے۔ لاحول ولاقوۃ...''

وہ نماز کے لیے جا رہے تھے۔ عینی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی' جب وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس نے زیر لب کہا۔ ''واہ مولانا صاحب! آپ کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ ابھی ہماری دنیا میں فرشتہ صفت انسان موجود ہیں۔ خدا آپ کو سلامتی اور نیک نامی دے۔''

اسی وقت فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ وہ فون ڈھلے ہوئے کپڑوں کے ٹوکرے پر رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں۔ امی! دودھ کا چیک مل گیا؟''

جواب میں دردانہ کی آواز سنائی دی۔ ''میری جان نہ جلاؤ۔ گھر آؤ۔ میں تمہاری شادی کراؤں گی۔ کم سے کم رقم میں تمہارا گھر آباد کر دوں گی۔''

''آپ میری شادی عرفان سے کبھی نہیں کرائیں گی۔ میں اپنا معاملہ خود نمٹاؤں گی اگر آپ نے ایک لاکھ نہ دیے تو میں محلے والوں کے سامنے کہوں گی کہ میں گھر سے بھاگ کر

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور دنیا کے ہر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ' ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں' اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 6,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 5,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: شہر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی' مین کورنگی روڈ' کراچی
فون: 35895317 فیکس: 35802551

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئی ہوں۔ اور نکاح کے بغیر ایک شخص کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"اپنی ماں کو نادان نہ سمجھنا۔ میں معلوم کر چکی ہوں' تمہاری سہیلی مولانا فضل کریم کے پیچھے والے مکان میں رہتی ہے۔ تم بھی وہیں ہو۔ میں تم پر لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دینا نہیں چاہتی۔ چپ چاپ گھر آ جاؤ...."

"چپ چاپ اپنے مجازی خدا کے ساتھ آؤں گی لیکن ایک لاکھ سکہ رائج الوقت لینے کے بعد...."

"تم میری طرح ضدی ہو لیکن میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ تم دیکھو گی کہ کس طرح میں تمہیں وہاں سے لاؤں گی؟"

ماں نے فون بند کر دیا۔ اس کی سہیلی نے آ کر پوچھا۔

"اتنی دیر سے یہاں کیا کر رہی ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مولانا صاحب سے سامنا ہو گیا تھا۔"

سہیلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیوں بیچارے مولانا کے پیچھے پڑ گئی ہو؟"

"عرفان سے شرط لگی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا' مولانا صاحب صحیح معنوں میں فرشتہ ہیں اور میں نے کہا تھا' عورتوں کے معاملے میں کوئی مرد فرشتہ نہیں ہوتا۔"

"اب تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں نے آج فجر سے انہیں تجسس میں مبتلا رکھا۔ میرا خیال تھا' اچانک مجھے دیکھیں گے تو ہزار جان سے عاشق ہو جائیں گے۔"

"تو پھر ہو گئے؟"

"انہوں نے صرف ایک بار مجھے دیکھا پھر اس خدا کے بندے نے میرے پاؤں کے انگوٹھے پر بھی نظر نہیں ڈالی۔ میں مان گئی' ابھی اس دنیا میں نیک اور پارسا لوگ موجود ہیں۔"

"بس بہت ہو چکا یہ ڈراما... اب اسے ختم کرو اور نیچے چلو۔"

"ڈراما تو تب ختم ہوگا' جب امی سے اپنے حصے کی رقم وصول کر لوں گی۔ وہ نعیم پر سب کچھ لٹاتی رہتی ہیں۔ کل تک ان سے ایک لاکھ روپے وصول کر لوں گی۔ یہاں مولانا صاحب کے پاس آ کر عرفان سے اپنا نکاح پڑھاؤں گی پھر تمہارے گھر سے چلی جاؤں گی۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے نیچے جانے لگیں۔ اسی وقت فون نے پھر مخاطب کیا۔ اس نے خوش ہو کر فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہائے عرفان! میں کب سے تمہارے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں نے کال کی تھی۔ تمہارا فون بزی جا رہا تھا۔"

"ہاں۔ امی سے بات کر رہی تھی۔"

"کیا بات بن گئی ہے؟"

"ضرور بنے گی۔ ابھی تو وہ منانے کی کوششیں کر رہی ہیں۔"

"فرض کرو انہوں نے رقم نہ دی تو کیا کرو گی؟"

"میں کبھی ان کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ رشتہ توڑ دوں گی۔ انہیں بدنام کروں گی کہ ان کی بھتیجی ایلا تو ایک رات کے لیے گھر سے گئی تھی۔ میں تو دو دنوں سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔"

"یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا خود کو بدنام کرو گی؟"

"میں تمہاری نگرانی میں ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں نے گھر سے نکل کر کسی پرائے مرد کا منہ نہیں دیکھا۔ جب تم مجھے شریک حیات بناؤ گے تو پھر بدنام کرنے والی انگلیاں بھی میری طرف نہیں اٹھیں گی۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ میری عینی صرف میرے لیے ہے۔ ویسے تم نے مجھ سے شرط لگائی تھی کہ مولانا صاحب تم پر ہزار جان سے عاشق ہو جائیں گے۔ کیا ایسا کچھ ہوا؟"

"نہیں۔ تم جیت گئے۔ وہ واقعی قابل احترام ہیں۔ انہوں نے صرف ایک مختصر سی نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ اس کے بعد ایسے منہ پھیر لیا' جیسے میں کوئی چیز ہی نہیں ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ وہ بولی۔ "پہلے تو مجھے اپنی توہین کا احساس ہوا جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہ ہو پھر خیال آیا کہ ہم عورتیں بھی عجیب ہیں جب مرد دیکھتے ہیں تو برا لگتا ہے اور جب کوئی نہ دیکھے تو لگتا ہے' ہماری ذات صفر ہو کر رہ گئی ہے۔"

ایسے ہی دیکھے جانے اور نہ دیکھے جانے کی شکایتوں کے دوران چاہنے اور چاہے جانے کی ہوس پروان چڑھتی ہے۔ ایک ہوس نے مولانا فضل کریم کے دروازے پر دستک دی۔ وہ مسجد سے آ کر بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ذرا کمر سیدھی کر رہے تھے کہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

دروازہ وہ کبھی [illegible] سے بند نہیں رہتا تھا۔ اس روز آنے والے سب ہی شک [illegible] کر رہے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو ایک جوان پڑوسن ان کے سامنے کھڑی تھی۔ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ [illegible] بھی شکایت کی۔ مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اندر [illegible] ہے؟ ہمیں بھی اپنا راز دار بنائیں۔"

انہوں نے ناگواری سے پوچھا۔ "یہ کیا بول رہی ہو؟ کسی ضرورت سے آئی ہو تو اپنے گھر کے کسی مرد کے ساتھ آؤ۔ میں تنہا کسی عورت سے نہیں ملتا۔"

"چھت پر [illegible] ہیں۔"

ان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بولی۔ "میں اپنی چھت پر چھپ کر سب دیکھ رہی تھی۔

یا دیکھ رہی تھیں؟ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں

اس سے دور تھا، منہ پھیر کر کھڑا ہوا تھا۔"

"مگر آپ اس سے بول رہے تھے۔ اسے سمجھا رہے تھے کہ جب آپ دونوں مکان کے اندر کھل کر ملتے ہیں تو چھت پر فاصلہ رکھنا چاہیے۔ ورنہ بدنام ہو جائیں گے۔"

"یہ سراسر بہتان ہے۔ وہ میرے گھر میں نہیں آتی ہے۔"

"نماز پڑھنے والوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ میں نے آج ہی دن کے دس بجے اسے آپ کی چھت پر دیکھا تھا پھر وہ سیڑھیاں اتر کر مکان کے اندر گئی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی وہ پورے ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھی۔"

وہ پریشان ہو کر یہ باتیں سن رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا' جب وہ امام صاحب اور سلیمان کے ساتھ دردانہ کے گھر گئے تھے۔ انہوں نے واپس آ کر کنگھی میں الجھے ہوئے بال خود بھی دیکھے تھے۔

پڑوسن کہہ رہی تھی۔ "میں چاہتی تو سارے محلے والوں کو اکٹھا کر لیتی مگر جانتے ہیں' میں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"تم.... تم جیسا سمجھ رہی ہو۔ وہ بات نہیں ہے۔"

"بات جو بھی ہو' کیا دروازے پر ہی ہوتی رہے گی؟ اندر آنے نہیں دیں گے؟"

وہ بری طرح پھنس گئے تھے۔ ایک طرف ہٹ کر بولے۔ "اندر آؤ۔ بس یہیں دروازے کے پیچھے رہ کر میری بات سنو۔ میرے گھر میں کوئی نہیں آتی ہے۔ میں کسی سے نہیں ملتا ہوں۔"

"آپ اقرار نہ کریں۔ اب تو وہ جیسے ہی آئے گی' میں محلے والوں کو یہاں لے آؤں گی۔"

ان پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ محلے والے اسے دیکھیں گے تو پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

وہ ان کی گھبراہٹ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "اگر چاہیں تو میں آپ کی راز دار بن سکتی ہوں۔ گھر کی بات باہر نہیں جائے گی۔"

فی الحال وہ یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "یہ تمہارا احسان ہوگا۔ وہ جو یہاں آتی ہے' اس کے بارے میں سچ بتاؤں گا۔ تب تمہیں یقین ہوگا کہ...."

وہ آگے نہ بول سکے۔ وہ بالکل قریب آ کر گویا ہوئی۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں سننا ہے۔ میں آپ کا راز دل میں چھپا کر رکھوں گی۔ بس آپ مجھے اس کا صلہ دیں۔"

وہ پیچھے ہٹ کر بولے۔ "تت۔ تم چاہتی کیا ہو؟"

"بھولے نہ بنیں۔ اسے خوش کرتے ہیں تو مجھے بھی کریں۔"

وہ غصے سے بھنا گئے۔ "کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"جب آپ کو مولوی ہو کر شرم نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے گی؟ مجھے دیکھیں...! جوان ہوں' خوبصورت ہوں۔ سب مجھے کنواری لڑکی سمجھتے ہیں جبکہ چار بچوں کی ماں ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر بولے۔ "یا اللہ! ہمارا دین ایمان' ہماری تہذیب' شرافت زوال کی طرف جا رہی ہے۔ اپنے بندوں پر رحم فرما میرے مالک...! گمراہوں کو راہ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔"

وہ بولی۔ "مولانا صاحب! یہ دعائیں مسجد میں مانگیے گا۔ چوری پکڑی گئی تو ناٹک کر رہے ہیں۔"

"بس زیادہ نہ بولو۔ تم کیا سمجھتی ہو' میں گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گار بن جاؤں گا؟"

وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ "وہ کنواری چھوکری ہے اس کے ساتھ جیسے کوئی گناہ نہیں ہوتا اور میرے ساتھ ہو جائے گا۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ میرا رب جانتا ہے۔ اپنی والدہ مرحومہ کے بعد میں نے کبھی کسی عورت کو نظر بھر کے نہیں دیکھا۔"

"خدا کو گواہ بنانے سے کیا ہوتا ہے؟ جب ثبوت اور چشم دید گواہوں کے ساتھ پکڑے جائیں گے تو لوگ آپ کی عزت اور پارسائی پر تھوکیں گے۔"

"تمہاری ہوس تم سے درست کہتی ہے کہ مجھے خوامخواہ بدنامی مول نہیں لینی چاہیے۔ تمہاری بات مان لوں گا تو بھید نہیں کھلے گا۔ میری پارسائی کا بھرم رہ جائے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "آپ بہت سمجھدار ہیں۔"

"میری سمجھداری' میرا ایمان کہتا ہے کہ یہ آزمائش کی گھڑی ہے۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اگر حالات میرے موافق نہیں ہیں تو اس میں کوئی قدرتی مصلحت ہوگی۔ میرا اللہ مجھے آزما رہا ہے۔ انشاء اللہ... میں آزمائش پر پورا اتروں گا۔ تمہیں بھی سمجھاتا ہوں' توبہ کرو اور یہاں سے جاؤ۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ انہیں گھورتے ہوئے دانت پیس رہی تھی پھر وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ "ارے او داڑھی رکھ کر مولانا بننے والے! بہت پچھتاؤ گے۔"

اس کے باہر نکلتے ہی انہوں نے دروازے کو بند کر دیا۔ اس سے ٹیک لگا کر سوچنے لگے۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چھت پر اس لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا جاؤں گا اور وہ وہی لڑکی ہے جو میرے گھر میں گھس آتی ہے۔ ابھی یہ کہہ رہی تھی کہ اس نے آج صبح دس بجے اسے میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھت پر دیکھا تھا پھر وہ سیڑھیاں اتر کر یہاں اندر آئی تھی۔

یا خدا! جس نے مجھے تجسس میں مبتلا کر رکھا تھا' میں اسی کے ساتھ چھت پر باتیں کر رہا تھا اور اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔ اس نے اپنا نام عینی بتایا تھا۔ یہ پڑوسن تو اب رائی کا پہاڑ بنا دے گی۔ میں کیا کروں؟ سیدھی سی بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ پیچھے والے مکان میں جاؤں اور عینی سے کہہ دوں کہ پڑوسن نے اسے میرے گھر میں جاتے آتے دیکھ لیا ہے۔ آئندہ میری چھت پر بھی قدم نہ رکھے ورنہ میں مفت میں بدنام ہو جاؤں گا۔

لیکن میں یہ بات ایک تنہا جوان لڑکی سے کیسے کہوں گا؟ اس گھر میں اور بھی افراد ہوں گے' وہ بھی نہیں مانیں گے کہ ان کی لڑکی چھپ کر میرے گھر میں آتی ہے۔ یوں ایک لڑکی کو بدنام کرنے والی بات کوئی نہیں مانے گا۔"

ابھی اس بات کی ذرا تسلی تھی کہ جب تک عینی ان کے گھر میں نہیں آئے گی' تب تک پڑوسن کھلے ثبوت کے ساتھ انہیں بدنام نہیں کر سکے گی۔

اب یہی کوشش کرنی تھی کہ عینی ان کی چھت پر کبھی قدم نہ رکھے۔ کسی نہ کسی طرح اس سے ملنا اور اسے سمجھانا ضروری ہو گیا تھا۔

وہ بے چینی سے ٹہلنے لگے۔ سوچنے لگے۔ "تنہا عینی اور اس کے گھر والوں کے پاس جا کر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ امام صاحب کو ساتھ لے جانا چاہیے۔"

وہ فوراً مکان سے باہر آ گئے۔ اچھو پان والے نے اپنی دکان سے انہیں دیکھا پھر پوچھا۔ "کہیں جا رہے ہیں؟"

وہ بولے۔ "ہاں۔ پیش امام صاحب سے ملنے جا رہا ہوں۔"

"آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے دکان کے سامنے آ کر کہا۔ "ہاں۔ بولو؟"

وہ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ "یہ آپ کی پڑوسن بڑی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے۔ آپ کو بدنام کر رہی ہے۔"

انہوں نے سر گھما کر پڑوسن کے دروازے کو دیکھا۔ اچھو نے کہا۔ "اُدھر گلی کے نکڑ پر دیکھیں! وہاں تین عورتوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ ضرور آپ کے خلاف بول رہی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر اس طرف دیکھنے لگے۔ ان کے گھر سے نامراد ہو کر جانے والی ہاتھ نچا نچا کر عورتوں سے کچھ بول رہی تھی۔ انہوں نے پریشانی سے کہا۔ "یا خدا! ہم سب کو جھوٹوں سے اور شر پھیلانے والوں سے محفوظ رکھ۔ تو ہی عزت دیتا ہے۔ تو ہی ذلت دیتا ہے۔ ہمارے لیے خیر کثیر فرما۔"

اچھو نے کہا۔ "آمین..."

وہ زیرِ لب ایک آیت پڑھتے ہوئے امام صاحب کے کوارٹر میں آئے۔ وہ مولانا صاحب کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرانی سے بولے۔ "آپ اس وقت... خیریت تو ہے؟"

وہ پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے بولے۔ "ابھی تک تو خیریت ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو ذرا میرے ساتھ چلیں۔"

"زحمت کیسی...؟ ابھی چلتا ہوں۔"

وہ گھر کے اندر گئے پھر دستار پہن کر آ گئے۔ مولانا نے اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے انہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ امام صاحب نے حیرانی سے کہا۔ "وہ پچھلے مکان میں رہتی ہے اور چھت کے راستے آپ کے مکان میں آ جاتی ہے۔ یہ تو سراسر بدنام کرنے والی بات ہے۔"

مولانا نے کہا۔ "ہم دین ایمان کی باتیں سمجھاتے ہیں۔ نیک ہدایات کے پھول پیش کرتے ہیں پھر ہمیں کیوں پتھر مارے جاتے ہیں؟"

"اور مولانا صاحب آپ کی شخصیت تو ایسی ہے کہ سب ہی آپ کو انسان نما فرشتہ کہتے ہیں۔ یہ بیٹھے بٹھائے دو عورتیں آپ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ خود ہی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا' وہ لڑکی چھپ کر آپ کے گھر میں کیوں آتی ہے اور وہ دوسری پڑوسن آپ کے خلاف کیوں ہو گئی ہے؟ آخر چاہتی کیا ہے آپ سے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ کھل کر کہہ نہیں سکتا۔ وہ تہذیب اور شرافت کے خلاف اپنی خواہش پوری کرنا چاہتی تھی۔"

وہ کانوں کو چھو کر بولے۔ "لاحول ولا قوۃ... وہ تو کئی بچوں کی ماں ہے۔"

"ہاں۔ چار بچے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے' ہوس غالب آتی ہے تو ایک عورت' ماں اور ممتا کا تقدس بھی بھول جاتی ہے؟ یا اللہ! ہم سب پر رحم فرما...!"

امام صاحب آمین کہتے ہوئے بولے۔ "ہم پہلے اس لڑکی کو سمجھائیں گے' وہ آپ کی چھت پر نہیں آئے گی۔ پڑوسن اسے نہ دیکھ سکے گی' نہ آپ کو بدنام کر سکے گی۔"

وہ دونوں پچھلے مکان کے دروازے پر آئے تو وہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ امام صاحب نے کہا۔ "یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے۔"

"ظہر سے پہلے وہ لڑکی اس مکان میں تھی۔ اچانک یہ لوگ کہاں جا سکتے ہیں؟"

انہوں نے دوسرے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ وہاں سے ایک عمر خاتون نے نکل کر انہیں سلام کیا۔ امام صاحب نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ "یہ آپ کے

پڑوسی کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔ "نسیمہ کی زچگی کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے اسپتال لے گئے ہیں۔"

"کیا گھر کے تمام لوگ گئے ہیں؟"

وہ بولی۔ "یہاں تو صرف میاں بیوی رہتے ہیں۔ اس کا خاوند اسے اسپتال لے گیا ہے۔"

مولانا اور امام صاحب نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مولانا نے پوچھا۔ "یہاں اور کوئی لڑکی نہیں رہتی؟"

"ہاں۔ نسیمہ کی ایک سہیلی یہاں رہنے آئی ہوئی ہے۔ کہہ رہی تھی' سوتیلے باپ سے جھگڑ کر آئی ہے۔"

"کیا وہ اپنے گھر واپس چلی گئی ہے؟"

"نہیں۔ وہ بھی نسیمہ کے ساتھ اسپتال گئی ہے۔"

عصر کی اذان گونج رہی تھی۔ وہ اس خاتون سے رخصت ہو کر مسجد کی طرف جانے لگے۔ مولانا نے کہا۔ "وہ سہیلی کے ساتھ اسپتال گئی ہے۔ شاید آج کی رات وہیں گزارے گی۔"

"پھر تو اطمینان ہے۔ وہ صبح تک چھت پر نہیں آئے گی۔ نہ وہ پڑوسن دیکھے گی' نہ آپ کو بدنام کرے گی۔"

مولانا نے کہا' "پھر بھی مجھے محتاط رہنا ہو گا۔ میں آج رات قادر جان کو اپنے ساتھ رکھوں گا اس طرح مجھ پر کسی سے تنہائی میں ملنے کا الزام نہیں آئے گا۔"

اکثر ایسا ہوتا ہے' جو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے' انہیں طرح طرح سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اگر مولانا کے پاس کوئی عورت کسی ضرورت سے آتی تو وہ کہتے تھے' میں کسی نامحرم سے بات نہیں کرتے۔ گھر کے کسی مرد کو ساتھ لاؤ۔

وہ اپنے آس پاس سے گزرنے والی عورتوں کو بھی نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا سر جھکا رہتا تھا۔ اس کے باوجود ایک طرف عینی اور دوسری طرف پڑوسن ان کے بدنامی کے راستے ہموار کر رہی تھیں۔

کیوں خوامخواہ ایسا کیا جاتا ہے؟ اگر کیا جاتا ہے تو ایلیا کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اسے بھی ثبوت اور گواہوں کی طرف سے گناہ گار ٹھہرایا گیا تھا جبکہ وہ بے گناہ اور بے داغ تھی۔

پھوپی نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ مولانا کے خلاف سازش نہیں ہو رہی تھی۔ عینی شوخ' چنچل اور کھلنڈرے مزاج کی لڑکی تھی۔ اس نے عرفان سے کہا تھا' مرد بڑے ہرجائی ہوتے ہیں۔ ایک سے دل بھر جائے تو دوسری پر نیت خراب کرتے ہیں۔

عرفان نے کہا۔ "سب ایسے نہیں ہوتے۔ میں بھی ایسا نہیں ہوں۔"

وہ بولی۔ "یہ تو شادی کے بعد پتا چلتا ہے کہ میاں کیسے رنگ رنگیلے ہیں؟ میں نے آج تک کوئی شریف مرد نہیں دیکھا۔"

"صرف دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی کو پرکھنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ کیا تم نے مولانا فضل کریم کو نہیں دیکھا؟ عورتوں کے سامنے سر جھکا لیتے ہیں۔ کبھی نظریں ملا کر بات نہیں کرتے۔"

"ایسے مولانا بگلا بھگت ہوتے ہیں۔ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ... اگر میرے جیسی کوئی لڑکی تنہائی میں ملے تو رال ٹپکنے لگے گی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ کوئی حسینۂ عالم بھی آ جائے تو وہ بھی اپنی کافرانہ اداؤں سے انہیں گمراہ نہیں کر سکے گی۔"

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "دیکھو! عورت کو کبھی چیلنج نہ کرو۔ یہ بادشاہ کے سر سے تاج اور سپاہی کے ہاتھ سے ہتھیار گرا سکتی ہے۔ میں چاہوں تو چٹکی بجا کر انہیں اپنا دیوانہ بنا سکتی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "میں تمہاری خوش فہمی ختم کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں اپنا دیوانہ بنا کر دکھاؤ۔"

"شرط لگاؤ اگر کامیاب ہو گئی تو کیا انعام دو گے؟"

"میں ایک مہینے کی پوری تنخواہ تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا اور اگر ناکام ہو گئیں تو...؟"

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں اپنی پوری زندگی تمہارے نام کر رہی ہوں۔ ہاں۔ اگر مولانا صاحب واقعی فرشتہ ثابت ہوں گے تو یہ طے کر لو کہ ہم ان سے ہی اپنا نکاح پڑھوائیں گے۔"

"یہ تو میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔ انشاء اللہ وہی ہمیں رشتۂ ازدواج میں منسلک کریں گے۔"

یوں دیکھا جائے تو عینی ان کے خلاف سازش نہیں کر رہی تھی۔ اپنے ہونے والے جیون ساتھی کو اپنے اعتماد میں لے کر ایک تماشا کر رہی تھی اور ان کی شرافت اور نیک نیتی کو بھی آزما رہی تھی۔

اسی طرح وہ پڑوسن بھی اپنی دانست میں ان پر جھوٹا الزام لگانے والی نہیں تھی۔ جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اسی کا اشتہار لگانے والی تھی۔

مولانا نے اسے دھتکار دیا نہیں تھا۔ دین و ایمان کے حوالے سے اسے سمجھایا تھا۔ گناہ سے باز رکھنا چاہا تھا۔ لیکن اسے یہ نصیحتیں زہر لگی تھیں۔ اس لیے وہ مولانا کو ذلیل کرنے گئی تھی۔

جو ہو رہا تھا' اس کے پیشِ نظر یہ حقیقت سامنے آ رہی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ کوئی کسی کا برا چاہے یا نہ چاہے' اس کے باوجود بھی برائی آسکتی ہے۔

انیلا نے بھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا مگر اس پر برائی تھوپ دی گئی تھی۔ ابھی مولانا ایک بدنام ہونے والی لڑکی کے حوالے سے اپنے حالات کا جائزہ نہیں لے رہے تھے۔ آگے چل کر یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ وہ بھی ویسے ہی برے حالات سے گزر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا' اسی معبود کی رضا سے ہو رہا تھا۔ لیکن ایک نیک اور صالح کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا تھا؟

ایسی بات نہیں تھی کہ مولانا سے جانے انجانے میں کوئی غلطی ہوئی تھی' جس کی سزا انہیں ملنے والی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔

ایسے وقت میں ایمان ڈگمگائے تو بندہ سوچتا ہے کہ اوپر والے نے دیکھنا' سننا اور دعاؤں کو قبول کرنا چھوڑ دیا ہے۔ خدا ہمیں بھول گیا ہے ..... جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔

انتہائی مایوسی کے باوجود ہی انسان کی آخری دوا ہوتی ہے۔ اور دعا تب قبول ہوتی ہے' جب نماز قائم کی جاتی ہے۔

یہ مجرب نسخہ کوئی بھی آزما لے۔ نماز پڑھے اور اپنی ذات کو دوسروں کی بہتری کے لیے وقف کر دے۔ ان دو باتوں پر عمل کرنے والے کے دن ضرور پھرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ نماز پڑھتے ہی اور نیکیاں کرتے ہی دن پھر جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں ..... خدا سے دکانداری نہیں ہوتی کہ ہم جتنی رقم دے رہے ہیں' اتنے کا مال بھی ہمیں دو۔

خدا سب کچھ ہے۔ دکاندار نہیں ہے۔ وہ فوراً صلہ نہیں دیتا۔ اس کی حکمت وہی جانتا ہے۔ کبھی برسوں بعد خوب صلہ دیتا ہے' کبھی پلک جھپکتے ہی وارے نیارے کر دیتا ہے۔

اس روز قادر جان نے اوور ٹائم ڈیوٹی کی۔ عشا کی نماز کے وقت مسجد میں مولانا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نماز کے بعد اسے اپنے موجودہ حالات بتائے۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے آج رات آپ کو تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ میں ابھی گھر والوں سے کہہ کر آتا ہوں۔ میری موجودگی میں نہ عینی آسکے گی نہ پڑوسن بدنام کر سکے گی۔''

وہ اپنے طور پر بدنامی کی راہیں مسدود کر رہے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ قدرت کی منشا کے مطابق اگر ہونی ہے تو ہو کر رہے گی۔ اس کے باوجود انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کی طرف برائی نہ آئے اور قدرت کی منشا کے مطابق یعنی عشا کی نماز کے وقت ہی اسپتال سے واپس آگئی تھی۔ اس کی سہیلی نسیمہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اسے اپنے گھر سے ضرورت کا کچھ سامان منگوانا تھا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔

''آصف! آپ کو نائٹ ڈیوٹی کے لیے جانا ہے۔ آپ عینی کے ساتھ گھر جائیں۔ یہ ضرورت کی چیزیں وہاں سے لے آئے گی۔''

عینی ایک رکشے میں آصف کے ساتھ گھر آئی۔ اسے نسیمہ کی ضروری چیزیں لے کر اسپتال واپس جانا تھا لیکن نہ جا سکی۔

اس نے عرفان سے کہا تھا۔ ''میرے جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی مولانا کو تنہائی میں ملے گی تو رال ٹپکنے لگے گی۔''

اس کی یہ بات آصف پر صادق آئی۔ اس نے گھر میں آتے ہی دروازے کو اندر سے بند کر دیا پھر عینی سے کہا۔ ''تم بہت حسین ہو۔ بہت ہی پرکشش ہو۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تم نے کبھی نسیمہ کے سامنے میری تعریف نہیں کی۔''

''وہ سنتی تو حسد کرنے لگتی۔ اس گھر میں تمہیں رہنے نہ دیتی۔''

اس نے یہ کہتے ہوئے اس کے بازو کو تھام لیا۔ وہ خود کو ایک جھٹکے سے چھڑا کر دور ہوتے ہوئے بولی۔ ''مرد اپنی حیوانیت سے باز نہیں آتا۔ بہتر ہے کہ مجھ سے فاصلہ رکھو۔''

''پلیز عینی! مجھے حیوان نہ کہو۔ تم میرے دل و دماغ میں سما گئی ہو۔ میں تمہارے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔''

''یعنی مجھے حاصل نہ کر سکے تو پاگل ہو جاؤ گے اور میں بھی تمہیں خوش کیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکوں گی۔''

''پلیز۔ میری محبت کو اور شدتِ طلب کو سمجھو۔ مجھ سے دور نہ جاؤ۔''

''دور کہاں جاؤں گی؟ باہر نکلنے کا راستہ بند ہے۔ تمہاری بات ماننا ہی پڑے گی۔ میں ابھی واش روم سے آتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گئی۔ اسے پلٹ کر بڑی معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرائی پھر دروازے کو بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

وہ چونک گیا۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ اسے کھولنا چاہا تو وہ باہر سے بند ہو چکا تھا۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''انیلا کو دعائیں دے رہی ہوں۔ اس نے بیان دیا تھا کہ اس نے نعیم سے بچنے کے لیے خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ابھی اچانک ہی اس کی یہ بات یاد آگئی۔ میں مانتی ہوں' واقعی اس نے یہی کیا ہوگا۔''

اس نے دروازے کو ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''فضول بکواس نہ کرو۔ دروازہ کھولو ورنہ میں اسے توڑ کر بھی آجاؤں گا۔''

''میرے بھائی نے بھی انیلا سے یہی کہا ہوگا۔ خود پر بیت رہی ہے تو وہ مجھے سچی لگ رہی ہے۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ یہاں سے نکل پاؤ گی؟ یاد رکھو! تم میرے گھر میں ہو۔ اپنے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہو۔''

''ہاں۔ یہاں میں چیخنے چلانے کی حماقت کروں گی تو بدنام ہو جاؤں گی۔ مدد کو آنے والے یہی کہیں گے کہ تم میرے گھر نہیں گئے ہو۔ انیلا کی طرح میں تمہارے گھر آئی ہوں۔''

''تو پھر عقل سے کام لو اور دروازہ کھولو۔''

''کھولتی ہوں۔ ذرا صبر کرو۔''

وہ وہاں سے چلتے ہوئے موبائل فون نکال کر نمبر پنچ کرنے لگی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آگئی۔ رابطہ ہونے پر عرفان کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے عینی! ابھی میں کال کرنے والا تھا۔ نسیمہ کیسی ہے؟''

''ہاں۔ وہ خیریت سے ہے۔ بچہ بھی ٹھیک ہے مگر بچے کا باپ بگڑ گیا ہے۔''

''کیا مطلب.....؟''

وہ اسے مطلب سمجھانے لگی۔ عرفان نے تمام واقعہ سننے کے بعد کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آصف تم پر نیت خراب کرے گا۔''

''میں نہ کہتی تھی کہ مرد کسی بھی عورت کو تنہائی میں پا کر انسان سے حیوان بن جاتا ہے۔''

''میں آرہا ہوں لیکن میرے آنے تک آصف خود نیک نام رہنے کے لیے تم پر کسی اور طرح کا الزام لگا کر بدنام کر سکتا ہے۔ تم چھت پر چلی جاؤ۔''

''میں اوپر ہی ہوں۔''

''مولانا صاحب کے پاس جاؤ۔ میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔''

''رات کا وقت ہے۔ کیا وہاں جانا مناسب ہوگا؟''

''تم وہاں جا کر انہیں بتاؤ کہ اب تک ان کے گھر میں جا کر کیسی شرارتیں کرتی رہی ہو؟ میں پہنچ رہا ہوں۔ ان سے گزارش کروں گا' ہمارا نکاح پڑھا دیں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''پھر تو میں ابھی جاتی ہوں۔ جلدی آنے کی کوشش کرو۔''

یہ دنیا قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اوپر والا ہر انسان کے ساتھ ایک کہانی بناتا ہے۔ مولانا فضل کریم' انیلا' دردانہ' عینی اور پڑوسن کے الگ الگ معاملات تھے لیکن وہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایک کہانی بنا رہے تھے۔

مشیتِ ایزدی کے مطابق دردانہ مولانا صاحب کے دروازے پر آئی تو وہ گھر میں نہیں تھے۔ عشا کی نماز پڑھنے مسجد گئے ہوئے تھے۔ وہ وہیں انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں پہنچے تو اسے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔ ''تم.....؟ میرے دروازے پر کیا کر رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟''

سامنے اچھو کی دکان پر دو آدمی کھڑے تھے۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت رات کو بھی ملنے آئی تھی۔ یہ بات دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔

دردانہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میرا ایک مسئلہ ہے۔ آپ دروازہ کھولیں۔ میں اندر چل کر بات کروں گی۔''

انہوں نے دروازے کو پوری طرح کھول دیا۔ وہ اندر چلی آئی۔ وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولے۔ ''اندر کمرے میں چلو۔ یہ دروازہ پوری طرح کھلا رہے گا۔''

وہ دونوں کمرے میں آگئے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میری بیٹی مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے چلی گئی ہے۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''کہاں گئی ہے؟''

''یہیں آپ کے پیچھے والے مکان میں اپنی سہیلی کے پاس ہے۔''

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا نام ہے اس کا.....؟''

''نور العین ..... ہم اسے عینی کہتے ہیں۔''

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''وہ تمہاری بیٹی ہے؟''

''کیا آپ اسے جانتے ہیں؟''

''ہاں۔ تم بولو! مسئلہ کیا ہے؟ میرے پاس کیوں آئی ہو؟''

میں ایک اچھا کمانے والے، شریف آدمی سے اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں مگر عرفان نامی ایک لڑکا اسے بہکا رہا ہے۔''

''میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''وہ ..... بات یہ ہے کہ شام کو اس نے فون پر کہا ہے کل کسی وقت وہ عرفان سے نکاح پڑھوانے والی ہے۔''

''اگر لڑکا لڑکی راضی ہیں تو تم بھی راضی ہو جاؤ۔''

''کیسے ہو جاؤں؟ وہ میری بیٹی کو بہکا رہا ہے اور میری بیٹی مجھ سے ایک لاکھ روپے مانگ رہی ہے۔ میں اسے لڑکے پر رقم لٹانے نہیں دوں گی۔''

''مگر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''اس نے فون پر بتایا ہے کہ وہ کل آپ کے پاس آئے گی۔''

انہوں نے بے اختیار زینے کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''وہ میرے پاس کیوں آئے گی؟''

''عرفان کے ساتھ نکاح پڑھوانا چاہتی ہے۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ اطمینان ہوا کہ چھت کے راستے آنے والی سے تو نجات ملے گی' ان کی نیک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نامی قائم رہے گی۔ انہوں نے کہا۔ ''وہ دونوں بالغ ہیں۔ اپنے ساتھ وکیل اور گواہ لائیں گے تو میں ان کا نکاح پڑھا دوں گا۔''

وہ پہلو بدل کر بولی ''ہرگز نہیں۔ میں آپ سے یہی کہنے آئی ہوں کہ میری مرضی کے بغیر آپ نکاح نہیں پڑھائیں گے۔ وہ یہاں آئیں تو ان کے لیے دروازہ بھی نہ کھولیں۔''

اندر ایک کمرے سے عینی کی آواز سنائی دی۔ ''دروازہ بند ہو میں تب بھی چلی آتی ہوں۔ آپ مجھے کیسے روکیں گی؟''

مولانا ایک دم سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ دردانہ کے دماغ کو بھی جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر ان کے سامنے آ گئی۔ وہ عرفان کے مشورے کے مطابق مولانا کی پناہ میں آئی تھی۔

دردانہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے آ گئیں؟''

''جیسے بھی آ گئی۔ نکاح تو مولانا صاحب ضرور پڑھائیں گے۔ انکار کریں گے تو سب سے کہہ دوں گی کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں اور یہاں چھپ کر رہتی ہوں۔''

مولانا نے بوکھلا کر پوچھا۔ ''یہ کیا بول رہی ہو؟ کیا مجھے بدنام کرو گی؟''

وہ بولی۔ ''میرا نکاح عرفان سے پڑھائیں گے تو نیک نام رہیں گے۔ عرفان گواہی دے گا کہ میں بے داغ ہوں اور آپ فرشتہ ہیں، یہ سمجھ نہیں سکتے کہ ہماری نظروں میں کتنے عظیم ہیں؟''

''عظیم تو صرف اللہ ہے۔ اس معبود نے مجھے جو عزت دی ہے' اس کا خیال کرو اور ابھی اپنی ماں کے ساتھ جاؤ۔''

''عرفان یہاں آ رہا ہے۔ آپ ابھی اس سے میرا نکاح پڑھائیں۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گی۔ امی کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی۔''

اس بات پر ماں بیٹی میں 'تو تو میں میں' ہونے لگی۔ ماں نکاح کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اگر وہ دردانہ کی بات مانتے تو عینی ماں کو دھمکی دے چکی تھی کہ اعلانیہ خود کو گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کہے گی اور یہ بھی کہے گی کہ بھاگنے کے بعد مولانا صاحب کے گھر میں تھی۔

وہ بے چارے نہ کسی کے لینے میں تھے' نہ دینے میں تھے۔ نہ ہی ان کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچا تھا کہ وہ سب اپنے اپنے مفادات کی خاطر ان کے لیے عذاب جان بن رہے تھے۔

دوسری طرف بھی حالات بگڑ چکے تھے۔ پڑوسن نے عینی کو چھت کے راستے ان کے گھر میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ محلے کے کئی لوگوں کے کانوں میں یہ بات پھونک چکی تھی۔ دعویٰ کیا تھا کہ جلد ہی بہروپیے مولانا کا اصلی چہرہ دکھائے گی۔

اور وہ عورتوں اور مردوں کو اکٹھا کر کے وہاں پہنچ گئی تھی۔ پہلے دو آدمیوں نے کہا۔ ''ہم اچھو کی دکان کے سامنے تھے۔ مولانا صاحب دروازہ کھول کر دردانہ کے ساتھ اندر آئے تھے پھر یہ جوان لڑکی کہاں سے آئی ہے؟''

عینی اپنے چچا کے پاس دوسرے علاقے میں رہتی تھی۔ اس محلے کے لوگ اسے دردانہ کی بیٹی کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔ ایک عورت نے پوچھا۔ ''یہ ہے کون...؟ کہاں سے آئی ہے؟''

دردانہ نے تقریباً دو ہفتے پہلے انیلا کو بدنام کیا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ اپنی بیٹی کی بات گھر سے باہر نہ جائے۔ اب وہ بیٹی انیلا کی طرح پکڑی گئی۔ محلے کے لوگ اس کا محاسبہ کرنے پہنچ گئے تھے۔

دردانہ اپنے منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ ایک عورت نے کہا۔ ''یہ دردانہ کی بیٹی عینی ہے۔''

''کیا...؟'' سب ہی نے چونک کر دردانہ کو دیکھا۔ عورتوں نے حیرانی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔ ''ہائے دردانہ! یہ تمہاری بیٹی ہے۔''

وہ ان عورتوں سے نظریں چرا رہی تھی' جنہوں نے انیلا پر کیچڑ اچھالنے کے لیے اس کا ساتھ دیا تھا۔

اب وہی عورتیں کہہ رہی تھیں۔ ''پہلے بھتیجی نے گل کھلایا' اب بیٹی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔''

ایک عورت نے کہا۔ ''بیچ خاندانوں میں ایسے ہی تماشے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں بھاگ جاتی ہیں اور مائیں بیوہ ہوتے ہی دوسری شادی کر لیتی ہیں۔''

دردانہ غصے میں انہیں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر موقع کہاں مل رہا تھا۔ سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ''پتا نہیں' مولانا صاحب نے اسے کب سے یہاں چھپا کر رکھا ہے؟''

پڑوسن نے کہا۔ ''میری گناہ گار آنکھوں نے اس لڑکی کو آج صبح اس گھر میں گھستے دیکھا تھا۔ یہ چھت کے راستے یہاں آئی ہے۔''

ایک شخص نے پوچھا۔ ''کیوں مولانا صاحب! کب سے رنگ رلیاں منا رہے ہیں؟''

مولانا پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ عینی نے چیخ کر کہا۔ ''بکواس مت کرو۔ مولانا صاحب فرشتہ ہیں۔ اپنی

طرح دوسروں کو بدکار نہ سمجھو۔''

ایک اور شخص نے کہا۔ ''بدکار تو وہ ہوتے ہیں' جو کھلے ثبوت کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔''

ایک عورت نے پوچھا۔ ''تم چھت کے راستے چھپ کر کیوں آتی ہو؟''

دوسری نے کہا۔ ''کیا یہاں مولانا صاحب کے ساتھ نمازیں پڑھنے آتی ہو؟''

عورتیں اور مرد ایک کے بعد ایک بولتے جا رہے تھے۔ عینی کو کچھ بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا اور مولانا تو بولنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ ایسا شرمناک الزام تھا کہ وہ زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ ان کا سر گھوم رہا تھا۔

ایک شخص نے کہا۔ ''یہ تو سب ہی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ماں باہر سے دروازہ کھلوا کر آئی ہے اور بیٹی پہلے سے گھر کے اندر موجود تھی۔''

ایک بوڑھے پوچھا۔ ''مولانا صاحب! چپ کیوں ہیں؟ کچھ تو فرمائیں؟ اسے کتنے دنوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے؟ جب آپ جیسے دیندار اور معزز حضرات ایسا کریں گے تو معاشرے میں بہتری کیسے آئے گی؟''

وہ زیر لب کلام پاک کی آیتیں پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کلمہ پڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں اللہ رسول ﷺ کا نام لے کر' کلمہ پڑھ کر سچ بولوں گا' تب بھی جھوٹا کہلاؤں گا۔''

انہوں نے سر جھکا کر کہا۔ ''ایسے وقت انیلا کی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اس نے کہا تھا' کبھی کبھی آنکھوں سے دیکھی ہوئی سچائی بھی غلط ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی اسی طرح بدنام کیا گیا تھا جبکہ وہ زلیخا کی تنہائی میں رہ کر اس کی ہوس اور ترغیب کے باوجود پارسا رہے تھے۔''

ایک عورت نے ناگواری سے سر جھٹک کر کہا۔ ''جسے دیکھو گناہ کرنے کے بعد پیغمبروں کے قصے سنانے لگتا ہے۔ ارے وہ سچے دیندار بندے تھے۔ اللہ کے پیغمبر تھے۔ اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کا حوالہ کیوں دیا جا رہا ہے؟''

وہ ایک لمبی سانس کھینچتے ہوئے بولے۔ ''یہ سچ ہے' ہم کسی کو سمجھا نہیں سکتے مگر کسی روز اوپر والا سمجھا دیتا ہے۔ آج انیلا کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ خدا کرے' میری بات کل آپ لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔''

ایسے وقت قادر جان وہاں آیا۔ اچھو نے اسے بتایا کہ مولانا صاحب کے گھر سے دردانہ کی جوان بیٹی برآمد ہوئی ہے۔ سب پوچھ رہے ہیں کہ گناہ کا یہ کھیل کب سے کھیلا جا رہا ہے؟

قادر جان غصے سے گرجتے ہوئے اندر آیا۔ ''خبردار!

ذوق سخن

شاہ جہاں اور ممتاز محل کی بیٹی جہاں آرا برقعہ اوڑھے ہاتھی پر سوار باغ کی سیر کر رہی تھی۔ اس عہد کا قادرالکلام شاعر میر صیدی طہرانی باغ کے ایک گوشے میں چھپا بیٹھا تھا۔ شہزادی قریب سے گزری تو اس نے برجستہ غزل کا مطلع پڑھا جس میں برقعہ پوش شہزادی کے حسن کی تعریف تھی۔ جہاں آرا نے شاعر کو اپنے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب وہ سامنے آیا تو شہزادی نے اس سے یہ مطلع بار بار پڑھوایا۔ اس کے بعد اسے پانچ ہزار روپے انعام دے کر حکم دیا کہ شہر سے باہر نکل جائے۔ جہاں آرا کو

مطلع تو پسند آیا تھا

لیکن شاعر کی گستاخی

پسند نہ آئی

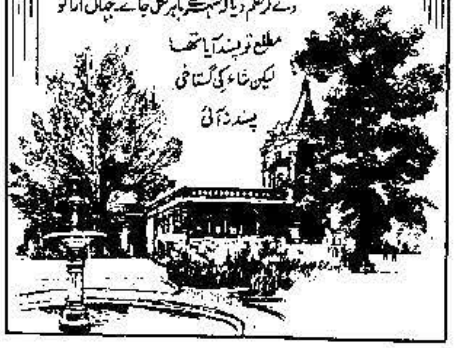

اگر کسی نے مولانا صاحب پر شرمناک تہمت لگائی تو میں اسے چیر پھاڑ کر رکھ دوں گا۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ قدآور باڈی بلڈر تھا۔ غصے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔ کسی بھی مخالف کی اچھی خاصی پٹائی کر دیتا تھا۔ صرف مولانا سے محبت اور عقیدت کی وجہ سے سب کے سامنے سر جھکائے رہتا تھا۔ بدمعاشی چھوڑ دی تھی۔

انہوں نے کہا۔ ''قادر جان! غصہ نہ دکھاؤ۔ کسی کو دھمکی نہ دو۔ دماغ ٹھنڈا رکھو۔ اللہ پر بھروسا کرو۔ وہ جانتا ہے' میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔''

عینی نے کہا'' اور میں بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ کہتی ہوں' میں نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ اس چار دیواری میں پہلی بار مولانا صاحب سے سامنا کر رہی ہوں۔''

انہوں نے کہا۔ ''کل اتوار ہے۔ چھٹی کا دن ہے۔ آپ حضرات کے ساتھ فجر کی نماز پڑھوں گا اور خدا کے گھر میں کلام پاک کو سینے سے لگا کر سچ بولوں گا۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''مسجد میں کوئی گناہ گار قدم نہیں رکھے گا۔ اگر رکھے گا تو ہم مسجد میں نہیں جائیں گے۔''

وہاں کھڑے ہوئے کئی نمازیوں نے کہا۔ ''ہم مسجد میں کیوں نہیں جائیں گے؟ ضرور جائیں گے لیکن مولانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب کو وہاں قدم نہیں رکھنے دیں گے۔"

قادر جان نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کون مائی کا لعل نہیں مسجد میں جانے سے روکے گا؟ جس نے ماں کا دودھ پیا ہے وہ سامنے آئے۔"

مولانا نے کہا۔ "قادر جان! کسی کو نہ للکارو، طاقت کا مظاہرہ نہ کرو۔"

"کیوں نہ کروں؟ یہی لوگ تو آپ کی شرافت کی قسمیں کھاتے تھے۔ کیسے طوطا چشم ہیں؟ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں پھیر رہے ہیں؟ آپ کا ایک ذرا سا لحاظ نہیں کر رہے۔"

ایک شخص نے کہا۔ "کوئی بندہ کتنا ہی عالم فاضل اور عبادت گزار کیوں نہ ہو اگر اس سے گناہ سرزد ہوگا تو خدا اسے معاف نہیں کرے گا۔ بندے بھی اس محاسبہ کریں گے۔"

مولانا نے قادر جان سے کہا۔ "تم میرے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولتے ہو۔ میری ہر بات مان لیتے ہو اب بھی خاموش رہو۔"

اس نے ان کے حکم پر سر جھکا دیا۔ انہوں نے کہا۔ "ان سب کو محاسبہ کرنے کا حق ہے۔ حالات میرے موافق نہیں ہیں۔ ایک جوان لڑکی میرے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔ کوئی اندھا بھی یہی کہے گا کہ میں گناہ گار ہوں جبکہ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے۔"

وہ قادر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "مجھے صبر و تحمل سے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ میرا ایمان ہے میری بہتری کے لیے اللہ مجھے آزما رہا ہے۔ میں جب تک اپنی بے گناہی ثابت نہیں کروں گا مسجد میں نہیں جاؤں گا۔"

ایسے وقت پیش امام صاحب دوڑے دوڑے آئے۔ انہوں نے کہا۔ "مجھے ابھی معلوم ہوا کہ آپ کی ذات پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے۔ میں مرتے دم تک یقین نہیں کروں گا کہ آپ بھول سے بھی ایسی شرمناک غلطی کریں گے۔ کون ہے وہ لڑکی...؟"

عینی نے کہا۔ "آپ حضرات اسے میری شوخی اور شرارت کہہ لیں یا میری حماقت سمجھ لیں۔ میں مولانا صاحب کی موجودگی میں چھپ کر آئی تھی۔ طرح طرح سے شرارت کر کے چھت کے راستے بھاگ جاتی تھی۔ یہ پریشان ہو کر مجھے ڈھونڈتے رہتے تھے۔ مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔

مگر افسوس! میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شرارت اتنی مہنگی پڑے گی۔

میں جانتی ہوں۔ یہاں کوئی یقین نہیں کرے گا کہ محض میری حماقت سے ایک فرشتہ صفت انسان بدنام ہو رہا ہے۔

میں اپنے باپ کے لہو اور ماں کے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں یہ گناہوں سے پاک ہیں۔ روشنی میں کھڑے ہوں گے تو میں ان کے سائے میں نماز پڑھوں گی۔ اس سے زیادہ ان کی پاکیزگی اور پارسائی کا اور کیا ثبوت دوں؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یہ میری وجہ سے بدنام ہو رہے ہیں۔"

ایک عورت نے نم تھ نچا کر کہا۔ "مولانا صاحب کی آڑ میں اپنی پارسائی جتانے کے لیے باپ کے لہو اور ماں کے دودھ کی قسمیں کھا رہی ہو۔"

وہ فخر سے بولی۔ "میں بدنام ہو کر بھی نیک نام رہوں گی۔ مجھے نام دینے والا مجھے تحفظ دینے والا میرے سر پر حیا کا آنچل رکھنے والا میرا منگیتر موجود ہے۔ وہ ابھی مجھ سے یہاں نکاح پڑھوائے گا۔"

کسی نے کہا۔ "جب ایک گناہ گار کو مسجد میں جانے کی اجازت نہیں تو اسے نکاح پڑھانے کا بھی حق نہیں ہے۔"

عرفان وہاں آ گیا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ میں کھڑا ان سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "عینی...!"

اس نے خوش ہو کر اسے دیکھا پھر لوگوں سے کہا۔ "یہ ہے میرا منگیتر... ان سب کے سامنے بولو عرفان! کیا میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچا سکتی ہوں؟"

وہ بولا۔ "ہرگز نہیں۔ تم یہاں آ کر جتنی شرارتیں کرتی رہی ہو وہ سب میرے علم میں ہیں۔ ابھی میں نے ہی تمہیں فون پر مولانا صاحب کے پاس جانے کی اجازت دی تھی لیکن چھت کے راستے آنے جانے کے باعث یہ لوگ تم پر شبہ کر رہے ہیں اور ہم مجبور ہیں ان کا شبہ دور نہیں کر سکیں گے۔"

پھر اس نے مولانا صاحب کو دیکھتے ہوئے کہا "اور آپ لوگ برسوں سے ان کی شرافت دیکھتے آ رہے ہیں۔ آج یہ اچانک گناہ گار کیسے بن گئے؟ یہ تو وہ فرشتہ ہیں جنہیں گناہ کا تصور بھی چھو کر نہیں گزرتا۔" اس نے مزید کہا۔

"مولانا صاحب! لوگ تو پتھر مارتے ہی ہیں۔ پیغمبروں پر بھی پتھراؤ کرتے رہے ہیں۔"

اس نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ عاقبت نااندیش ہیں۔ تماش بین ہیں۔ ان کی پروا نہ کریں۔ میں نے اور عینی نے طے کیا ہے کہ آپ سے صرف آپ سے ہی اپنا نکاح پڑھوائیں گے۔"

مولانا نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں یہ نیک کام نہیں

کر سکوں گا۔"

عینی نے کہا۔ "جب آپ کی نیک نامی بحال ہوگی تب تو یہ نیک کام کریں گے؟"

"بیشک۔ میں پہلے اپنی نیک نامی چاہوں گا۔"

عرفان نے کہا۔ "ہم کوشش کریں گے کہ ان بہنوں بھائیوں اور بزرگوں کے دلوں سے شبہ دور کر دیں۔ یہ آپ کو پہلے کی طرح معزز سمجھیں۔ جب تک ہم آپ کی نیک نامی بحال نہیں کریں گے شادی نہیں کریں گے۔"

عینی نے کہا۔ "میری غلطی سے آپ پر یہ اُفتاد آ پڑی ہے۔ میں اپنی غلطی کی تلافی کروں گی۔ یہ طے ہے کہ ہمارا نکاح آپ ہی پڑھائیں گے۔"

بڑی دیر بعد دردانہ نے بیٹی سے کہا۔ "تم نے تو مجھے منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ اب... نہ تو مولانا صاحب کو نیک نامی ملے گی نہ تمہارا نکاح ہوگا۔ میرے ساتھ گھر چلو۔"

"میں عرفان کے گھر جاؤں گی۔"

"کیا نکاح کے بغیر جاؤ گی؟ کیا چاہتی ہو ماں شرم سے ڈوب مرے؟"

"میں نے بچپن سے اب تک یہ کبھی نہیں دیکھا کہ آپ کو کسی بات پر شرم آئی ہو۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ اپنی ماں کو بے شرم کہہ رہی ہو؟"

"میں اس بات کا جواب ضرور دوں گی لیکن میرے دل میں ایک پھانس ہے پہلے اسے نکال دیں۔"

ماں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ "عرفان جانتا ہے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں ایک مرد کے شکنجے میں آ گئی تھی۔ اس نے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔ تب میں نے عزت بچانے کے لیے وہی کیا جو انیلا نے کیا تھا اور پھر..... نعیم نے اس کے ساتھ یہی حرکت کی تھی۔ دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا تھا۔"

"تم بکواس کر رہی ہو۔"

مولانا اور دوسرے لوگ حیرانی اور توجہ سے سن رہے تھے۔ عینی نے مردوں اور عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ میں سے کسی نے یقین کیا تھا کہ انیلا مقفل کمرے میں رہنے کے باوجود بے داغ رہی ہے؟"

وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ "نہیں۔ کسی نے یقین نہیں کیا تھا لیکن میں مانتی ہوں۔ میں بھی انیلا کی طرح اس خبیث شخص کو جھانسا دے کر کمرے سے نکل گئی۔ دروازے کو بند کر کے اس سے نجات حاصل کر لی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انیلا نے عزت بچانے کے لیے خود کو ایک کمرے میں بند کیا تھا جبکہ میں اس منحوس کو بند کر کے آئی ہوں۔"

اس نے ماں سے کہا۔ "اگر مقفل دروازے کے پیچھے ایک بدنیت شخص سے بچنا ناممکن ہے تو میں بھی بدکار ہوں اور اگر بچاؤ ممکن ہے تو انیلا بدکار نہیں ہے۔ آج بھی بے داغ ہے یہی سچ ہے۔ آپ ان سب کے سامنے بولیں! آپ کی بیٹی بے داغ ہے یا نہیں...؟ اگر ہے تو ابھی تسلیم کریں کہ انیلا پارسا تھی اور پارسا ہے۔"

وہ ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "تمہیں بے داغ کیسے کہوں؟ یہاں سب ہی تمہیں مولانا صاحب کے گھر میں دیکھ رہے ہیں۔"

"آپ تسلیم نہیں کریں گی کہ بیٹا آپ کے ساتھ جھوٹ بولتا آ رہا ہے۔"

"تم اپنے معاملے میں میرے بیٹے کو کیوں گھسیٹ رہی ہو؟ کیا وہ تمہارا سگا بھائی نہیں ہے؟"

"سگا ہے لیکن بچپن سے اس کے کرتوت دیکھتی آ رہی ہوں۔"

وہ غصے سے بولی۔ "تمہیں چلنا ہے تو چپ چاپ گھر چلو ورنہ جہنم میں جاؤ۔ میرے لیے تم مر چکی ہو۔"

اس نے بیٹی کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ ایک عورت نے کہا۔ "جو کیا ہے وہی سامنے آ رہا ہے۔ منہ چھپا کر جا رہی ہو۔"

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس نے بھتیجی کو بدنام کیا تھا۔ اب اس کی بیٹی پر بھی یہی الزام آیا تھا اور وہ منہ چھپا کر جا رہی تھی۔

وہ جاتے جاتے ٹھٹک گئی۔ سلیمان نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس نے کہا۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی... آئندہ تم بھی میری طرح منہ چھپاتی پھرو گی۔ اب بھی خدا سے ڈرو اور سب سے کہہ دو کہ انیلا گناہ گار نہیں ہے۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "ہے۔ ہزار بار کہوں گی اس نے منہ کالا کیا ہے۔"

امام صاحب نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے؟ موٹی عقل سے ہی سوچو! اگر سچ بولو گی اور انیلا بے داغ تسلیم کی جائے گی تو تمہاری بیٹی کے لیے بھی یہی تسلیم کیا جائے گا کہ یہ گناہ گار نہیں ہے۔"

قادر جان نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لیے سچ بول دو۔ مولانا صاحب کی نیک نامی بحال ہو جائے گی۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر چیخ پڑی۔ "مجھے پریشان نہ کرو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مولانا نے کہا۔ ”اسے جانے دو۔“

وہ سب پیچھے ہٹ گئے۔ وہ بھاگنے کے انداز میں تیزی سے چلتے ہوئے سب کی نظروں سے اوجھل ہوتی چلی گئی۔

مولانا نے امام صاحب سے کہا۔ ”اس سے سچ اگلوانا فضول ہے اگر وہ سچ بولے گی تب بھی یہ لوگ کہیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کو الزام سے بچانے کے لیے انیلا کو بے گناہ کہہ رہی ہے۔ ایک جھوٹی اور چالباز عورت کا سچ بھی جھوٹ سمجھا جائے گا۔“

عینی نے مولانا کے سامنے آکر زمین پر گھٹنے ٹیک دیے۔ ایک دم رونے سسکنے لگی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔ ”یہ کیا کررہی ہو؟“

عرفان نے کہا۔ ”مولانا صاحب! یہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ میں بھی اس کی احمقانہ شرارت میں شریک رہا ہوں۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”اب ہماری یہی کوشش ہوگی کہ آپ کے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو کسی طرح مٹا دیں۔“

عرفان نے کہا۔ ”ہم جارہے ہیں۔ انشاءاللہ جلد ہی نکاح پڑھوانے آپ کے پاس آئیں گے۔“

عینی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ عرفان کے ساتھ جاتے ہوئے بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے بولی۔ ”آج سے بن بیاہی عرفان کے گھر میں رہوں گی جو بدنام کرنا چاہے کرے۔ میرے اور عرفان کے درمیان شرافت اور حیا کی ضامن صرف ایک کتاب ہوگی۔ آخری آسمانی کتاب...“

عرفان نے کہا۔ ”بے شک۔ اللہ تعالیٰ ہی عزت دیتا ہے اور وہی ذلت دیتا ہے۔ یا اللہ! ہمیں خیرِ کثیر عطا فرما...“

مولانا فضل کریم، امام صاحب، قادر جان اور سلیمان نے یک زبان ہوکر کہا۔ ”آمین...“

وہاں کوئی عدالت قائم نہیں کی گئی تھی۔ نہ محلے کی پنچایت کمیٹی کے ممبر آئے تھے۔ صرف آس پاس کی گلیوں کے مردوں اور عورتوں نے ان کا محاسبہ کیا تھا۔ وہ لوگ مولانا اور عینی پر صرف تنقید کرسکتے تھے۔ ان کے خلاف بول سکتے تھے مگر ان کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں سنا سکتے تھے۔

وہ سب یہ کہہ کر چلے گئے کہ پنچایت کمیٹی میں فیصلہ کرایا جائے گا اور انہیں اس محلے سے نکال دیا جائے گا۔

انیلا اور نعیم کے معاملے میں بھی یہی کہا گیا تھا کہ باقاعدہ پنچایت میں انہیں سزا سنائی جائے گی لیکن وہ کمیٹی اس وقت فیصلہ سناتی، جب مقدمے کا دوسرا فریق نعیم حاضر ہوتا۔ اور وہ کبھی حاضر ہونے والا نہیں تھا۔ دردانہ نے بیٹے کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔ ماں بیٹے نے فیصلہ کیا تھا کہ آئندہ اس علاقے میں نہیں رہیں گے۔ وہ اپنا مکان بیچ کر پندرہ لاکھ روپے حاصل کرسکتے تھے پھر مطلقہ ہونے پر دردانہ کو دو لاکھ روپے مل گئے تھے۔ اس طرح وہ کسی دوسرے علاقے میں مکان خرید کر رہائش اختیار کرسکتے تھے۔

وہ ماں بیٹا مطمئن تھے۔ انہوں نے بڑی کامیابی سے انتقام لیا تھا۔ انیلا تمام عمر آبرو باختہ کہلانے والی تھی۔ اگرچہ دردانہ کی بیٹی عینی کے ساتھ بھی یہی ہورہا تھا لیکن وہ ایسی ڈھیٹ اور پتھر دل تھی کہ انیلا کو بدکار ثابت کرنے کے بعد اپنے بیان سے پھرنے والی نہیں تھی۔

تمام لوگ جاچکے تھے۔ مولانا کے گھر میں پیش امام، قادر جان، سلیمان اور معزز تعلیم یافتہ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ ”ہمارے محلے میں جاہل افراد زیادہ ہیں۔ انہیں جس سمت بہکایا جاتا ہے، وہ اسی سمت چل پڑتے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم دو دو چار چار افراد سے تنہائی میں مل کر انہیں پیار سے سمجھاتے رہیں گے تو وہ سمجھ جائیں گے۔ جاہلانہ انداز میں مولانا صاحب کی مخالفت نہیں کریں گے۔“

مولانا نے کہا۔ ”ہم اپنے رسولؐ کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ وہ نافرمانوں سے بحث نہیں کرتے تھے۔ دینِ اسلام کے خلاف مشتعل ہونے والوں سے نرم لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ کلامِ پاک کے مطابق ہدایات فرماتے تھے۔ ان ہدایات پر کوئی عمل کرے یا نہ کرے۔ وہ لوگوں کو ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔

اور وہ کبھی کبھی مایوس بھی ہوجاتے تھے۔ مخالفین ان کی ہدایات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ جب وہ مایوس ہوئے تھے، تب ان پر وحی نازل ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا، ہم نے آپ کو ہادی بنایا۔ آپ کا کام ہدایات دینا ہے۔ باقی ہم جانتے ہیں کہ کسے راہِ راست پر لے جانا ہے اور کس گمراہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہے۔“

وہ ذرا ٹھہر کر بولے۔ ”ہم بھی سچ بولیں گے اور باقی نتائج اللہ پر چھوڑ دیں گے۔“

دوسرے دن علاقے کا چیئرمین اور پنچایت کمیٹی کے بزرگ ان کے پاس آئے۔ ان سب کو تمام واقعے کا علم ہوچکا تھا۔ ایک بزرگ نے کہا۔ ”مولانا صاحب! آپ کے خلاف ٹھوس ثبوت ہیں۔ عینی آپ کے گھر سے برآمد ہوئی ہے۔ اگرچہ ہم آپ کے کردار پر شبہ نہیں کررہے ہیں۔ تاہم لوگوں کو آپ کی حمایت میں سمجھانا ناممکن ہے۔“

چیئرمین نے کہا۔ ”اس کے باوجود ہم نادانوں کو سمجھائیں گے کہ ٹھوس ثبوت کے باوجود آپ پاک اور بے

داغ ہیں۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کفارِ مکہ حضورؐ کو صادق اور امین کہتے تھے لیکن سچا ماننے کے باوجود یہ نہیں مانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے اور حضرت محمدؐ اس کے رسول ہیں۔“

پنچایت کمیٹی کے ایک بزرگ نے کہا۔ ”بے شک۔ ہم مثبت سوچ رکھنے والوں کو پیار و محبت سے سمجھاتے رہیں گے۔ اس طرح جلد ہی آپ کی حمایت میں بولنے والوں کا اضافہ ہوجائے گا پھر مخالفین اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے۔“

مولانا سے محبت کرنے اور ان سے عقیدت رکھنے والوں نے ایک مہم شروع کی۔ وہ لوگ ایک ایک، دو دو آدمیوں سے تنہائی میں باتیں کرتے تھے۔ گھروں میں جاکر عورتوں کو بھی سمجھاتے تھے۔ ان سے کہتے تھے کہ دردانہ کی چالبازی رفتہ رفتہ سمجھ میں آرہی ہے۔ اس نے بیٹے کو پنچایت کمیٹی سے دور کردیا ہے۔ وہ بھی گناہ گار تھا۔ ماں نہیں چاہتی تھی اسے سزا سنائی جائے۔ یا دو گناہ گاروں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کا حکم دیا جائے۔

وہ کسی حال میں انیلا کو بہو بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی اپنی بیٹی کسی دوسرے علاقے میں رہنے کے لیے عرفان کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ کہا جارہا تھا کہ دردانہ نے بیٹی کو بھی بیٹے کی طرح پنچایت کمیٹی سے دور کردیا ہے۔

دو دنوں کے اندر ہی مولانا کے درجنوں حمایتی ان کے دروازے پر آگئے۔ انہوں نے کہا۔ ”مولانا صاحب! آپ مسجد میں تشریف لے چلیں۔ ہم مخالفت کرنے والوں سے نمٹ لیں گے۔“

انہوں نے کہا۔ ”مخالفین کو چیلنج نہ کرو۔ خواہ مخواہ لڑائی جھگڑے ہوں گے، خون خرابہ ہوگا۔“

ایک شخص نے کہا۔ ”ہم کسی سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ مسجد کمیٹی اور پنچایت کمیٹی کے تمام ارکان مسجد میں آپ کا انتظار کررہے ہیں۔ ہمارے ساتھ چلیں۔“

ایک اور شخص نے کہا۔ ”ہم میں سے کئی افراد صرف جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں۔ آج آپ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھیں گے۔“

ایک بزرگ نے کہا۔ ”میری اتنی عمر گزر گئی ہے۔ میں نے باقاعدہ نماز نہیں پڑھی۔ آپ چلیں گے تو میں پانچوں وقت کی نماز پڑھنے مسجد میں آیا کروں گا۔“

یہ سنتے ہی مولانا اٹھتے ہوئے بولے۔ ”سبحان اللہ! نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔ میں سر کے بل جاؤں گا۔“

وہ اپنے حمایتیوں کے ساتھ مسجد کے دروازے پر آئے تو پیش امام صاحب نے اور مسجد کمیٹی کے ارکان نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ جن مخالفین نے کہا تھا کہ مولانا مسجد میں نہیں آئیں گے، خدا کی قدرت سے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ان کے ساتھ نماز ادا کی۔

اس روز نمازیوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ مولانا خوشی سے رو پڑے۔ بے شک۔ اللہ نماز پڑھنے اور صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو عزت دیتا ہے۔

امام صاحب نے نماز کے بعد کہا۔ ”الحمدللہ... آج مسجد بھری بھری سی لگ رہی ہے۔ مولانا صاحب! آپ کے طفیل نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور اسی حساب سے آپ کے حمایتیوں میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔“

مسجد کمیٹی کے صدر نے کہا۔ ”اور بہت سے حمایتی ایسے ہیں جو بیماری اور دیگر مصروفیات کے باعث یہاں نہ آسکے لیکن وہ اپنے دفتروں، ملوں اور کارخانوں میں نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ کی قدر و منزلت میں اضافے کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔“

مولانا وہاں سے اٹھ کر مسجد کے ایک حصے میں جاکر سجدۂ شکر ادا کرنے لگے۔ یہ بات پورے علاقے میں پھیل گئی کہ ان کی نیک نامی بحال ہورہی ہے۔ حمایتیوں کی تعداد اچھی خاصی ہوچکی ہے۔ مخالفین کے متعلق کہا جارہا تھا کہ وہ کم سے کم ہوگئے ہیں۔ اور وہ ایسے افراد ہیں، جو فطرتاً خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔

مولانا نماز کے بعد گھر نہیں گئے۔ مغرب کی نماز تک عبادت میں مصروف رہے۔ قادر جان ڈیوٹی سے واپس آگیا تھا۔ یہ سن کر اور دیکھ کر خوش ہورہا تھا کہ مولانا نماز پڑھنے مسجد میں آئے ہیں اور اپنے ساتھ خاصی تعداد میں نمازیوں کو لائے ہیں۔

وہ مغرب کی نماز کے بعد ان کے ساتھ گھر کی طرف جانے لگا۔ ایک گلی سے گزرتے وقت عورتوں اور مردوں نے آس پاس کے گھروں سے نکل کر انہیں سلام کیا۔ وہ سب کو سلام کا جواب دیتے ہوئے گزر رہے تھے۔

قادر جان نے کہا۔ ”کل آپ میرے ساتھ پرچون کی دکان تک گئے تھے لیکن کسی نے آپ کو سلام نہیں کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے، یہ لوگ اب پہلے کی طرح آپ کی عزت کرنے لگے ہیں۔“

وہ بولے۔ ”میں ہر سانس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہوں تو بھی کم ہے۔ بے شک۔ اللہ تعالیٰ مستحقین کو عزت دیتا ہے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اس گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں آئے۔ انیلا نے سنا تھا کہ مولانا فضل کریم کی نیک نامی بحال ہوگئی ہے اور وہ مسجد میں ہیں تب سے وہ ان کی منتظر تھی۔ بار بار کھڑکی کے پاس آ کر دیکھتی تھی پھر وہ قادر جان کے ساتھ نظر آئے۔ کھڑکی کے پاس سے گزرنے لگے تو وہ بولی۔ ”مولانا صاحب! اسلام علیکم...“

اس نے کھڑکی سے پہلی بار سلام کیا تھا۔ وہ رک کر بولے۔ ”وعلیکم اسلام...“

”آپ کو مبارک ہو۔ نیک نامی بحال ہوگئی ہے۔“

انہوں نے کہا۔ ”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“

”آپ میری طرح ٹھوس ثبوت کے ساتھ پکڑے گئے تھے پھر بھی آپ کے ساتھ معجزہ ہوگیا۔ میرے ساتھ کب ہوگا...؟“

یہ بڑا چونکا دینے والا سوال تھا۔ وہ بول رہی تھی۔ ”آپ کے حق میں اس لیے فیصلہ ہوا کہ آپ عابد و زاہد ہیں۔ خدا جانتا ہے اور محلے کی سب ہی عورتیں جانتی ہیں' میں بھی پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں۔ میری ذات سے بھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ میرے سر سے کبھی آنچل نہیں ڈھلکتا۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”میں آپ کی طرح عالم فاضل نہیں ہوں لیکن تمام دینی احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کرتی ہوں پھر مجھے ایک سچی اور دیندار لڑکی کیوں تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے؟ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ خدا سے پوچھ کر بتائیں میرے ساتھ کب یہ معجزہ ہوگا؟“

وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہے تھے اور اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں خدا پر بھروسا ہے؟“

”خدا شاہد ہے' میں اس پروردگار کے سوا کسی پر بھروسا نہیں کرتی۔“

”تو پھر صبر کرو۔ تمہارے ساتھ بھی بہت جلد معجزہ ہوگا۔“

یہ کہتے ہی وہ قادر جان کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ وہ بولا۔ ”آج مجھے اس لڑکی پر غصہ نہیں آ رہا ہے' ترس آ رہا ہے۔“

”ہاں۔ میں بھی سوچ رہا ہوں' اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔“

”میں تو کیا' پورا علاقہ جانتا ہے' نعیم جھوٹا فریبی' بدحرام اور نشے کا عادی ہے پھر ہم لوگوں نے اس جھوٹے حرام خور کی بات کیوں مان لی؟ انیلا کی بات کیوں نہیں مانی کہ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے؟“

”یہ بحث فضول ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ بات اہم ہے کہ کسی بھی طرح اس کی نیک نامی بحال کی جائے۔“

انہوں نے دوسری صبح نماز کے بعد پیش امام سے اور دوسرے تمام نمازیوں سے کہا۔ ”آپ حضرات کی محبتوں سے اور کوششوں سے میری نیک نامی مجھے واپس ملی ہے۔ میرے ساتھ انصاف ہوا لیکن پلمبر سلیمان کی صاحبزادی کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔“

سلیمان پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ اس وقت بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر مولانا سے کہا۔ ”آپ پر خدا کی رحمت ہو۔“

وہ بولے۔ ”جو الزام مجھ پر لگایا گیا تھا' مجھ سے پہلے ویسا ہی الزام انیلا پر لگ چکا تھا۔ اگر میں سچا اور دین دار ہوں تو وہ بھی سچی اور پانچ وقت کی نمازی ہے۔ اس کے برعکس نعیم جھوٹا' فریبی اور نشے باز ہے۔ ایک سچی لڑکی کہتی ہے کہ وہ بے داغ ہے۔ وہ جھوٹا کہتا ہے کہ گناہ گار ہے۔ ہم سب جھوٹے کی بات کیوں مان رہے ہیں؟“

تمام نمازی قائل ہو کر ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”آپ درست فرماتے ہیں۔ ہم اس کی پارسائی تسلیم کریں گے لیکن سب لوگ نہیں مانیں گے۔“

مولانا نے کہا۔ ”لوگ کیا ہوتے ہیں؟ ہم سب مل کر ہی لوگ کہلاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے' اب ہمارے علاقے میں حق بات کو سمجھنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہم سب مل کر اس کی حیا اور پارسائی کو تسلیم کریں گے تو اعتراض کرنے والے بھی رفتہ رفتہ مان جائیں گے۔“

امام صاحب نے کہا۔ ”بے شک۔ ہم نے مولانا صاحب کے سلسلے میں کوششیں کیں اور کامیاب رہے۔ خدا سلیمان کی صاحبزادی سے راضی ہوگا تو اسے بھی ضرور عزت ملے گی۔“

مولانا نے کہا۔ ”قادر جان! تمہیں جو سمجھایا ہے' وہ کرو۔ سلیمان کے ساتھ اس کے گھر جاؤ۔ ہم بھی وہاں آ رہے ہیں۔“

سلیمان خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ نے فرمایا تھا' نماز قائم کرو اور یاد رکھو نماز پڑھتے ہی معجزہ نہیں ہوگا۔ کبھی برسوں کے بعد عبادت کا صلہ ملتا ہے اور کبھی پلک جھپکتے ہی وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔“

وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ”بے شک۔ اللہ قادر مطلق ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے' جیسے پلک جھپکتے ہی میرے منہ کی کالک دھل رہی ہے۔ اب یہ منہ ہمیشہ مسجد کے فرش پر جھکتا رہے گا۔“

کئی نمازیوں نے کہا۔ ”سبحان اللہ...!“

وہ قادر جان کے ساتھ مسجد سے باہر آیا پھر گھر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ میں سنبھل سنبھل کر چل رہا ہوں۔ میری گھر والی کے گھٹنوں میں تکلیف ہے لیکن وہ سنے گی تو خوشی سے اچھل کر کھڑی ہو جائے گی۔ اب میری انیلا کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئیں گے۔ میری بیٹیوں کی ڈولیاں اٹھیں گی۔“

وہ بولتا جا رہا تھا اور مسرتوں کے ہجوم میں ڈگمگاتا جا رہا تھا۔ عرفان بائیک پر ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے قریب آ کر کہا۔ ”قادر بھائی! مولانا صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ کیا مسجد میں ہوں گے؟“

”ہاں۔ وہ مسجد میں ہیں۔ کیا بات ہے؟ اتنی صبح ان سے ملنے آئے ہو؟“

”مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ لوگ پھر سے ان کی عزت کرنے لگے ہیں۔ میں انہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔ اب تو میں اور عینی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکیں گے۔“

”بے شک۔ مولانا صاحب تمہارا نکاح پڑھائیں گے۔ مسجد میں جاؤ۔ ان سے ملاقات کرو۔“

وہ مسجد کی طرف چلا گیا۔ سلیمان نے گھر پہنچ کر قادر جان کے لیے بیٹھک کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”رضیہ بیگم! کہاں ہو؟ میں تو خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔ میری انیلا کو پھر سے نیک نامی مل رہی ہے۔ ابھی مسجد میں یہ فیصلہ ہوا ہے۔ مولانا صاحب اور پیش امام صاحب یہاں آ رہے ہیں۔“

یہ ایسی خوش خبری تھی کہ وہ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ انیلا کہہ رہی تھی۔ ”میں نے مولانا صاحب سے پوچھا تھا' ان کے ساتھ معجزہ ہوا ہے۔ میرے ساتھ کب ہوگا؟ انہوں نے ہدایت کی تھی کہ میں صبر کروں۔ میرے ساتھ بھی معجزہ ہوگا۔ اور اب' ایسا ہی ہو رہا ہے۔“

وہ ٹھہر کر بولی۔ ”یا خدا! میں ساری عمر تیرا شکر ادا کرتی رہوں' تب بھی شکریہ ادا نہیں کر سکوں گی۔ میری عمر چھوٹی پڑ جائے گی۔“

قادر جان بیٹھک میں تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ”یہ وہی لڑکی ہے' جو روز صبح مولانا صاحب کو طعنے دیتی تھی۔ آئندہ دل سے ان کی عزت کرے گی۔“

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ سلیمان نے قادر جان سے پوچھا۔ ”مولانا صاحب اور امام صاحب ابھی تک کیوں نہیں آئے؟ لگتا ہے' مسجد کے کسی معاملے میں الجھ گئے ہیں؟“

وہ ان کے انتظار میں بیٹھک سے باہر آ گیا۔ سلیمان بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ باہر آتے ہی ٹھٹک گیا۔ دروازے

اطوار اقوام

مختلف قوموں اور مختلف ممالک کے اطوار میں کس قدر فرق ہوتا ہے، آیئے دیکھیں۔

☆ برطانیہ اور ہالینڈ میں آستینیں چڑھانے کا مطلب کام کے لیے تیار ہونا ہے، جرمنی میں اس کا مطلب آرام کرنا اور پاکستان میں اس سے مراد لڑائی کے لیے تیاری سمجھی جاتی ہے۔

☆ امریکا کے دفاتر میں لوگ فون پر بات کرتے ہوئے پاؤں میز پر رکھ لیتے ہیں، جاپان میں اس کو انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔

☆ فرانس کے بعض علاقوں میں آپ کیفے میں اس وقت تک نہیں بیٹھ سکتے جب تک کہ آپ وہاں موجود ہر جاننے والے کے ساتھ ہاتھ نہ ملا لیں۔

☆ افغانستان میں سرِ راہ ملنے والے لوگ حال احوال پوچھنے میں پانچ منٹ لگاتے ہیں۔

☆ عرب ممالک میں آپ میزبان کے گھر میں چیزوں کو غور سے دیکھیں تو وہ خیال کرے گا کہ آپ کو ان چیزوں کی ضرورت ہے۔

☆ روس میں میزبان، مہمان کے مشروب کی مقدار اپنے مشروب کی مقدار جتنی رکھتا ہے ورنہ مہمان برا مان جاتا ہے۔

☆ جب آپ ملاقات کے لیے مختلف لوگوں کو 4 بجے کا وقت دیں تو جرمن عین وقت پر پہنچیں گے۔ امریکن 15 منٹ پہلے، برطانوی 15 منٹ تاخیر سے اور اطالوی شاید ایک گھنٹا لیٹ پہنچیں۔

☆ بزنس میٹنگ کے سلسلے میں برطانوی لوگ کاروباری معاملات، کھانے پینے کے دوران میں طے کرتے ہیں۔ جاپانی کھانے کے دوران میں کاروباری گفتگو نہیں کرتے، جرمن کاروباری معاملات، کھانے سے پہلے طے کرتے ہیں۔ فرانسیسی پہلے کھاتے ہیں بعد میں کاروبار پر بحث کرتے ہیں۔

مرسلہ: تفسیر عباس بابر، اوکاڑہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سامنے مسجد کے چار نمازی اپنی بیویوں اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

سلیمان نے تعجب سے کہا۔ ''آپ چاروں مسجد میں تھے۔ اتنے لوگوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں اور مجھے آواز بھی نہیں دی؟''

ایک نمازی نے کہا۔ ''ابھی اور نمازی اپنے گھر والوں کے ساتھ آرہے ہیں۔ اس کے بعد ہم تمہیں بلانے والے تھے۔''

اور واقعی وہ سب اپنی عورتوں اور پڑوسیوں کے ساتھ آرہے تھے۔ سلیمان نے حیرانی سے قادر جان کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''دیکھتے جاؤ' ابھی کیا تماشا ہونے والا ہے؟''

اس نے دیکھا' مولانا صاحب' پیش امام صاحب اور علاقے کا چیئرمین پنچایت کمیٹی کے ممبران کے ساتھ ادھر آرہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری گلی عورتوں اور مردوں سے بھر گئی۔ ایسی بھیڑ دیکھ کر محلے کے تمام لوگ گھروں سے ...... نکل آئے۔ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ ''یہاں کیا ہورہا ہے؟''

علاقے کے چیئرمین نے بلند آواز میں کہا۔ ''سلیمان! ہم نے سوچ سمجھ کر یہ بھیڑ لگائی ہے۔ یہاں مولانا صاحب کے سیکڑوں حمایتی ہیں۔ ہم انیلا کی حمایت میں بولیں گے تو سب کی آواز گونجے گی' دور تک کانوں میں جائے گی۔''

مولانا نے کہا'' اور ہم بول رہے ہیں۔ دردانہ جھوٹی اور مکار ہے۔''

تمام حمایتیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ''دردانہ جھوٹی اور مکار ہے۔''

''انیلا بچی' بے داغ اور پارسا ہے۔''

سب نے کہا۔ ''انیلا بچی' بے داغ اور پارسا ہے۔''

انیلا کھڑکی کے پیچھے خوشی سے رو پڑی۔ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بے شک۔ خدا ہی عزت دیتا ہے اور وہی ذلت دیتا ہے۔ مجھے اس کے کرم سے عزت اور نیک نامی مل رہی ہے۔ اے اللہ! تیرا شکر ہے....''

رضیہ بیگم اور دوسری بیٹیاں بھی خوشی سے رو رہی تھیں۔ گھر کے سامنے ایک دو نہیں' بے شمار لوگ انیلا کی پارسائی کا اعتراف کر رہے تھے۔

امام صاحب نے کہا۔ ''ہم سب نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ وضو سے دھلی ہوئی زبان سے انیلا کو باحیا اور بے گناہ کہہ رہے ہیں۔ خدا دیکھ رہا ہے' سن رہا ہے۔ انیلا کو عزت اور نیک نامی دے رہا ہے۔ ہم حاضرین سے گزارش کریں گے کہ وہ خدا کی رضا کے آگے سر جھکا لیں۔''

قادر جان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''سب سے اہم بات کہنے کا اعزاز مجھے حاصل ہو رہا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم نے انیلا کی پارسائی تسلیم کی ہے لیکن صرف تسلیم کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ وہ سہاگن بنے گی' ایک مجازی خدا کے سائے میں جائے گی تو سلیمان کی دوسری بیٹیوں کے رشتے بھی اچھے گھرانوں سے آسکیں گے۔''

ایک نمازی نے کہا'' لہٰذا ہم انیلا کا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔''

دوسری خاتون نے کہا۔ ''ہم بھی اسی لیے آئے ہیں۔''

پھر تو کتنی ہی عورتیں' اور مرد اس کا رشتہ مانگنے لگے۔

امام صاحب نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر کہا۔ ''سلیمان! رشتہ مانگنے والے بے شمار ہیں مگر تمہاری صاحبزادی کا طلبگار ایک ہی ہے۔ یہ سب لوگ مولانا صاحب کے لیے انیلا کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ تمہارے در پر سوالی بن کر آئے ہیں۔''

فرطِ مسرت سے سلیمان کے گھٹنے کانپنے لگے۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ گرنے کے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا۔ دو افراد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''یا خدا! تو میری اوقات سے بڑھ کر مجھے دے رہا ہے۔ مجھ سے خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

گھر کے اندر یہی حال رضیہ بیگم کا تھا۔ وہ چکرا کر بیٹھ گئی تھی۔ چھوٹی بیٹیاں خوشی کے مارے رو رہی تھیں۔

اور انیلا پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ذلت کی پستیوں میں گرنے کے بعد عزت کی ایسی بلندی ملے گی۔

وہ دعائیں مانگتی تھی کہ شوہر کے نام پر کوئی بھی آئے اور اس کے سر پر حیا کا آنچل رکھے۔ اسے وہاں سے دور لے جائے۔

کیا خدا کی شان ہے کہ اس نے ایک چلو مانگا اور اسے سمندر مل رہا تھا۔ وہ ایک بے حد خوبرو اور عالم فاضل شخص کی شریک حیات بننے والی تھی۔

وہ ایک دم سے کھڑے کھڑے سجدے میں گر پڑی۔

یہ مرد سے زیادہ عورت کا مسئلہ ہے کہ پارسائی کیسے قائم رکھے اور مرد ہی اسے اپنی پناہ میں لے کر یہ مسئلہ حل کرتا ہے۔

کوئی انیلا سے پوچھے' وہ کس طرح کانٹوں کے بستر پر کروٹ کروٹ لہولہان ہوتی رہی تھی....؟ لیکن کوئی بات نہیں....

دل دُکھا ہے تو کُھلی ہے مرے وجدان کی آنکھ
اک نگینہ تھا کہ شبنم نے جگایا ہے ابھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk